خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

مئی 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ عذرا رسول

11 — انشائیہ — جون ایلیا
دورِ حاضر کے مصائب و آلام کا دلخراش تذکرہ

12 — آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی محفلِ مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

20 — فصل اجڑ گئی — ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ، با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

47 — شوقِ مردانگی — مختار آزاد
زندگی سے لطف اندوز ہونے والے ایک بے حس مسیحا کی روداد

61 — دوراہا — طاہر جاوید مغل
سلگتے جذبوں اور بے کل لمحات کی ادھوری داستان

68 — کشکول — انوار صدیقی
اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

99 — دادا پوتا — عائشہ فاطمہ
ایک وفا شعار بیوی اور... ایک ماں کی ممتا کا امتحان

116 — مجرمانہ ذہن — مرزا امجد بیگ
بھری عدالت میں مدلل جرح... کامیاب وکیل کا دلچسپ انداز

143 — رقیب — سلیم انور
گمان اور بدگمانی کے درمیان ڈگمگاتی ہوئی ایک تاثر انگیز نیم سائنسی کہانی

152 — محفلِ شعر و سخن — قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ، آپ کی پسند آپ کے ذوق نے ہم آہنگ

155 — بھیدی — نظارت نصر
کھوکھلی بنیادوں پر قلعے تعمیر کرنے والے فریبی کا ماجرا

169 — مصروف لاش — اثر نعمانی
لاشوں کا کھیل تماشا...... ایک عجیب پراسرار کہانی

176 — مسافر — ناصر ملک
گل و گلزار سے راہِ پرخار تک ایک مسافرِ بے نوا کی رودادِ حیات

215 — بمقابلہ — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
انارکی اور بے حیائی کا سنگین منظر نامہ

219 — حضرت داؤد ؑ — رضوانہ ساجد
حالات اور جالوت سے مقابلہ کرنے والے نبی کا احوال

229 — شیریں زہر — محمد عفان
بے ضرر نظر آنے والے پھولوں جیسے انسانوں کا فریب

242 — اچھوتی محبت — ایچ اقبال
وحشت اور لذت آزار سے بے پروا... ایک سرکش حسینہ کی دیوانگی

000 — کترنیں — ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے، اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے، سب کچھ آپ کے لیے

جلد 41 • شمارہ 05 مئی 2012 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا
اب اس کا حال بتائیں کیا

مگر ہم آپ کو بتائیں گے اور خوب بتائیں گے۔

جی ہاں..... ماہنامہ سرگزشت کراچی کا ایک اور معرکتہ الآرا خاص نمبر

عشق ناکام نمبر

عشق.....جس میں مہر بھی ہے اور قہر بھی، وصل بھی ہے اور فراق بھی..... عشق، انسان سے کیا کچھ نہیں کراتا انہوں نے بھی اپنی شہرت دنا موری کو داؤ پر لگا دیا۔

مشہور و معروف ہستیوں، تاریخ ساز افراد کے ناکام عشق کی داستانیں.....دل پر اثر کرنے والی سچ بیانیاں، ایسی دلچسپ سچی کہانیاں جو آپ کو چونکا دیں گی۔

بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

ہر صاحب علم کے لیے تحفۃً خاص

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

انشائیہ

آخری المیہ

جون ایلیا

شام ہے، اک لالہ فام ہے اور فضا سے کلام ہے مگر چند لمحے سے میں، میرا ہمزاد اور میرا انشا پرداز بھائی معراج رسول ساکت اور صامت بیٹھے ہیں۔ ہم ابھی چند لمحے پہلے بیسویں صدی اور خاص طور پر بیسویں صدی کے اس دوسرے آدھے حصے کے نفع و نقصان کا حساب لگا رہے تھے اور اس کی سیاسی، اخلاقی، نفسیاتی اور عمرانی صورت حال کو معرض گفتگو میں لا رہے تھے۔

ہم تینوں اس دور کے ایک غالب رجحان اور میلان کے باعث بہت ہمت شکن تشویش اور بہت مایوس کن خدشوں میں مبتلا ہیں۔ ہمارے اردگرد سانس لینے والے جاندار ہماری تشویش اور خدشوں کو شاید وہم اور مالیخولیا خیال کریں لیکن ان کے کسی خیال سے ہمارے مسئلے اور معاملے کی سنگینی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جو کچھ ہے وہ ہے۔

انسان نے گزشتہ چند صدیوں کے دوران میں، خاص طور پر گزشتہ چار ساڑھے چار صدیوں کے دوران میں علمی اور فنی (تکنیکی) ارتقا کا جو عالی شان سفر طے کیا ہے وہ نوع انسانی کے ذہنی اعجاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صدیاں علم اور فن (ٹیکنالوجی) کے درجہ بہ درجہ اوج اور عروج، حیران کن اوج اور عروج کی صدیاں رہی ہیں اور بیسویں صدی کا یہ دوسرا حصہ تو ان روشن سے روشن تر اور روشن ترین صدیوں کا حاصل ہے۔

اس دور کو خیر و جمال اور شستگی اور شائستگی کا سب سے زیادہ زریں دور ثابت ہونا چاہیے تھا لیکن یہ حقیقت کس قدر اذیت ناک حقیقت ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس برعکس حقیقت کے ذمے دار وہ لوگ ہیں جنہیں صاحبانِ امر و قدر کی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کے ان صاحبانِ امر و قدر نے اپنے آپ کو بڑے بھونڈے انداز میں نااہل، ناہنجار اور نابکار ثابت کیا ہے۔

ابھی چند لمحے پہلے معراج رسول کہہ رہے تھے اور بجا کہہ رہے تھے کہ پتھر کے دور کے انسانوں کا کوئی ایک فول کسی دوسرے فول کے حق میں اتنا مہیب، مدہش اور مہلک نہیں رہا جتنا مہیب، مدہش اور مہلک بیسویں صدی میں رہا ہے۔ تاریخ کی جتنی تباہ کن لڑائیاں علم اور فن کی اس سب سے پُرمایہ صدی میں لڑی گئی ہیں، اتنی تباہ کن لڑائیاں وحشت، بہیمیت اور بربریت کے بدترین دور میں بھی نہیں لڑی گئیں۔

بیسویں صدی کا کیا مطلب ہے؟ بیسویں صدی کا مطلب ہے لاکھوں برس کی انسانی ریاضت، علم، تحقیق، ہنرمندی، کاریگری (ٹیکنالوجی) اور مہارت کے کمال کی سب سے تابندہ، درخشندہ اور رخشندہ صدی۔ اس صدی کو تو انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ سکون بخش، فرحت ناک اور جاں فزا صدی ہونا چاہیے تھا، اس صدی کے انسانوں کو گزشتہ تمام صدیوں کے انسانوں سے کہیں زیادہ انسانیت دوست انسانوں، نفیس انسانوں کی حیثیت سے سامنے آنا چاہیے تھا۔

تاریخ کے شریف اور لطیف انسان لاکھوں برس سے انسانیت کی شستگی، فیروزمندی اور خرسندی کے جو خواب دیکھتے چلے آئے ہیں، اس صدی کو ان خوابوں کی روح پرور ترین تعبیر ثابت ہونا تھا لیکن کیا ایسا ہوا؟ یہ شرمناک ترین اور اشتعال انگیز ترین حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

میں نے بیسویں صدی کے اس آخری دور کی بات کی تھی۔ بیسویں صدی کا یہ آخری عشرہ اپنے مزاج میں انتہائی وحشیانہ دور ثابت ہو رہا ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت وہ نسلی، لسانی، سیاسی اور مذہبی تعصبات ہیں جو مشرق و مغرب کے اعصاب پر بری طرح طاری ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اس صورت حال کے ذمے دار مہذب انسانیت کے سردھرے ہیں۔ ان ارجمند سردھروں نے ذہنی توازن کھو دیا ہے، بری طرح کھو دیا ہے۔ ان کا وجود تاریخ کی انتہائی بیہودہ مسخرگی ثابت ہو رہا ہے۔ یہ عالمی ٹولا، صحت مند انسانیت کے حق میں ایک زہریلی گند کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عہد کے شائستہ اور شریف ذہنوں کا جو سب سے بڑا فرض ہے وہ تعصبات کے عالمی رجحان کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ یہ جنگ بہ یک وقت شعور اور جذبے کے ساتھ کی جانی چاہیے۔ اگر یہ جنگ نہ کی گئی تو انسانیت کا تمام تر سرمایہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ انسان کی لاکھوں برس کی علمی، فنی اور تہذیبی کمائی نیست و نابود ہو کر رہ جائے گی اور یہ کہکشاؤں کا، کائنات کا شاید سب سے بڑا حادثہ، سب سے بڑا اور آخری المیہ ہوگا۔

ایک خط

عزیز قارئین!

تسلیمات

مئی 2012ء ... موجودہ عہد میں دیکھا جائے تو بہت کٹھن ثابت ہو رہا ہے۔ پہلے موسم گرما لُو کی حدت بڑھانے کا سبب تھا مگر اب مزاج کی گرمی کے بھی کیا ہی کہنے۔ جبکہ پیٹرول کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اور اس کے خلاف ہونے والے مظاہروں کو دیکھ کر احساس ہو رہا ہے کہ شاید ارباب اختیار طے کیے بیٹھے ہیں کہ "عوام کی آواز پر کان نہیں دھرنا۔" اور ساتھ ہی قتل و غارت کا گرم بازار دیکھ کر لگتا ہے کہ "غریبوں کو مار کر غربت ختم کرنے کا کوئی پروگرام ہے۔" .. بات آگے بڑھاتے ہیں، یکم مئی مزدوروں کا عالمی دن، محض یکم تاریخ تک ہی محدود کر دیا گیا ہے جبکہ مئی کے آخری عشرے میں، ہم نے خود کو ایٹمی قوت کے حوالے سے پوری دنیا میں تسلیم کرایا مگر ترقی کرنے کے بجائے زندگی کے تمام شعبے تنزلی کی طرف گامزن دکھائی دیے۔ پچھلے دنوں لاہور ہائی کورٹ نے پنجاب بھر کے تمام تعلیمی بورڈ کو مینوئل سسٹم بحال کرنے کا حکم دیا ہے، عدالت کے مطابق 18، 18 گھنٹے کی لوڈشیڈنگ میں آن لائن سسٹم کس طرح چلایا جا سکتا ہے۔ گویا ہمارا ترقی معکوس کا سفر اب تک جاری ہے لیکن ... نامساعد حالات کے باوجود تعلیمی میدان میں ہمارے طلبہ عزم کی سیسہ پلائی دیوار کے مانند مضبوطی سے اپنے ارادوں پر عمل پیرا ہیں جس کی حالیہ مثال پچھلے دنوں ہمارے پھالیہ سے تعلق رکھنے والے ایک ہونہار طالب علم 13 سالہ موسیٰ فیروز نے انٹرنیٹ کے ذریعے میتھ میٹکس کے ایک بین الاقوامی مقابلے میں (جس میں 14 لاکھ طلبہ نے حصہ لیا) 4405 پوائنٹس لے کر پہلی پوزیشن حاصل کی جبکہ دوسری پوزیشن بھی پاکستانی طالب علم حسنین نے حاصل کی۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی کہ نہایت ناگفتہ بہ حالات میں تعلیم کے شعبہ میں بہترین کارکردگی دکھانے والے ممالک میں پاکستان چوتھے نمبر پر ہے۔ شاباش ہونہاروں شاباش۔ پاکستانی طلبہ کے استقلال اور پرجوش تعلیمی رجحان کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی" خدا ہمارے ارض وطن کو سدا سلامت اور پرامن رکھے، آمین۔ اور جناب اب ہم چلتے ہیں اپنے بریڈ ٹیسیڈر کی محفل میں جو ہماری تحریروں پر کھل کر تعریف و تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "اس بار سرورق جاسوسی کے سرورق کے انداز میں تھا۔ لڑکا نما لڑکی اولیویا کے پتوں سے جھانک رہی تھی۔ جون ایلیا اس بار قدرے آسان لفظوں کے انشائیہ کے ساتھ موجود تھے۔ ہمارے معاشرتی حالات، بے روزگاری مہنگائی، لاقانونیت جرم کی آبیاری کے لیے واقعی بہت سازگار ہیں۔ اداریہ حسب سابق دل دہلا دینے والے حالیہ واقعات سے پُر تھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ اپنے دست غیب سے مسلمانوں کے حالات درست فرما دے (آمین) ماہا ایمان کافی عرصہ بعد رن کروانے آئی ہیں اور حسب معمول صنف وجاہت سے پنجہ آزمائی کرتی نظر آ رہی ہیں، ویلکم بیک ٹو محفل ماہا جی! تصویر العین! بھئی اب تو آپ ہمارے پڑوسی ہو گئے۔ ملتان ہمارے خانیوال کے قریب ہی ہے، بہن کی شادی مبارک ہو۔ ڈاکٹر وسیم، گجرات! بھائی واقعی بڑا حوصلہ ہے آپ کا خط شائع نہ ہونے پر آپ کو کوئی دکھ نہ ہوا۔ اپنے خط میں مدیرہ آنٹی کی باخبری پر حیرت ہوئی۔ آنٹی جی! ہم تو خود کو بڑا چالاک سمجھ رہے تھے لیکن آپ تو بڑی تیز نکلیں سب پتا ہے آپ کو بہرحال اس بے ضرر شرارت پر معذرت خواہ ہوں۔ سسپنس محاوروں کے درمیان میں ایک دوست کی رائے شرارتی قاری کے بارے میں ہے کہ یہ لیبا انصاری ہیں۔ عمران حیدر بلوچ ابھی ہم آپ کی رہائی کے لیے دعاگو ہیں۔ سعدیہ بخاری! آپ کی یادداشت واقعی بہت کمزور ہے، طاہرہ گلزار پچھلے ماہ پہلی دفعہ سسپنس میں شامل ہوئی ہیں، بادام وغیرہ کھایا کریں۔ طاہرہ گلزار! جناب یاد رکھنے کا شکریہ۔ تفسیر عباس کافی عرصہ بعد تشریف لائے اور بہت نادر مشورے سے ادارے کو نوازا کہ خطوط کی محفل کے صفحات بڑھائے جائیں تاکہ بلیک لسٹ والا چکر ہی نہ رہے۔ سیانوالی سے سید حکیم رضا شاہ اور احسان سحر نے فون پر اپنے تبصروں کے غیاب پر بہت ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ کشکول میں شیخ حامد اپنے حریف رستم کے خلاف بہت ہوشیاری سے افضل خان کو استعمال کر کے بلیک میلنگ مواد حاصل کر چکا ہے تاہم افضل خان کی جس طرح توڑ پھوڑ ہوئی تھی اس کے بعد اس قسم کی بھاگ دوڑ، اتنی جلدی؟ ناممکن ہے۔ مسافر میں شاہ جی کو سلامت پا کر سکون محسوس ہوا۔ کھالے اور شہریار کی جاسوسیوں سے کہانی میں دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ شہریار یقیناً حیات خان اور حیدر خان کے ہاتھوں زک اٹھائے گا اور پھر نئی منزلوں کا راہی بن جائے گا۔ نجمہ مودی کی "دشت تنہائی" بے حد طویل ثابت ہوئی، اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ کہانی بہت اچھے انداز میں شروع ہوئی لیکن بڑے ملک کی وفات کے ساتھ ہی کہانی بس سلطانہ کے غیاب اور طلن تک محدود ہو کر رہ گئی۔ مختار آزاد کی فیملی بزنس دلچسپ کہانی تھی۔ سوزی کے پاپا نے کچھ دن قید میں تو گزار لیے لیکن تھامس کی حرکت اور اس کے پکڑے جانے کے بعد ملاوٹ کے لیے اصلی شہد خریدنے کا مسئلہ بھی باقی نہ رہا جس کا مطلب کم سرمایہ کاری زیادہ منافع، تاہم تھامس برا پھنسا۔ عابدہ زجس کی لاحاصل واقعی لاحاصل ثابت ہوئی، جیک جان سے گیا اور سنگی در بدر رہی، وہاں پوکی کے مزے ہو گئے۔ خواب بسر لاشعور کی کارستانیوں پر مشتمل مختصر تحریر تھی۔ اس کا ایک پہلو انسان پر مسلط کردہ پابندیوں کا ردعمل بھی کہا جا سکتا ہے۔ کاش ایسی دہری زندگی کے خواب ہمارے حکمرانوں کو بھی آتے، جہاں وہ عام کے روپ میں ہوتے بجلی، گیس اور دیگر بلز بھرنے کی فکر میں ہلکان ہوتے مہینا کے آخر میں قرض لے کر گزارہ کرتے تو انہیں بھی عوام کی مشکلات کا احساس ہوتا۔ (بہت خوب) رضوانہ ساجد حضرت داؤد کے حالات سے بہتر انداز میں آگاہ کرتی نظر آئیں۔ حضرت داؤد کی فلسطینی بادشاہ کے پاس پناہ کی غرض سے روانگی پہلی بار پڑھی۔ محفل شعر و سخن میں محمد قاسم ضلع خوشاب اور زوہیب احمد کراچی کا انتخاب بہت پسند آیا۔"

✠ **رمضان پاشا** گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "تازہ شمارے کے سرورق کی دوشیزہ اور پری جوڑا کچھ اچھے نہیں

لگے، البتہ اناس کے لیے بے سبز برگ بہت ہی پرکشش اور پربہار لگ رہے تھے۔ تلخ حقیقت پر مبنی انشائیہ کافی زیادہ فکر انگیز تھا۔ آپ کے اداریہ میں وطن عزیز کے تازہ اور سنگین حالات کے تناظر میں تحریر کردہ آپ کے اداریے نے دل کو چیر ڈالا، اس ماہ کیا خوب اداریہ لکھا ہے آپ نے۔ چار یا پانچ ماہ کے غیاب کے بعد ماہا ایمان تشریف لائی ہیں اور آتے ہی صدارت کی کرسی پر قبضہ کر لیا بغیر کسی الیکشن کے، ویسے موصوفہ کا تبصرہ بہت جاندار اور شاندار تھا، لاتعداد مبارکباد! دیگر تبصروں میں عمران علی، قدرت اللہ نیازی اور تصویر العین کے تبصرے اچھے لگے اور محاوروں والا تبصرہ تو لاجواب تھا، جتنی تعریف کی جائے کم ہے، کہاں تو یہ صاحب خودکشی کرنے چلے تھے اور اب بھرپور انداز میں رنگین زندگی کی طرف لوٹ آئے، کیا خوب، نئی زندگی مبارک ہو۔ حاضری کی رجسٹر پر اس عاجز کا نام پہلے نمبر پر نظر آیا، بڑی خوشی ہوئی، کبھی تو پہلے نمبر پر آیا۔ اشعار کی محفل میں ساگر نور، ریاض بٹ کے منتخب اشعار قابل داد تھے، چمن آرا خان کا متبرک قطعہ بھی دل کو بھایا۔ کہانی "کشکول" اب بہت ہی ہنگامہ خیز ہوتی جا رہی ہے، خوب لطف آیا البتہ لیاقت کے غیر فطری اور غیر حقیقی کارنامے سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مسافر اب رنگ پکڑنے لگی ہے، مزہ آنے لگا ہے۔ نجمہ صاحبہ کی طول و عریض کہانی دشت تنہائی نے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی، موصوفہ سے ایسی کہانی کی توقع نہیں تھی، اس کہانی کا ہر کردار بے مثال، ہر مکالمہ باکمال، ہر انداز پرجمال، کیا خوب، اس ناچیز اور کم فہم کی جانب سے بے شمار داد ان کی نذر ... دشت تنہائی کو اسٹوری آف دی منتھ کا اعزاز دیا جانا چاہیے۔ چھوٹی کہانیوں میں جرم محبت، لاحاصل، چور سپاہی، نظر فریب اور انوکھی محبت مجھے بے حد پسند آئیں، ایسی ہی کہانیوں کی خاطر تو سسپنس خریدتا ہوں۔ حسام بٹ صاحب کا بیمار گھوڑا بھی قابل داد ہے۔"

✠ **ہمایوں سعید راج**، بنوں سے چلے آ رہے ہیں "انکل جی ایک طرف تو ملکی حالات سے بے حد دلبرداشتہ اور مایوس نظر آئے تو دوسری جانب پراؤڈ آف پاکستان شرمین عبید چنائے پر فخر بھی کرتے۔ نعمان پیارے! یار یہ تم لوگوں نے میرے سدھرنے اور نہ سدھرنے کو سیاسی ایشو کیوں بنا دیا ہے؟ عمران برادر! میں کوئی سیاست دان تو نہیں ہوں جو تم لوگ میرے سدھرنے کی خبر سے انگلیاں دانتوں تلے کچل رہے ہو، بھئی قلعی ہاتھ تھامنے کو مل جائے تو قدم سنبھلنے میں دیر کہاں لگتی ہے۔ فرقہ بندی کے ماہر جناب قمر تقی سے درخواست ہے کہ محفل کو ٹکڑوں میں بانٹنے کی لاحاصل سازشیں نہ فرمائیں۔ ریاض بٹ صاحب! آپ لوگ تو یوں ری ایکٹ کر رہے ہو جیسے تصویر العین کا نام پہلی بار سنا ہو۔ ڈاکٹر وسیم جیسا ڈاکٹر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ بھائی میرے، سرورق گرل کے بارے میں تمہارے ایسے ارشادات تمہارے قریب الدیوالیا کلینک کے لیے زہر ثابت ہوں گے۔ سعید عباسی نے سارا زور طاہرہ گلزار کی بار بار آمد کو یقینی بنانے کے لیے لگایا۔ تفسیر برادر کا تبصرہ بھی شاندار رہا۔ محترم تصویر العین کی آؤ بھگت میں بے تحاشا بزی تھے۔ اس ماہ کا خاص الخاص تحفہ کسی شریر نامی قاری کا تبصرہ تھا جنہیں خاص اہتمام سے شائع کیا گیا۔ اتنا خوبصورت تبصرہ بلاشبہ آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ جناب شریر نے آسکر ٹائپ تبصرہ لکھ کر جی خوش کر دیا۔ سب سے پہلے مسافر کی جانب دوڑے اور اس دوڑ میں بھی وہ بے چینی تھی جو میٹرک کے اسٹوڈنٹ کے انگ انگ سے رزلٹ والے دن عیاں ہوتی ہے۔ یہ قسط کہانی کو زبردست ڈائریکشن اور اسپیڈ دینے میں کامیاب رہی۔ بخت خان کا کردار بے حد پسند آیا۔ بے پروا کھالے کی ذہانت متاثر کرنے میں جبکہ شاہ جی کے دل کو چھونے والے الفاظ دل میں گھر کرنے میں کامیاب رہے، خالدہ کی بے ساختہ محبت بھی قابل ذکر رہی۔ امید واثق ہے کہ یہ کہانی ناصر ملک کی ایک شاہکار کہانی ثابت ہوگی۔ ملک صاحب حسب ریکارڈ شاندار کہانی لیے حاضر تھے۔ حیرت صرف اس بات پہ ہے کہ ہم نے ملک صاحب کی ڈائری سے بے شمار کیسز پڑھے ہیں مگر ہم نے کبھی بھی ملک صاحب کو ڈائری لکھتے نہیں دیکھا (آپ کے ارادے کیا ہیں جناب) کاشف زبیر کی جرم محبت لاجواب رہی۔ یہ منفرد کیس لگا جس میں محبت کے اجزا نے نئے رنگ بکھیر دیے تھے اور اسی وجہ سے اس کا انجام بھی خوشگوار رہا۔ مریم کے خان کی خواب بسر بھی دل پہ نقش ہوئی۔ محفل شعر و سخن میں طاہرہ اور سعدیہ کا انتخاب اچھا لگا۔"

✠ **شیر علی خاں**، خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "اس دفعہ سسپنس نکلتی سردیوں اور گرمیوں سے پہلے بہار کے خوشگوار احساس کے ساتھ ملا۔ جون ایلیا! ہم جو بھی راستہ اختیار کریں کتنے بھی اچھے نہ ہو جائیں جب تک ایک منصف حکمران کرسی نہیں سنبھالتا اس وقت تک "جرم" خون سے ہاتھ رنگتا رہے گا اور پاکستان کیا ہر گلی میں جرم دندناتا پھرے گا۔ ہمیں اچھے اور انصاف پسند اور میرٹ پر یقین رکھنے والوں کو سلیکٹ کرنا ہے (اللہ آپ کی زبان مبارک کرے، آمین) خطوط کی محفل میں پہنچ کر ادارے کی طرف سے اور خبروں میں بھی ملک کے معماروں کی تذلیل کا سن کر آنکھیں بھر آئیں، کیا کریں جہاں ملک کے بڑے عہدیدار عدالتوں کو ترزی لگائیں وہاں اساتذہ کرام کو کون پوچھتا ہے۔ بہرحال خوشی غم کے ساتھ چلتے ہوئے اپنا خط حاضری رجسٹر میں پا کر کچھ مایوسی اور کچھ اطمینان ہوا کہ چلو حاضری تو لگ گئی (جگہ کی کمی کے باعث ایسا ہوا، لیکن آپ کی محبت نے دل خوش کر دیا) ماہا ایمان اور یقین ہے آپ کو کرسی صدارت مبارک! ڈیئر میدان کارزار کے بھوتوں کی محفل میں آخر آپ نے بڑے بھوت کا درجہ پا ہی لیا۔ ویسے آپ سسپنس کی بزرگ تبصرہ نگار جو ٹھہریں۔ نعمان بیوٹی فل بھائی نے نپے تلے انداز میں خط لکھ کر دوسرا درجہ حاصل کیا۔ تصویر العین میرے ابو بھی ہارٹ پیشنٹ ہیں اور میں ان کی دوائیوں کے متعلق فکرمند رہتا ہوں۔ پتا نہیں تمہاری بھابی میرے نام کے ساتھ کیا حشر کرے گی۔ عمران علی مجھے تمہاری صاف گوئی بہت پسند آئی ہے، قدرت اللہ نیازی سے میرا نمبر لے لینا۔ قمر تقی دل آزاری والی بات پہ میں آپ کے خیال سے پوری طرح متفق ہوں (اور ہم بھی) میانوالی کی ملکائیں! بہت اچھا، آپ نے خط چھوٹا لکھ کر جگہ تو بہت بنائی مگر قدرت اللہ نیازی اور تفسیر عباس بھائی نے کسی کا خیال نہیں رکھا۔ غیر حاضری کی ساری کسر اس دفعہ والوں نے پوری کر دی۔ ماہ تاب "گل معصوم" کو بھی میری طرف سے خوش آمدید! مرزا طاہر الدین بیگ صاحب میری بھی سب کی طرح ڈاکٹر صاحب سے التماس ہے کہ وہ مسلمان جرنیلوں پر ضرور لکھیں۔ عمران حیدر ہم نے کبھی اسیری نہیں دیکھی اس لیے احساس نہیں ہوتا (اللہ تمام بے گناہ اسیروں کو رہائی

ولائے، آمین) سعدیہ بخاری صاحبہ زیادہ دوڑیں لگانے اور لیٹنا مارنے سے تو بال بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی آپ کی دوڑنے کی عمر ختم ہو چکی ہے۔ طاہرہ گلزار باجی آپ کو اعداد و شمار بہت یاد رہتے ہیں۔ ہمایوں سعید راج بھائی کرایہ کی گاڑیاں اینڈ سی این جی مہنگا ہونے کی وجہ سے بہت جلد رک جاتی ہیں۔ راجا ثاقب آپ کی مسز قمر ضیا سے رشتہ داری ہے؟ تفسیر عباس مجھے کوئی بھی دوست آپ کا نمبر نہیں دے رہا۔ خطوط کی محفل کے بعد کہانیوں کی محفل میں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب اس دفعہ خوب اچھی کہانی لے کر آئے اور دہلی کی سیاست کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آگہی حاصل ہوئی۔ جرم محبت حقیقی طور پر اپنے ٹائٹل پر پورا اتری۔ کشکول میں اب افضل خان کے کردار میں جان پڑ چکی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ نئے کرداروں اور بگ باس کا کس انداز میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور لیاقت حسین کا کردار ڈینجرس میں ہوگا یا دوبارہ جاندار بنے گا۔ مختار آزاد نے ہمت مرداں مدد خدا کی صحیح تصویر فیملی بزنس میں پیش کر دی ہے۔ عرفان نے جس طرح نرگس کو پالینے کا طریقہ اختیار کیا، اس سے چار بندوں کی زندگی داؤ پر لگ گئی۔ میگی اپنی محبت پالینے کی خاطر بلا چوں چرا اس کی باتوں پر عمل کرتی رہی مگر سی لاحاصل اور انجام بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ محفل شعر و سخن میں راشدہ اینڈ زاہدہ، ڈاکٹر وسیم، حکیم سید محمد رضا شاہ، مسز ضیا القمر، طاہرہ یاسمین، سعید عباسی کے اشعار اچھے لگے۔ آپ بیتی کے انداز میں لکھی گئی مسافر میں معاشرے کی رنگینیوں سے ہٹ کر حقیقت پر مبنی معاشرے کے حقیقی رنگ نظر آ رہے ہیں، بہت زبردست جا رہی ہے۔ ہیزل اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس گئی۔ نجمہ مودی صاحبہ کیا ہر جاگیردار کا بیٹا شہریار کی طرح بغاوت کر سکتا ہے؟"

✠ **بشیر احمد بھٹی**، بہاولپور سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "اس دفعہ ٹائٹل میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔ سرسبز لمبوترے پتوں سے جھانکتا حسینہ مہ جبینہ کا چہرہ۔ ایک پریشان سوچوں میں گم مرد کا چہرہ۔ ذاکر صاحب کے فن میں نکھار آ رہا ہے۔ سب سے پہلے آخری صفحات میں نجمہ مودی صاحبہ کی طویل کہانی دشت تنہائی پڑھی۔ دیہاتی ماحول کے پروردہ ایک امیر بگڑے ہوئے زمیندار کی کہانی۔ ایک ایسا فرعون جس کا بیٹا باپ کے رنگ میں بھنگ بنا رہا۔ مسافر کی دوسری قسط نے تہلکہ آمیز تاثر چھوڑا۔ اس کہانی کا اسکیچ بھی بڑا خوبصورت ہے۔ مصور نے کرداروں کی خوب عکاسی کی ہے (مصور شاہد کی جانب سے آپ کا شکریہ) ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تاریخی کہانی "گھر کے چراغ سے" اچھی کاوش ہے۔ تاریخی کہانی سے قارئین تصور ہی تصور میں ماضی کی سیر کر لیتے ہیں۔ ایک عرصہ سے الیاس سیتا پوری صاحب کی کوئی کہانی شائع نہیں ہوئی۔ ان کا انداز بھی خوب تھا۔ انہوں نے لکھنے لکھانے سے قطع تعلق کر لیا ہے؟ (الیاس سیتا پوری صاحب کا انتقال ہو گیا ہے تاہم ہم کوشش کریں گے کہ ان کی کوئی منتخب کہانی دوبارہ پیش کریں) نواب صاحب، لگتا ہے کسی نئی کہانی کی قسطوں کو ذخیرہ کرنے کے لیے آپ سے کچھ مدت مانگ بیٹھے ہیں (جی آپ کا اندازہ صحیح ہے لیکن وہ جلد سسپنس کے آخری صفحات کے لیے کچھ تحریر کریں گے) کشکول کی قسط نمبر 9 پڑھی۔ انوار صدیقی صاحب بہت کم لکھتے ہیں مگر اچھا لکھتے ہیں۔ کم لکھنا بھی ایک لحاظ سے اچھا ہوتا ہے۔ کہانی میں غلطیوں کا احتمال نہیں ہوتا۔ زیادہ لکھنے والے مصنفین کی کہانیوں میں کہیں نہ کہیں غلطی ہو جاتی ہے۔ اس دفعہ مغربی کہانیوں میں بھی خوب چاشنی رہی۔"

✠ **جعفر حسین**، بھوآنہ سے محفل میں آ رہے ہیں "سرورق اچھا تھا، ظاہر ہے اچھا نہ ہوتا تو سرورق کیوں ہوتا۔ "جرم" کے بارے میں انشائیہ پڑھا، ایک حالیہ گیلپ سروے کے مطابق پاکستان اداس ترین ممالک میں چوتھے نمبر پہ آ گیا ہے۔ فنون لطیفہ اور تفریح کے مواقع کی فراہمی، انصاف، روزگار، شخصی اور صلاحیتوں کے اظہار کی آزادی جہاں پہ ہوتی ہے وہاں پہ نہ اداسی ہوتی ہے اور نہ جرم۔ ایک دانشور کا قول ہے "اگر تمہارے پاس دو روٹیاں ہیں تو ایک مانگنے سے پہلے بھوکے کو دے دو، ورنہ نہ تم بچو گے اور نہ روٹیاں۔" (کیا خوب بات کہی) اداریہ جہاں پہ افسر شاہی کے کارنامے بتا رہا تھا وہیں پہ پاکستانی نژاد برطانوی ڈاکٹر جواد، کینیڈین ہدایت کار اور شرمین عبید چنائے کی مشترکہ کاوش Saving Face کے ذریعے شرمین کے الفاظ میں "خواب دیکھنا مت چھوڑیں" کا پیغام بھی دے رہا تھا۔ ہم دو تین ماہ اور نہ خط لکھتے مگر دو تین باتوں نے طاق نسیاں پہ رکھے گرد آلود قلم کو اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ خط نہ لکھنے کی وجہ طاہرہ یاسمین صاحبہ تھیں جنہوں نے ہمارے بارے میں انکشاف کر کے ہمیں عمران، شرلاک ہومز اور جیمز بانڈ کی مدد حاصل کر کے ان کے بارے میں جاسوسی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق محترمہ ڈارون کے نظریہ ارتقا کی رو سے ہماری کچھ نہ کچھ لگتی ہیں۔ ماہا ایمان کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر آپ سسپنس کے دوستوں سے بھی اپنی خوب صورت سی مصروفیت کا ذکر کر دیتیں۔ اگرچہ عمیرہ احمد کی تحریروں میں ایک سوچ، ایک نظریہ ہوتا ہے جو ہر ایک باشعور انسان پر فہم و ادراک کی کئی نئی جہتیں کھولتا ہے، جبکہ نمرہ احمد باوجود اپنی تمام تر تعلیمی مصروفیت کے ہر کہانی کو طویل ریسرچ اور مکمل ہوم ورک کر کے لکھتی ہیں مگر ہم بھی کیا کریں۔ گرداب پڑھنے کے بعد مومن کا دل نہیں چاہتا کہ وہ دوسری یا تیسری بار ڈسا جائے۔ ابن نائب مقبول صدیقی صاحب آپ کا محاوروں والا خط پڑھ کر یہی محسوس ہوا کہ یہ محترم انتظار حسین اور شان الحق حقی کی مدد سے مکمل کیا گیا ہے۔ محبت کے ان گنت پہلوؤں میں سے ایک پہلو سے روشناس کراتی جرم محبت نے متاثر کیا۔ محنت، مستقل مزاجی، محبت اور اعتقاد کا مجموعہ فیملی بزنس ہر اس شخص کو امید دلا رہی تھی جو زندگی میں کچھ کرنا چاہتا ہو۔ لاحاصل کا حاصل یہی رہا کہ محبت اندھی ہوتی ہے، عاشق نہیں۔ چور سپاہی کافی دلچسپ رہی۔ جب تک دنیا میں ایک بھی بے وقوف موجود ہے عقل مند بھوکا نہیں مر سکتا کی عکاس نظر فریب بہترین رہی۔ انوکھی محبت عام سی تحریر لگی تقدیر کے آگے بے بس معالج کا فسانہ زیست خواب بسر ایک معیاری انتخاب رہا۔ بادشاہوں کی غلطیوں کا کفارہ کسی نہ کسی کو تو دینا پڑتا ہے، اسی تناظر میں لکھی گئی گھر کے چراغ پسند آئی۔ کشکول بھی حسب روایت شاندار رہی۔ یہ عشق نہیں آساں بس...... کی عملی تفسیر بیمار گھوڑا میں ان عاشقوں کے لیے پیغام پنہاں تھا جو اپنی محبت کو حاصل تو کرتے ہیں مگر بعد میں مجنوں بن کر روتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے زندگی گزار دیتے ہیں۔ مسافر پر تبصرہ ادھار رہا، پہلے دیکھتے ہیں کہ مصنف کے مسافر کی پرواز کہاں تک ہے (ہم آپ کے تبصرے کا انتظار کریں گے) صاحب کتاب حضرت داؤد کی زندگی کے حالات و واقعات نے بہت متاثر کیا۔

نجمہ مودی صاحبہ ایک طویل عرصے بعد واپس آئی ہیں، ان کی تحریر دشت تنہائی اپنی اٹھان سے خاص توجہ کی متقاضی لگ رہی ہے سو اسے فرصت سے پڑھیں گے۔ محفل شعر و سخن میں انیلہ اور ہریرہ ابوبکر کا انتخاب معیاری لگا۔"

✠ **محمد عزیز ترین**، راولپنڈی سے تبصرہ کر رہے ہیں "کراچی کے حالات اور خبروں وغیرہ میں جب بھی ذکر ہوا آپ سب کے لیے بے اختیار منہ سے دعائیں نکل جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو...... اسٹاف، عملہ، کارکن، کاریگر، انتظامیہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین) روزنامہ ایکسپریس 19 مارچ 2012ء بروز پیر کو مشہور کالم نگار محمد عامر خاکوانی صاحب نے اپنے کالم "زنگار" میں ایک خط لکھا۔ جو اس خط کے ساتھ منسلک ہے، آپ کی معلومات کے لیے۔ میری آپ حضرات سے گزارش ہے کہ آپ اس خط کو اپنے تمام ماہناموں سرگزشت، جاسوسی، سسپنس اور پاکیزہ میں شائع کر دیں۔ کیونکہ آپ کے ماہنامے دنیا بھر میں جاتے ہیں اور قارئین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہ صرف اور صرف معلومات کے لیے ہوگا جو آپ اپنے تمام قارئین تک پہنچائیں یا جیسے بھی آپ کی مرضی، آپ تو حاکم ہیں۔ ہم صرف عرض، گزارش یا التماس ہی کر سکتے ہیں (آپ کا بھیجا ہوا مضمون ہم اپنے ماہ نامے "سرگزشت" میں مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد تفصیل سے شائع کرنا چاہ رہے ہیں۔ آپ جلد اس واقعے کو "سرگزشت" میں پڑھیں گے جو اس جیسے سچے واقعات کا مجموعہ ہے۔ بعد میں اس تحریر میں سے کوٹیشن لے کر سسپنس اور پاکیزہ میں بھی شائع کریں گے) اس دفعہ تو سردیوں نے بھی کافی زور دکھایا اور پھر "مرے کو مارے شاہ مدار" حکومت وقت نے بھی سوئی گیس کی سپلائی مختصر کر دی تھی۔ نتیجتاً ہم جیسے 70 سالہ تو جوان بوڑھوں نے بھی کسی نہ کسی طرح دم خم سے سردیوں کا مقابلہ کیا۔ کوئلہ/لکڑیوں کے دام، الامان والحفیظ۔ آپ کراچی والے ہی اچھے رہے جو کہ جنوری جیسے سرد موسم میں بھی پنکھے جھلتے رہے اور ہم ادھر آپ ہی کو دیکھ دیکھ کر جلتے رہے۔ کیونکہ یہ آپ حضرات ہی کا نعرہ ہے کہ "جلنے والے کو جلائیں گے، حلوہ پوری کھائیں گے" اے خانہ برانداز کچھ ادھر بھی؟"

✠ **ذیشان فیروز**، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے محفل میں چلے آئے ہیں "نٹ کھٹ محفل کے پرانے اور نئے دوستوں کو سلام عرض کرتا ہوں، امید ہے مجھے محفل میں خوش آمدید کہا جائے گا۔ (اور وہ بھی خلوص دل سے خوش آمدید۔ آتے رہیے گا کہیں حاضری لگا کر غائب نہ ہو جائیے گا) اس دفعہ مجھے سسپنس کا بڑی شدت کا انتظار تھا اور اس کی وجہ یقیناً ناصر ملک کی تحریر مسافر تھی۔ سرورق قدرے مختلف تھا۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی حقیقت گوئی ہمیں بہت پسند آئی۔ اداریہ میں مدیرہ آنٹی نے موجودہ حالات کا بڑا خوبصورت تجزیہ کیا ہے اور یقیناً اس حال میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کا ایشیا کپ جیتنا ایک خوش گوار اضافہ ہو سکتا ہے (جی ہاں، یہ بیچ بہت دلچسپ تھا، بس یہ نہ ہو کہ بعد میں پتا چلے کہ فکس تھا) ماہا ایمان صاحبہ یقیناً بہت عرصے بعد محفل میں شریک ہوئیں اور آتے ہی صدارت کی نشست پر براجمان ہوئیں اور ان کا تبصرہ اس قابل بھی تھا۔ نعمان پیارے صاحب کا تبصرہ ہمیں بہت اچھا لگا خوشبو لگا کے۔ تصویر العین کی بہن کی شادی کی خبر پر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ سعدیہ بخاری اس دفعہ اہل محفل پر کافی نکتہ چینی کرتی نظر آئیں۔ ہمایوں سعید راج صاحب یقیناً وہ معیاری لڑکی خوب صورت نینوں کے ساتھ آپ کا ہی انتظار کر رہی ہوگی۔ عمران حیدر بلوچ ہم آپ کو دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ طاہرہ یاسمین، صہیب الرحمن اور دوسروں کے تبصرے محفل میں شامل نہیں ہو سکے جبکہ شارقہ سلجوق، جاوید بلوچ اور شہزادہ ٹیڈو آپ اس دفعہ کہاں غائب ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ اس کا آغاز جاندار تھا اور اس قسط نے بھی ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اس کے بعد کشکول کی طرف بڑھے، شیخ حامد نے بڑی عیاری سے افضل کے ذریعے رستم علی آغا خانی کو ٹریپ کیا ہے اور اب شاید میڈم روبی اس کا اگلا شکار بننے والی ہے۔ مجموعی طور پر قسط زبردست تھی۔ ساجد امجد کی تحریر "گھر کے چراغ سے" میں انہوں نے مغلیہ دور حکومت کے اہم واقعات سے پردہ اٹھایا۔ ملک صفدر حیات کی بیمار گھوڑا میں عرفان کا کردار قابل نفرت اور فریب ہر مبنی تھا۔ جس نے دوست اور محبوب دونوں کو بہ یک وقت دھوکا دیا۔ رضوانہ ساجد کی تحریر حضرت داؤد نے ہماری دینی معلومات میں زبردست اضافہ کیا۔ جرم محبت میں رچرڈ نے انتہائی کامیاب منصوبہ بندی سے قانون کی گرفت سے بچتے ہوئے اپنی محبوب ہستی کو حاصل کیا۔ نجمہ مودی کی تحریر دشت تنہائی نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ مختصر کہانیوں میں خواب بسر، نظر فریب، چور سپاہی، لاحاصل اور فیملی بزنس بھی اچھی تحریریں تھیں۔ محفل شعر و سخن میں ساگر نگوکر، ہریرہ ابوبکر اور فرخ ناز کے اشعار داد کے قابل تھے۔"

✠ **شہزادہ ٹیڈو (عرفان شہزاد)** کشمیر ٹاؤن، سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "اس ماہ کا شمارہ 19 مارچ کی شام کو ملا۔ ٹائٹل گرل بالکل متاثر نہ کر سکی۔ پھر محفل میں پہنچے۔ مجھے تو آپ نے یوں محفل سے باہر نکال پھینکا جیسے دودھ میں سے مکھی (ایسا نہیں ہے۔ باری باری سب کو جگہ ملنی چاہیے۔ کیا خیال ہے؟) نعمان پیارے، شکریہ۔ مجھے محفل میں جی آیاں نوں گلے لگا کہ کیا اور عمران حیدر بلوچ آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے بھی مجھے محفل میں خوش آمدید کہا۔ محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ شاندار تھا اور باجی! ماہا آپ کے تبصرے نے تو محفل ہی لوٹ لی، دی ونر باجی اور خدا کا شکر ہے کہ آپ نے باجی طاہرہ کو لکھا کہ منے میاں سے زیادتی کر رہی ہو۔ ماہا سسٹر میرا نام اتنا اچھا ہے پر یہ بڑی ہونے کے ناتے مجھے ٹیڈو کہتی ہے، اس کو سمجھاؤ یہ آپ کی بہت بڑی فین ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پڑھی مسافر، بہت مزہ آیا۔ یکدم کہانی ختم ہو گئی پتا ہی نہ چلا۔ کشکول بھی بہت اچھی جا رہی ہے۔ رومی ٹیل دیدی کی دو تین تحریریں پڑھی تھیں اچھی لگی تھیں، دیدی آپ دوبارہ لکھو ناں سسپنس میں۔ انوکھی محبت اچھی تحریر تھی، دشت تنہائی ابھی پڑھ رہا ہوں۔ بہت مزہ آ رہا ہے۔"

✠ **اے ایم چودھری**، احمد پور شرقیہ سے چلے آ رہے ہیں "ٹائٹل بس ٹھیک تھا، لڑکی دیکھ تو تفسیر بھائی جان کو رہی تھی لیکن پھول گلنار ماہ لہ، راج پر برسا رہی تھی۔ ہاں اس کی آنکھیں بہت پیاری تھیں۔ محفل یاراں میں کرسی صدارت پر بھیا آغا فرید احمد خان پھنس کر بیٹھے ہوئے تھے، محمد عالی جان بہت مبارک ہو تبصرہ اچھا لگا۔ نعمان بھیا آپ میرے چھوٹے بھائی جانی کی عمر کے ہو، آپ کو لیٹ لیکن پھر بھی ہیپی برتھ ڈے۔ اللہ تعالیٰ

آپ کو لمبی زندگی عطا فرمائے، آمین۔ کہانیوں میں سے ابھی صرف کشکول پڑھی اور مسافر جو کہ بہت پسند آئی۔ تصویر العین آنٹی کا تبصرہ اچھا لگا۔ جاوید بھائی گاڑی میں چور لے کر گھومتے ہو، جو شمارہ چوری ہونے لگا تھا۔ ابرار وارث بھائی اللہ عزوجل آپ کو اور آپ کی فیملی کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ عمران علی فرام جھنگ مجھے جھنگ کے رہنے والوں کی بولی بہت اچھی لگتی ہے۔ طاہرہ باجی اللہ آپ کی امی جان کو صحت عطا فرمائے، آمین۔ حاجی عبدالحکیم انکل جی آپ ہمارے بزرگ ہیں پلیز ناراض ہوئے بغیر تشریف ضرور لاتے رہیں۔ شہزادنیلو بھائی ویلکم، جی آیاں نوں جناب۔ قرتی جی ہواؤں میں مت اڑو ورنہ ہم پر کاٹنا بھی جانتے ہیں۔ بھائی جان ماہا آنے کی واپسی ضرور اور پھر آپ کی خیر نہیں لیکن ماہا کے آنے تک ''میں ہوں نا'' طاہر الدین بیگ بھیا لگتا ہے کہ آپ ڈنگر ڈاکٹر ہیں جو راج کو نفسیاتی مریض کہہ رہے ہو۔ احمد خان توحیدی اور طاہرہ گلزار آپ کے خط بھی اچھے لگے۔ ارے ہاں باقی سب لوگ بابر عباس، تفسیر، راج، ماہا، دلشین، کوندل بھائی۔ ارے بھائی کہاں گم ہو بھائی، سب لوگ شرافت سے آجاؤ۔ مسافر جو کہ نئی سلسلے وار کہانی ہے شروع سے ہی اچھی لگی ہے۔ امید ہے کہ کبھی مایوس نہیں ہوں گے پڑھنے والے۔'' (شکر ہے آپ کو کہانیوں پر تبصرہ بھی یاد رہا)

✠ **طاہر الدین بیگ**، میرپور خاص سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''اپریل کا سسپنس اچھے اور دلچسپ خطوط سے آراستہ اور نوک جھوک سے بھرپور تبصروں کے ساتھ اچھا رہا۔ چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد ماہا ایمان اس شان سے آئیں کہ اول نمبر پر تشریف فرما ہوگئیں۔ ان کا تبصرہ اچھا رہا۔ ماہا ایمان اور تصویر العین کو سسپنس میں پاکر حیرت ہے۔ تفسیر عباس بابر خوب صورت تبصرے کے ساتھ اچھے رہے۔ سسپنس محاوروں کے درمیان..... مگر افسوس کے ہم کھوج نہ لگا سکے۔ تاریخ کے جھروکوں سے ڈاکٹر صاحب کی زبردست کاوش گھر کے چراغ سے بڑا ہی مناسب اور بڑا ہی زبردست عنوان، کہانی اس سے بھی زیادہ اثر انگیز، عبرت انگیز۔ بقول ڈاکٹر صاحب کہ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ تاریخ کے اوراق میں چچا نے بھتیجے کو، بھائی نے بھائی کو، بیٹے نے باپ کو تخت حاصل کرنے کے لیے راہ سے ہٹایا۔ مگر اس کہانی میں تو آغاز سے انجام عبرت انگیز ہے۔ سیدی مولہ کا کردار اور پھر غلطیاں اپنے آپ کو دہراتی رہیں۔ جلال الدین خلجی اور علاؤالدین خلجی تاریخ کا عبرت ناک واقعہ ہے۔ مگر سیدی مولہ کا کردار ڈاکٹر صاحب، معظم علی پر بھی ایک تحریر ہو جائے۔ بے وفائیوں سے بھری یہ تحریر، بہت عرصہ یاد رکھی جائے گی جہاں دل پر نشتر لگانے والے واقعات بھی ہیں اور محبت سے لبریز لمحات بھی۔ اب ذکر کچھ بدیسی تحریروں کا جنہیں کاشف زبیر، آزاد صاحب اور ثمر عباس لکھتے ہیں اور خوب ہی لکھتے ہیں۔ زبردست منظر نامے اور اصلی ماحول کے ساتھ کہانیاں دل پر اثر کرتی ہیں جیسے جرم محبت خاص طور پر اور مرتبان شہد کے درمیان لکھی گئی ایک فیملی کی کہانی فیملی بزنس خوب رہیں۔ خوب تو مریم کے خان کی خواب بسر بھی رہی۔ جاگیرداروں کے ماحول میں مجبور اور بے کس رعایا کی کتھا، سلطانہ اس کے شوہر فاروق اور پھر ملک کے کرداروں پر مبنی تحریر دشت تنہائی بہت اچھی کہانی تھی۔ شروع سے آخر تک اس کہانی نے ہمیں اپنی گرفت میں رکھا اور چونکے اس وقت جب یہ گونج سنائی دی۔ دشت تنہائی میں اے ......! انوار صدیقی کا کشکول سبک رفتار انداز سے رواں دواں ہے۔ آغاز ہی سے یہ کہانی اپنا اثر رکھے ہوئے ہے۔ تمام کردار اپنی جگہ بہت خوب ہیں۔ دوسری طرف مسافر اپنے قدم جما چکی ہے اور امید کرتے ہیں کہ یہ مسافر سسپنس میں کئی جگ مگاتے ہوئے چاندوں کا اضافہ کرے گا۔ مسافر میں اس دفعہ ڈاکٹر صاحب شرلاک ہومز نظر آئے اور بڑی خوبصورتی سے اپنے آپ کو بچا گئے۔ ملک صفدر حیات صاحب اس مرتبہ بیار گھوڑا لے کر آئے، محبت کو حاصل کرنے کے لیے ایک زبردست حماقت جس کا انجام بھی ایسا ہی ہونا تھا۔ اس مرتبہ منظر امام صاحب کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔''

✠ **عمران علی**، دریام جھنگ سے تبصرہ کر رہے ہیں ''اس بار سسپنس 19 تاریخ کی صبح کو ملا۔ وہ بھی آندھی کے ساتھ رات کو آندھی آئی، دن کو سسپنس ملا۔ انکل ذاکر کا شاہکار ہماری سمجھ سے بالاتر تھا جو آندھی کی طرح سر سے گزر گیا۔ کہانیوں کی لسٹ اس بار بڑی زبردست بنائی گئی تھی۔ انشائیہ میں جرم پر ایک بہت اچھا موضوع لکھا گیا۔ اب آتے ہیں دوستوں کی محفل میں سب سے پہلے تو بہاولپور کے شرارتی قاری کا لکھا نامہ جو ضرب الامثال پر لکھا تھا، بہت پسند آیا۔ جتنی داد دیں کم ہے، یہ کون قاری ہے جو خودکشی کرنا چاہتا تھا اس کا پتا تو خطوط میں چلے گا، ہم تو نئے قاری ہیں۔ تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے محفل میں خوش آمدید کہا (تھینک یو) آخر کار ماہا بہن نے اپنی خاموشی توڑ دی کیونکہ صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ جی پھر اب محفل میں آتی رہیے گا۔ ماہا شارقہ کہاں گئی شاید وہ اکیلی لڑلڑ کر بھاگ گئی ہے۔ تصویر العین، بہن کی شادی مبارک ہو۔ سدا جوڑی سلامت رہے آمین۔ تصویر صاحبہ اگر میری عمر جاننا چاہتی ہوں تو آپ کو ناورا آفس آسانی سے مل جائے گا، وہاں سے تصدیق کر لینا اور دوسری بات میرے خط کا موضوع بھی کچھ اس طرح تھا کہ عمر کا لکھنا پڑ گیا۔ ہمارا تو ووٹ آپ کے حق میں ہے کہ ضرور عمیرہ احمد اور نمرہ احمد سے سسپنس کے لیے لکھوایا جائے۔ قرتی صاحب طاہرہ یاسمین نے صحیح بات کی ہے، اچھی باتیں اور جاندار تبصرہ لکھیں خاص ٹائم نکال کر۔ میں بھی کلینک سے ٹائم نکال کر لکھتا ہوں بڑی مشکل سے۔ ریاض بٹ صاحب اپنی حاضریاں گنتے رہیے گا یہ نہ ہو کہ کسی دن حاضریاں مکمل نہ ہونے کی وجہ سے بلیک لسٹ سے فارغ ہو جائیں۔ مرزا بیگ صاحب سوچ لیا ہے کرسی صدارت کے لیے تو اگلے شمارے میں کرسی صدارت پر آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں بھولیے گا نہیں۔ عمران حیدر بلوچ صاحب ہم بھائیوں کی ہمہ وقت آپ کے لیے دعائیں ہی دعائیں ہیں۔ ہمایوں صاحب اپنے دماغ کرائے پر دیتے رہیے گا تاکہ صنف نازک کے تبصرے شائع ہونا بند نہ ہو جائیں۔ کسی مصورہ سے شادی ہوگئی تو پھر آپ تو راج کریں گے۔ تفسیر عباس آپ تو بہت گہرائی میں جا کر تبصرہ لکھتے ہیں۔ طاہرہ گلزار کے تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاعرہ ہیں۔ اب آتے ہیں جی خوبصورت کہانیوں کی طرف سب سے پہلے کشکول پڑھی، اس بار تو کہانی شبنم اور افضل کے اردگرد گھومتی رہی، کوئی خاص موڑ نہیں لیا۔ مسافر تو اس بار بہت اچھی رہی۔ حیات خان شاہ جی کے خلاف اور بھی قدم ضرور اٹھائے گا۔ تاریخ کے اوراق میں

ثمری ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی گھر کے چراغ سے بڑی سبق آموز کہانی رہی، بادشاہ کی ایک چھوٹی سی غلطی سلطنت کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے اور خاص طور پر درویشوں کا قتل بہت بڑی غلطی ہوتی ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانی بیار گھوڑا عبرت ناک کہانی تھی۔ نادانی کی محبت اور فیصلے انسان کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ تاریخ انبیا رضوانہ ساجد کی تاریخ انبیا میں حضرت داؤدؑ بڑی اچھی معلومات تھی۔ سوانح اولیا کرام بھی شروع کی جائے۔ مریم کے خان کی کہانی خواب بسر زبردست کہانی تھی۔ نجمہ سودی نے دشت تنہائی کے ساتھ میدان مار لیا۔ محبت ہو اور ہجر نہ ہو تو کہانی بے معنی دکھائی دیتی ہے۔ تبصروں میں محمد قدرت اللہ خان، ماہا ایمان، سعدیہ بخاری اور تفسیر عباس کے تبصرے اچھے لگے۔ شاعری اس بار بہت اچھی رہی۔'' (شکریہ)

✠ **راجا ثاقب نواز ثاقب**، رتی ٹبی، ساہیوال سے تشریف لائے ہیں ''اپریل کا شمارہ قدرے تاخیر سے ملا۔ اس تاخیر کی وجہ بجلی کا بدترین بندش اور ٹرینوں کی آمد و رفت میں غیر معمولی تاخیر ہی ہو سکتی ہے۔ مسائل اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ پوری قوم اب کرکٹ کے میدانوں میں ملنے والی فتح ہی کو حقیقی کامیابی و خوشی سمجھنے لگی ہے (کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے..... آپ نے سنا ہی ہوگا) مگر دکھوں کا مداوا کرنے والے تو روپے پیسے کی چکاچوند منڈی میں خریدتے اور بکتے نظر آتے ہیں۔ سرورق اب کی بار قدرے مختلف لگا۔ جون ٹی نے جہاں جرم کی نشاندہی کی، وہاں ساتھ ہی ساتھ سدباب کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔ گھر کے چراغ سے، کئی تاریخی گھروندوں کو جلتے دیکھا۔ جرم محبت میں مرینا نے اپنی منزل پالی۔ فیملی بزنس میں ہیری بزنس میں کم ہمارے روایتی دکانداروں کی طرح ملاوٹ کرنے کے فن سے مالا مال نظر آیا۔ بیار گھوڑا میں عرفان نے اپنے ساتھ ساتھ نرگس کی بھی لٹیا ڈبو دی۔ لاحاصل کے مطالعہ کے بعد منگی بے چارگی کے درجہ پر فائز دکھائی دی۔ چور سپاہی میں پولیس افسر کی اصلیت کا کچھ کچھ اندازہ پہلے سے تھا۔ بہر حال کاوش اچھی تھی۔ نظر فریب مختصر ترین ثابت ہوئی۔ انوکھی محبت میں اندھی رقابت کی وجہ سے بے گناہ جولیو فانٹا کی جان گئی۔ حضرت داؤدؑ کی داستان حقیقی ہنوز جاری و ساری ہے۔ خواب بسر کے اختتام نے حقیقت میں چونکا دیا۔ دشت تنہائی میں سلطانہ کے پے در پے جذباتی فیصلوں کی وجہ سے شہر یار ملک وچھوڑے کی سولی پہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جھول گیا۔ کترنوں کے معیار میں مزید بہتری نظر آئی، مگر ان کی تعداد میں اضافہ ناگزیر ہے۔ اشعار معیاری تھے۔''

✠ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے محفل میں حاضر ہوئی ہیں ''ماہا ایمان جی نے ویلکم کیا اچھا لگا۔ تصویر العین! مون عباس، تفسیر عباس کے بڑے بیٹے کا نام ہے جو دو ڈھائی سال کا ہے۔ عمران علی آپ نے صحیح فرمایا کہ ہمایوں سعید کا سدھر جانا اس سال کا لطیفہ ہے۔ قرتی صاحب بھائی کو، بھائی کہنا کوئی بری بات تو نہیں۔ ملک بشریٰ نکوکر اینڈ تانی نکوکر آپ کا دل شاد ہوا کہ کسی نے یہ نہیں کہا کہ گیا دونوں بہنیں ہو۔ ڈاکٹر ذیشان آپ اتنے سنجیدگی سے نہ سوچا کریں کہ سرورق کی حسینہ آپ کو دیکھ رہی تھی، آپ میں ایسا کیا ہے؟ قدرت اللہ بری بات آپ آغا فرید خان کو کن معنوں میں بزرگ کہہ رہے ہیں؟ قدرت اللہ صاحب سازشی مرد ہوتا ہے اور عالم بھی کیونکہ معاشرہ جو آپ لوگوں کا ہے تو پھر عورت کو کیوں بدنام کرتے ہو۔ شیر علی خان کیا آپ خود بچے ہیں کہ آپ دوسروں کے اکسانے پہ ہر کام کرتے ہیں۔ ماہ تاب گل رانا یہ کیا بات ہوئی کہ ایک نظر میں کوئی چیز دل کو چھو جائے اور دوسری نظر میں اتر بھی جائے۔ انکل مرزا طاہر الدین بیگ کے خط میں ایک جملہ ایسا لگا کہ یہ تو میرے خط سے کاٹ کے شائع کیا ہے۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کا منظر پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انکل یہ اچھی بات نہیں ہے۔ شکریہ سعید عباسی میں ہوں بھی بہت اچھی۔ عمران حیدر بلوچ اور حسین بلوچ ہم تو آپ سب کو یاد کرتے ہیں۔ سعدیہ بخاری جی۔ نمبرون پہ سسپنس، دوسرے نمبر پہ جاسوسی اور تیسرے نمبر پہ سرگزشت ہے۔ ہر جگہ موجود ہوتی ہوں۔ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ کچی محبت واقعی کسی وقت، ملک اور قوم کی محتاج نہیں، کچی محبت ہمیشہ جیتی ہے جیسی کاشف زبیر کی کہانی جرم محبت، جس میں رچرڈ نے آخر مرینا کو پالیا۔ کشکول کی یہ قسط کچھ خاص نہیں تھی۔ مسافر بہت تیز دوڑ میں ہے۔ وہی جاگیرداروں اور وڈیروں کی بے غیرتی اور ڈھیٹ پن کی شاہکار کر خود کو بڑے اور طاقتور کہنے والے اپنے طاقت کے نتیجے میں بھول جاتے ہیں کہ وہ ایسی نیچ حرکتیں کر کے پستی کے کس گہرائی میں جا گرتے ہیں۔ سرورق کو حسینہ کو ماہم ایمان کی طرح تھوڑی اداس لگی۔ کیوں ماہا جی خوش رہا کریں۔ انکل آپ کو نہیں پتا کہ تفسیر عباس بابر کی ایک شاعری کی کتاب شائع ہوئی ہے اس کا نام ہے ''بہت کچھ تم سے کہنا تھا'' (ہم نے پوچھا تھا کہ کتاب کہاں ہے؟) لگتا ہے ہمایوں سعید راج کے دل و دماغ پر کچھ زیادہ اثر ہوا ہے۔ تفسیر عباس یہ آپ سرورق کی حسینہ کی تعریف کر رہے ہیں یا ماہا ایمان کی۔ ماضی آئینہ یا اختیار میں اس بار جلال الدین کے بارے میں لکھا گیا اور شاندار لکھا گیا۔ یہ جملہ دیر تک دماغ میں رہا کہ ''جو تلوار سے قتل کرتا ہے، وہ تلوار ہی سے قتل ہوتا ہے'' اور یہی ازل سے ہوتا آیا ہے۔ ان مسلمان بادشاہوں کی تاریخ پڑھنے کے بعد اپنے مسلمان ہونے پر شرم آتی ہے۔''

✠ **ماہا ایمان**، حافظ آباد سے تشریف لائی ہیں ''اللہ رب العزت آپ کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آپ سے درخواست ہے کہ معراج انکل کی خیریت سے بھی ضرور آگاہ کیجیے۔ اللہ انہیں بھی اپنے سایہ رحمت میں رکھے (آمین) اپریل کا شمارہ حسب معمول مجھے دیر سے موصول ہوا، جس میں ہماری تحقیق کے مطابق قصوروار سراسر ہمارے ہاکر صاحب ٹھہرتے ہیں۔ سرورق پہلی نگاہ میں جاسوسی کا لگا جس کی وجہ خلاف معمول ٹرپل ایکس اسٹائل کی حسینہ اور ایک جاکیٹی ہیرو کی موجودگی تھی۔ محفل اس دفعہ واقعی کلر فل نظر آئی کیونکہ ماہ دولت نے اول آکر صفحہ نمبر 12 کو آٹھ چاند لگانے میں کوئی کسر جو نہیں چھوڑی۔ باقی خطوط میں کشمکش عروج پر تھی سب اپنے اپنے بدلے چکا رہے تھے۔ بہاولپور سے جس شرارتی قاری نے ہمیں ضرب الامثال اور محاورات کی مار ماری ہے وہ یقیناً بیا انصاری فرام بہاولپور ہیں (جی شرارتی قاری جلد بتاؤ بھئی کہ گیا یہ پہیلی بوجھ لی گئی ہے؟) راجا ثاقب نواز بھائی آپ واقعی اتنے شریف ہیں یا یہ میرا گمان ہے۔ سعدیہ بخاری ڈیئر آپ کا تعلق کیا زنانہ پنجاب پولیس سے ہے، لگتا ہے

دوڑیں لگانے کی کافی پریکٹس ہے آپ کی۔ مرزا طاہر الدین بیگ صاحب سب سے پہلے نمبر پر آنے کے لیے سب سے ضروری ہے کہ آپ کا خط پڑھتے وقت آنٹی جی کا موڈ خوشگوار ہو (خراب موڈ میں بھی فیصلہ اچھا کیا جاسکتا ہے) محمد قدرت اللہ قدرت صاحب آپ کی باتیں آپ ہی کی طرح عمر رسیدہ لگیں۔ ڈاکٹر وسیم خالق ایسی عقل و دانش کی باتیں ہمایوں سعید راج کو بھی کرنا سکھا دیجیے۔ دعائیں دے گا آپ کو۔ تصویر العین ڈیئر، بہن کی شادی مبارک ہو۔ عمران حیدر بلوچ بہت شکریہ آپ کی پر خلوص پکار کا۔ تفسیر عباس بابر، انکل اس ماہ آپ کو عام معافی ہے، تبصرہ آپ کا بہت اچھا تھا۔ لگتا ہے آپ کی وائف آپ کے لیے دوائے دل ثابت ہوئی ہیں۔ قمر تقی آپ نے اندھیرے میں تیر پھینکا ہے جو عین نشانے پر لگا ہے۔ ماہ تاب گل اور طاہرہ گلزار خوش رہو آپ کے خط میں صنف نازک کی کمی کا خوب پورا کیا ہے تم دونوں نے آکر۔ سویٹ آنٹی جی عمران علی کے خط میں کی گئی آپ کی وضاحت کے ہم پہلے ہی قدردان ہیں اور عمیرہ احمد تو ہماری آل ٹائم فیوریٹ ہیں اور خدارا ان سے سسپنس وجاسوسی کے لیے ضرور لکھوائیے تاکہ جنہوں نے ابھی تک عمیرہ کو نہیں پڑھا وہ بھی ان کی صلاحیتوں کے معترف ہو سکیں کیونکہ میرا ماننا تو یہ ہے کہ جس نے عمیرہ احمد کی تحریروں کو نہیں پڑھا، اس نے کچھ نہیں پڑھا۔ سو پلیز پلیز درخواست پر ہمدردانہ غور کیجیے گا (آپ سب کی فرمائش ہم نے نوٹ کرلی ہے) محفل شعر و سخن خوش ذوق قارئین کے عمدہ ذوق کی آئینہ دار ہے۔ اس ماہ سب سے بہترین انتخاب چمن آرا خان کا ہے۔ کہانیاں پڑھنے کی ابتدا مسافر سے کی۔ ڈاکٹر شاہ نے اپنے خلاف ہونے والی سازش کا بڑی خوبی سے توڑ کیا۔ زبان تو نہیں لیکن کہانی کا ماحول بہت مانوس سا ہے۔ شہریار اور خالد کی کیمسٹری بھی زبردست ہے۔ مجموعی طور پر مسافر سسپنس کی دنیا میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ اس کے بعد باری آتی ہے کشکول کی۔ اس دفعہ کہانی میں افضل اور شبنم چھائے رہے۔ مکالمے بہت جاندار ہوتے ہیں لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ یہ تحریر بھی ذاتی دشمنیوں پر مبنی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ کوئی ملک دشمن عناصر کی سرکوبی پر مشتمل طویل تحریر پڑھنے کو ملے تاکہ ہم حقیقت میں نہ سہی تصورات میں ہی خوش ہو سکیں۔ نجمہ سودی صاحبہ بھی بڑی موڈی ہیں کافی عرصے بعد تشریف لائی ہیں، دشت تنہائی کسی حد تک گنجلک اور پیچیدہ اسٹوری تھی۔ انسان چاہے دنیا کی ہر آسائش پر دسترس رکھتا ہو لیکن اپنی قسمت کو بدلنا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ تحریر دل گرفتگی کے عالم میں ویران راہوں پر ایک تنہا مسافر اور نا آسودہ خواہشوں کا عمدہ طاپ تھی۔ ملک صفدر حیات کی بیمار گھوڑا میں مجھے سب سے زیادہ نرگس کی بے وقوفی پر غصہ آیا جسے مصنف نے چھوٹ دینے کی کوشش کی ہے۔ مختار آزاد کی مختصر ترجمہ تحریر فیملی بزنس عزم و حوصلے کے ساتھ ساتھ تھوڑے سے دھوکے پر مشتمل تھی۔ کاشف زبیر کی جرم محبت رچرڈ کی چالاکی اور سریتا کی کسی حد تک بے وقوفی پر مشتمل تھی۔ میں تو توقع نہیں کر رہی تھی کہ لڑکی اینڈ پر رچرڈ کی بیٹی نکلے گی۔ عابدہ نرجس کی لاحاصل میں جلدی ہی سیکی کی جیک سے جان چھوٹ گئی حالانکہ میں سمجھ رہی تھی اب پوکی سیکی کو اپنے اشاروں پر نچائے گا۔ ثمر عباس کی چور سپاہی نے تو اینڈ تک ہمیں حیران کیے رکھا۔ آرتھر اور جیڈ بڑی عمدگی سے دوسری جوڑی کو ڈاج دینے میں کامیاب رہے۔ سلیم انور کی نظر فریب میں ایزل اب اپنی بقیہ زندگی زنداں میں گزارے گی۔"

✠ **طاہرہ یاسمین**، سرگودھا سے چلی آرہی ہیں "اس ماہ کا شمارہ 18 مارچ کی شام کو شہزاد نیڈو نے لاکر دیا۔ بجلی نہ تھی، میں نے چارج لائٹ جلا کر بے تابی سے شمارہ کھولا اور اپنا خط نہ پاکر چہرہ ایک دم پھر اتر گیا۔ بلیک لسٹ میں (جسے ہم حاضری رجسٹر کہتے ہیں) اپنا محبت نامہ دیکھا تو دل کو تھوڑا سکون ملا کہ چلو خط پہنچ تو گیا ورنہ میں نے جس کو خط پوسٹ کرنے کو دیا تھا پھر اس کی خیر نہ تھی۔ ماہا جی شکر ہے آپ محفل میں آگئیں آپ کے آنے سے جان میں جان آئی، مبارک ہو کرسی صدارت کی۔ آپ کی بات پر سب گھر والے بہت ہنسے تھے جو آپ نے لکھا تھا کہ بڑی زیادتی کی منے بھائی نے۔ شہزاد نیڈو نے کہا باجی ماہا نے ٹھیک لکھا ہے تم مجھے نیڈو مت کہا کرو میرا اسید عاپورا نام لیا کرو عرفان شہزاد چودھری۔ آپ کا تبصرہ بیسٹ، نمبرون تھا ماہا جی۔ نعمان پیارے، نوی بھائی کیا حال ہے آپ کا؟ تصویر العین، بہت شکریہ کہ آپ نے میری امی کا حال پوچھا اب وہ آپ سب کی دعاؤں سے ٹھیک ہیں۔ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد اگر شمارے سسپنس میں لکھیں تو شمارے کو چار چاند لگ جائیں گے۔ محمد قدرت اللہ نیازی، صاحب مان گئے بھئی آپ کے تبصرے کو اور اتنا طویل اور خوبصورت تبصرہ، ویلڈن۔ عمران حیدر بلوچ، مجھے آپ کی اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ جیل میں بندہ کس طرح چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے دوسروں کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے۔ سعدیہ بخاری کا تبصرہ بھی دلچسپ تھا۔ طاہرہ گلزار جی کیا حال ہے؟ سسٹر پشاور میں میری ننھیال بھی رہتی ہے۔ ہمایوں سعید راج آپ بڑے دن بعد محفل میں آئے۔ تفسیر عباس بابر، بھئی آپ کے تبصرے نے تو محفل میں پانچ چاند لگا دیے۔ شعروں کی محفل میں بیسٹ نمبرون شعر تھا۔ زوہیب احمد ملک محمد قاسم بلی عمران اور قدرت اللہ کے اشعار بھی زبردست تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پڑھی، مسافر۔ شاندار جی لگتا ہے راجا اور رفیق اناڑی والے کردار اب مسافر میں خالا خالد اور شہریار نبھار ہے ہیں۔ مسافر کی آئندہ قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ کشکول تو ہر ماہ ہی دلچسپ ہوتی جارہی ہے اور جرم محبت کاشف زبیر کی اچھی تحریر تھی۔ نجمہ سودی کی دشت تنہائی پڑھی، بہت پر اثر تحریر تھی۔ مدتوں یاد رہے گی۔ بیمار گھوڑا، ملک صفدر حیات کی تحریر ہو اور ہمیں پسند نہ آئے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ملک صاحب تو میرے فیورٹ ہیں کاش آج کے دور میں بھی کوئی ملک صاحب جیسا ایماندار ہوتا۔"

✠ **مقصود الحسن طاہر**، پتوکی قصور سے محفل میں تشریف لائے ہیں "اپریل کا خوبصورت شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ ٹائٹل پر تبصرہ کروں کہ نہ کروں۔ سچی بات بتاؤں کہ اس دفعہ کا سرورق بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ پیاری محفل میں چھلانگ لگائی تو کیا دیکھتے ہیں، ماہا ایمان صاحبہ کرسی صدارت صدر پاکستان کی طرح سنبھالے ہوئے بیٹھی تھی۔ ماہا ایمان جی بھوتوں کی محفل میں چڑیلوں کا کیا کام؟ آپ کے آنے سے خوشیاں تو بکھریں گی۔ محمد نعمان پیارے، فروری کی سرد شام اور اوپر سے سسپنس کا دیدار آپ نے ہمیں بھی سسپنس میں ڈال دیا ہے، خوشبو لگا کے۔ اور آپ کی

سفارش کے بھی کیا ہی کہنے؟ ہماری بھی تھوڑی سی کرویں پیاری عذرا باجی سے کہ وہ ہمیں بھی محفل میں دوبارہ سے جگہ دے دیں۔ (جناب آپ کو سفارش کی کیا ضرورت ہے) تصویر العین آپ کی خوشی میں بالکل ڈھول بجا کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بہن کو شادی کی ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے، آمین۔ قمر تقی صاحب تصویر العین اور ماہا ایمان ایک ہی صورت کے دو نام ہیں۔ کمال ہے آپ کو اتنی دیر بعد پتا چلا، حیرانی والی بات ہے۔ ریاض بٹ جی دل کے چراغ روشن رکھا کریں۔ انہیں بجھنے مت دیں یہی زندگی ہے۔ محمد قدرت اللہ نیازی آپ کون سے محبت نامے کھنگالتے رہے ہیں جو آپ اتنے اداس ہو گئے۔ اپنی عمر ہمیشہ کالج لائف والی بتائی جاتی ہے۔ ماہ تاب گل رانا جی آپ نے پہلی دفعہ کیا واقعی سرورق ہی دیکھا تھا؟ جو دوسری نظر مور کے پاؤں پر ڈال لی۔ چلیں آپ کی معصومیت کو دیکھتے ہوئے عذرا باجی نے آپ کو محفل میں شامل کرہی لیا آخر ان کی صنف کی جو ہوئیں آپ۔ مرزا طاہر الدین بیگ پہلے نمبر پر آنے کے لیے بہت ہی خوبصورت تبصرہ لکھنا ضروری ہے۔ سعید عباسی بھائی جاوید بلوچ نے ماہا ایمان سے تو بڑا تبصرہ نہیں لکھا تھا جو آپ ان سے گلہ کرتے۔ سعدیہ بخاری آپ سے کس نے کہا تھا کہ بلی کو پکڑنا چاہیے۔ بہن طاہرہ گلزار آپ اب بھی خوش نہیں کہ آپ کے سارے خط شامل ہو رہے ہیں اور ہمارا ایک بھی نہیں۔ آتی رہا کریں اچھا لگتا ہے۔ ہمایوں سعید راج کمال ہے آپ معیاری لڑکی کے چکر میں الجھے رہے اور یہاں ماہا ایمان میدان مار گئی۔ ویسے آپ کو ابھی تک آپ کی مصورہ ملی ہے یا کہ نہیں؟ راجا ثاقب نواز شکر کریں کہ طاہرہ گلزار نے آپ کو آپ کا بچپن کا زمانہ یاد کروا دیا۔ تفسیر عباس بابر میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو بھی لکھا وہ واقعی معاشرے کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ آپ نے اس محفل کی سب سے بڑی بونگی کا نام سنا ہے۔ یہ محاوروں کے درمیان والا جو خط تھا وہ اسی بونگی کا تو تھا۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے تو کشکول پڑھی، حسب روایت بہت مزہ دیا۔ ملک صفدر حیات نے اپنی کاوش کو احسن طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ واقعی نرگس سے بھول تو ہوئی لیکن آخر کار اس کا اے اور اک بھی ہو گیا۔ ناصر ملک کی مسافر کی جتنی بھی تعریف کی جائے اتنی ہی کم ہے۔ جتنی بھی کہانیاں ہٹ ہوتی ہیں وہ ساری گاؤں کے ماحول میں ہی ہوتی ہیں اور نجمہ سودی صاحبہ کی آخری صفحات پر دشت تنہائی، اس بار سسپنس کی جان تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی وجہ سے دل بس یہی کہہ رہا ہے کہ دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں۔ تیری آواز کے سائے۔ اور کچھ نہیں لکھا جارہا اسی لیے اب ختم کرتا ہوں۔" (کہانیوں پر مختصر سا تبصرہ کرنے کا شکریہ)

✠ **احمد خان توحیدی**، پاکستان اسٹیل، کراچی سے تشریف لائے ہیں "جون ایلیا آپ کے چند الفاظ بہت گہرے ہوتے ہیں۔ جرم کی جڑ، لڑاؤ اور حکومت کرو والے عیاش لیڈرز ہیں۔ محفل خطوط۔ ارے ماہا ایمان پردہ اٹھا کر کرسی صدارت پر مبارک ہو۔ نعمان پیارے، میں نے تبصرہ 23 فروری کو حوالۂ ڈاک کیا تھا، دیکھ لیں نام و نشان نہیں ہے۔ ماہا ایمان، تفسیر عباس اوکاڑہ، قدرت اللہ نیازی کے طویل تبصرے میرا نصیب روی کی ٹوکری۔ تصویر العین پاکیزہ کے بارے میں سب کو کہیں ایک بار پڑھ کر دیکھیں۔ نمرہ احمد، عمیرہ احمد شامل کرنا اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ سسپنس میں ناول کے بجائے حقیقی کہانی ہوتی ہے۔ قمر تقی کھوٹہ، پاکستان کی سیاست ایماندار کے بس کی بات نہیں ہے۔ سعید عباسی بہاولپور 40 سال والی بات 1972ء میں 7 ویں میں پڑھتا تھا، پرانا رسالہ پڑھا سسپنس یا کوئی اور یاد نہیں۔ عمران بلوچ، اللہ آپ کو جلد رہائی نصیب کریں۔ گھر کے چراغ سے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب تاریخی تحریر کا شکریہ، پلیز شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے بارے میں لکھیں۔ کشکول ابھی پڑھی نہیں ہے۔ بیمار گھوڑا، عرفان اور نرگس نے فرید کے ساتھ دھوکا کیا یہی انجام ہونا تھا۔ جرم محبت کاشف زبیر، بزنس فیملی مختار آزاد، لاحاصل عابدہ نرجس، چور سپاہی اچھی کہانیاں ہیں اردو میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ اشعار میں پہلا نمبر میرا، شکریہ۔ دیگر اچھے ہیں۔ مسافر بہت خوب، دور بین کی چوری بری بات، شاہ جی جیسے لوگوں کو وقت کے فرعون کب برداشت کرتے ہیں۔ صدف کی اطلاع پر شہریار اور کھالے کی بروقت کارروائی بہت اچھی لگی۔ نظر فریب، چور کبھی تو قابو آہی جاتا ہے۔ انوکھی محبت میں بے گناہ قتل ہوا۔ دشت تنہائی شاہ زیب جیسے فرعونوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ شہریار نے اچھی روش اختیار کی۔ افسوس، سلطانہ سے شادی نہ کرسکا۔ اچھی لڑکیاں بہت ہیں۔ شہریار جلد شادی کرلیں۔"

✠ **ساگر تلوکر**، چشمہ بیراج، میانوالی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "سسپنس 14 مارچ کو ملا۔ ٹائٹل اس مرتبہ معمول سے ہٹ کر لگا۔ جون ایلیا مرحوم کا جرم پڑھا۔ جون صاحب ہمیشہ کڑوے سچ لکھتے رہے۔ اداریے میں ملک کے خراب حالات کا رونا رونا تھا، اب تو یہ معمول کی بات بن گئی ہے۔ شرمین نے پاکستان کا واقعی نام روشن کر دیا ہے۔ باجی ماہا آئیں اور آتے ہی کرسی صدارت لے گئیں۔ مبارک ہو سسٹر۔ تصویر العین ہماری دعا ہے کہ ہماری بہن ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزاریں، آمین۔ جی آنٹی ضرور عمیرہ احمد، نمرہ احمد سے سسپنس کے لیے بہت جلد لکھوایا جائے اور ساتھ ہی ماہا اسا قادری کو بھی اب پکڑ لائیں۔ قدرت اللہ، ماہ تاب، سعدیہ بخاری، ہمایوں سعید اور تفسیر عباس بابر کے خط بہت اچھے تھے۔ عمران حیدر بلوچ کو سلام اور ان کے لیے دعا وہ جلد رہا ہو جائیں (آمین) کشکول بہت اچھی جارہی ہے۔ افضل نے پھر کامیابی حاصل کرلی ہے، آگے خدا خیر کرے۔ مسافر لگتا ہے کہ یہ کہانی بہت اچھی بنے گی۔ آخری صفحات پر نجمہ سودی کو دیکھ کر محمود سودی کی آرزو کے مراحل یاد آگئی۔ اب پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام پڑھ کر ایمان اور اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہوسکے۔

محسن علی سوم، بالاکوٹ۔ دعا چوہدری، ساہیوال۔ محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور۔ ریحانہ اسلم، ابرار وارث، وڑآباد سندیلیا نوالی۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی۔ حاجی عبدالحکیم، خانیوال۔ ملک بشریٰ تلوکر اینڈ تانی تلوکر، میانوالی۔ عصمت علی، مالم جبہ سوات۔ حسنین خان بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ ملک عثمان کھوکھر، میانوالی۔ محمد شہزاد اقبال، کوٹ ادو، ضلع مظفر۔

فصل اجڑ گئی

ڈاکٹر ساجد امجد

تاریخ ہمیشہ صفحۂ قرطاس پر صرف محبت کے رنگین جذبات کو نہیں بلکہ سنگین واقعات کو بھی رقم کرتی ہے... خواہ یہ واقعات ہجر و وصل سے معمور ہوں یا لرزہ خیز حالات سے۔ یہ بھی چچا بھتیجے کی محبت اور جوندی معرکوں کا ایک ایسا تسلسل ہے... جس مدن کبھی جلال الدین خلجی کی نرم طبیعت نے اسے شفیق القلب مگر بہ ظاہر غم گساروں کے درمیان تنہا کر ڈالا تو کبھی علاؤالدین خلجی کی سخت فطرت اور احتیاط پسندی نے اسی رشتے اور محبت پر پھر سفاکی کو پھر سے دھرایا... اور تاریخ تو نام ہی کتاب کے بار بار کھلنے اور بند ہونے کا ہے۔ سلطان بدلتے ہیں مگر تخت وہی رہتا ہے۔ علاؤالدین خلجی... جس نے سکندر کی طرح دنیا کو فتح کرنے کا عزم کیا تھا... اور جو کچھ اس نے چاہا وہ پا بھی لیا اس کے باوجود اس نے اپنی ذہانت اور سفاکی سے کوئی سبق نہ سیکھا اور جب تاریخ نے خود کو دھرایا تو فصل اجڑتی چلی گئی، اور ایک بار پھر وہی منظر تھا۔ وہی پیش گوئی گردش مدن تھی... جو تلوار سے قتل کرتا ہے وہ تلوار سے قتل ہوتا ہے... وہی چچا بھتیجے کی محبت اور وہی اقتدار کی جنگ... پھر نتیجہ کیسے کوئی اور نکلتا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

جب علاؤالدین خلجی اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کرنے کے بعد حالات کے دھارے پر بہتا ہوا دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا تو اسے خود بھی یہ امید نہیں تھی کہ معاملات اتنی آسانی سے اس کے حق میں پلٹا کھا گئیں گے۔ ایک جلال الدین ہی تو قتل ہوا تھا باقی سب تو نہیں مر گئے تھے۔ اگر اسے کچھ امید تھی تو اپنے ساتھ لائی ہوئی دولت کے انبار سے تھی جس سے وہ راستے بھر لوگوں کو خریدتا ہوا چلا آیا تھا۔

ایک غلطی دس غلطیوں کو جنم دیتی ہے۔ جلال الدین کی بیوی ملکہ جہاں سے غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے ولی عہد سلطنت ارکلی خاں کو بروقت مطلع نہیں کیا اور اپنے چھوٹے بیٹے کو تخت پر بٹھا کر باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مشیروں اور امرا کے مشوروں کے خلاف عمل کر کے علاؤ الدین کو روکنے کی کوشش تک نہیں کی گئی۔ امرا علاؤ الدین سے مل گئے اور خانوادۂ شاہی کو فرار ہونا پڑا۔ علاؤ الدین نے اس فرار کو برداشت نہیں کیا اور چن چن کر ایک ایک فرد کو قتل کر دیا۔ کچھ کو ہمیشہ کے لیے کال کوٹھریوں میں بند کر دیا۔

انتقام کی اس لہر نے اچھے اچھوں کو دہلا دیا۔ جو جہاں تھا بت بن کر خاموش ہو گیا۔ اردگرد کے حکمران اس کے قدموں کی دھول چاٹنے لگے۔

تخت نشینی کو صرف تین سال ہوئے تھے کہ اس نے جو چاہا وہ کر لیا۔ اس کی سلطنت گجرات تک وسیع ہو گئی۔ سارا ملک دشمنوں اور مدعیان سلطنت سے پاک ہو گیا۔ کوئی نہیں تھا جو اس کے خلاف آواز اٹھاتا۔

وہ جاہل محض تھا۔ اجڈ پن اور حیوانیت اس کی طبیعت کے خاص جوہر تھے۔ ایسے میں اتنی کامیابیاں نصیب ہو گئیں تو اس کا ذہن فاسد خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔

ایک روز محفل شراب سجی ہوئی تھی۔ نشے نے زور پکڑا تو دل کا زہر زبان پر آ گیا۔ زہر بھی ایسا کہ جس نے سنا مردے کی طرح خاموش ہو گیا۔

''تم سب نرے جاہل تو ہو لیکن یہ تو معلوم ہو گا کہ جسے تم لوگ شریعت کہتے ہو وہ کیسے پھیلی۔ مجھے معلوم ہے تم نہیں بتا سکتے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ٹھہرو، میں یہ آخری گھونٹ ختم کر لوں اس کے بعد بتاتا ہوں کیونکہ جو بات میں کہنے والا ہوں اس کے لیے ہوش میں رہنا ضروری ہے۔''

اس نے گلاس خالی کر دیا۔ باقی لوگوں نے بھی اس کے احترام میں جلدی جلدی گلاس خالی کیے اور سراپا گوش ہو کر بیٹھ گئے کہ دیکھیے ارشاد عالی کیا ہوتا ہے۔

علاؤ الدین نے کہنا شروع کیا۔ ''حضرت محمد ﷺ نے اپنی قوت و شوکت سے شریعت قائم کی اور ان کے چاروں خلفا نے اس شریعت کو مضبوط بنایا۔''

چاروں طرف سے داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں۔ خوشامدی امرا اور کیا کر سکتے تھے۔ بعض نے سرگوشیوں میں یہ بھی کہا کہ شکر ہے اس جاہل کو اتنا تو معلوم ہے۔

اب وہ اصل مطلب پر آیا۔ ''اسی طرح اگر میں بھی اپنے چاروں امرا الماس بیگ، ظفر خان، ملک نصرت خاں اور الپ خاں کی قوت اور بل پر ایک نیا مذہب جاری کروں تو پھر یقیناً روز قیامت تک میرا نام دنیا میں باقی رہے گا۔''

یہ سنتے ہی جس کا منہ جس طرف تھا اسی طرف رہ گیا۔ زبانوں پر تالے پڑ گئے۔ سلطانِ وقت کو اتنی تاب کہاں کہ وہ کچھ کہے اور جواب میں خاموشی ملے۔ اس نے گرج کر کہا۔

''کیا تم سب مر گئے جو میری بات کا جواب نہیں دیتے؟''

اب امیروں کو ہوش آیا کہ وہ کیا غلطی کر رہے ہیں۔ ان سب نے بہ یک آواز سلطان کے خیالِ فاسد کی تائید کی۔

''حضور، ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ ایسے اعلیٰ خیالات آپ کے دماغ مبارک میں آئے کیسے؟''

''اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ میں کیا طریقہ اختیار کروں کہ میرا جاری کیا ہوا نیا مذہب اہلِ علم کی نگاہوں میں وقار پائے اور ان کے حلقے میں مروج ہو۔''

''حضور ہمیں تلواروں سے کام ہے۔ جنگ کے داؤ پیچ تو جانتے ہیں۔ ان علمی باتوں کا ہمارے پاس کیا جواب؟''

یہ محفل تقریباً بدمزگی پر ختم ہوئی۔ کیونکہ علاؤالدین کو اس کی باتوں کا خاطر خواہ جواب نہیں مل سکا تھا۔ لوگ بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ نے نشے میں یہ خرافات بک دی ہیں۔ اب رات گئی بات گئی کا معاملہ ہو گا۔ نشہ اترتے ہی بادشاہ کو خود احساس ہو گا کہ اس نے نشے کے عالم میں کیا کہہ دیا تھا۔

اس کے امرا اسے وقتی خرافات سمجھ رہے تھے لیکن علاؤ الدین اتنا سنجیدہ ہو گیا تھا کہ ہر محفل میں یہی تذکرہ چھیڑ دیتا تھا۔ وہ بضد تھا کہ نیا مذہب جاری کرے گا اور اس کے چار امیر اس کے چار خلفا ہوں گے۔ لوگ اس کے ڈر سے خاموش رہتے تھے اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے تھے۔ اس پر اسے مزید یقین ہو گیا کہ اس کا خیال بالکل درست ہے۔

جب یہ چرچے مجالس امرا سے باہر نکلے اور عام مسلمانوں تک پہنچے تو سخت شورش پھیلی۔ لوگوں نے بزرگان دین کی خانقاہوں کا رخ کیا۔ بادشاہ کی شکایتیں جمع ہونے لگیں۔

یہ سب لوگ اور خاص طور پر حضرت سلطان نظام

الدین اولیاؒ و دیگر بزرگان دین بادشاہ کے لیے ان شیطانی خیالات سے نجات پانے اور مذہب اسلام پر ثابت قدم رہنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

کہتے ہیں دہلی کے کسی بزرگ نے یہ دعا بھی کرائی تھی کہ اللہ تعالیٰ کچھ دن کے لیے بادشاہ کو کسی ایسے مسئلے میں الجھا دے کہ اس کا دھیان اس فاسد خیال کی طرف جانے ہی نہ پائے۔

یہ دعا مقبول ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمانِ دہلی پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔

ماوراء النہر کے حاکم دوا خان کا بیٹا قتلق خواجہ بیس ثمن یعنی دو لاکھ وحشی مغل سواروں کو ساتھ لے کر ہندوستان فتح کرنے کے ارادے سے نکلا۔ رفتار کیا تھی آندھی کا پھیلاؤ تھا۔ ابھی روانگی کی خبر آئی تھی، ابھی معلوم ہوا دریائے جمنا کے کنارے جا پہنچا اور خیمہ زن ہوا ہے۔

مغلوں کے خوف نے ایسا خوف زدہ کیا کہ دہلی کے آس پاس کے لوگ دہلی میں آ آ کر پناہ گزیں ہونے لگے۔ گلی کوچے اور مسجدیں باہر سے آنے والوں سے بھر گئیں۔

مغلوں نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ آنے جانے اور رسد رسانی کے راستے بند ہو گئے۔ اشیائے صرف کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ ہو گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دنوں یہی حالت رہی تو قحط پڑ جائے گا۔

لوگ یہ کہتے سنائی دے رہے تھے کہ علاؤ الدین کے فاسد خیالات نے یہ دن عذاب کے طور پر دکھایا ہے۔ فقیر کی دعا پوری ہوئی، بادشاہ ایسے مسئلے میں الجھ گیا ہے کہ آخر میں توبہ ہی کرتے بنے گی۔

جب محاصرہ طویل ہونے لگا تو علاؤ الدین نے امرا و اراکین سلطنت کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔

''مغلوں کے لشکر کا کچھ احوال معلوم ہوا؟''

''دو لاکھ سے زیادہ کا لشکر ان کے ساتھ ہے اور سب کے سب سوار ہیں۔ لڑنے میں بھی یہ قوم جیسی مہارت رکھتی ہے وہ حضور کے علم میں ہے۔''

''وہ کب تک محاصرہ کر سکتے ہیں؟''

''آس پاس کے علاقے سے ان کو برابر رسد مل رہی ہے جبکہ اہلِ دہلی کا برا حال ہے۔''

''ہمارے لشکر کا احوال کیا ہے؟''

''اشیائے صرف کی قیمتوں کا اثر لشکر پر بھی پڑا ہے۔''

''ان کمزوریوں سے قطع نظر آپ لوگوں کا کیا مشورہ ہے۔ ہمیں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے؟''

''جب جنگ ہوتی ہے تو شکست و فتح دونوں ہی ممکن ہوتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے مقابلے سے گریز کر کے کوئی درمیانی راستہ نکالا جائے۔''

''بادشاہوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ جنگ سے خوف زدہ ہوں۔ میں باہر نکل کر مغلوں کا مقابلہ کروں گا۔''

امرا کے مشورے کے باوجود علاؤ الدین نے مقابلے کا ارادہ کر لیا۔ بدایوں دروازے کے سوا تمام دروازے بند کر دیے، تین لاکھ سواروں اور ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ نہایت شان و شوکت سے شہر سے باہر نکلا۔

علاؤ الدین نے اپنے لشکر کو اس طور پر ترتیب دیا کہ میمنہ پر اپنے لشکر کے بہادر ترین سپاہیوں کو متعین کیا۔ میسرہ میں الماس بیگ اپنی جمعیت کے ساتھ کھڑا ہوا اور ملک نصرت خاں جری سواروں اور مست ہاتھیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ قلب لشکر میں کھڑا ہوا۔

ایسے دو عظیم الشان لشکر کبھی ایک دوسرے کے مقابل نہیں آئے ہوں گے۔

سب سے پہلے ظفر خاں نے دشمن لشکر کے سامنے والے حصے پر حملہ کیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مست ہاتھیوں نے غنیم کو کچل کر رکھ دیا۔ ظفر خاں کی دلیری نے مغلوں کو ششدر کر دیا۔ ظفر خاں کی دلیری کو دیکھ کر دیگر علاقائی امیروں نے بھی ایک ساتھ ہلہ بول دیا۔ جب چاروں طرف سے تلواریں چمکیں تو مغلوں کا لشکر حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ظفر خاں نے بھاگتے ہوئے مغلوں کا تعاقب شروع کر دیا۔ الماس بیگ بھی اس کے ساتھ تھا لیکن وہ ظفر خاں سے دشمنی کے جذبات رکھتا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد خاموشی سے پیچھے رک گیا اور ظفر خاں کو آگے جانے دیا۔

مغلوں کا ایک سردار گھات میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ ظفر خاں اکیلا ہے اور اس کے پیچھے کوئی امدادی لشکر نہیں تو اس نے یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اپنی کمیں گاہ سے نکلا اور ظفر خاں کے گھوڑے کے پاؤں کاٹ ڈالے۔

ظفر خاں زمین پر آ گیا اور تیر چلا چلا کر اپنا دفاع کرنے لگا۔ اس وقت بھی اس کی بہادری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو خود کو دشمن کے حوالے کر دیتا لیکن وہ برابر تیر اندازی کر رہا تھا اور مغلوں کو قریب آنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

مغلوں کے سردار قتلق خواجہ نے ظفر خاں کو پیغام

دیا۔ ”تو اپنے تیروں کو ترکش میں رکھ اور میرے پاس آجا۔ میں تجھے تیرے موجودہ عہدے سے کہیں زیادہ بڑا عہدہ عطا کروں گا۔“

ظفر خاں نے اس پیغام کو کوئی اہمیت نہیں دی اور برابر تیر برساتا رہا۔ مغل جب اس کی وفاداریاں خریدنے میں ناکام ہوئے تو انہوں نے بھی ظفر خاں پر تیر چلانے شروع کر دیے اور اسی طرح اسے ختم کر دیا۔ اس کے چند دہلوی امیر بھی مغلوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

فتلق خواجہ پر اب بھی ہندوستانیوں کا ایسا خوف تھا کہ تیس کوس تک سانس لیے بغیر چلتا رہا اور منزلیں طے کرتا ہوا اپنے ملک پہنچ گیا۔

اس عظیم الشان کامیابی نے علاؤالدین کے تکبر میں مزید اضافہ کر دیا۔ اب تک تو وہ ان خیالات کا اظہار کرتا رہا تھا کہ ایک نیا مذہب جاری کرے گا مگر اب اس میں ایک اور ارادہ بھی شامل ہو گیا کہ دہلی کی حکومت کسی قابل اعتبار شخص کے حوالے کر کے خود سکندر کی طرح دنیا فتح کرنے کے لیے نکل جائے۔ خراسان، ترکستان وغیرہ فتح کرے اور وہاں اپنے مذہب کو رائج کرے۔ دنیا میں جہاں جہاں اس کے قدم پہنچیں اس کا مذہب بھی وہاں پہنچے۔

اس نے مغل سردار فتلق خواجہ کو شکست دی تھی لہٰذا اس کا دماغ عرش معلیٰ پر پہنچا ہوا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے خیالات سے اختلاف کرتا۔ امرا کی شامت آئی تھی کہ اسے سمجھاتے۔ سب اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے بلکہ اس کا حوصلہ بڑھاتے کہ اس وقت روئے زمین پر اس جیسا کوئی بادشاہ نہیں۔ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے بالکل درست سوچ رہا ہے۔ ایک دن آئے گا کہ ساری دنیا میں اس کی فتح کے جھنڈے گڑے ہوں گے۔

اس نے جب امیروں کو اپنا ہم خیال دیکھا تو حکم جاری کر دیا کہ خطبوں میں اس کے نام کے ساتھ ”سکندر ثانی“ کے لقب کا اضافہ کیا جائے۔ سکوں پر بھی یہ نقش کروایا۔

شاید اللہ تعالیٰ کو اس کی اصلاح منظور تھی کہ کوتوال شہر علاءالملک کے دل میں یہ جرأت پیدا ہوئی کہ وہ بادشاہ کو اس کے ان فاسد خیالات پر ٹوک سکے۔

علاء الملک بادشاہ کی طرف سے برپا ہونے والی مجالس بادہ نوشی میں بہت کم شریک ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جو وہ شریک ہوا تو بادشاہ نے اپنے خیالات کے بارے میں اس کی رائے طلب کی۔ علاءالملک کے دل میں پہلے تو یہ خیال آیا کہ دوسرے امرا کی طرح وہ بھی بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملا دے لیکن پھر اس کے دل میں خوف خدا غالب ہوا۔ اس نے سوچا چند روزہ زندگی کے لیے حقائق پر پردہ ڈال کر گناہ گار ہونے کا کیا فائدہ۔ مجھے خدا کا خوف ہونا چاہیے نہ کہ بادشاہ کے عتاب کا۔ اگر سچی بات کے کہہ دینے میں شہادت بھی نصیب ہو جائے تو پروا نہیں۔ اس نے بے خوف ہو کر بادشاہ سے کہا کہ اگر کچھ دیر کے لیے بادہ نوشی موقوف کر دی جائے اور تمام لوگوں کو باہر نکال دیا جائے تو وہ اکیلے میں اس کے سوالوں کا جواب دے سکے گا۔ یہ بات سن کر پہلے تو بادشاہ کی تیوری پر بل پڑ گئے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے تمام لوگوں کو باہر نکال دیا۔

کوتوال نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ ”کچھ کہنے سے پہلے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر میری گزارش طبع نازک پر گراں گزرے تو اس غلام کو معاف فرما دیجیے گا۔“

”میں نے تمہاری درخواست قبول کی۔ جو کچھ کہنا ہے بے کھٹک کہو۔“

کوتوال نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھا کہ بادشاہوں کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اگر اس درخواست کی قبولیت کے بعد بھی میری گردن مار دی جائے تو مجھے پروا نہیں۔

کوتوال نے کہا۔ ”حضور، سوچنے کو انسان کچھ بھی سوچ لے لیکن حقیقت، حقیقت ہوتی ہے۔ شریعت کا تعلق انبیائے کرام سے ہے۔ انبیائے کرام کی نبوت وحی آسمانی سے تعلق رکھتی ہے۔ کوئی شخص اپنے خیالات کو شریعت نہیں کہہ سکتا اور نہ کوئی نیا مذہب جاری کر سکتا ہے۔ نبوت کا منصب حضرت محمد ﷺ پر ختم ہو چکا۔ اب کوئی نئی شریعت نہیں آئے گی۔ اگر آپ نے کسی نئے مذہب کا اجرا کیا تو کوئی مسلمان اسے قبول نہیں کرے گا۔ فساد کا ایسا دروازہ کھل جائے گا کہ آپ اسے بند نہیں کر سکیں گے۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے یہ جسارت کرنے کی کوشش کی لیکن کیا وہ کامیاب ہوئے؟ اگر آپ نے اپنے ارادے پر عمل کیا تو مسلمانوں کے غضب کا نشانہ بھی بنیں گے اور خدا کے عذاب کے حق دار بھی کہ جس نے یہ منصب شاہی آپ کو عطا کیا ہے۔“

”آج تک میرے کسی امیر نے یہ جسارت نہیں کی، تجھے یہ جرأت کیسے ہوئی؟“

”شاید خدا کو مجھ سے یہ کام لینا ہو کہ آپ کے سامنے سچ بول سکوں۔ اب آپ چاہیں تو میری گردن اتار لیں۔“

”کیا میرے امیروں میں اتنی عقل نہیں جو تجھ میں ہے؟“

”وہ آپ کے خوف سے آپ کو نہیں جھٹلاتے۔ ان کے مفاد آپ سے وابستہ ہیں ورنہ عام مسلمان دین کی حرمت کے لیے جان دے دے گا لیکن کسی خود ساختہ دین کو قبول نہیں کرے گا۔“

”اچھا یہ تو ہو گیا۔ میں نے تیری باتیں سن لیں۔ اب یہ بتا کہ میرے دوسرے خیال کے متعلق تیرا کیا خیال ہے؟“

”آپ کے دوسرے خیال کی میں مخالفت نہیں کروں گا لیکن اس میں میری ایک رائے ہے اس پر بھی غور فرما لیں۔ آج کا زمانہ سکندر کے زمانے سے مختلف ہے۔ اس وقت عہد شکنی اور مکاری کا عام رواج نہیں تھا۔ سکندر کامل 32 سال تک اپنے ملک سے باہر رہ کر اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتا رہا اور اس کے نظام سلطنت میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ جب فتوحات سے فارغ ہو کر اپنے ملک واپس پہنچا تو ہر شخص کو اسی طرح سچا اطاعت گزار پایا۔ اگر آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی عدم موجودگی میں نظام سلطنت چلتا رہے گا اور آپ کے لوگ آپ سے منحرف نہیں ہو جائیں گے تو حضور اپنے ارادے میں حق بجانب ہیں۔“

علاؤالدین نے کوتوال کی تقریر کو بڑے غور سے سنا۔

”تیرا مشورہ یہ ہے کہ میں دنیا کی فتح کا ارادہ منسوخ کر دوں اور صرف دہلی کی بادشاہت پر قناعت کر کے بیٹھ جاؤں۔ اپنے خزانے بھرے رکھوں اور ان سے کوئی کام نہ لوں۔“

”حضور کے شوق فتح کی تکمیل کے لیے ہندوستان میں بھی کئی میدان ہیں جہاں آپ کے خزانے اور دفینے کام آسکتے ہیں اور آپ وہ کام کر سکتے ہیں جو دوسرے بادشاہوں نے نہیں کیے۔“

”تیرے خیال میں وہ کون سی مہمات ہیں؟“

”پہلی مہم تو یہ ہے کہ ہندوستان کے سرحدی علاقوں کے بعض شہروں کو فتح کیا جائے۔ رن تھنبور، جالور اور نندیری ہیں جو فتح کے منتظر ہیں۔ مشرق میں دریائے محیط تک کا علاقہ اور شمال میں بلقان اور کابل تک کے خطے کو فتح کر کے یہ مہم سر کی جا سکتی ہے۔

مغل جتھے بار بار ہندوستان پر حملہ آور ہوتے ہیں، ان کی گوشمالی کے لیے دیبال پور اور ملتان جیسے شہروں کے قلعوں کو فتح کر کے مغلوں کی سرکوبی کی جا سکتی ہے۔ ان انتظامات کے بعد اگر حضور دنیا کی فتح کے لیے نکل بھی جائیں تو کوئی خطرہ نہیں۔“

”کیا تو اتنا ہی عقل مند ہے جتنی تیری باتیں ہیں۔“

”یہ وہ جسارت ہے جو حضور نے مجھے عنایت کی ہے ورنہ یہ غلام کسی قابل نہیں۔“

”کچھ اور کہنا چاہتا ہے یا تو نے بات ختم کر لی؟“

”ایک گزارش اور ہے۔“ کوتوال نے کہا۔ ”یہ مقاصد اسی وقت حاصل کیے جا سکتے ہیں جب حضور شراب نوشی، عیش کوشی اور میر و شکار وغیرہ کی طرف کم توجہ فرمائیں اور تمام مہمات کی خود نگرانی کریں۔“

علاؤالدین خلاف معمول اس کی باتیں نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔ پھر اس کی زبان سے کوتوال کے لیے تحسین آمیز کلمات ادا ہوئے اور انعامات سے سرفراز کیا۔ جامہ زردوزی جس پر شیر کی صورت منقش تھی، دس ہزار تنکہ اور دو عدد مرصع زین لگام کے گھوڑے عطا کیے اور یہ عہد بھی کیا کہ وہ اس کے مشوروں پر عمل کرے گا۔

اس نے واقعی اپنے کوتوال کے مشورے پر عمل کیا اور رن تھنبور کے قلعے پر حملے کی تیاری کرنے لگا۔ اس قلعے کی مضبوطی ہر بادشاہ کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے اپنے بھائی الماس بیگ اور نصرت خاں کو ایک عظیم الشان فوج کے ہمراہ رن تھنبور کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ اس قلعے کی تسخیر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ علاؤالدین کے بہت سے مخالفین رن تھنبور کے راجا رانا ہمیر کے پاس پناہ گزیں ہو گئے تھے اور وہ کسی قیمت پر ان کو علاؤالدین کے حوالے کرنے پر تیار نہیں تھا۔

نصرت خاں اور الماس بیگ لشکر لے کر روانہ ہوئے اور رن تھنبور کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ ”رن“ اور ”تھنبور“ نامی دو پہاڑوں کے درمیان تھا اور یہی اس کی مضبوطی کا سبب تھے۔ ایک پہاڑ تو ایسا تھا جو اس قلعے کے لیے مورچے کا کام کرتا تھا۔ پہاڑ پر چڑھے بغیر اس مورچے کو منہدم کرنا آسان نہیں تھا جبکہ اوپر سے پتھر بھی آتے تھے تو ان سے بچاؤ ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جلال الدین خلجی بھی اسے تسخیر کیے بغیر واپس چلا گیا تھا اور اب علاؤالدین کا لشکر اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔

اس قدر مضبوطی کے باوجود رانا ہمیر کے سپاہیوں پر سلطانی رعب ایسا تھا کہ وہ راجا کو مشورے دے رہے تھے کہ سلطان کے پناہ گزیں امرا کو سلطان کے حوالے کر دے اور لڑائی سے گریز کرے لیکن راجا کو قلعے کی مضبوطی پر گھمنڈ تھا اس لیے وہ ان کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ بضد تھا کہ راجپوت جسے اپنی پناہ میں لے لیتے ہیں پھر اس کے سر سے حفاظت کا ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

راجا اور اس کے خاص آدمیوں کے درمیان یہ مباحثے جاری تھے لیکن وہ محاصرے کی طرف سے بھی غافل نہیں تھے۔ فصیلوں پر رانا کے سپاہی تعینات تھے۔ سلطانی فوجیوں کو جب بھی حرکت میں دیکھتے ان پر تیروں سے حملے کرتے یا بڑے بڑے پتھر لڑھکاتے جو نشیب تک آتے ہوئے نہایت خطرناک ہو جاتے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ نیچے سے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جا سکتی تھی۔ تیروں کا فصیل تک اول تو پہنچنا محال تھا، دوسرے پہاڑ کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے فصیل پر کوئی نظر بھی نہیں آتا تھا جس کا نشانہ لیا جا سکے۔

الماس بیگ اور نصرت خاں برابر گھوڑے دوڑاتے رہتے تھے کہ کسی طرح پہاڑ پر چڑھ سکیں اور کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں سے دھاوے لگا کر فصیل کو اڑا دیا جائے اور اندر پہنچنے میں کامیابی ہو۔ لیکن وہ جب بھی آگے بڑھتے تھے تو رانا کے سپاہیوں کو خبر ہو جاتی تھی اور وہ زد میں آئے بغیر تیر برسانا شروع کر دیتے تھے بالآخر ایک رات وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں فصیل کی بنیادیں ڈھلوان پر قائم تھیں۔

وہ اس فصیل میں ایسی جگہ تلاش کرتے رہے جہاں بہ آسانی دھماکے لگائے جا سکیں۔ اسی میں رات گزر گئی اور کچھ کچھ روشنی نمودار ہونے لگی۔ روشنی میں شاید وہ دونوں فصیل پر بیٹھے ہوئے سپاہیوں کو نظر آنے لگے۔ اوپر سے سنگ باری شروع ہو گئی۔ جگہ ایسی تھی کہ لیٹ کر بھی اپنی جان نہیں بچائی جا سکتی تھی۔ پھر بھی وہ دونوں اپنے آپ کو بچاتے ہوئے نیچے اترتے رہے۔ ایک پتھر اچانک نصرت خاں کی کمر میں لگا۔ اس کی ضرب سے وہ لڑھکتا ہوا کافی دور تک چلا گیا۔ الماس بیگ بھی اس کے پیچھے دور تک گیا۔ اتفاق سے وہ دونوں ایک ایسی جگہ جا کر رکے کہ فصیلوں پر بیٹھے ہوئے لوگ انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ دونوں پہاڑ سے نیچے اتر گئے لہٰذا سنگ باری بند ہو گئی۔

اس سنگ باری کی خبر لشکر تک بھی پہنچ گئی تھی لہٰذا بہت سے لوگ وہاں پہنچ گئے اور زخمی نصرت خاں کو اٹھا کر الماس بیگ کے خیمے میں لے آئے جہاں جراح اور طبیب اس کی جان بچانے کی کوششیں کرنے لگے۔ طبیبوں کا خیال تھا کہ زخم معمولی ہیں اور نصرت خاں جیسا بہادر آدمی ان زخموں کو بہ آسانی جھیل جائے گا۔ دو تین دن بعد وہ باتیں کرنے کے لائق بھی ہو گیا تھا لیکن پھر اچانک اس کی حالت بگڑ گئی۔ شاید کچھ اندرونی چوٹیں ایسی آئی تھیں کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

الماس بیگ نے بہت چاہا کہ اس کی موت کی خبر عام نہ ہو لیکن راجا کے جاسوسوں نے یہ خبر قلعے کے اندر پہنچا دی۔

راجا کے مشیروں نے راجا کو مشورہ دیا کہ اس وقت سلطانی لشکر ایک سانحے سے گزرا ہے۔ ان کا ایک اہم سپہ سالار مارا گیا ہے لہٰذا ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور باہر نکل کر بھرپور حملہ کر دینا چاہیے۔

راجا جو، اب تک سلطانی لشکر سے خائف تھا اسے یہ مشورہ پسند آیا۔ وہ قلعے سے باہر نکلا اور سلطانی لشکر پر حملہ آور ہو گیا۔

نصرت خاں کی موت واقعی ایسی افتاد تھی کہ سلطانی لشکر کے دل اکھڑ گئے تھے۔ خود الماس بیگ بوکھلایا ہوا تھا، اس کے لشکر نے کچھ دیر تو مقابلہ کیا لیکن پھر الماس بیگ لشکر کو لے کر پیچھے ہٹنے لگا اور بالآخر محاصرے سے دستبردار ہو کر "جہائن" کے قلعے میں مقیم ہو گیا۔ رن تھنبور آنے سے پہلے نصرت خاں اور الماس بیگ نے یہ قلعہ فتح کر لیا تھا۔ یہاں پہنچ کر جب اس کے کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے علاؤالدین کو تمام حالات تفصیل سے لکھ کر روانہ کیے۔

نصرت خاں کی بے وقت موت اور الماس بیگ کی پسپائی نے سلطان کو سخت برافروختہ کر دیا۔

"رن تھنبور کی فتح اس سے پہلے اتنی ضروری کبھی نہیں ہوئی تھی۔ گستاخ رانا ہمیر کو سبق سکھانا ضروری ہے۔ کوچ کی تیاری کی جائے۔ اس مرتبہ ہم خود جائیں گے۔"

فوج نے تیاری پکڑی اور سلطان علاؤالدین خلجی تزک و احتشام کے ساتھ دہلی سے جہائن کی طرف روانہ ہوا جہاں الماس بیگ قلعہ بند تھا۔

دہلی سے چھتیس میل دور ٹپٹ نامی مقام پر سلطان نے پہلا پڑاؤ کیا اور عارضی قیام کے لیے چند روز ٹھہرنے کا حکم دیا۔

سلطان نے فوج کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے شکار کا اہتمام کیا۔ ہانکا لگانے والے شور مچاتے ہوئے جنگل کی طرف نکل گئے تاکہ جنگل کے جانور شور سن کر آگے کی طرف بھاگیں۔ سلطان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک اونچی جگہ بیٹھ گیا کہ ہانکے کا شور سن کر جب جانور اس طرف آئیں تو وہ ان پر تیر چلائے۔

سلطان شاہ، علاؤالدین خلجی کا بھتیجا تھا۔ اسے راکٹ خاں کا خطاب ملا ہوا تھا۔ وہ راستے بھر کسی خیال میں ڈوبا ہوا چلا آ رہا تھا۔ سلطان کو چند ہمراہیوں کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر اس خیال نے سر ابھارا اور سمجھنے لگا کہ قدرت نے یہ موقع خود بخود عطا کر دیا ہے۔

وہ راستے بھر یہ سوچتا آیا تھا کہ علاؤالدین نے اپنے

بابا جلال الدین کو قتل کر کے عنان حکومت سنبھالی ہے۔ علاؤالدین میرا چچا ہے۔ اگر میں بھی اسے قتل کر دوں تو تخت شاہی پر بیٹھ سکتا ہوں۔ اس میں کوئی جرم بھی نہیں ہوگا کیونکہ علاؤالدین خود یہی حرکت کر چکا ہے۔

اس نے اپنے ملازموں سے پہلے ہی ساز باز کر رکھی تھی۔ یہ موقع غنیمت تھا کہ بادشاہ لشکر سے دور تھا۔ اس نے اپنے ایک سو قدیم نو مسلم ملازموں کو ساتھ لیا اور اس بلند جگہ پر پہنچ گیا جہاں سلطان شکار کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ملازموں نے "شیر آیا شیر آیا" کا شور مچانا شروع کر دیا اور ساتھ تیر برسانے لگے۔ ان تیروں کا نشانہ سلطان تھا۔ تیر جنگل کی طرف سے آ رہے تھے۔ یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ تیر کون چلا رہا ہے لیکن اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ کوئی ہے جو بادشاہ کو نشانہ بنا رہا ہے۔ بادشاہ کے ہمراہیوں نے بادشاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور تلواریں سونت لیں۔

انہوں نے بادشاہ کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن پھر بھی دو تیر بادشاہ کے بازو میں پیوست ہو گئے۔ سردیوں کے دن تھے۔ سلطان نے روئی کا موٹا دگلہ پہنا ہوا تھا اسی لیے زخم زیادہ کاری نہیں تھے۔ بادشاہ نے ایک ہوشیاری یہ کی کہ زمین پر گر گیا اور اس طرح پڑا رہا جیسے مر گیا ہو۔ یہ دیکھ کر اس کے ہمراہی چیخنے چلانے لگے۔ سلیمان شاہ سلطان کا سر کاٹنے کے لیے گھوڑے سے اترا تھا لیکن یہ سن کر کہ سلطان مر چکا اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ سلطان کے ہمراہی اگر مقابلے پر اتر آئے تو انہیں ٹھکانے لگانے میں مزید وقت لگ جائے گا۔

سلیمان شاہ نے ان آوازوں پر اعتبار کر لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کی طرف دوڑا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے جو چیخ چیخ کر اعلان کرتے جا رہے تھے کہ سلیمان شاہ نے سلطان کو قتل کر دیا ہے اور اب وہی تاج و تخت کا مالک ہے۔ تم سب اطاعت کرو۔

سلیمان شاہ، شاہی خیمے میں داخل ہوا تو کسی نے بھی اسے نہیں روکا بلکہ فوجی سرداروں نے مبارک باد دینے کے لیے تخت شاہی کا رخ کیا جس پر اب سلیمان شاہ براجمان تھا۔ ہر شخص نے اپنے مرتبے کے مطابق سلیمان کی خدمت میں حاضر ہو کر مبارک باد دی اور اس کی بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

انہوں نے مبارک سلامت کا شور بلند کیا۔ قاریوں نے کلام مجید کی تلاوت شروع کی اور مطربوں نے طرب و مسرت کے نغمے گانے شروع کیے۔

علاؤالدین وقتی طور پر بے ہوش ہوا تھا یا پھر جان بوجھ کر خود کو مردہ ظاہر کیا تھا۔ وہ اٹھا تو اپنے ساتھیوں کو حیران پریشان دیکھا۔ قریب ہی مقرب خاص ملک حمید الدین کھڑے تھے جنہیں دیکھ کر سلطان کی ڈھارس بندھی۔

"جناب عمدۃ الملک۔ یہ سب کیا ہے، کیا ہو رہا ہے یہ؟"

"حضور آپ کے بھتیجے سلیمان شاہ پر بادشاہ بننے کا خبط سوار ہوا ہے۔"

"نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"وہ ایسا کر گزرا ہے۔"

"اگر یہ سب اس نے کیا ہے تو امرا کی اعانت اس میں ضرور شامل ہوگی۔ اس لیے اب میرا یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں۔ میں الماس بیگ کے پاس جہائن پہنچتا ہوں پھر وہی کروں گا جو الماس بیگ کہے گا۔"

"غلام کا مشورہ اس کے برعکس ہے۔"

"آپ کیا کہتے ہیں؟"

"حضور، ابھی سلیمان شاہ کا رنگ پوری طرح جما نہیں ہے۔ آپ کی موت کا کسی کو یقین ہے کسی کو نہیں بلکہ میں تو یہ دیکھ کر آ رہا ہوں کہ سلیمان شاہ نے جب حرم شاہی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو خواجہ سراؤں کے سردار ملک دینار حری اور اس کی مسلح جماعت نے سلیمان شاہ کو روک دیا کہ جب تک ہم بادشاہ کا کٹا ہوا سر نہ دیکھ لیں کسی کو حرم میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اگر آپ جہائن چلے گئے تو سلیمان شاہ کو حالات پر قابو پانے کا موقع مل جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ حضور اسی وقت سراپردہ کی طرف چلیں۔ آپ کو دیکھ کر پورا لشکر آپ کے ساتھ ہو جائے گا۔"

سلطان کو یہ تجویز پسند آئی۔ چتر شاہی تلاش کیا گیا جو جنگل میں پڑا مل گیا۔ علاؤالدین چتر شاہی لے کر سکون کے ساتھ سراپردہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں جس سوار کی نظر پڑتی تھی وہ اس کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ وہ خیمہ شاہی تک پہنچا تو پانچ سو سوار اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر چتر شاہی کو بلند کیا۔ اس کو دیکھتے ہی سارا لشکر علاؤالدین کی طرف آ گیا۔ وہ تمام لوگ جو سلیمان شاہ کے ساتھ ہو گئے تھے، علاؤالدین کے گرد جمع ہو گئے۔ سلیمان شاہ کے اپنے ملازمین بھی اسے لعنت ملامت کر رہے تھے کہ اس نے بادشاہ کا سر کیوں نہیں اتارا۔ اب بادشاہ کے غضب سے انہیں کون بچائے گا۔ سلیمان شاہ بھی ایسا حواس باختہ ہوا کہ راہ فرار اختیار کی اور دہلی کے قریب افغان پور میں جا کر روپوش ہو گیا۔

علاؤالدین پوری شان و شوکت سے اپنے خیمے میں داخل ہوا۔ گرفتاریاں شروع ہوگئیں تو معلوم ہوا کہ سلیمان شاہ کہیں بھاگ گیا ہے۔ بادشاہ نے سپاہیوں کی ایک جماعت سلیمان شاہ کے تعاقب میں روانہ کی۔ دیہاتیوں نے بتایا کہ ایک سوار کو دہلی کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ افغان پور تک پہنچ کر مخبری ہوگئی کہ سلیمان شاہ اسی گاؤں میں چھپا ہوا ہے۔ سپاہیوں نے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ گاؤں کے کھیا کی گردن پر تلوار رکھی گئی تو اس نے اگل دیا کہ وہ سپاہیوں کی آمد کا سن کر قریب کے کھیتوں میں چھپا ہوا ہے۔ سپاہیوں نے کھیتوں میں تلاش کرکے اسے گرفتار کرلیا اور پھر اس کا سر قلم کرکے علاؤالدین کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ علاؤالدین کے حکم سے یہ سر سارے شہر میں پھرایا گیا۔

اس قضیے سے نمٹنے کے بعد سلطان نے کچھ دن اپنے زخموں کے بھرنے کا انتظار کیا اور پھر اپنی فوج کے ساتھ جھائن پہنچ گیا۔ الماس بیگ سے ملاقات کی اور تمام حالات معلوم کیے۔ نصرت خاں کی موت واقعی ایسا صدمہ تھا جس پر سلطان بھی غمگین تھا۔ پہلے اس کے امیر ظفر خاں کی ہلاکت ہوئی اور اب نصرت خاں بھی چل بسا۔ یہ دونوں وہ قابل اعتبار امرا تھے جن کو وہ اپنے نئے مذہب کے لیے خلفا کہا کرتا تھا۔ نئے مذہب سے تو تائب ہوچکا تھا لیکن خلفا کی محبت تو اب بھی اس کے دل میں تھی۔ ان خلفا میں ایک الماس بیگ بھی تھا جو اب تک اس کا وفادار تھا۔ سلطان نے الماس بیگ اور اپنے لشکر کو ساتھ ملایا اور رن تھنبور کی طرف روانہ ہوا۔

رن تھنبور پہنچ کر اس نے رانا ہمیر کے پاس قاصد بھیجا اور اس سے مطالبہ کیا کہ اگر وہ سلطان کے باغی امیروں کو حوالے کردے تو وہ محاصرہ اٹھا کر جانے کو تیار ہے۔

رانا ہمیر دیکھ چکا تھا کہ جلال الدین خلجی بھی ناکام واپس چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے محاصرے میں نصرت خاں مارا گیا۔ اسے اپنے قلعے کی مضبوطی پر اتنا گھمنڈ تھا کہ علاؤالدین خلجی کو بھی اس نے رعونت سے جواب دیا۔

"میں کسی پناہ گزین کو حوالے کرنے کو تیار نہیں۔ تم محاصرہ اٹھاؤ اور چلے جاؤ ورنہ یہیں دفن ہونے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

علاؤالدین کو طیش تو بہت آیا لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ راجا کو مزید راضی کرنے کی کوشش کی جائے اس طرح وہ مزید وقت لینا چاہتا تھا تاکہ فصیل کا کوئی کمزور اور پوشیدہ حصہ تلاش کرسکے۔ وہ بار بار قاصدوں کو بھیجتا رہا اور راجا ہر مرتبہ سخت سے سخت جواب بھجواتا رہا۔ اس عرصے میں علاؤالدین مطمئن ہوکر بیٹھ نہیں گیا بلکہ محاصرے کو شدید سے شدید تر کرتا رہا۔ کئی ایسی جگہیں بھی تلاش کرلیں جنھیں خندق کے طور پر کام میں لایا جاسکتا تھا۔

راجپوت قلعے پر سے پتھر اور آگ پھینکتے تھے۔ مسلمانوں کا لشکر نقب زنی وغیرہ کے ذریعے اہلِ قلعہ پر مزید سختیاں کرتا رہا۔

مسلمانوں کے لشکر کے سردار راجپوتوں کے ملک میں جا جاکر تباہی و غارت گری کا بازار گرم کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ان اقدامات سے راجپوتوں کی حالت کمزور ہوتی جارہی تھی۔

حالت مسلمانوں کی بھی خراب تھی، محاصرہ اتنا طویل ہوگیا تھا کہ فوج میں بددلی پھیلنے لگی تھی۔ ہر سپاہی اپنے گھر جانے کی فکر میں تھا اور یہاں محاصرہ ختم ہونے کی کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔ علاؤالدین نے اپنا پرانا حربہ یہاں بھی استعمال کیا۔ لشکر میں وافر مقدار میں سونا چاندی تقسیم کرکے سپاہیوں کے دل بڑھائے۔

وہ ان کوششوں میں مصروف تھا کہ اودھ اور بدایوں سے ایسی خطرناک خبریں پہنچیں کہ دور ہونے کی وجہ سے وہ سخت پریشان ہوگیا۔ اس کے دو بھانجوں امیر عمرو اور منکو خاں نے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا تھا۔ یہ دونوں اودھ اور بدایوں کے حکمراں تھے۔

یہ دونوں اس کے بھانجے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ دونوں اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اس کے احکام کی خلاف ورزی شروع کردیں گے۔

اگر وہ کامیاب ہوجاتے تو دہلی تک انھیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ علاؤالدین نے ان علاقوں کے امرا کے نام فرامین جاری کیے کہ ان کی بغاوت کو کچل دو اور انھیں گرفتار کرکے فوراً میرے پاس روانہ کردو۔

ان امیروں نے بادشاہی حکم کی تعمیل کی۔ ان حکمرانوں نے بھی یونہی بغاوت نہیں کردی تھی۔ باغیوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ تھی۔

ان امیروں نے حق نمک ادا کیا اور باغیوں کو شکست فاش دی۔ ان کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان دونوں کو گرفتار کرکے رن تھنبور علاؤالدین کے پاس بھیج دیا۔

رن تھنبور کے قلعے کے نیچے عمرو اور منکو کو سزا دی گئی۔ پہلے آنکھیں نکال لی گئیں اور پھر اذیتیں دے دے کر دونوں کو قتل کردیا گیا۔

ابھی یہ فساد کم نہیں ہوا تھا کہ دہلی سے وحشت ناک

خبریں آنے لگیں۔ وہاں حاجی مولی نامی ایک شخص نے ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ حاجی مولی سلطان جلال الدین خلجی کے زمانے میں دہلی کا داروغہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ علاؤالدین ایک مدت سے رن تھنبور کے محاصرے میں مصروف ہے۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

کوتوال شہر علاء الملک کو بادشاہ اپنے ساتھ رن تھنبور لے گیا تھا۔ اس کی نیابت بایزید نامی ایک شخص کررہا تھا جس سے اہل دہلی خوش نہیں تھے۔

حاجی مولی نے پورا منصوبہ تیار کیا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ دوپہر کی گرمی اپنے عروج پر تھی۔ چہل پہل بہت کم تھی۔ سخت گرمی اور لو سے بچنے کے لیے لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کررہے تھے۔ حاجی مولی اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ بایزید کوتوال کے گھر گیا۔ اس کے ساتھی کسی جگہ چھپے رہے۔

حاجی مولی نے کہلوایا کہ بادشاہ کا ایک پیغام آیا ہے وہ آکر سن لے۔ بایزید یہ سنتے ہی گھر سے باہر آیا، حاجی مولی نے اسے دیکھتے ہی اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ ان لوگوں نے فوراً بایزید پر حملہ کیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس سے پہلے کہ شورش بڑھتی، حاجی مولی نے مشہور کردیا کہ بایزید کو شاہی حکم کے مطابق قتل کیا گیا ہے۔ دہلی کے تمام دروازوں کے دربانوں کو حکم دیا کہ شہر کے دروازے بند کردیے جائیں۔

اس کے بعد حاجی مولی کوشک لعل میں گیا۔ اس نے تمام قیدیوں کو رہا کردیا۔ یہ قیدی بھی ان کے ساتھ ہوگئے۔ اسلحہ، گھوڑے اور خزانہ وغیرہ بھی اس کے ساتھ لگ گیا۔

حاجی مولی نے علوی نامی ایک شخص کو جبراً کوشک لعل میں شاہی تخت پر بٹھا دیا۔ یہ شخص سلطان التمش کی اولاد میں سے تھا۔

ہوتا یہی تھا کہ جس کے ہاتھ میں طاقت اس کے ہاتھ میں سب کچھ۔ تمام امرا و روسا نے بیعت کرلی۔

رن تھنبور میں علاؤالدین کو یہ خبریں پہنچیں تو اس نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لشکر میں کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ امرا تک کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ بس اتنا کیا کہ ایک قاصد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں دہلی روانہ کیا اور ان سے دعا کی درخواست کی اور لکھا کہ میں یہاں تاج و تخت سے دور اسلام کی سربلندی کے لیے دیار غیر میں ہوں۔ ہر قسم کی صعوبتیں جھیل رہا ہوں اور وہاں میری بادشاہت پر غیروں کی نظر ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے جواب میں صرف یہ کہلوا بھیجا کہ اللہ سے فتوحات کی امید رکھو۔

اس حوصلہ افزا جواب نے علاؤالدین کو دہلی کی طرف سے مطمئن کردیا اور اس نے یکسو ہوکر رن تھنبور کی فتح کے لیے کوشش مزید تیز کردیں۔

بزرگوں کی دعا میں اثر ہوتا ہے۔

حاجی مولی نے کوتوال دہلی کو قتل کرکے علوی کو تخت نشین کردیا تھا اور شہر کے دروازے بند کرادیے تھے کہ کوئی اندر سے باہر نہ جاسکے۔ ملک حمید الدین کو کا بدایوں دروازہ کھول کر شہر کے باہر نکل گیا۔ اس کے بہادر بیٹے بھی اس کے ہمراہ تھے۔ اس نے اردگرد کے علاقوں سے لشکر جمع کیا اور غزنی دروازے سے شہر میں داخل ہوگیا۔ وہ آگے بڑھ کر تہنہ دروازے تک پہنچا تھا کہ حاجی مولی اور اس کے ساتھیوں سے آمنا سامنا ہوگیا۔ دونوں طرف سے تلواریں نکل آئیں۔ لڑائی کا بازار گرم ہوگیا۔ ملک حمید الدین اپنے گھوڑے سے اترا اور اچک کر گھوڑے پر بیٹھے حاجی مولی کو گرفت میں لے لیا اور گھوڑے سے اتار کر زمین پر گرا دیا اور سینے پر چڑھ بیٹھا۔ حاجی مولی کے ساتھی اس کی طرف دوڑے اور اسے چھڑانے کے لیے ملک حمید الدین پر حملہ کیا۔ کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح حاجی مولی کو چھڑالیں۔ ملک حمید الدین اس کے سینے پر بیٹھے بیٹھے اس کے ساتھیوں سے مقابلہ کرتا رہا اور موقع دیکھ کر حاجی مولی کا سر کاٹ لیا۔ اس کے مرتے ہی اس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ملک حمید الدین کوشک لعل میں آیا اور اس کا سر ایک نیزے پر لٹکا کر سارے شہر کے گلی کوچوں میں پھرایا۔

حمید الدین نے علوی کا سر علاؤالدین کی خدمت میں رن تھنبور روانہ کردیا۔

علاؤالدین کو پہلے پریشانی نہیں تھی لیکن اب وہ ضرور پریشان تھا کہ دہلی کا نظم و نسق کون سنبھالے گا۔ رن تھنبور فتح نہیں ہوا تھا اور دہلی ہاتھ سے نکلی جارہی تھی، کیا میں اس ویرانے تک محدود ہوکر رہ جاؤں گا؟ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ رن تھنبور کا محاصرہ اٹھا کر چل دیتا لیکن اس کا بھائی الماس بیگ جسے اس نے الغ خاں کا خطاب دیا تھا۔ اس کے سامنے آگیا۔

"جب آپ بہ نفس نفیس یہاں موجود ہیں تو میرا یہاں رہنا فضول ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں دہلی جاکر وہاں کا نظم و نسق سنبھال لوں؟"

علاؤالدین کو یہ مشورہ پسند آیا لیکن اس کے مخبروں نے بروقت اسے ٹوکا۔

"بغاوتوں کے اس موسم میں آپ کو الماس بیگ کو دہلی روانہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔"

"کیا تم میرے بھائی پر بھی شبہ کرو گے؟"

"حضور، اس سے پہلے آپ کے دو بھانجے بغاوت کر چکے ہیں۔"

"ہمارے رعب شاہی نے کتنی جلدی ان کے سر ان کے جسموں سے الگ کرا دیے۔"

"حضور، گستاخی معاف! ان میں اور الماس بیگ میں بہت فرق ہے۔ الماس ایک تجربہ کار اور بہادر امیر ہے۔ اس کے پاس اپنی فوج ہے۔ وہ چاہے تو نئے فوجی بھی بھرتی کر سکتا ہے۔ ہم شبہ نہیں کرتے اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی ثبوت ہے لیکن اگر اس نے آپ کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا تو کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوگا۔"

علاؤالدین نے دکھاوے کے طور پر مخبروں کو ڈانٹ دیا لیکن اس کے دل میں بال آ گیا۔ اس نے یہ کہہ کر الماس بیگ کو اپنے پاس ہی روک لیا کہ بادشاہ کو اس کی ضرورت ہے۔

اب اسے جلد سے جلد رن تھنبور کا قلعہ تسخیر کر کے دہلی واپس لوٹنا تھا۔ ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا کہ اس ویرانے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے الماس بیگ کو حکم دیا کہ قریب کے علاقوں میں جا کر خوب لوٹ مار مچاؤ تاکہ یہاں کے لوگ راجپوت راجا کے خلاف ہو جائیں اور راجا پر دباؤ ڈالیں کہ وہ ہم سے صلح کرنے پر مجبور ہو جائے۔

"الماس بیگ، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یا تو اس قلعے کو تسخیر کروں گا یا راجا کو سر جھکا کر صلح کرنے پر مجبور کر دوں گا۔"

"آپ فرمائیں تو میں لشکر کو لے کر پہاڑ پر چڑھ جاؤں؟"

"مجھے یہ کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر چکا ہوتا لیکن اس طرح ہمارے لاتعداد سپاہی مارے جائیں گے۔ میں اپنے سپاہیوں کی جانیں یوں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔"

"پھر کیا تدبیر سوچی؟"

"میں نے ایک درے کا انتخاب کر لیا ہے۔ تمام فوجیوں سے کہو اس میں ریت کے بورے ڈالتے جائیں اور پھر ان ریت کے بوروں کے ذریعے اوپر جایا جائے۔ تم ایسا کرو کہ قریب کی بستیوں میں جا کر جتنی لوٹ مار مچا سکتے ہو مچاؤ۔"

الماس بیگ تھوڑے سے سپاہی لے کر نکل کھڑا ہوا اور باقی سپاہیوں نے بورے بھر بھر کے خندقوں میں ڈالنا شروع کر دیے۔

اس کی خبریں رانا ہمیر تک پہنچیں تو وہ خود فصیل کے اس حصے پر پہنچا جہاں ریت کے بورے ڈالے جا رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان جس تندہی سے کام کر رہے ہیں اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فصیل پر چڑھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس نے اپنے سپاہیوں کو آگ کے گولے اور تیر برسانے کا حکم دیا لیکن مسلمان ایسی جگہ تھے جہاں یہ حربے بہت کم کامیاب ہو رہے تھے۔

قلعے کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ الماس بیگ کے دھاوے بھی کامیاب ہو رہے تھے۔ راجپوت بستیوں میں خوب لوٹ مار ہو رہی تھی۔ رائے عامہ تیزی سے راجا کے خلاف ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ پھر راجا کے امیروں نے اسے مجبور کیا کہ وہ صلح کے لیے قاصد روانہ کرے۔ راجا نے یہ مشورہ حقارت سے ٹھکرا دیا۔

ایک رات راجا کے تین قابلِ ذکر امیر کسی نہ کسی طرح قلعے سے نکلے اور اس جگہ پہنچے جہاں خندق کو پاٹا جا رہا تھا۔ سلطان خود اس کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ راجا کے تین امیر غالباً شرائط صلح طے کرنے لشکر میں آئے ہیں۔ سلطان کو تعجب ضرور ہوا کہ راجا صلح پر کیسے تیار ہو گیا جبکہ اس کا ایک بھی آدمی گھائل تک نہیں ہوا ہے۔ اس کے پاس اناج کے ذخیرے بھی اتنے ہیں کہ وہ جھکنے پر تیار نہیں ہوگا۔ پہاڑوں کے درمیان ایسے راستے ہیں جہاں سے رسد فراہم ہو رہی ہے۔ ان خیالات کے باوجود وہ اپنے خیمے میں آ گیا تاکہ ان تینوں سے مل سکے۔

سلطان نے ان تینوں سے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا جو وہ سوچتا رہا تھا۔ اس کے جواب میں جو کچھ معلوم ہوا، اس سے حقیقت کھل گئی۔

"اب اگر صلح ہوگی تو میری شرائط پر ہوگی۔" سلطان نے ان پر واضح کیا۔

"سلطان! ہم یہ صلح راجا کے لیے نہیں اپنے لیے کرنے آئے ہیں۔"

"اپنے لیے؟"

"ہاں اپنے لیے۔ راجا کو ہر طرح سمجھا کر دیکھ لیا۔ اب صلح کے لیے آپ کی طرف ہم ہاتھ بڑھاتے ہیں۔"

"تم سے صلح کا مجھے کیا فائدہ ہوگا اور تم مجھ سے کن شرائط پر صلح کرو گے؟"

"ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو قلعے پر قابض کروا دیں گے۔"

"میرے ساتھ یہ ہمدردی کیوں؟"

"رانا ہمیر کے خاتمے کے بعد یہاں کی حکومت ہمیں ملنی چاہیے۔ ہم آپ کو خراج ادا کرتے رہیں گے۔"

"کیا ایک مملکت کے تین راجا ہوں گے؟"

"یہ ہمارا کام ہے کہ ہم تینوں میں سے کون راجا ہوتا ہے۔ آپ صرف قلعے پر قبضہ کریں اور اپنی فوج کو حکم دیں کہ ہمیں اور ہمارے اہل وعیال کو قتل نہ کیا جائے۔"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ ہمارے لشکر کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ تم ہو اور یہ تمہارے اہل وعیال؟"

"سلطان آپ بھی بس تلوار کے دھنی ہیں، چالوں کے بادشاہ نہیں۔ ہم نے اپنے اہل وعیال کو پہلے ہی یہاں سے نکال دیا ہے، ہم تو آپ سے یہ وعدہ اس لیے لے رہے ہیں کہ اگر معاہدے کے بعد بھی آپ نے ہمیں قتل کیا تو ہمارے اہل وعیال کو بھی ڈھونڈ ہی لیں گے۔ ان کی جاں بخشی کا مطلب ہماری جاں بخشی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہارے اہل وعیال کو قتل نہیں کراؤں گا۔"

"تو پھر ہم فصیل کے اس حصے سے فوج ہٹا لیں کے جہاں سے اوپر آنے کی آپ لوگ کوشش کر رہے ہیں۔"

"یہ کام کب تک ہوگا؟"

"یہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن یہ کام جب بھی ہوگا ہم قلعے سے نکل کر آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

سلطان نے ان سے معاہدہ کر لیا اور انہیں پابند کیا کہ وہ قلعے کے اندر داخلے میں مسلمانوں کی مدد کریں گے۔

قلعے کے اندر راجا پر دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کے امیر بضد تھے کہ جن مسلمانوں کو راجا نے پناہ دے رکھی ہے انہیں سلطان علاؤالدین کے حوالے کر دے اور ایک بڑی جنگ سے بچ جائے۔ مسلمان کسی وقت بھی اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ راجا اب بھی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

اسی وقت سلطان کا ایک امیر میر محمد شاہ جو راجا کی پناہ لیے ہوئے تھا، راجا کے سامنے آیا۔

"آپ اپنے آدمیوں کا کہنا مان لیں اور میرا سر کاٹ کر سلطان کے پاس بھیج دیں۔ سلطان واپس چلا جائے گا۔"

راجا نے ناراض ہو کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"میں پرتھوی راج کا پوتا ہوں۔ جو میری پناہ میں ہے اس کا سر کاٹوں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا، تیرا سر میرے بعد کٹے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔"

راجا نے ایک مرتبہ پھر اپنے امیروں کا مطالبہ ٹھکرا دیا۔

وہ تینوں امیر جو سلطان علاؤالدین سے مل کر آئے تھے یہ سوچ رہے تھے کہ رانا کی فوج کو درے کے پاس سے کیسے ہٹایا جائے۔

اس نے راجا سے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمان دکھاوے کے لیے درے کو پاٹ رہے ہیں تاکہ آپ کی ساری توجہ اسی طرف رہے ورنہ وہ تو فصیل کے دوسرے حصوں کی تلاش میں ہیں جہاں سے وہ اوپر چڑھ سکیں۔

بہرحال یہ سنتے ہی راجا سہم گیا۔ اس نے بہت معمولی سی فوج چھوڑ کر باقی فصیل کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلا دی۔ اسی روز یہ ہوا کہ غلے کے گودام میں آگ لگ گئی۔ ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ اسی بھگدڑ کا فائدہ اٹھا کر وہ تینوں امیر قلعے سے نکل کر سلطانی کیمپ میں پہنچ گئے۔

قلعے میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی کہ علائی فوجی فصیل پر چڑھ گئے اور اندر جا کر دروازہ کھول دیا۔

میر محمد شاہ راجا کے پاس آیا۔ "اب وقت آ گیا ہے کہ میں آپ کے احسانات کا حق ادا کروں۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر سلطان کی فوج سے مقابلہ کروں اور لڑتے لڑتے اپنی جان دے دوں۔" اب رانا ہمیر دیو کے پاس بھی اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا تھا کہ اپنی بچی کھچی طاقت سلطان کے مقابلے میں جھونک دے۔

سلطانی فوجوں نے قلعے میں گھستے ہی قتل عام شروع کر دیا تھا۔ رانا کے سپاہی بے دلی سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک سال اور بعض مورخین کے نزدیک تین سال بعد علاؤالدین کی فوجوں کو یہ موقع ملا تھا کہ وہ قلعے کے اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قلعے کے اندر لاشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رانا ہمیر دیو بھی مع اہل وعیال قتل ہو چکا تھا۔

الماس بیگ کو میر محمد شاہ کی تلاش تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے اسی قلعے میں پناہ لی ہوئی تھی۔ وہ یا تو قتل ہوا ہوگا یا کہیں زخمی پڑا ہوگا۔ وہ لاشوں کو دیکھتا پھر رہا تھا کہ اس کی نظر محمد شاہ پر پڑ گئی۔ وہ زخمی تھا اور لاشوں کے درمیان ایک جگہ پڑا ہوا تھا۔ الماس بیگ نے فوراً علاؤالدین کو خبر کی۔ محمد شاہ کو اٹھا کر علاؤالدین کے روبرو پیش کیا گیا۔

علاؤالدین نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "محمد شاہ! اگر ہم علاج کروا کے تمہیں موت کے منہ سے بچا لیں تو صحت یاب ہو کر تم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

محمد شاہ نے جواب دیا۔ "اگر میں ان زخموں سے نجات پا لوں تو سب سے پہلے تجھے قتل کروں گا۔"

یہ جواب ہی ایسا تھا کہ علاؤ الدین طیش میں آ گیا۔ اس نے ٹیل بان کو حکم دیا۔ ٹیل بان ہاتھی نے کر آگے بڑھا اور میر محمد کو ہاتھی کے پاؤں نے کچل کر رکھ دیا۔

اس کے بعد علاؤ الدین نے راجا ہمیر دیو کے ان تین امیروں کو طلب کیا جن سے معاہدہ ہوا تھا۔ وہ تینوں خوشی خوشی حاضر ہوئے کہ اب حکومت انہیں دی جائے گی۔

علاؤ الدین نے ان تینوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ ''جب ان لوگوں نے اپنے آقا کے ساتھ بے وفائی کی تو ہمارے ساتھ کس طرح وفا کریں گے۔''

اس قلعے میں بے اندازہ دولت تھی۔ علاؤ الدین نے یہ دولت اور اس علاقے کی حکومت اپنے بھائی الماس بیگ کے سپرد کی اور خود دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

اس واقعے کے چھ مہینے بعد الماس بیگ (الغ خاں) اچانک بیمار پڑ گیا۔ اسی بیماری کے عالم میں وہ دہلی کی طرف چلا لیکن راستے ہی میں موت نے اس کی زندگی کا پیمانہ لبریز کر دیا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ الماس بیگ کو زہر دیا گیا تھا۔ علاؤ الدین اپنے خلاف ہونے والی بغاوتوں سے اتنا ڈر گیا تھا کہ اسے کسی پر بھی بھروسا نہیں رہا تھا۔ الماس بیگ کی طرف سے بھی وہ خائف رہتا تھا۔

الماس بیگ کو اس کے مکان میں دفن کیا گیا اور سپاہیوں کو حفاظ بٹھا دیے گئے۔

PaPaPa

رن تھنبور کے طویل ترین معرکے سے گزرنے کے بعد علاؤ الدین کو کسی بھیانک خواب کی طرح وہ بغاوتیں یاد آئیں جو اس کی غیر موجودگی میں ہوئی تھیں۔ وہ اپنے مشیروں سے مشورہ کرتا رہتا تھا کہ وہ کون سی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن پر عمل کر کے بغاوتوں کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔

اس کے مخلص مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ ہنگامہ خیزی اور بغاوت کا سبب عام طور پر چار چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ اگر آپ ان پر قابو پا لیں تو ہر طرف امن و امان ہو جائے گا۔

بادشاہ کا رعایا سے بالکل بے خبر ہو جانا۔

ملک میں شراب نوشی کا عام رواج ہونا۔

امرا و ارکین سلطنت کا آپس میں گہرے مراسم رکھنا۔

جب امرا آپس میں شیر و شکر ہوتے ہیں تو جرائم میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔

مال و دولت کی فراوانی۔ جب کم ظرفوں اور کمینوں کو ان کی حیثیت سے زیادہ مل جاتا ہے تو وہ اپنی حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور ہر چیز پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔

علاؤ الدین نے ان تدابیر کو بہ غور سنا اور ان پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چاروں طرف معتبر جاسوسوں کا جال پھیلا دیا۔ خفیہ خبر رسانی کا محکمہ قائم کیا۔ اس محکمے نے اتنی ترقی کی کہ لوگ اپنے گھروں میں جو باتیں کرتے ان کی اطلاع بھی سلطان کو ہو جایا کرتی تھی۔ امرا اتنا ڈر گئے کہ گھروں میں بھی زور سے باتیں کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ جب عالم یہ ہو تو بادشاہ کے خلاف سازشیں کرنے کی ہمت کس میں تھی۔ ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔

شراب نوشی کی ممانعت پر بادشاہ نے پہلے خود عمل کیا اور کھلے بندوں شراب پینی بند کر دی۔ بادہ نوشی کی محفلیں جو بادشاہ کی جانب سے منعقد ہوتی تھیں، ان کا خاتمہ ہو گیا۔ شراب پینے کے لیے جو ظروف استعمال کیے جاتے تھے۔ انہیں گلا کر سونے کے سکے ڈھال لیے گئے۔ شہر میں عام اعلان کر دیا گیا کہ بادشاہ نے شراب سے توبہ کر لی ہے۔ لہٰذا جو شخص شراب بیچے گا یا پیے گا، اسے سزا دی جائے گی۔

اس حکم شاہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے سڑکوں اور شاہراہوں پر شراب کے مٹکے بہا دیے۔ کہا جاتا ہے کہ اتنی شراب بہائی گئی کہ برسات کے موسم کی طرح ہر طرف کیچڑ ہو گئی۔

بادشاہ کو پھر بھی اطلاع ملی کہ بعض لوگ اب بھی گھروں میں بیٹھ کر ساغر و مینا سے اٹھکیلیاں کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو سزا سے دوچار کرنے کے لیے بدایوں دروازے کے پاس ایک کنواں کھودا گیا۔ ان بدمست و سرشار بادہ نوشوں کو اس کنویں میں قید کر دیا جاتا۔ ان میں سے بعض تو اس اسیری ہی میں اللہ کو پیارے ہو جاتے۔ جو رہا ہوتے ان کی حالت ایسی ہوتی کہ برسوں علاج معالجے میں گزر جاتے۔ ان کی حالت دیکھ کر دوسروں کو ایسا خوف ہوا کہ شراب کی لعنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

تیسرے مشورے پر اس طرح عمل کیا گیا کہ امرا اور درباریوں کو بادشاہ کے حکم کے بغیر رشتے ناتے کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ پابندی بھی لگا دی گئی کہ امرا آپس میں ایک دوسرے کی دعوت نہیں کریں گے۔ مصلحت یہی تھی کہ نہ یہ آپس میں ملیں گے، نہ کوئی سازش تیار ہو گی۔ خوف اتنا طاری ہو گیا تھا کہ اگر اتفاق سے کسی امیر کے گھر کوئی مہمان آ جاتا تو وہ بارگاہ شاہی میں تمام حالات لکھ کر بھیجتا اور خوشامد اور چاپلوسی سے اپنا قصور معاف کراتا۔

چوتھا مشورہ بادشاہ کو یہ دیا گیا تھا کہ عام لوگوں سے دولت واپس لے لی جائے۔ اس مشورے پر اس طرح عمل کیا گیا کہ وہ تمام قصبات جو معافی یا کسی اور وجہ سے رعایا کے قبضے میں تھے وہ شاہی تحویل میں لے لیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنے مسائل میں گرفتار ہو گئے۔ غربت کی دھوپ میں انہیں اتنی فرصت ہی نہ رہی کہ وہ فتنوں اور ہنگاموں کی طرف توجہ کرتے۔

PaPaPa

سلطان علاؤ الدین خلجی کے خیالات ہمیشہ سے یہ تھے کہ بادشاہت کے نظام کا صرف بادشاہ کی رائے اور اس کی مصلحتوں سے تعلق ہوتا ہے، ان سیاسی کاموں سے شریعت کا کوئی واسطہ نہیں۔ اسی لیے وہ علما کو زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتا تھا اور شرعی احکام کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس کے ان خیالات سے سب ہی واقف تھے مگر اس سے واقف نہیں تھے کہ اس میں کچھ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ اس نے شاہی گماشتوں کے مراسلے پڑھنے کے لیے کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا جس سے اس کے خیالات میں کچھ تبدیلی آنے لگی تھی۔

قاضی مغیث الدین بیانوی کو بادشاہ کی پوری قربت حاصل تھی لیکن ان سے بھی وہ کبھی دینی مسائل پر گفتگو نہیں کرتا تھا۔ ایک روز بادشاہ نے قاضی صاحب سے کہا۔ ''میں تم سے چند مسائل کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔''

قاضی صاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ ''حضور، کیا میری موت قریب ہے۔ اگر ایسا ہے تو مسائل پوچھنے کی زحمت کیوں کرتے ہیں۔ حکم فرمائیں ابھی میرا سر قلم ہوا جاتا ہے۔''

''بات تو دینی مسائل کی ہے۔ آپ اتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟''

''خوف کی یہی تو وجہ ہے۔ حضور مجھ سے جو کچھ بھی دریافت فرمائیں گے میں اس کا صحیح صحیح جواب دوں گا۔ یہ جواب اگر حضور کی مرضی کے خلاف ہوا تو میری موت یقینی ہے۔ اگر آپ کی خوشنودی کے لیے غلط جواب دیتا ہوں اور آپ نے دوسرے علما سے تصدیق فرمائی تو میں جھوٹا قرار پاؤں گا۔ اس صورت میں بھی میری موت یقینی ہے۔''

بادشاہ یہ سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور قاضی سے کہا۔ ''اطمینان رکھو کہ سچ بولنے کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا۔''

''حضور فرمائیں۔ میں سچ بولنے کی پوری کوشش کروں گا کیونکہ سوالات کے جوابات نہ دینے کی صورت میں بھی موت ہی میرا مقدر ہو گی۔''

بادشاہ نے پہلا سوال کیا۔ ''اسلامی شریعت کی رو سے

ذہانت

سکھ سلطنت کے مشہور مہاراجا رنجیت سنگھ کے بچپن ہی میں ان کی ایک آنکھ چیچک سے ضائع ہو گئی تھی۔ ایک دن مہاراجا نے شاہی مصور کو اپنی حسین و جمیل تصویر بنانے کے لیے کہا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا ''اگر تصویر پسند نہ آئی تو مصور کو قتل کر دیا جائے گا۔''

مصور نے ہر زاویے سے تصویر بنا کر دیکھی لیکن کانے پن کے باعث خوبصورت نہ بن سکی۔

مصور نے آخرکار ایک تصویر مہاراجا کو پیش کی جو رنجیت سنگھ کو اتنی پسند آئی کہ اس نے مصور کو مالا مال کر دیا۔ تصویر میں مہاراجا رنجیت سنگھ تیر کمان سے ایک آنکھ بند کر کے ہرن کا نشانہ لے رہے تھے۔ اس طرح آنکھ بند کرنے سے مہاراجا کی کانی آنکھ کا نقص بھی چھپ گیا اور مصور کی ذہانت نے اس کی جان بھی بچا لی اور وہ انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

مرسلہ: اسریٰ بنت متین، ٹیکساس، یو ایس اے

کس ہندو کو ذمی اور خراج گزار کہا جا سکتا ہے؟''

قاضی مغیث نے جواب دیا۔ ''علمائے مذہب اسلام نے غیر مسلموں کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ یا تو وہ مذہب اسلام قبول کر لیں یا قتل کر دیے جائیں لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ نے غیر مسلموں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے اور اس کی جگہ جزیہ وصول کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے غیر مسلموں سے سخت گیری سے جزیہ وصول کرنا چاہیے تاکہ یہ سخت گیری قتل کے قائم مقام ہو سکے۔''

بادشاہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''بے شک تم نے شریعت کی بات کی لیکن میں نے از خود جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ یہی ہے۔''

بادشاہ نے دوسرا سوال کیا۔ ''بادشاہی اہل کار اگر رشوت لیتے ہیں تو کیا اسے چوری سے تعبیر کیا جائے اور ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جائے جو چوروں کے ساتھ ہوتا ہے یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا؟''

قاضی مغیث نے جواب دیا۔ ”چوروں کے لیے جو ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے وہ ان لوگوں پر لاگو نہیں ہوتی البتہ بڑی سختی سے ان لوگوں سے یہ رقم واپس لے لینی چاہیے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”میں بھی اسی قانون پر کاربند ہوں۔“

بادشاہ نے اگلا سوال کیا۔ ”لشکر کی مدد سے جو دولت میں حاصل کرتا ہوں اس پر میرا حق ہے یا رعایا کا۔ وہ میری ملکیت ہے یا بیت المال کی؟“

قاضی مغیث نے جواب دیا۔ ”اس تمام مال و دولت میں آپ کا حق اتنا ہی ہے جتنا ان لوگوں کا، جنہوں نے یہ سب کچھ حاصل کرنے میں آپ کی مدد کی۔“

بادشاہ بھڑک اٹھا۔ ”کیا میں اور میرے لشکر کا عام سپاہی برابر ہے؟“

”برابر نہیں لیکن یہ دولت آپ نے ذاتی محنت سے حاصل نہیں کی ہے۔ لوگوں نے آپ کی مدد کی ہے، صرف اس میں کسی کا حصہ نہیں ہوگا جو آپ نے ذاتی کوشش اور محنت سے حاصل کی ہو۔“

ابھی اس جواب کی تلخی کم نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہ نے اس سے ملتا جلتا ایک اور سوال کر دیا۔

”لشکر اسلام کی مدد سے جو دولت حاصل کی جائے اس میں میرا اور میری اولاد کا کتنا حصہ بنتا ہے؟“

قاضی کو یقین آ گیا کہ اب تک تو خیر گزری لیکن اس سوال کے جواب میں یقیناً بادشاہ کی آتش غضب بھڑک اٹھے گی۔ اس نے جواب دینے میں تامل کیا اور پھر عرض کیا۔

”آپ کو میرا پہلا جواب بھی پسند نہیں آیا تھا اور یہ جواب تو کچھ زیادہ ہی ناپسندیدہ ہوگا۔ کیا میں اب بھی خود کو محفوظ سمجھوں؟“

”میری بات کا جواب دو۔ اپنی جان کو بالکل محفوظ سمجھو۔“

”اس طرح کی دولت سے بادشاہ کو اسی قدر حصہ لینا چاہیے جتنا کہ ایک عام مسلمان کو زیادہ سے زیادہ ان امیروں کے برابر جنہیں زیادہ حصہ ملتا ہو۔“

”اور میری اولاد کو؟“

”بادشاہ کی اولاد کا حق امرا اور مسلمانوں کے برابر ہونا چاہیے۔“

”قاضی صاحب!“ بادشاہ کا غصہ اس کی آواز میں اتر آیا تھا۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں بادشاہت کا رعب قائم رکھنے کے لیے جو کچھ خرچ کرتا ہوں، تم اسے ناجائز اور حرام سمجھتے ہو۔“

”حضور نے مجھ سے شرعی جواب مانگا تھا۔ میں نے از روئے شرع جو صحیح تھا، کہہ دیا۔“

”اچھا یہ بتاؤ، میرا طریقہ یہ ہے کہ جو لشکری جنگ کے وقت حاضر نہیں ہوتا۔ میں اس سے تین سال کا معاوضہ واپس لے لیتا ہوں۔ مفسدوں اور سرکشوں کو ان کے بیوی بچوں سمیت موت کے گھاٹ اتار دیتا ہوں۔ ان کی دولت شاہی خزانے میں جمع کر لیتا ہوں۔ میرا خیال ہے تم ان سب باتوں کو بھی شرع کے خلاف کہو گے۔“

قاضی مغیث کے سامنے اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ ایک کونے میں جا کر سجدے میں گر پڑے۔ سجدے میں گرے گرے انہوں نے جواب دیا۔ ”یہ سب باتیں شریعت کے خلاف ہیں۔“

بادشاہ نے اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا اور حرم سرا کی طرف چلا گیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ناخوش ہو کر گیا ہے۔ قاضی مغیث نے بھی سجدے سے سر اٹھایا اور گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ گھر پہنچ کر اہل و عیال کے سامنے پورے واقعات دہرائے اور اپنے قتل کے شاہی فرمان کا انتظار کرنے لگے۔

وہ رات ان کے گھر میں سجدے اور دعاؤں میں گزر گئی۔ دوسرے دن دربار میں ان کی طلبی ہوئی۔ انہیں اب بھی بادشاہ کی جانب سے بدگمانی تھی کہ وہ ضرور ان کے قتل کے احکام صادر کرے گا لیکن دربار نہ جائیں، یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا، مجبوراً غسل کیا نیا لباس زیب تن کیا اور دربار پہنچ گئے۔

بادشاہ ان کی توقع کے خلاف نہایت لطف و مروت سے ملا۔ ایک جامہ زردوزی اور ایک ہزار تنکہ انعام مرحمت کیا اور قاضی صاحب سے فرمایا۔

”اگرچہ میں علم شرعی سے بالکل ناواقف ہوں لیکن مسلمان ہوں اور سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ فرمایا بالکل صحیح ہے لیکن ہندوستان کی مہمات صرف شرعی مسائل پر عمل کر کے حل نہیں ہو سکتیں۔ یہاں کے لوگوں کو سیدھے راستے پر لانے کے لیے خود ساختہ قوانین کی ضرورت ہے۔ اگر میں چند کو قتل کرتا ہوں تو محض اس لیے کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ میرا مقصد امن و امان قائم کرنا ہے۔ میری نیت صاف ہے اس لیے امید ہے اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف فرمائے گا۔“

☆☆☆

سلطان علاؤ الدین نے ایک لشکر تلنگانہ کے مشہور علاقے ورنگل کو فتح کرنے کے لیے روانہ کیا اور خود ایک فوج لے کر قلعہ چتوڑ کی طرف بڑھا جو اس وقت تک کسی مسلمان

سے فتح نہ ہو سکا تھا۔

اسے اس مہم پر گئے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ مغل قسمت آزما ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کب وہ کسی طویل مہم پر جائے اور وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ ماوراء النہر کے مغلوں کو جونہی معلوم ہوا کہ علاؤ الدین چتوڑ کی مہم پر نکلا ہوا ہے اور واپسی میں طویل عرصہ درکار ہوگا، طرغی نامی مغل سردار ایک لاکھ جنگجوؤں کا لشکر لے کر ہندوستان کو لوٹنے کے ارادے سے نکلا۔

علاؤ الدین کو معلوم ہوا تو اس نے نہایت برق رفتاری سے سفر طے کیا اور دریائے جمنا کے کنارے مقیم ہوا۔ مغلوں کا لشکر ابھی دہلی نہیں پہنچا تھا۔

علاؤ الدین کی فوج کا بہترین حصہ دکن گیا ہوا تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ مغل کتنا بڑا لشکر لے کر آ رہے ہیں لہٰذا فی الحال اسے مغلوں کا مقابلہ کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ دہلی سے ایک مقام ”سیری“ چلا گیا کیونکہ یہاں جنگل تھا۔ یہاں پہنچ کر اپنے لشکر کے گرد خندقیں کھود لیں اور خاردار جھاڑیاں ڈال دیں۔ اسے اپنے امرا کا انتظار تھا، اس سے پہلے وہ مغلوں سے لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

مغلوں کا لشکر میدانوں کی دھول اڑاتا پہنچا اور دہلی کے نواحی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مغلوں کا لشکر راستوں کو گھیرے کھڑا تھا۔ جن امرا کو علاؤ الدین تک پہنچنا تھا ان کے لیے اب مشکل ہو گیا تھا کہ اس کی مدد کو پہنچیں۔ علاؤ الدین خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ خندقوں سے نکلے۔ وہ محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ بیرونی امداد کی توقع نہیں تھی۔

یہ خبریں برابر مل رہی تھیں کہ مغل اردگرد کے علاقوں میں لوٹ مار کر رہے ہیں۔ ان کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ خاص دہلی پر بھی چھاپا مارا اور غلہ وغیرہ اٹھا کر لے گئے۔ یہاں جو شاہی فوج تھی اس پر بھی حملہ کیا اور بہت سوں کو ہلاک و زخمی کر کے چلے گئے۔

علاؤ الدین سخت پریشان اور اپنے انجام کی طرف سے فکرمند تھا۔ کچھ دیر کے لیے آنکھ لگی تھی کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ کسی خانقاہ میں گیا ہے جہاں کئی بزرگ بیٹھے ہیں۔ وہ اپنا حال ان سے بیان کرتا ہے اور مدد کی درخواست کرتا ہے۔ وہ بزرگ اس سے کہتے ہیں ”تو اتنی دور چلا آیا۔ دہلی کیوں نہیں گیا۔ جا وہاں جا۔ تیرا حصہ تو وہاں ہے۔ اپنا حصہ لیتا کیوں نہیں۔“ اس کی آنکھ کھلی تو اس خواب پر غور کرنے لگا۔ پہلے تو اس خواب کی تعبیر یہ سمجھ میں آئی کہ اس سے کہا جا رہا ہے، دہلی جا کر مغلوں کا مقابلہ کرے لیکن جب اس نے اپنے لشکر پر غور کیا تو اس کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اس خواب کی تعبیر کچھ اور ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنے چند مقربین کو بلایا اور یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ ہر ایک نے مختلف رائے پیش کی۔ ایک صاحب نظریات کی تہ تک پہنچ گیا۔

”حضور عالم خواب میں جنگ کے لیے نہیں نکلے ہیں بلکہ کسی خانقاہ میں دعا کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ دہلی یعنی دہلی کی کسی خانقاہ میں جاؤ۔ تمہارا حصہ یعنی تمہاری کامیابی وہاں ہے۔ دہلی میں تو بہت سی خانقاہیں ہیں۔ اب یہ حضور کی مرضی مبارک کہ کس خانقاہ کا انتخاب فرماتے ہیں۔“

”دہلی میں سب سے بڑی سرکار تو حضرت نظام الدین اولیا کی ہے۔ مجھے گمان ہے کہ وہ میرے بارے میں اچھا گمان رکھتے ہیں۔“

”تو پھر خواب میں انہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔“

”وہ پہلے بھی ایک مقام پر میری مدد کر چکے ہیں۔“

”تو پھر انہی سے رجوع فرمائیے۔“

”عجیب بات ہے کہ دہلی میں رہتے ہوئے وہ کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئے۔“

”بزرگان دین، بادشاہوں سے میل جول نہیں رکھتے۔“

”مجھے بھی کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ ان سے ملاقات کو جاتا۔ اس وقت بھی میرا جانا امر محال ہے۔“

”انہیں آپ کی مجبوریوں کا علم ہوگا۔ کسی کو بھیج کر دعا کی درخواست کیجیے۔“

”قاضی مغیث بھی یہاں نہیں ہیں ورنہ انہیں بھیجتا۔“

”کسی شخص کو قاضی مغیث کے پاس بھیج دیجیے وہ آپ کی جانب سے حضرت نظام الدینؒ سے ملاقات کر لیں گے۔“

علاؤ الدین نے ایک التجا آمیز رقعہ لکھ کر ایک ملازم کے حوالے کیا کہ وہ دہلی جا کر اس رقعہ کو قاضی مغیث کے حوالے کر دے۔ وہ اس رقعے کو حضرت محبوب الٰہی تک پہنچا دیں گے۔

اس ملازم نے دیہاتی کا حلیہ اختیار کیا اور چھپتا چھپاتا دہلی پہنچ گیا۔

قاضی مغیث وہ رقعہ لے کر حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زبانی بھی بادشاہ کی سفارش کی۔ باشندگان دہلی کی مصیبتوں کا بھی ذکر کیا۔

”حضرت، اس وقت بادشاہ کی تمام بہترین فوج دکن میں ورنگل کی مہم پر گئی ہوئی ہے۔ بادشاہ بے دست و پا ہے۔

مغلوں سے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا۔ خلقِ خدا پریشان ہے۔ خدا جانے کیا انجام ہو۔ دعا فرمائیے کہ مغل محاصرہ اٹھا کر اپنے وطن لوٹ جائیں۔"

"دیکھو آج رات ہم بادشاہ کے حق میں دعا کریں گے۔ اللہ سے اچھی توقع رکھیے۔ اپنے بادشاہ سے کہنا، اللہ کے احسانات کو یاد رکھے اور خلقِ خدا کی بہتری کے لیے کام کرتا رہے۔"

آپ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے جو فرمایا تھا، وہی ہوا۔ اس رات ترغی کے دل میں خدا جانے کیا آئی کہ راتوں رات اس نے وہ محاصرہ جو دو مہینے سے قائم تھا کسی وجہ کے بغیر اٹھا لیا اور اپنے وطن کی طرف یوں لوٹ گیا جیسے کوئی بلا اس کے پیچھے لگی ہو۔ اس کے امیر اپنی محنت کو رائگاں جاتے دیکھ کر محاصرہ اٹھانے کا سبب پوچھ رہے تھے۔ وہ بس یہی کہنے کی حالت میں تھا کہ میرا دل کہہ رہا ہے اگر یہاں مزید ٹھہرے تو ہم میں سے کوئی زندہ بچ کر واپس نہیں جائے گا۔ علاؤ الدین کی خاموشی کہہ رہی ہے کہ وہ کوئی عظیم لشکر تیار کر رہا ہے۔

اس کرامت کو دیکھ کر سلطان علاؤ الدین کے دل میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی عقیدت بے حد بڑھ گئی۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ ہمیشہ ان کے مشوروں پر عمل کرتا رہے گا۔

وہ حضرت محبوب الٰہیؒ سے خط کتابت کرتا بھی رہا لیکن عجیب بات ہے کہ زندگی میں کبھی اس کی ملاقات آپ سے نہیں ہوئی۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بذاتِ خود ایک کرامت ہے۔ ان کے مرشد حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے آپ کو نصیحت کی تھی کہ بادشاہوں سے ملاقات مت رکھنا۔ پھر وہ علاؤ الدین کے دل میں یہ کیسے ڈالتے کہ وہ ان سے ملاقات کرے البتہ وہ ہر محاذ پر علاؤ الدین کی روحانی مدد فرماتے رہے۔ یہ انہی کی کرامت ہے کہ علاؤ الدین نے زندگی میں 84 جنگیں لڑیں اور کسی میں اسے شکست نہیں ہوئی۔

اس واقعے کے بعد اسے یہ بھی نصیحت ہوئی تھی کہ دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھنا ایک غلط بات ہے۔ اصل کام تو یہ ہے کہ دارالسلطنت میں بیٹھ کر بیرونی حملہ آوروں کی شورشوں کا دفاع کیا جائے۔ دارالسلطنت کو اتنا مستحکم کیا جائے کہ کسی بیرونی طاقت کو اس طرف رخ کرنے کی ہمت نہ ہو اور اپنے تمام وسائل خلقِ خدا کی بہتری کے لیے صرف کیے جائیں۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے "سیری" کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ شاندار عمارتیں بنوائیں۔ حصار دہلی کو بھی ازسرِنو تعمیر کیا۔ مغل جن راستوں سے آتے تھے ان کے قلعوں کو مضبوط کیا۔

ان سب کے باوجود یہ ضروری تھا کہ دارالسلطنت میں ایک بڑا لشکر ہر وقت موجود رہے تاکہ اگر بادشاہ کسی مہم پر روانہ ہو تو یہ لشکر دارالسلطنت کی حفاظت کر سکے۔ اس کا تجربہ اسے طرغی کے حملے کے وقت ہوا تھا جب اس کی فوج دکن کے معرکے پر تھی اور دارالسلطنت خالی پڑا تھا۔

لشکر میں اضافہ کرنے کے لیے ان کی تنخواہوں کی مد میں خطیر رقم کی ضرورت تھی۔ شاہی خزانے پر بوجھ بہت زیادہ بڑھ جاتا۔

اس نے مشیروں سے مشورہ کیا۔ "موجودہ حالات میں لشکر کی تعداد میں کیسے اضافہ کیا جائے؟"

"صرف ایک صورت ہے۔" مشیروں نے مشورہ دیا۔ "سپاہیوں کی تنخواہوں میں کمی کر دی جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ اس طرح تو بددلی پھیل جائے گی۔ ان کی تنخواہیں اگر پہلے ہی سے کم ہوتیں تو الگ بات تھی۔ بڑھی ہوئی تنخواہیں کم کر دی جائیں گی تو ان کا گزارہ کیسے ہوگا؟"

"اس کے لیے حضور کو چند اقدام اٹھانے ہوں گے۔ روزمرہ اشیا کو سستا کر دیا جائے۔ اسی طرح گھوڑوں اور ہتھیاروں کی قیمتوں میں کمی کر دی جائے۔ اس مناسبت سے، اس ارزانی کی وجہ سے سپاہیوں کو اپنی تنخواہوں میں کمی کا احساس نہ ہوگا۔"

مشیروں نے چند قواعد بھی مرتب کر کے بادشاہ کے حوالے کیے جنہیں رائج کر کے اشیا کی قیمتوں میں خاطر خواہ کمی ہو سکتی تھی۔

علاؤ الدین نے ان قواعد کو پسند کیا اور ملک میں رائج بھی کیا۔ ان قاعدوں کے مطابق ہر چیز کی قیمت بادشاہ نے خود مقرر کی اور ایسے ضابطے بنائے کہ کوئی زیادہ قیمت وصول نہ کرے۔ ذخیرہ اندوزی کا قلع قمع کر دیا۔ لونڈیوں اور غلاموں تک کی قیمتیں مقرر کی گئیں۔

اس سلسلے میں یہ لطیفہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رنگین مزاج درباری نے علاؤ الدین کو خوش دیکھ کر عرض کیا۔ "حضور نے تمام ضروریاتِ زندگی کے نرخ تو مقرر کر دیے لیکن ایک چیز جو سب سے ضروری ہے، اس کی طرف توجہ نہیں دی۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "ایسی کیا چیز ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ رہی؟"

درباری نے کہا۔ "بازاری عورتیں۔ یہ عورتیں پہلے کی طرح اب تک اپنی مرضی کی مالک ہیں اور من مانی قیمت

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

مئی 2012ء
سالگرہ نمبر 2
کی رعنائیاں

عمیرہ احمد
عکس — عکس در عکس پہلے سلسلے زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج جستجو کا سفر

ناہید سلطانہ اختر
زندگی — زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے روشناس کراتا آپ کی پسندیدہ مصنفہ کے قلم سے لکھا نیا سلسلے وار ناول

اے دل ناداں — ایک لڑکی کی زندگی کے نشیب و فراز جو اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں تھی میمونہ خورشید علی کی ناقابل فراموش تحریر

دودھ کا جلا — ماضی کے آئینے میں جھلملاتے عکس کو وقت کی ویرانیاں بھی منعکس ہونے سے روک نہیں سکتیں کچھ ایسی رنگ لیے نگہت سیما کی تحریر

کانچ سی لڑکی — خوش قسمتی ہر دروازے پر دستک نہیں دیتی...... بعض اوقات انسان انہونی کا انتظار ہی کرتا رہ جاتا ہے۔ انجم انصار کا ناولٹ

آپ کی آرا و نگارشات سجے مستقل سلسلے

رفعت سراج، رخ چوہدری، ریما علی سید، نگہت یاسمین، قانتہ رابعہ اور عذرا بیگ کی دلچسپ و یادگار تحریریں

وصول کر رہی ہیں۔''

''فکر نہ کرو۔ تمہاری خاطر میں ادھر بھی توجہ کرتا ہوں۔'' بادشاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے بعد بادشاہ نے کوتوالِ شہر کو طلب کیا۔ ''پیشہ ور عورتوں، گانے والیوں اور سازندوں کو باخبر کردو کہ مقررہ نرخوں سے ایک پیسا بھی زائد وصول نہ کریں۔''

بادشاہ نے ہر طرح کی طوائفوں کے لیے نرخ مقرر کیے اور انہیں پابند کیا کہ وہ اس شاہی قیمت سے زیادہ وصول نہ کریں۔

اشیا کی ارزانی اور تنخواہوں کی کمی کا اثر یہ ہوا کہ اس نے اپنے لشکر میں بے پناہ اضافہ کرلیا۔ اس کے پاس پانچ لاکھ سواروں کا ایک لشکرِ جرار تیار ہوگیا۔ اب وہ کسی مہم پر جاتا تو جتنا لشکر اس کے ساتھ ہوتا، اس سے زیادہ دارالسلطنت کی حفاظت کے لیے رہ جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی شورشیں ختم ہوکر رہ گئیں جو اس وقت سب سے بڑا خطرہ بنے ہوئے تھے۔ اگر اتفاق سے مغلوں کی کوئی جماعت ادھر آنکلتی تو جماعت کا کوئی فرد زندہ بچ کر نکلنے کے لائق نہ رہتا۔ مارا جاتا یا گرفتار ہوجاتا۔

دو تین حملے ہوئے ضرور لیکن مغلوں کو ایسی عبرتناک شکست ہوئی کہ اس سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔

جب مغلوں کے حملے کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہوگئے تو علاؤالدین اپنے باج گزاروں کی طرف متوجہ ہوا۔ دیوگڑھ کے حاکم راجا دیو نے تین سال سے خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔ اس کی گوشمالی ضروری تھی۔ بادشاہ نے ملک نائب کو نامی گرامی امرا کے ساتھ دکن کی فتح کے لیے روانہ کیا۔

ملک نائب ماضی میں ایک غلام تھا جس کا اصل نام ملک کافور ہزار دیناری تھا۔ ہزار دینار اس لیے کہا جاتا تھا کہ گجرات کے حاکم راجا رائے کرن نے اسے ہزار دینار میں خریدا تھا۔

الماس بیگ اور نصرت خاں جب زندہ تھے تو انہوں نے گجرات پر چڑھائی کی تھی۔ یہاں سے وہ دو تحفے ساتھ لائے تھے۔ ایک راجا کرن کی رانی کنولا دیوی اور دوسرا ملک کافور ہزار دیناری۔

راجا کرن کی رانی کنولا دیوی حسنِ صورت میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ شیریں کلامی اور دلبرانہ اداؤں کی وجہ سے بھی اپنا جواب آپ تھی۔ علاؤالدین نے اسے مسلمان کرکے اس کے ساتھ شادی کرلی۔

کافور ہزار دیناری اسے ایسا پسند آیا اور اس کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ اس غلام کے مقابلے پر دنیا کی کسی چیز کی کوئی وقعت نہ رہی۔ اس نے اس غلام کو ملک نائب کا خطاب دیا اور رفتہ رفتہ امورِ مملکت کے تمام کام اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ سایہ بان اور سراپردہ جو صرف بادشاہوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں، ملک کافور کو عطا کیے۔ یہ حکم تھا کہ دورانِ سفر امیر اور درباری روزانہ ملک نائب کی خدمت میں آداب بجا لانے کے لیے حاضر ہوں جتنے بھی کام ہوں وہ اس کے حکم سے سرانجام ہوں۔ کسی کو انکار کی جرأت نہ ہو۔

خود بادشاہ کا یہ حال ہوا کہ ملک نائب کا ہر مشورہ اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ کیسا ہی نامعقول مشورہ ہو بادشاہ اس پر عمل کرتا تھا۔

اچھے اچھے معقول امرا دبے لفظوں میں کہنے لگے تھے کہ اگر علاؤالدین کی بادشاہت کو زوال ہوا تو اس کا سبب بھی ملک نائب ہوگا۔

☆☆☆

بادشاہ ابھی دربار کی فراغت کے بعد آکر بیٹھا ہی تھا کہ رانی کنولا دیوی ایک ادائے خاص سے کمرے میں داخل ہوئی اور پلنگ پر اس کے برابر بیٹھنے کے بجائے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ یہ ایک خلافِ معمول قدم تھا۔

''تم اب مسلمان ہو ہندو نہیں رہیں۔ مسلمان عورتیں اس طرح قدموں میں نہیں بیٹھتیں۔'' علاؤالدین نے کہا اور اپنے پاؤں ذرا سمیٹ لیے۔

''اس وقت نہ میں ہندو ہوں نہ مسلمان۔ ایک ماں ہوں جو اپنے بچوں کے لیے بھیک مانگ رہی ہے۔ آپ اتنے بڑے مسلمان ہیں۔ ایک ماں کو مایوس تو نہیں کریں گے؟''

علاؤالدین یہ سن کر تڑپ گیا۔ اس نے کنولا دیوی کا چہرہ اوپر اٹھایا کیونکہ وہ اس کی کانپتی ہوئی آواز سے سمجھ گیا تھا کہ شاید وہ رو رہی ہے۔ کنولا دیوی کی آنکھوں میں واقعی آنسو تھے اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا ہوا کنولا دیوی؟'' اس نے کنولا دیوی کو سہارا دیا اور پلنگ پر بٹھا دیا۔ ''ہم سے کوئی خطا ہوگئی جو یوں رو رہی ہو، کیا بات ہے؟''

اس نے کسی کنیز کو بلانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ خود اٹھا اور صراحی سے پانی نکال کر پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس دوران مسلسل پوچھتا رہا کہ کیا بات ہوئی ہے۔

جب کنولا دیوی کی سانسیں کچھ قابو میں آگئیں تو اس نے کہنا شروع کیا۔

''میری دو بیٹیاں میرے ساتھ ہی راجا رائے کرن

کے محل میں پرورش پارہی تھیں کہ آپ کے لشکر نے حملہ کیا۔ میں تو خوش نصیب تھی کہ آپ کے حرم میں آگئی اور اب عیش میں ہوں لیکن میری دونوں بیٹیاں مجھ سے بچھڑ گئیں۔ اب یہ معلوم ہوگیا ہے کہ میری بڑی بیٹی کا انتقال ہوچکا ہے، چھوٹی لڑکی زندہ ہے جسے میں چار برس کا چھوڑ کر آئی تھی۔ اس کا نام دیولدی ہے، میں اتنے برس خاموش رہی کہ آپ نے مجھے سہارا دیا ہے، ایک ہندو کی بیٹی کو کیسے برداشت کریں گے۔ وہ جہاں ہے وہیں رہے لیکن اب جو یہ سنا کہ آپ کا لشکر دکن کی طرف جارہا ہے تو دیولدی مجھے یاد آگئی۔ اپنے لشکر والوں سے کہیں کہ وہ میری دیولدی کو وہاں سے نکال لائیں جیسے مجھے نکال لائے تھے۔ میں وعدہ کرتی ہوں اسے بھی اپنی طرح مسلمان بنالوں گی۔ وہ ہندو بن کر یہاں نہیں رہے گی۔ میں اسے دیکھ تو سکوں گی۔ آپ کو اللہ اور بڑا مسلمان بنائے۔ آپ میری بیٹی کو مجھ سے ملوا دیں۔''

علاؤالدین اس طرح اس کی داستان سن رہا تھا جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔ شاید سوچ رہا ہو کہ بادشاہوں کی ان لڑائیوں میں گھر ہی نہیں اجڑتے، دل بھی اجڑ جاتے ہیں۔ کنولا دیوی اپنی بچی کے لیے کیسا کیسا روتی ہوگی۔ کہیں ایک ماں کی بددعا اسے نہ لگے۔

''کنولا دیوی، آج سے پہلے تم نے کبھی اپنی بیٹی کا ذکر ہم سے نہیں کیا ورنہ ہم بہت پہلے اسے تم سے ملوا دیتے بہرحال اب بھی ہم قسم کھاتے ہیں کہ تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک ضرور پہنچائیں گے۔ لشکر روانہ ہوچکا ہے لیکن ہم ابھی قاصد دوڑاتے ہیں جو ملک نائب کو پیغام پہنچا دے گا کہ دیولدی کو ہر قیمت پر بازیاب کرایا جائے۔''

کنولا دیوی نے ایک مرتبہ پھر شکر گزاری کے طور پر علاؤالدین کے پاؤں چھونے کی کوشش کی لیکن علاؤالدین نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور سینے سے لگالیا۔ کنولا دیوی کے چہرے پر حیا کے کئی رنگ بکھر گئے۔

علاؤالدین نے دو قاصد روانہ کیے ایک گجرات کے حاکم الغ خاں کے پاس گیا، دوسرا ملک نائب کے پاس۔ دونوں کے پاس ایک پیغام پہنچا۔

''جس طرح بھی ہو دکن کے مشہور راجا کرن کی بیٹی دیولدی کو میرے پاس بھیجو۔ اس سلسلے میں چاہے سختی سے کام لیا جائے، چاہے نرمی سے۔''

ملک نائب کو جونہی یہ پیغام ملا اس نے اس کی نقول راجا رام دیو، راجا کرن اور دیگر راجگانِ دکن کے نام بھجوا دیں اور اپنی جانب سے بھی لکھ دیا کہ وہ یہ کام خون خرابے کے بغیر انجام دے لیں۔

ان راجاؤں نے بادشاہ کا حکم ماننے سے انکار کردیا۔

''اب علاؤالدین کی اتنی ہمت ہوگئی کہ راجپوتوں کی بہو بیٹیوں کو ان کے نام لے کر اٹھوانے کی بات کرے۔ ہم راجپوت ایسی لڑکیوں کو زندہ جلا دیں گے لیکن مسلمان بادشاہ کے حوالے نہیں کریں گے۔''

ملک نائب سلطان پور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جواب ملتے ہی اس نے سلطان پور سے کوچ کیا اور سرحدِ دکن میں داخل ہوا۔ الغ خاں بھی گجرات سے ایک زبردست لشکر لے کر نکلا اور بگلانہ کی طرف بڑھا جو راجا کرن کا علاقہ تھا۔ راجا کرن بھی پورے حفاظتی اقدام کرچکا تھا۔ اس نے ہر لڑائی

لاجواب

شیخ سعدیؒ نمازِ عشا کے بعد بازار سے گزر رہے تھے کہ انہیں ایک بچہ دکھائی دیا۔ بچے کے ہاتھ میں جلتا ہوا چراغ تھا۔ شیخ سعدیؒ کو یونہی شرارت سوجھی۔ انہوں نے اس بچے سے پوچھا۔

کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس چراغ میں روشنی کہاں سے آرہی ہے؟ بچے نے فوراً ہی پھونک مار کر چراغ گل کردیا اور شیخ سعدیؒ سے کہا۔ اگر آپ بتادیں کہ روشنی کہاں چلی گئی تو میں بھی بتادوں گا کہ روشنی کہاں سے آرہی ہے۔ یوں بچے نے انہیں لاجواب کردیا۔

بے وقوفی

مشاعرہ ہورہا تھا۔ حاضرینِ محفل لطف اندوز ہورہے تھے۔

شاعر نے مصرعہ پڑھا۔

''دل سی نایاب شے فدا کردی۔''

سامعین نے کہا۔ ''واہ واہ..... ارشاد...... مکرر۔'' شاعر نے پھر کہا۔ ''دل سی نایاب شے فدا کردی۔''

محفل میں سے کسی منچلے نے آواز لگائی۔ ''بے وقوفی کی انتہا کردی۔''

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

میں بڑی جانبازی سے کام لیا اور ہر بار بغیر شکست کھائے واپس ہوا۔ وہ اپنی رانی کھو چکا تھا، بیٹی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ الغ خاں اور ملک نائب ہر قیمت پر دیولدی کو لینا چاہتے تھے لہٰذا دونوں اپنی اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف وعدے کا پاس تھا دوسری جانب آن کا سوال تھا۔ دیکھنا تھا فتح کس کی ہوتی ہے؟

ان معرکہ آرائیوں کی سب سے زیادہ فکر رام دیو کے بیٹے سنگل دیو کو تھی۔ وہ دیولدی کا عاشق اور اس سے شادی کرنے کا خواہاں تھا لیکن چونکہ رام دیو مرہٹہ تھا اس لیے اس شادی پر رضامند نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ راجپوتوں کی بیٹی اس کے گھر میں آئے۔ سنگل دیو اب تک کسی امید میں تھا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مسلمان دیولدی کو لے گئے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے چلی جائے گی۔

سنگل دیو اپنے بھائی بھیم دیو کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ دیولدی کو کیسے حاصل کیا جائے۔

''بھیم دیو کیا تو سمجھتا ہے کہ راجا کرن، دیولدی کی حفاظت کرے گا؟''

''وہ اپنی رانی کنولا دیوی کی حفاظت نہ کر سکا۔ دیولدی کو کیا بچائے گا؟''

''مقابلہ تو وہ خوب کر رہا ہے۔''

''تو ان مسلمانوں کو نہیں جانتا۔ بڑی جنگجو قوم ہے یہ۔ بڑی تیاری سے آئے ہیں۔ یہاں کے راجا کب تک ان کا مقابلہ کریں گے۔''

''میں نے پتاجی سے کہا تھا کہ میری شادی دیولدی سے کرا دیں۔ اگر اس وقت یہ شادی ہو گئی ہوتی تو میں اسے لے کر کہیں بھی بھاگ جاتا۔ مسلمانوں کے ہاتھ نہ لگتا۔''

''وہ راجپوت ہے اور ہم مرہٹہ پھر یہ شادی کیسے ہو سکتی تھی۔ پتاجی اسی لیے انکاری تھے۔''

''اور اب جو مسلمان اسے لے جائیں وہ اچھا ہوگا۔ ہم کم از کم ایک دھرمی تو تھے۔ ذات برادری الگ سہی۔''

''ہاں بھائی، یہ تو، تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو جنگ لگی ہوئی ہے۔''

''اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔''

''کیا ہو سکتا ہے؟''

''تم راجا کرن کے پاس جاؤ اور میرا پیغام اسے پہنچا دو۔ وہ اس وقت مشکل میں ہے، ہماری بات ضرور مان لے گا..... لیکن یاد رکھو، پتاجی کو یہ معلوم نہ ہو ورنہ وہ تمہیں بھی نہیں جانے دیں گے۔''

سنگل دیو نے راجا کرن کے نام پیغام بھجوایا۔

''مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب کی بنا پر جو دشمنی ہے وہ ظاہر ہے۔ ان کا ہمارا کوئی میل نہیں۔ راجپوت اور مرہٹہ تو پھر ایک قوم ہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنی بیٹی کا بیاہ مجھ سے کر دو۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ دیولدی کی شادی ہو گئی تو پھر وہ تم سے جنگ نہیں کریں گے۔''

راجا کرن کو یہ پیغام ملا تو اس نے ایک مرتبہ پھر غور کیا۔ مسلمانوں کے مطالبے نے اس کی اکڑفوں نکال دی تھی۔ اس نے وہ تحفے تحائف قبول کیے جو بھیم دیو اپنے ساتھ لایا تھا اور وعدہ کیا کہ وہ دیولدی کا بیاہ سنگل دیو کے ساتھ کر دے گا تاکہ مسلمانوں سے اس کی جان چھوٹے۔

''میں دیولدی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرتا لیکن حالات ایسے نہیں ہیں۔ مسلمانوں کو تو یہ معلوم بھی نہ ہونے پائے کہ دیولدی کا بیاہ ہو رہا ہے۔ تو ایسا کر جس لشکر کو تو اپنے ساتھ لایا ہے اسی میں شامل کر کے دیولدی کو بھی اپنے ساتھ دیوگڑھ لے جا۔ پھیرے وہاں لے جا کر کر لینا۔''

بھیم دیو اسے اپنے ساتھ لے کر چلتا بنا۔

الغ خان کو کہیں سے معلوم ہو گیا کہ دیولدی کی شادی کی بات ہو رہی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بھیم دیو کے ساتھ دیوگڑھ جانے کے لیے روانہ ہو گئی ہے۔

الغ خاں نے فوراً مجلس مشاورت منعقد کی۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ راجا کرن دیولدی کی شادی کر رہا ہے۔ اگر وہ یہاں سے نکل گئی تو سلطان ہم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ابھی وہ یہیں ہے۔ ہمیں پوری قوت سے اسے چھین لینا چاہیے۔''

تمام امیروں نے اتفاق کیا اور آخری دم تک لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی وقت صفیں درست کیں اور کوہستان میں داخل ہو گئے۔

علاؤ الدین ان سے سیکڑوں میل دور تھا لیکن اس کا خوف ایسا تھا کہ سب کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اگر دیولدی ہاتھ سے نکل گئی تو پھر انہیں سلطان سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ انہوں نے قسم کھائی کہ اپنے خون سے اس زمین کو سرخ کر دیں گے لیکن دیولدی کو جانے نہیں دیں گے۔

راجا کرن سے آمنا سامنا ہوا تو راجا ان کے بپھرے ہوئے جذبات کا سامنا نہ کر سکا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک مرنے کو تیار ہے۔ راجا کرن بس کچھ دیر ہی مقابلے پر ڈٹا رہا اور پھر جنگ کے میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔

الغ خاں کو یقین تھا کہ دیولدی اس کے ہمراہ ہوگی۔

اس نے راجا کے تمام مال و اسباب اور ہاتھیوں وغیرہ پر قبضہ کیا اور ساتھیوں کو حکم دیا کہ راجا کا تعاقب کریں۔ وہ اگر بچ کر چلا گیا تو سمجھو ہم میں سے کوئی نہیں بچا۔

الغ خاں اپنے لشکر کے ساتھ نہایت تیز رفتاری سے جنگلوں سے گزرتا ہوا، پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا دیوگڑھ پہنچ گیا لیکن نہ راجا کرن کے قدموں کے نشان ملے، نہ دیولدی کی خوشبو۔

الغ خاں نے اپنے لشکر کو دریا کے کنارے ٹھہرنے کا حکم دیا تاکہ یہاں رک کر راجا کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے۔ قریب ہی میں ایلورا کے غار تھے جہاں بدھ مت کے زمانے کی تاریخی مورتیاں تھیں جنہیں غار کی دیواروں پر بڑی مہارت سے نقش کیا گیا تھا۔ فوجیوں کو فرصت ملی تو انہیں ایلورا کی سیر کی سوجھی۔ وہ الغ خاں کی اجازت سے اس عجیب و غریب مقام کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ ان لشکریوں کو دور سے ایک دکنی فوج آتی نظر آئی۔ وہ سب یہ سوچ کر لڑنے کے لیے تیار ہو گئے کہ یہ راجا کرن کی فوج ہوگی۔

دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے مقابلے کے بعد ہندو، مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے تیراندازی جاری رکھی۔ ایک گھوڑا بڑی تیزی سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک سپاہی نے اس گھوڑے کو نشانہ بنایا۔ اس تیر نے گھوڑے کو بالکل بے کار کر دیا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت اس گھوڑے کے قریب پہنچی تو اس گھوڑے پر بیٹھی ایک ملازمہ زور سے چلائی۔

''اس کی عزت کرو۔ یہ رانی دیولدی ہے۔ اسے اپنے سردار کے پاس لے چلو۔''

یہ سنتے ہی مسلمانوں کی تو جیسے دلی مراد بر آئی۔ اب معلوم ہوا کہ یہ بھیم دیو کا لشکر تھا جو دیولدی کو دیوگڑھ لے کر آ رہا تھا۔ جس کے ملنے کی امید نہیں تھی، جس کی خاطر یہ خوں ریزی ہوئی تھی۔ یوں اچانک معجزانہ طور پر مل جائے گی کسے امید تھی۔

یہ سپاہی دیولدی کو لے کر الغ خاں کے پاس پہنچے۔ الغ خاں یہ خبر سنتے ہی خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور دیولدی کو لے کر فوراً گجرات کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر دیولدی ایک پالکی میں بیٹھ کر دہلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ ادھر یہ حالات دیکھ کر رام دیو ملتجیانہ ملک نائب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

ملک نائب بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رام دیو کے لڑکے نے اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔ بادشاہ اس کی کارکردگی سے اتنا خوش ہوا کہ اس کا مرتبہ پہلے سے بھی دس گنا زیادہ ہو گیا۔ بادشاہ کی نوازشیں رام دیو پر بھی ہوئیں۔ اسے چتر سفید اور رائے رایاں کا خطاب عطا کیا اور بڑے اعزاز سے روانہ کیا۔ دیوگڑھ اور قدیم ممالک کی حکومت اس کے سپرد کی۔

رام دیو جب تک رہا، علاؤ الدین کی اطاعت کا دم بھرتا رہا۔

PaPaPa

مسلسل فتوحات نے علاؤ الدین کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ ناقابل تسخیر ہے اور وہ یہ بات ہر ملنے والے سے کہا بھی کرتا تھا۔ جالور کا راجا کانیر دیو ایک مرتبہ دہلی آیا ہوا تھا۔ بادشاہ سے ملاقات کے لیے آیا تو دوران ملاقات اس نے راجا کے سامنے اپنے اس عزم کو دہرایا۔

''اب ہندوستان کے کسی راجا میں مجھ سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ سب نے مجھ سے شکست بھی کھائی اور میرے مطیع بھی بنے۔''

''ہندوستان کی زمین بہادروں سے خالی نہیں ہوئی۔'' راجا نے کہا۔ ''آپ سے مقابلہ کرنے والے اب بھی موجود ہیں۔''

''آپ کسی ایک راجا کا نام مجھے بتا دیں۔'' بادشاہ نے کہا۔

''اگر مجھ سے آپ کا مقابلہ ہو تو میں پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ اگر یہ نوبت آ گئی تو جان دے دوں گا مگر ہتھیار گلے میں ڈال کر آپ کے سامنے پیش نہیں ہوں گا۔''

بادشاہ کو اس کا یہ دعویٰ نہایت برا لگا لیکن اس وقت چپ ہو گیا۔

راجا کے رخصت ہونے کے بعد اس کے دعوے کی قلعی کھولنے کا ارادہ کیا۔ لشکر کشی کا خیال آتے ہی ایک اور بھی خیال آیا۔ راجا کو ذلیل کرنے کی اس نے عجیب ترکیب سوچی۔ بڑے بڑے امرا سے شکست کھا جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ راجا کو یہ بتایا جائے کہ وہ ایک معمولی لونڈی سے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس نے اپنی ایک لونڈی گل بہشت کو فوج کے ساتھ جالور روانہ کیا۔ تمام لشکر کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ گل بہشت کی اسی طرح بات مانیں جس طرح اپنے سپہ سالار کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔

گل بہشت نے جالور پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اہل قلعہ محاصرے کی شدت سے سخت پریشان ہوئے۔ کئی مرتبہ باہر نکل کر مقابلہ کیا لیکن گل بہشت نے دانت کھٹے کر دیے۔

قلعہ فتح ہونے کو تھا کہ گل بہشت بیمار پڑ گئی اور چند روز بعد اسی بیماری کے ہاتھوں انتقال کر گئی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے نے اس کی جگہ سنبھالی۔

راجا جالور قلعے سے باہر نکلا اور یہ سوچ کر کہ اب گل بہشت تو رہی نہیں۔ لشکر کا مقابلہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے، لشکر کے مقابل آ گیا۔ دونوں میں معرکہ آرائی ہوئی۔ گل بہشت کا بیٹا مارا گیا۔ اہلِ لشکر بھی مقابلہ نہ کر سکے اور چند منزل پیچھے ہٹ گئے۔

علاؤ الدین کو ان واقعات کی اطلاع ملی تو اس نے ایک غیر معروف شخص کمال الدین کو ایک زبردست لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ اس نے نہایت مردانگی سے قلعہ فتح کر لیا۔ کاتیر دیو اپنے عیال کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

PoPoPo

علاؤ الدین کی سلطنت کابل وسندھ کی سرحد سے لے کر بنگالہ، دکن اور گجرات کی حدود تک پہنچ گئی تھی۔ سارے ہندوستان میں دس بیگہ زمین بھی ایسی نہیں تھی جہاں علاؤ الدین کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری نہ ہو۔ راجاؤں کے محل اور شاہی خزانے اس کے قبضے میں تھے۔ دریائے عمان کے ساحلی علاقے اور دکن کے دور دراز سرحدی خطے فتح کر چکا تھا۔ یہ سب فتوحات ملک نائب کے مرہون منت تھیں۔ اس نے جب وہ خزانے اور دفینے جو اس نے راجاؤں سے چھینے اور مندروں سے نکالے تھے، علاؤ الدین کے قدموں میں ڈھیر کیے تو علاؤ الدین بے اختیار کہہ اٹھا۔ ''یہ سب وہ ہے جس کے سامنے پرویز و دارا کے خزانے بھی ہیچ ہیں۔''

ملک نائب نے دریائے عمان کے ساحلی علاقوں دھور سمندر اور مبصر کو فتح کیا اور وہاں کے مندروں سے جواہرات نکال کر دہلی پہنچا اور مال غنیمت پیش کیا تو مال غنیمت کیا تھا، وہ پورا ہندوستان اٹھا کر دہلی لے آیا تھا۔ یہ مال غنیمت تین سو بارہ ہاتھیوں، بیس ہزار گھوڑوں، چھیانوے من سونا اور بے حد وحساب اشرفیوں اور موتیوں پر مشتمل تھا۔ اس مرتبہ علاؤ الدین نے بھی خزانے کا منہ کھول دیا۔ امرا میں سونا تقسیم کیا۔ کسی کو دس من کسی کو پانچ من مشائخین بھی اس فیاضی سے دور نہیں رہے۔

مورخین کا بیان ہے کہ علاؤ الدین خلجی کو جس قدر فتوحات حاصل ہوئیں اتنی ہندوستان کے کسی اور حکمران کو نصیب نہ ہوئیں اس نے جس کثرت سے مسجدیں، تالاب، سرائیں، خانقاہیں اور قلعے تعمیر کرائے، اتنے کسی اور بادشاہ نے نہیں بنائے۔ اہل فن اس کے زمانے میں بہت بڑی تعداد میں جمع تھے۔ ان کا اتنا بڑا گروہ کسی اور بادشاہ کے زمانے میں جمع نہیں ہوا۔

یہی حال علمائے کرام، مورخین، شعرائے کرام اور اطبا کا تھا۔ مطربوں، کوئیوں اور دیگر اربابِ طرب کی وہ کثرت تھی جو پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

اس فراوانی دولت نے بادشاہ کو امورِ حکومت سے غافل کر دیا۔ تمام امور ملک نائب کے ہاتھوں رہے۔ بادشاہ کے بیٹوں تک کی جرأت نہیں تھی کہ وہ ملک نائب سے اختلاف کی جرأت کرتے، امرا کی تو کیا مجال۔ ان حالات میں سازشیں اپنا منہ کھولتی ہیں لیکن علاؤ الدین کا رعب اب بھی طاری تھا اور پھر دولت کی کثرت تھی جو ہر ایک کا منہ بند کیے ہوئے تھی۔

سازشوں کے لیے مواقع بادشاہ کی بیماری نے مہیا کر دیے۔ عیش وعشرت اور لہو ولعب نے علاؤ الدین کو بیمار ڈال دیا۔ اس بیماری نے بہت سے چہروں کو بے نقاب کر دیا۔ اس کا بڑا بیٹا، خضر خان جسے اس نے ولی عہد بنایا تھا اور ملکہ جہاں کو بزم آرائیوں سے فرصت نہیں تھی، وہ بادشاہ کی بیماری کی پروا کیا کرتے۔ دیگر رانیاں جن میں کنولا دیوی بھی تھی، اس کی تیمارداری کے لیے کبھی کبھی حاضر ہوتی تھیں۔ چند باوفا امرا تھے جو اس کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔

''خضر خاں کو میرے پاس آئے آج چار روز گزر گئے۔'' بادشاہ نے ایک روز اپنے ایک امیر سے شکایت کی۔

''حضور، انہیں چوگان بازی اور ہاتھیوں کی لڑائی سے فرصت نہیں۔''

''انہیں یہ بھی تو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ولی عہدِ سلطنت ہیں۔''

''یہ بے پروائی شاید اسی لیے ہے۔''

''آپ کا مطلب کیا ہے؟''

''حضور بادشاہت کے ہر راز سے واقف ہیں، اب ہم کیا عرض کریں۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ اسے میرے مرنے کا یقینی انتظار ہوگا۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ملکہ جہاں کو اپنے بیٹوں کی شادیوں اور پوتیوں کے عقیقوں سے فرصت نہیں ہے انہیں ہمارے سوا سب کچھ یاد ہے۔''

ان حالات کو دیکھتے ہوئے سلطان نے ملک نائب کو طلب کیا جو ان دنوں دکن میں تھا۔ وہ شاہی حکم کی تعمیل میں فوراً چلا آیا۔ بادشاہ نے اس سے بھی خضر خاں اور ملکہ جہاں کی شکایت کی۔

یہی وہ موقع تھا جب ملک نائب کے دل میں پہلی مرتبہ یہ خیال آیا کہ وہ علاؤ الدین کی جگہ اس ملک کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ وہ تو خیر بستر پر تھا لیکن اس کا ولی عہد خضر خاں

موجود تھا جو بادشاہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی تخت پر بیٹھ جاتا۔ ملک نائب کی بادشاہت تو رہی ایک طرف، وہ اعزاز و مرتبہ بھی چھن جاتا جو اسے علاؤالدین نے عطا کیا ہوا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ خضر خاں کو راستے سے ہٹایا جائے۔ اس نے خضر خاں کی طرف سے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیے۔

ایک دن یہ تک کہہ دیا۔ ”آپ کی موجودگی انہیں بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ تہ دل سے آپ کی موت کے خواہاں ہیں۔“

”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”یہ اگر کسی طرح بھی آپ کے قریب رہے تو آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انہیں خود سے دور کر دینا چاہیے۔ میں شاہی خاندان کا فرد تو نہیں لیکن آپ کا نمک خوار اور وفادار ہوں۔ خضر خاں یہاں موجود نہیں ہوں گے تو میں تمام کام سنبھال لوں گا۔ وہ تو مجھے آپ کے علاج کی طرف بھی متوجہ نہیں ہونے دیتے۔ ولی عہد ہیں، میں کیا کر سکتا ہوں۔“

علاؤالدین اس کی کوئی بات ٹالنے کا روادار نہیں تھا۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے خضر خاں کو شکار کے بہانے امروہہ کی طرف روانہ کر دیا۔

”تم میری وجہ سے خوانخواہ پریشان رہتے ہو۔ کچھ دن شکار میں گزارو۔ جب میں صحت یاب ہو جاؤں گا تو تمہیں خود بلواؤں گا۔“

”میں نے یہ منت مانی ہے کہ جب آپ صحت یاب ہوں گے تو امروہہ سے دہلی تک مشائخ کی زیارت کے لیے پیدل آؤں گا۔“

”خدا تمہاری منت پوری کرے اور مجھے صحت ملے۔“ بادشاہ نے کہا۔

خضر خاں امروہہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ملک نائب نے امرا سے ساز باز شروع کر دی۔ اس کا اعزاز و مرتبہ ایسا تھا کہ وہ جس سے ہنس کر بات کر لیتا وہ اسے اپنی خوش قسمتی تصور کرتا۔ امرا تیزی سے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔

بادشاہ کی حالت کچھ سنبھلنے لگی تھی۔ جب خضر خاں کو معلوم ہوا کہ بادشاہ صحت یاب ہو رہا ہے تو اس نے اپنی منت پوری کی اور اپنے لشکر خاصہ کے ساتھ امروہہ سے دہلی تک پاپیادہ آیا۔

اس موقعے پر اسے یہ فرمان شاہ یاد نہیں رہا کہ جب میں صحت یاب ہو جاؤں گا تو تمہیں بلواؤں گا۔ اس میں یہ شرط چھپی ہوئی تھی کہ از خود مت چلے آنا۔

ملک نائب نے اس کی اسی غلطی کو اس کی خودسری کے روپ میں پیش کیا۔

”حضور، شہزادہ آپ کی اجازت کے بغیر آیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں امیروں کے ساتھ مل کر کوئی سازش نہ کرے۔“ چند روز نہیں گزرے تھے کہ ملک نائب نے یہ فرضی انکشاف بھی کر دیا۔

”حضور، بات اتنی بڑی ہے کہ مجھ غلام کو کہتے ہوئے بھی حجاب آتا ہے اور اگر نہ کہوں تو حضور سے غداری ہوگی۔“

”ملک نائب، تم نے ہمیشہ ہمارے مفاد کا خیال رکھا ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہے تو ضرور کہو۔“

”حضور، خضر خاں اور شادی خاں آج کل ہی میں آپ کے دشمنوں کی جان لینے والے ہیں۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں ان لوگوں تک پہنچ گیا ہوں جو ان دونوں شہزادوں کے ساتھ شامل ہیں لیکن میں شہزادوں کی موجودگی میں ان لوگوں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔“

ملک نائب نے چند غلام بھی گواہی کے لیے خرید لیے جنہوں نے جاں بخشی کے وعدے پر بادشاہ کے سامنے جھوٹی گواہی دی۔ ان لوگوں کے نام لیے جو اس میں شامل ہیں۔

بادشاہ، ملک نائب پر اتنا اعتبار کرتا تھا کہ نہ بیٹوں سے باز پرس کی اور نہ کسی دوسرے ذریعے سے تصدیق کی اور اپنے دونوں بیٹوں خضر خاں اور شادی خاں کی گرفتاری کا فرمان جاری کر دیا۔

اس فرمان پر ملک نائب ہی کو عمل درآمد کرانا تھا۔

ملک نائب نے ان دونوں شہزادوں کو گوالیار کے قلعے میں قید کروا دیا اور ملکہ جہاں کو محل سے نکلوا کر پرانی دہلی میں نظر بند کر دیا۔

غضب تو یہ ہوا کہ ملک نائب نے حاکم گجرات الغ خاں کی موت کا فرمان جاری کروا لیا۔ الغ خاں جو خضر خاں اور شادی خاں کا خالو تھا اور حال ہی میں گجرات سے آیا تھا، ملک نائب کی عیاری سے مارا گیا۔

علاؤالدین، ملک نائب کی محبت میں ایسا گرفتار تھا کہ جو وہ کہتا جا رہا تھا، بادشاہ اس پر عمل کر رہا تھا۔ ملک نائب کو جس جس سے خطرہ ہو سکتا تھا، بادشاہ سے اس کے قتل کا فرمان جاری کرا دیا تھا۔ ایک شخص کو جالور روانہ کیا تا کہ وہ جالور کے حاکم نظام الدین کو جو الغ خاں کا بھائی تھا، قتل کر سے۔

اس ظلم و زیادتی نے پورے ملک میں انتشار برپا کر دیا۔ گجرات کی فوج نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس بغاوت کو

کچلنے کے لیے سید کمال الدین کرک کو روانہ کیا لیکن گجرات پہنچتے ہی الغ خاں کے طرف داروں نے کمال الدین کو پکڑ کر بری طرح موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جیت پور کے حاکم نے بھی بغاوت کر دی اور شاہی ملازموں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں قلعے سے نیچے پھینک دیا۔

وکن میں ہو پال دیو نے جو رام دیو کا داماد تھا، ہنگامہ کھڑا کیا۔

علاؤالدین نے جس سلطنت کی حدود کو دن رات ایک کر کے وسیع کیا تھا اور بہترین تدبیر سے ہر طرف امن و امان پیدا کیا تھا، ملک نائب کی بداعمالیوں نے اسے ریت کے گھروندے کی طرح بٹھا دیا۔

علاؤالدین ان خبروں کو سن رہا تھا لیکن اب حالات اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ اگر وہ کوئی مشورہ بھی دیتا تھا تو ملک نائب اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ان واقعات پر کڑھنے کے سوا اس کے بس میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ملک نائب جو چاہ رہا تھا، وہ کر رہا تھا۔

بادشاہ کی صحت پھر گرنے لگی۔ رہے سہے سہارے یا تو قید میں تھے یا قتل کر دیے گئے تھے۔ اب اس کے علاج کے لیے اطبا کو آواز دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ملک نائب نے وفادار ملازموں کو بھی بادشاہ سے دور کر دیا تھا۔ حفاظت کے نام پر بادشاہ کا حال یہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ قیدی نہیں تھا مگر قیدیوں کی طرح تھا۔

اس کی صحت اچانک مخدوش ہو گئی اور 6 شوال 716ھ کی رات کو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

بعض کا کہنا ہے کہ بادشاہ کی موت زہر خورانی سے ہوئی تھی۔ ملک نائب نے اسے زہر دیا تھا۔

بے شمار زر و جواہر جو محمود غزنوی کو بھی میسر نہیں ہوئے تھے، علاؤالدین دوسروں کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔

ملک علاؤالدین خلجی کو خاموشی سے دفن کر دیا گیا۔ تدفین کے دوسرے دن ملک نائب نے تمام امرا اور ارکین دربار کو جمع کیا اور خلجی کا وصیت نامہ پڑھ کر سنایا۔ یہ وصیت نامہ اس نے نہ جانے کب اور کس چال سے لکھوا لیا تھا۔

”میں اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کو ولی عہدی سے معزول کرتا ہوں اور اس کی جگہ اپنے چھوٹے بیٹے شہاب الدین عمر کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔ ملک نائب بہ دستور نائب السلطنت رہیں گے۔“

اس وصیت نامے میں شہاب الدین کا نام اس لیے لکھوایا گیا تھا کہ شہاب الدین کی عمر صرف سات سال تھی۔ وہ برائے نام بادشاہ ہوتا پس پردہ ملک نائب ہی بادشاہ ہوتا۔

اس وصیت نامے کے بعد کسی امیر کی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کی مخالفت کرتا۔ جتنے طاقتور امرا تھے وہ پہلے ہی قتل کیے جا چکے تھے۔ جو باقی تھے ان پر ملک نائب کا خوف غالب تھا یا انہیں دولت دے کر ان کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔

ملک نائب نے شہزادہ شہاب الدین کو تخت پر بٹھا دیا اور خود اس سات سالہ فرماں روا کا نائب بن گیا۔ نائب کیا تمام کام اسی کو انجام دینے تھے۔

اس نے جو پہلا کام کیا اسی سے اس کے عزائم کا اظہار ہوتا تھا۔ جلوس کے پہلے ہی دن ملک سہیل کو بارکی کے عہدے پر مقرر کر کے گوالیار کی طرف روانہ کیا اور حکم دیا کہ وہ خضر خاں اور شادی خاں کو اندھا کر دے۔ اس شخص نے گوالیار جا کر دونوں شہزادوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دیں۔

دونوں شہزادے ٹھکانے لگ چکے تھے۔ (اندھا سرابر) اب ملک نائب کو شہزادہ مبارک کی طرف سے خطرہ تھا۔ شہاب الدین تو کم سن تھا اس لیے وصیت میں اسی کا نام ڈالا گیا تھا۔ اگر کسی طرح شہزادہ مبارک تخت پر بیٹھ جاتا تو زمام حکومت ملک نائب کے ہاتھ سے نکل سکتی تھی۔

ملک نائب اس فکر میں تھا کہ شہزادہ مبارک خاں کو بھی اندھا کر دے۔ اس کے اس ارادے کا علم کسی طرح شہزادے کی والدہ بی بی مالک کو ہو گیا۔ وہ ایک دن پالکی میں سوار ہوئیں اور حضرت نجم الدین کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ یہ حضرت صاحب کشف بزرگ تھے۔

بی بی مالک نے انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا اور امداد کی طالب ہوئیں۔

”میرا بچہ بے قصور ہے۔ بادشاہ بننے کا طالب بھی نہیں۔ اسے محض بادشاہ کا بیٹا ہونے کی سزا دی جا رہی ہے۔ نمک حرام نائب ملک اسے اندھا کرنے کے ارادے باندھ رہا ہے۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں، آپ سے امداد کی طالب ہوں۔“

”تم فکر مت کرو۔ جو ملک نائب سوچ رہا ہے ویسا نہیں ہوگا۔ غیبی امداد کا انتظار کرو۔“ حضرت نجم الدین نے فرمایا۔

حضرت نجم الدین نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور اسے الٹ کر دوبارہ اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا۔ ”اب میں اس ٹوپی کو اسی وقت سیدھا کروں گا جب مبارک شاہ تخت حکومت پر بیٹھے گا۔“

بی بی مالک خوش خوش گھر چلی آئیں۔ ملک نائب سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ اسے تفصیلات کا علم تو نہ ہو سکا لیکن یہ

ضرور معلوم ہوگیا کہ وہ اپنے بیٹے شہزادہ مبارک کے سلسلے میں ان بزرگ کے پاس گئی تھیں۔ ملک نائب کا اب معمول بن گیا تھا کہ وہ خلجی خاندان کی تباہی کے منصوبے باندھتا رہتا تھا۔ شہزادہ مبارک اس کے خاص نشانے پر تھا کیونکہ وہ کسی بھی وقت تخت وحکومت کا دعویٰ کرسکتا تھا۔

بی بی مالک کی حضرت نجم الدین سے خفیہ ملاقات کے بعد ملک نائب چوکنا ہوگیا تھا۔ اس نے مبارک شاہ کو راستے سے ہٹانے کے لیے اپنی کوششیں تیز کردیں۔

ایک رات ملک نائب نے ان چند خواجہ سراؤں پر اپنا ارادہ ظاہر کیا جو اس رات مبارک شاہ کے محل کی حفاظت پر متعین تھے۔ انہیں لالچ دے کر اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ مبارک شاہ کو قتل کردیں گے۔

یہ خواجہ سرا تاک میں لگے رہے اور موقع دیکھ کر مبارک شاہ کے سر پر پہنچ گئے۔ قریب تھا کہ اس کا کام تمام کر دیتے، مبارک شاہ نے انہیں آمادہ کرلیا کہ پہلے وہ اس سے بات کریں پھر چاہیں تو اسے قتل کردیں۔

''تم میری جان کے درپے کیوں ہوئے ہو۔ کیا دشمنی ہے میری تم سے؟''

''ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہم تو جس کے نوکر ہیں اس کا حکم مانتے ہیں۔ ہمیں ملک نائب کا حکم ملا ہے کہ تمہیں قتل کردیا جائے۔''

''نوکر تو تم سلطان شہاب الدین کے ہو، بادشاہ تو وہ ہے۔''

''وہ بے شک بادشاہ ہے لیکن حکم تو ملک نائب کا چلتا ہے۔ تمام امرا اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ کیا آپ اس کے پابند نہیں؟''

''اس کا حکم نہیں چلتا۔ لوگ اس کے ظلم سے ڈرتے ہیں۔''

''کچھ بھی ہو ہم نے اگر اس کا حکم نہیں مانا تو ہم اس کے عتاب کا نشانہ بنیں گے۔''

''کیا تم ان احسانات کو بھول گئے جو میرے باپ سلطان علاؤالدین خلجی نے تم پر کیے۔ اس نے تمہیں چاندی اور سونے سے مالا مال کردیا تھا۔ تم ایک ایسے شخص کا حکم مان رہے ہو جو خلجی خاندان کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینا چاہتا ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ اس نے دو خلجی شہزادوں کو اندھا کرادیا۔ ملکہ جہاں قید میں ہیں اور اب وہ مجھے راستے سے ہٹا دینا چاہتا ہے اور تم اس کا ساتھ دے رہے ہو۔ اس کی سازش کو سمجھو۔ جو غلام کی صورت میں میرے والد کے پاس آیا تھا، آج خزانے پر قابض ہے۔ اس کے بعد بھی اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو کر گزرو۔ میں تمہارا مقابلہ تک نہیں کروں گا۔''

خواجہ سرا سر جھکائے کھڑے تھے۔ انہیں اپنے فعل پر ندامت ہورہی تھی۔ شیخ نجم الدین کی دعا تھی یا کیا تھا کہ خواجہ سرا، مبارک شاہ کو قتل کیے بغیر جیسے گئے تھے ایسے ہی لوٹ آئے۔

واپس آکر انہوں نے اپنے سرداروں بشیر اور مبشر سے سارا قصہ کہا۔ وہ بھی متاثر ہوئے لیکن انہیں یہ فکر ہوئی کہ ملک نائب حکم عدولی کی سزا ضرور دے گا۔ پھر انہوں نے وہ فیصلہ کیا جو ملک نائب کی قسمت ہی ان سے کرا سکتی تھی۔

جب رات اپنے شباب پر آئی۔ بادشاہی محل کے تمام دروازے بند ہوگئے۔ پہرے داروں کے سوا کوئی نہیں رہا اور وہ سب بشیر اور مبشر کے ساتھی تھے۔ دونوں نے تلواریں ہاتھوں میں لیں اور ملک نائب کی خواب گاہ کے دروازے سے لگ کر کھڑے ہوگئے۔ پہرے دار خواجہ سراؤں میں سے ایک نے کسی کام کے بہانے ملک نائب کا دروازہ کھلوایا۔ بشیر اور مبشر خواب گاہ میں گھس گئے۔ ملک نائب کچھ سمجھنے بھی نہیں پایا تھا کہ قتل کردیا گیا۔

اسے قتل کرنے کے بعد یہ لوگ مبارک شاہ کے پاس پہنچے اور اسے قید سے آزاد کرایا۔

شہاب الدین کو بہ دستور بادشاہ رہنے دیا گیا۔ مبارک شاہ کو اس کی نیابت پر مقرر کیا لیکن آخرکار اس نے امرا وارا کین سلطنت کو اپنے ساتھ ملالیا اور صرف دو ماہ بعد شہاب الدین کو بادشاہت سے معزول کرکے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

مبارک شاہ کی بادشاہت کا اعلان کردیا گیا۔

اس بدبخت نے بھی وہی کھیل کھیلا جس کے لیے وہ ملک نائب پر لعن طعن کرتا رہا تھا۔ سات سال کے شہاب الدین کی آنکھوں میں سلائیاں پھروادیں اور گوالیار کے قلعے میں قید کرادیا۔ جو کام غیر نہیں کرسکے، اپنے کر گزرے۔

شہاب الدین صرف دو ماہ حکومت کرسکا تھا اور ملک نائب علاؤالدین خلجی کی موت کے بعد صرف 35 روز بعد قتل کردیا گیا۔

مبارک شاہ، خلجی خاندان کا آخری بادشاہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

شوق مردانگی

مختار آزاد

بے شک اچھی صحت اللہ کی طرف سے ایک نایاب تحفہ ہے مگر زر کی خواہش میں مبتلا کچھ نن آسان لوگ ایسی سمت چل نکلتے ہیں جن کی منزل ناآسودہ خواہشوں اور تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں... اس نے بھی شوق اور دیوانگی کی ایسی راہ اختیار کی تھی جس میں زندگی عجیب تماشے دکھا رہی تھی اور پھر اچانک اس کی اپنی زندگی داؤ پر لگ گئی... وہ ایسی بندگلی میں قید ہوگیا جہاں سناٹوں کا راج تھا۔

زندگی سے لطف اندوز ہونے والے ایک بے حس مسیحا کی روداد

وہ کُل چھ لوگ تھے اور تین گاڑیوں میں سوار ہوکر وہاں پہنچے تھے۔ دو اُس گاڑی سے اترے جس پر پولیس کا موٹو گرام بنا ہوا تھا۔ اسی طرح کی دوسری گاڑی سے تین لوگ باہر آئے۔ تیسری ایک نجی کار تھی۔ اس چھوٹی کار سے صرف ایک شخص باہر نکلا تھا۔ دوسرے لوگوں کی نسبت وہ پولیس والا نہیں لگ رہا تھا۔ باہر نکل کر وہ قطار بنا کر کھڑے

ہو گئے۔ اُن کے سامنے کھڑا لمبا تڑنگا شخص اُن سب کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ بہ ظاہر وہ اُن پولیس والوں کا انچارج افسر نظر آرہا تھا۔ اُس چھوٹی اور نجی کار والے کے سوا باقی تمام لوگوں کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے تھے۔ جسم کسرتی، آنکھوں پہ سیاہ چشمہ اور لباس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سیکیورٹی ایجنٹ ہو سکتے ہیں۔ چھوٹی کار والے شخص نے گرے کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھا۔ اگرچہ دو گاڑیوں پر نیو جرسی پولیس ڈیپارٹمنٹ کا مونو گرام بنا ہوا تھا مگر وہ لوگ مقامی پولیس والے نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ لمبا تڑنگا شخص خاموش ہوا اور آگے بڑھا۔ باقی لوگ چاروں طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے میرے کلینک کی طرف بڑھنے لگے۔

میں اُس وقت کلینک میں تھا اور سی سی ٹی وی کیمروں کے ذریعے انہیں کمپیوٹر مانیٹر پر دیکھ رہا تھا۔ میرے کلینک پر اکثر پولیس والے مریض کی حیثیت سے آتے رہتے ہیں۔ مقامی پولیس کے درجنوں افسران سے میری اچھی خاصی دوستی تھی مگر یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور کلینک پر کیوں آرہے ہیں۔ جس طرح وہ پہنچے اور آگے بڑھے، اس سے وہ مریض تو کسی طور نہیں لگ رہے تھے۔

کمرے میں کوئی مریض نہیں تھا۔ میں اُس وقت انٹر کام اٹھا کر استقبالیہ کو اگلا مریض بھیجنے کا کہنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نظر مانیٹر پر گئی۔ میں نے ریسیور رکھا اور انہیں دیکھنے لگا۔ اُس وقت اُن کی گاڑیاں کلینک کے سامنے پارکنگ ایریا میں رک رہی تھیں۔ پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر میری چھٹی حس خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں پوری توجہ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ نپے تلے قدموں سے کلینک میں داخل ہوئے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے انتظار گاہ میں پہنچ گئے جہاں کئی مریض اپنی باری کے انتظار میں رسالے پڑھ کر وقت گزار رہے تھے۔ جس انداز سے وہ اندر داخل ہوئے، وہ مریضوں کو چونکا گیا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے مگر وہ لاتعلق بنے استقبالیہ پر پہنچے جہاں ایک بڑے کاؤنٹر کے پیچھے کینسولا بیٹھی تھی۔ وہ دفتر کی استقبالیہ کلرک تھی۔ معائنے کے لیے وقت وہی دیتی تھی اور وہی مریضوں کو باری باری میرے پاس بھیجتی تھی۔

کینسولا نے انہیں دیکھا اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک شیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں آنے والے مریض اپنا نام لکھتے تھے اور پھر اسی کے مطابق نمبر آنے پر وہ انہیں میرے کمرے میں بھیج دیتی تھی۔ کینسولا نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کے لب ہلے۔ کینسولا نے اُن سے کیا کہا، یہ میں سن نہ سکا مگر میں سمجھ گیا کہ وہ اُن سے انشورنس کارڈ مانگ رہی ہوگی مگر اس کے جواب میں سب سے آگے کھڑے نووارد نے ایک فائل اس کے ہاتھ میں تھمائی اور کچھ کہا۔ اُس وقت میں کینسولا کے چہرے پہ آنے والے تاثرات صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ اجنبی کی بات سن کر پریشان نظر آرہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد میرے انٹر کام کی گھنٹی بج گئی۔

''کہو کینسولا۔'' میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔ اگر یہ وہی لوگ تھے کہ جن کی چار بجے کی اپائنٹمنٹ طے تھی تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں کافی دیر سے ان کے آنے کا منتظر تھا۔ اتفاق سے جن مریضوں کی اپائنٹمنٹ طے تھی، وہ بھی پولیس والے ہی تھے۔

''ڈاکٹر جیسمن...'' کینسولا نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ وہ پریشان لگ رہی تھی اور میں مانیٹر پہ اسے دیکھ رہا تھا۔ ''کچھ پولیس والے آئے ہیں۔ وہ ریکارڈ قبضے میں لینا چاہتے ہیں۔ اُن کے پاس تلاشی کا وارنٹ بھی ہے۔'' اس نے اٹکتے اٹکتے اپنی بات مکمل کی۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آرہی تھی۔

''کیا...؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تم نے وارنٹ پڑھا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا ہم ریکارڈ کی جانچ پڑتال یا اسے قبضے میں لینے سے ان پولیس والوں کو روک سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں سر! اُن کے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے۔''

''ٹھیک ہے، پھر انہیں اُن کا کام کرنے دو۔'' میں نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا تم انہیں روک نہیں سکتے، وہ فائلیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ مریضوں کا ریکارڈ ہے، ہزاروں مریضوں کا۔'' کینسولا نے گھبرائے لہجے میں سوال کیا۔

''کینسولا... مجھے یقین نہیں کہ انہیں روک سکوں گا۔'' میں نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

کینسولا میری بہت وفادار ملازم تھی۔ وہ کئی سالوں سے میرے پاس کام کر رہی تھی۔ وہ سادہ ہی نہیں، کسی حد تک بے وقوف بھی تھی۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی ہوگی کہ میں ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بااختیار ہوں۔ اس وقت بھی اس نے یہی سوچ کر یہ بات کہی ہوگی۔ میں بااختیار ہوں یا نہیں..... مگر ایک بات صاف ہے کہ پولیس اور وارنٹ کے ساتھ، انہیں روکنا تو کنا میرے بس کی

بات تو ہرگز نہیں تھی۔

پولیس والوں کی آمد میرے لیے حیران کن نہیں تھی۔ مگر یہ تو میرے خلاف کچھ کرنے آئے تھے۔ یقیناً ایسا کرنے کے لیے اُن کے پاس ٹھوس جواز بھی موجود ہوگا۔ اُس وقت وہ کینسولا کے سر پہ کھڑے تھے جس کی پشت پر دیوار گیر شیلف میں میرے تمام مریضوں کی پرسنل فائلیں موجود تھیں۔

میں مانیٹر پر دیکھ رہا تھا کہ کینسولا سے اُن کا رویہ نرم تھا وہ اتنی سادہ مزاج کی تھی کہ اگر پولیس والے ذرا سا بھی درشت لہجے میں اُس سے پوچھتے تو یہ انہیں وہ سب کچھ بتا دیتی خود شاید سرتوڑ تفتیش کے باوجود پولیس والے جان نہیں پاتے۔ اس کا بیان مجھے جیل پہنچانے کے لیے کافی ہوتا۔ دوسری طرف مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر اسے میرے سامنے کھڑا کر کے ہاتھ میں بائبل تھما کر بھی سچ پوچھا جاتا تو وہ کچھ بھی کہنے سے صاف انکار کر دیتی۔ یہی نہیں، اپنے حلفیہ بیان سے بھی انکاری ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے سامنے کچھ کہنے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ اسی لیے میری پوری کوشش تھی کہ اس سے بات کرتے ہوئے خود کو پُرسکون ظاہر کروں تاکہ اس کی ہمت بھی بندھی رہے۔ میں گھبراتا تو اس کا بوکھلا جانا یقینی تھا۔ میں بہ دستور مانیٹر پر اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ میری بات سن کر اس کی ڈھارس بندھی تھی۔ اب وہ خاصی مطمئن نظر آرہی تھی۔

''اگر کوئی پولیس والا میرے کمرے میں آنا چاہے تو انہیں روکنا مت۔ مجھے یقین ہے انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

استقبالیہ پر جو کچھ ہو رہا تھا، وہ میں مانیٹر پر دیکھ رہا تھا۔ تین پولیس والے استقبالیہ کی عقبی دیوار پر بنی الماریوں میں رکھی فائلیں اور دوسرا ریکارڈ اٹھا اٹھا کر دیکھتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک پولیس والا باہر گیا اور چار پانچ گتے کے بڑے بڑے تہ کیے ہوئے ڈبے لے آیا۔ اب دو پولیس والے فائلوں کی پڑتال کر رہے تھے، تیسرا انہیں ڈبوں میں رکھتا جا رہا تھا۔ میرے کلینک پر چھاپہ پڑ چکا تھا۔

پولیس والوں کے ساتھ آنے والا، سوٹ میں ملبوس شخص انتظار گاہ میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ سارے مریضوں کو پولیس نے واپس بھیج دیا تھا۔ اب وہاں کینسولا کے سوا باقی سارے لوگ وہی تھے، جو کچھ دیر پہلے گاڑیوں سے اترے تھے۔ میں مانیٹر پر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال میں خود کو پُرسکون رکھوں ورنہ ذرا سا اضافی تناؤ میرے لیے بڑی مصیبت کا سبب بن سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد دو پولیس والے میرے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک وہی لمبا تڑنگا شخص تھا جو چھاپے سے پہلے باقی لوگوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ میں نے فوراً مانیٹر کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور سر جھکا کر پیڈ پر کچھ لکھنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ جب وہ اندر پہنچیں تو انہیں قطعی یہ احساس نہ ہو کہ میں خوف زدہ ہوں۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میڈیکل کے شعبے میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہوتا اور بہت کچھ غلط بھی ہوتا ہے۔ جو کچھ ہوا، مجھے اس کا اندازہ بہت پہلے سے تھا۔ میرے لیے یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ میں نے اب تک میڈیکل کے پیشے میں علاج کے نام پر جو کچھ کیا تھا، اس کی وجہ سے مجھے یہ ڈر تو تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے مگر کب... یہ کہنا بہت مشکل تھا اور بدقسمتی سے وہ دن آ گیا تھا۔

جب سے پولیس والے کلینک میں گھسے تھے، تب سے میرا دماغ تیزی سے یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور بحیثیت ڈاکٹر میں جان چکا تھا کہ میرا بلڈ پریشر بھی ہائی ہو رہا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ پولیس والے صرف تلاشی کے لیے یہاں آئے ہیں یا پھر جاتے ہوئے کلینک کے ریکارڈ کے ساتھ مجھے بھی لے جائیں گے۔ یقین اور بے یقینی کے اس عالم میں، میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ مجھے گرفتار کر کے میڈیکل فراڈ انویسٹی گیشن ایجنسی کے حوالے کر دیں گے؟ میری کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ پر ایک بات طے تھی کہ جو ہوگا وہ بے حد بُرا ہوگا۔ شاید اُس کے بعد میں کلینک چلانے کے قابل ہی نہ رہوں۔ میرا میڈیکل پریکٹشنر کا لائسنس منسوخ ہو سکتا تھا۔ اس اچانک پڑنے والی افتاد کے باعث میرا دماغ بہت تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ میں بے حد پریشان تھا مگر پھر بھی خود کو بہ ظاہر پُرسکون اور چہرے کو بے تاثر رکھنے کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کر رہا تھا۔

''جی ڈاکٹر جیسمن، کیا ہو رہا ہے؟'' دو پولیس والے میرے کمرے میں گھس آئے تھے۔ ''میرا نام کیپٹن ایڈی ہے اور میں اس پارٹی کا انچارج ہوں جو یہاں تلاشی لینے کے لیے آئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پولیس شناختی کارڈ میری نظروں کے سامنے لہرایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔ فی الحال ہمارا ہدف صرف ریکارڈ اور تلاشی ہے۔''

''میرے پاس فی الحال تعاون کے سوا کوئی راستہ نہیں۔'' کیپٹن ایڈی کی بات سن کر میں نے زبردستی مسکرانے

کی کوشش کی۔ ”سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ دیکھ لیں جو دیکھنا ہے۔“

”شکریہ ڈاکٹر۔“ ایڈی نے مہذب مگر طنزیہ انداز میں کہا۔ اُس کے بعد وہ دونوں کمرے کی تلاشی لینے میں مصروف ہوگئے۔

اگرچہ مجھے اب تک باقاعدہ طور پر پولیس نے گرفتار نہیں کیا تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری گردن ایڈی کے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں ہے۔ اب تک میں آزاد تھا مگر یہ آزادی کب تک باقی رہتی ہے، اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

”پولیس سے پوچھ لو، اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو سارے ملازمین کو چھٹی دے دو۔“ کافی دیر تک سوچ میں غرق رہنے کے بعد میں نے انٹرکام پر کینسولا کو ہدایت دی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ کم از کم آج کی تاریخ میں، میں کسی مریض کو دیکھ سکوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس والے جو کچھ کرنے آئے تھے، وہ کام منٹوں کا نہیں گھنٹوں کا تھا۔ میں نے بازوں پسارے اور کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔ ذہنی تناؤ کے سبب سخت تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی بھی وقت دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔ ایسے میں کھلی آنکھوں سے پولیس والوں کی کارروائی دیکھنے کے بجائے میں نے مناسب سمجھا کہ آنکھیں موند کر خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کروں۔

☆☆☆

میں اس موڑ تک کیسے پہنچا، یہ جاننے کے لیے میرے اسکول کے زمانے کو جاننا ہوگا۔ نہیں، ٹھہریے ہائی اسکول — اوہ نہیں، صرف اسکول کی حد تک بات کریں، آگے کا معاملہ خود ہی سمجھ آجائے گا۔ بس یہ بات ذہن میں رہے کہ آپ مجھے جانتے ہیں اور میں اپنے اسکول کی دنوں کی بات کر رہا ہوں۔

میں ایک ناکارہ، گھامڑ اور ہر موقع پر نقصان اٹھانے والا لڑکا تھا۔ میں نے ہر بار کچھ نہ کچھ کھویا۔ اسکول میں ہر وقت اُبکائی لیتا رہتا تھا۔ میرا جسم مختلف امراض کا شکار تھا۔ جگر کمزور، معدہ خوراک ہضم کرنے کے بجائے اُلٹ دینا زیادہ مناسب سمجھتا تھا۔ کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔ اُس زمانے میں، میں تو بالکل چمگادڑ کی طرح تھا۔ روشنی میں آنکھیں چُندھیاتی تھیں۔ چہرہ مدقوق اور زرد، کمر آگے کو جھکی ہوئی، سینہ پیچھے کو دبا ہوا، پتلی پتلی پنڈلیاں... اب ایسے لڑکے کو کون دوست بنانا پسند کرتا ہے۔ اسی لیے میں سارا دن اپنے آپ میں مست رہتا تھا۔ کھیل بھی وہ کھیلتا، جو اکیلے کھیلا جاسکے۔ اکثر کھیلتے ہوئے جیتنے کی غرض سے میں خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دے دیتا تھا۔

کھیل میں دل نہ لگتا تو پنسل سے کاغذ پر تصویریں بنانے لگتا۔ رفتہ رفتہ پنسل اسکیچ بنانے میں میرا ہاتھ صاف ہوگیا۔ میری ہر تصویر میں ہمیشہ جوان مرد اور عورت ہوتے تھے۔ دونوں کے تاثرات اور جسمانی خطوط نہایت واضح ہوتے تھے۔ کئی بار میری تصویروں کو خوش قرار دے کر ٹھیک ٹھاک سرزنش بھی ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ پریکٹس جاری رہتی تو میں اس میدان میں آگے جاسکتا تھا مگر میں کمزور ارادوں کا کمزور بچہ تھا۔ باز پُرس اور ڈانٹ ڈپٹ سے دلبرداشتہ ہوا تو شوق کو ہی چھوڑ دیا۔

تنہائی کے احساس کا ایک بڑا فائدہ ہوا۔ جس نے مجھے کتابوں کی طرف مائل کر دیا۔ میں لڑکپن میں ہی یہ بات جان گیا تھا کہ ہمارے ذہن کی گنجائش بہت بڑی ہے جسے ہم مکمل کبھی استعمال نہیں کر پاتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں پڑھائی میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری کلاس میں غیر معمولی نظر آنے لگا۔ میرے گریڈ ہمیشہ اچھے آتے۔ میں ہر کلاس میں لگ بھگ پہلے یا دوسرے نمبر پہ رہتا تھا۔ یہ سلسلہ کالج تک جاری رہا۔ اس کی وجہ سے میں اساتذہ کی نظروں میں رہتا تھا۔

کتابوں میں گم ہونے کا ایک نقصان بھی ہوا۔ میری تنہائی بڑھتی گئی۔ میرا دماغ جتنا طاقت ور تھا، جسم اتنا ہی لاغر۔ دونوں میں بہ ظاہر کوئی مطابقت نہیں تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد یہ احساسِ تنہائی مزید بڑھ گیا تھا۔ میں تقریباً تیس سال کا ہونے والا تھا، جب خود کو جسمانی لحاظ سے بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے میں نے جم جوائن کر لیا۔ باقاعدگی سے ورزش شروع کر دی۔ چند مہینوں میں ہی اس کا اچھا نتیجہ نکلا۔ جسم بھرنے لگا۔ مدقوق چہرے پر رونق آنے لگی۔ جھکی کمر سیدھی اور پچکا سینا بھرنے لگا۔

کئی مہینوں کی نہیں بلکہ دو تین سالوں کی مسلسل کوشش سے میں بالکل بدل گیا تھا۔ اب مجھ میں اور اُس اسکول والے لڑکے میں جسمانی لحاظ سے زمین آسمان کا فرق تھا۔ جم نے میری پوری شخصیت کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

یہ اُس سے چند لمحوں پہلے کی بات ہے جب پولیس والے میری گردن ناپنے کے لیے کمرے کے اندر پہنچے تھے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا مانیٹر پہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو پولیس والے باہر استقبالیہ میں کر رہے تھے۔ سب دستانے

پہن کر سارا ریکارڈ ڈبوں میں پیک کررہے تھے۔ اُن کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ کسی اہم جرم کے موقع واردات سے ثبوت اکٹھے کررہے ہوں۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ میں اپنے وکیل کو فون کروں مگر اگلے ہی لمحے میں نے اُس پر لعنت بھیجی۔ وہ جائداد اور دیگر مالی اُمور کے مقدمات کا ماہر وکیل تھا مگر یہاں کیس کی نوعیت مجرمانہ تھی۔ اس کام کے لیے وہ سو فیصد ناموزوں وکیل تھا۔ اگر میں اس سے رابطہ کرتا تو وہ کسی موزوں وکیل سے بات کرواسکتا تھا لیکن میرے پاس وقت نہیں تھا۔ ہر لمحے میری فائلیں، ریکارڈز اور دیگر دستاویزات پولیس کی تحویل میں جارہی تھیں۔ جب تک وکیل کچھ کرپاتا، تب تک سب کچھ پولیس کے قبضے میں چلا جاتا اور یہ میں نہیں چاہتا تھا مگر یہاں بات میرے چاہنے یا نہ چاہنے کی نہیں تھی۔ سب کچھ پولیس کی مرضی کے مطابق ہورہا تھا۔ اس وقت اگر میں کسی نہایت قابل وکیل کو ایک لاکھ ڈالرز بھی دیتا تو بھی وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ پولیس کے پاس تلاشی کا وارنٹ تھا۔ وارنٹ کی موجودگی میں مجھے ان سے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ ویسے بھی میں جو کھیل کھیلتا رہا تھا، اس وقت وہ میرے لیے سخت پریشانی کا سبب بننے جارہا تھا۔

میرے مرد مریض ہوں یا عورتیں، سب قانون کے سامنے بائبل کو سر پہ اٹھا کر گواہی دیں گے کہ وہ مجھ سے علاج کراتے رہے ہیں۔ انہیں فائدہ بھی پہنچا مگر نہ مرض جڑ سے ختم ہوا اور نہ علاج بند ہوا۔ جب انہیں پتا چلے گا کہ میں علاج کے نام پر انہیں کیا کیا دوا دیتا رہا ہوں تو سب میری تِکا بوٹی کرڈالیں گے۔ میں کس کس سے نمٹتا پھروں گا...... عدالت، عوام اور میڈیا... سب کی توپوں کا رُخ میری طرف ہونے والا تھا اور میں آنے والے وقت سے اچھی طرح واقف تھا۔

پولیس والے بڑے انہماک سے فائلیں اور دیگر ریکارڈ جمع کرنے میں مصروف تھے۔ ویسے میرے لیے ایک بات ایسی تھی جو اس گمبھیر صورت حال میں بھی کچھ اطمینان کا باعث تھی۔ نہ تو میں دماغی طور پر مردہ تھا اور نہ ہی بے وقوف کہ سب کچھ کاغذات پر ٹھیک ٹھیک لکھ کر انہیں حفاظت سے کلینک کے ریکارڈ میں رکھتا۔ اور یہ بات تو میں بہت پہلے سے جانتا تھا کہ جو کچھ کررہا ہوں، وہ ایک دن پولیس کو یہاں تک ضرور لائے گا۔ ایسے میں جان بوجھ کر کون اپنے خلاف ٹھوس ثبوت یوں سب کی نظروں کے سامنے رکھے شیلف میں سجا کر رکھے گا مگر پھر بھی ان دستاویزات کا تجزیہ، پولیس کی تفتیش اور مجھ جیسا سیدھا سادا ڈاکٹر... کوئی بھی چیز خطرہ بن سکتی تھی...... یہ ریکارڈ میرے خلاف ٹھوس ثبوت بن سکتے تھے۔

میرے کمرے میں موجود دو پولیس والے ریکارڈ کے علاوہ شاید کچھ ٹھوس شواہد تلاش کرنے کی بھی کوشش کررہے تھے لیکن میں نے جو کچھ کیا تھا، اس کا ٹھوس ثبوت یوں تو نہیں ملتا، البتہ میرے کمرے میں ایک ٹھوس ثبوت تھا۔ یہ اعشاریہ چوالیس کی میگنم اسمتھ اینڈ ویسن پستول تھی جس کا باقاعدہ لائسنس میرے پاس تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی خطرناک پستول تھی۔ پستول اور سیکیورٹی کیمروں کی تنصیب دراصل میرے مزاج کے خلاف تھی مگر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ میں ان دونوں چیزوں کو رکھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

وہ مریض ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اُس سہ پہر جب وہ کلینک پہنچا تو شدید نشے میں تھا۔ اُس کی سوجی، سرخ آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر کینسولا کے ساتھ بدتمیزی کی۔ وہ اتنے زور زور سے اُس پہ چلارہا تھا کہ میرے کمرے میں بھی اُس کی آوازیں پہنچ رہی تھیں۔ میرے لیے ایسے شرابی سے نمٹنا بہت مشکل تھا۔ خیر میں باہر نکلا اور استقبالیہ پر گیا۔ خوف سے کینسولا کی حالت بہت بری تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے کچھ مریضوں کے ساتھ مل کر اسے کلینک سے باہر نکالا۔ اس دن میں نے کینسولا سے وعدہ کیا تھا کہ ایسا کچھ کروں گا کہ پھر اس طرح کے حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں نے اُس سے کیا ہوا وعدہ نبھایا۔ چند روز بعد میں نے سیکیورٹی کیمرے نصب کروائے اور پستول خریدلی۔ مجھے یقین تھا کہ خوفناک شکل کی اس پستول کو دیکھتے ہی بڑے بڑوں کا پتا پانی ہوسکتا تھا۔ میرے کمرے میں تلاشی لینے والے پولیس والے بہ دستور مصروف تھے۔ میں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے ان کی سرگرمیاں دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' ایک پولیس والے نے دراز کھولی اور پستول باہر نکالتے ہوئے کہا۔

''غور سے دیکھو، وہیں اس کا لائسنس بھی رکھا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ قانونی ہے اور ذاتی حفاظت کے لیے۔'' یہ کہہ کر میں نے دوسری طرف منہ کرلیا۔ وہ بڑے غور سے پستول کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ ''احتیاط سے... پستول لوڈ ہے۔'' میں نے منہ موڑے بغیر کہا۔

دراز کھینچنے کی آواز آئی تو میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ پولیس افسر ایڈی لائسنس نکال کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے پستول واپس دراز میں رکھ دی تھی۔ ''او کے ڈاکٹر۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور کسی دوسری اہم چیز کی تلاش میں لگ گیا۔

کینسولا تلاشی کا وارنٹ دیکھ کر تصدیق کرچکی تھی۔ اسی لیے میں بھی چپ بیٹھا تھا کہ شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری پوری کوشش تھی کہ اس ناگہانی پڑنے والی اُفتاد کے باعث میرے دل کی بے ترتیب دھڑکنیں معمول پہ آجائیں۔ بہ ظاہر مجھے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ پولیس چھاپے سے میں خوف زدہ ہوا۔ البتہ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کنپٹی پہ بھی دباؤ بڑھ رہا تھا۔

میری عمر اڑتالیس سال تھی مگر باقاعدگی سے ورزش اور جم جانے کے باعث بہ ظاہر میری صحت قابلِ رشک تھی۔ میری عمر کے اکثر لوگ مٹاپے کا شکار ہوجاتے ہیں مگر مجھے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں فربہی کی طرف مائل ہوں۔ میں بہ مشکل پچیس تیس سال کا دکھائی دیتا تھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں، کمر سے لگا پیٹ، چوڑا سینہ... اگر کوئی اجنبی دیکھے تو وہ مجھے ڈاکٹر نہیں، ایتھلیٹ سمجھے گا۔ لوگ مجھے صحت مند سمجھتے تھے مگر یہ میں ہی جانتا تھا کہ اندر سے سو فیصد صحت مند نہیں تھا۔

گزشتہ چند سالوں سے کلینک پر میری مصروفیات بہت بڑھ چکی تھیں لیکن اس کے باوجود باقاعدگی سے ہفتے میں دو تین بار جم جاتا تھا۔ پولیس والوں نے اب تک تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے میں ان کے مستقبل کے ارادوں کو جان سکتا۔ میں سوچ رہا تھا اگر تلاشی کے بعد گستاپو کے انداز میں چھاپہ مارنے والے یہ پولیس اہلکار مجھے گرفتار کرکے لے گئے تو میرے جم کے شیڈول کا کیا ہوگا۔ یہ سوال رہ رہ کر ذہن میں آرہا تھا۔ میں کئی سالوں سے جم جارہا تھا۔ کسرتی جسم میرا شوق تھا۔ جم جانا میری عادت بن چکی تھی۔ اب اگر گرفتار ہوتا ہوں تو کیا یہ سب کچھ کرسکوں گا؟ پولیس والے اپنے کام میں مصروف تھے اور میں اپنی سوچوں میں غرق تھا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ مجھے بھول چکے ہیں یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

''اے سنو...'' میں نے نرم آواز میں کمرے میں موجود پولیس والوں کو پکارا۔ ''میں ڈاکٹر جیمسن ہوں۔ تم میرے کلینک میں جو کچھ کرتے پھررہے ہو، کیا میں اس کا وارنٹ دیکھ سکتا ہوں؟'' میرا لہجہ مہذبانہ مگر سخت تھا۔ اب تک میں کچھ نہیں بولا تھا مگر کافی سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں احساس دلانا چاہیے کہ میں اس کلینک کا مالک ہوں اور یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ ویسے تو میں جانتا تھا کہ کینسولا وارنٹ دیکھ چکی ہے مگر انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے میں نے یہ بات کہی تھی۔

یہ سن کر ایک پولیس والا مڑا اور میرے قریب آکر اس نے ایک فائل میری طرف بڑھائی۔ ''بہتر ہے کہ اسے اچھی

بذریعہ ڈاک
معقول فیس میں ہنرمند بنیں
0344-2609828
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام پتہ کورس کا نام ضرور لکھیے
ہنر سیکھیے
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
حکمت ڈسپنسر ایکوپنکچر لیڈیز ٹیلرنگ کشیدہ کاری لیبارٹری ٹیکنیشن U.P.S ٹیکنیشن
علاج نبوی ڈریس ڈیزائنر بیوٹی پارلر ہومیو پیتھک
یوگا انٹیریئر ڈیکوریشن ایریبک سروئیر کمپیوٹر
ہوٹل مینجمنٹ شارٹ ہینڈ
فارمیسی فن مصوری میجک
فائر فائٹنگ
دی انسٹی ٹیوٹ پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی 75080

طرح پڑھ کر اپنی تسلی کرلو۔'' اس نے سرد آواز میں کہا۔

میں نے فائل لی۔ اس میں صرف تین کاغذات تھے۔ یہ دراصل تین وارنٹ تھے۔ میں ایک، ایک کر کے انہیں پڑھنے لگا۔ ایک میرے کلینک، دوسرا گھر کی تلاشی کے لیے تھا۔ وارنٹ، نیو جرسی ڈسٹرکٹ کورٹ نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی درخواست پہ جاری کیا تھا۔ میں نے تفصیل سے پڑھا۔ وارنٹ بالکل درست تھے۔ مگر جیسے ہی تیسرا وارنٹ دیکھا میرے اوسان خطا ہوگئے۔ تیسرا وارنٹ میرے گودام اور دیگر تمام متعلقہ جگہوں کی تلاشی کے لیے تھا۔

''سب کچھ یہاں ہے تو پھر گھر اور گودام کی تلاشی ضروری ہے؟'' میں نے سوچا۔ گودام کی تلاشی کا وارنٹ مجھے بری طرح چونکا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس نے بڑا پکا ہاتھ ڈالا ہے۔ گودام کے بارے میں میری بیوی بھی نہیں جانتی تھی تو پولیس کو کیسے پتا چلا۔ اس سوال کا جواب مجھے لمحہ بھر میں مل گیا۔ گودام کے بارے میں میرے بعد صرف ایک ہی شخص کو علم تھا اور وہ تھی کینسولا... یہ بات ذہن میں آتے ہی دماغ کی چولیں ہل گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ جم سے شروع ہونے والا دولت کا یہ کھیل بس اب ختم ہونے والا ہے۔ گودام کی تلاشی کا مطلب میری موت تھا۔

☆☆☆

میرا پہلی بار جم جانے کا واقعہ تو بھرپور کامیڈی ہے۔ میں عمر کی تیسری دہائی میں تھا اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جب میں پہلی بار ویٹ لفٹنگ کی کلاس میں گیا تو وہاں ساری عورتیں تھیں۔ کئی ایک نے مجھ کمزور اور ناتواں جسم والے کو پہلے تو حیرت سے دیکھا۔ پھر زوردار قہقہہ لگایا اور اس کے بعد کئی نگاہوں نے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں ''کیوں اپنی جان پہ ستم ڈھانے آئے ہو میرے بچے۔''

جم کی پہلی کلاس میں جو کچھ میرے ساتھ ہوا، اس کی وجہ سے بہت شرمسار تھا مگر میرا عزم جواں تھا۔ میں انسانی جسم کو دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تن سازی اور خوراک کے درست استعمال سے میں خود کو بدل سکتا ہوں۔ ویسے بھی میں ڈاکٹر بن چکا تھا۔ خوراک کے بہترین امتزاج سے جسم پر اُس کے اثرات کو اچھی طرح جانتا تھا۔ شاید اسی لیے شرمندگی محسوس کرنے اور عورتوں کے 'ایک مرد ناتواں' کا مذاق اُڑانے کے باوجود میں اپنے مقصد سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا۔

مجموعی طور پر میں اپنی زندگی میں ناکام شخص رہا ہوں۔ جس وقت میں بہ طور ڈاکٹر اپنی عملی زندگی شروع کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا، اُس وقت میرے اسکول کے کئی ساتھی اپنی پیشہ ورانہ زندگی شروع کر کے خود کو مستحکم کر چکے تھے۔ اُن کے پاس بہترین گاڑی تھی، گرل فرینڈز تھیں، گھر تھا اور جیب میں پیسے بھی مگر میں... ایک کمرے کے گھٹیا فلیٹ میں رہنے والا ڈاکٹر جیسمن ہائیڈ جو پرانی کار میں بیٹھ کر اپنا مقدر بنانے کے لیے سارا دن اِدھر سے اُدھر نوکری کی تلاش میں پھرتا تھا۔ اسکول کے زمانے کی تنہائی جوانی میں بھی برقرار تھی۔ کسی لڑکی نے مجھے اب تک اپنا بوائے فرینڈ بنانا پسند نہیں کیا تھا۔

میڈیکل کے شعبے میں میری سب سے بڑی خاصیت مریض کے درد کی شدت کو کم کرنا تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بچپن سے ہی مجھے دماغ کی صلاحیتوں کو سمجھنے اور استعمال کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ میں نے میڈیکل میں بھی اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ طالب علمی کے دوران میری پریکٹس جاری رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب میں کالج سے فارغ ہوا تو درد کم کرنے کے لیے دوا کے ساتھ ساتھ اپنے طریقے کو بھی استعمال کرنے پر قدرت حاصل کر چکا تھا۔ میں انٹرویو کرنے والوں کو یہ سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتا کہ ہم دماغی صلاحیتوں کو دوا کے ذریعے استعمال کر کے مریض کو بہت کم وقت میں فائدہ پہنچا سکتے ہیں مگر کوئی میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ ایک صرف میں ہی تھا جو اپنی اس لیاقت کے بارے میں پُراعتماد تھا ورنہ... میں کئی جگہ انٹرویو دینے گیا مگر ہر جگہ ناکامی میرا مقدر بنی۔ اُس وقت تو مجھے خود کو مسترد کیے جانے کی ٹھوس وجہ معلوم نہیں تھی مگر اب سوچتا ہوں تو وہ وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ میری ناکامی کا بنیادی سبب میرے خیال میں میرا حلیہ تھا۔ میں کہیں سے ڈاکٹر نظر نہیں آتا تھا حالانکہ میں ڈاکٹر تھا۔ اس کے برعکس جو میں نہیں تھا، وہ سب کو نظر آتا تھا۔ شکن دار سوٹ، سلوٹ پڑی میلی قمیص، کوٹ، ٹائی اور پتلون ایک دوسرے سے قطعی مختلف... جسمانی خدوخال سے میں لڑائی بھڑائی کرنے والا لگتا تھا اور لباس سے کسی برگر شاپ کا ویٹر۔

ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کافی عرصے جاری رہی مگر ناکامی نے ہر جگہ میرا راستہ روکا۔ آخر میری ہمت جواب دے گئی اور بہت سوچ وبچار کے بعد میں نے اپنا نجی کلینک کھولنے کا فیصلہ کیا۔ پیسے پلّے نہیں تھے مگر پھر بھی جیسے تیسے کر کے میں نے کلینک کھول ہی لیا۔ بے روزگاری میں کافی بڑی سرمایہ کاری کی تھی۔ میرے نزدیک کامیابی کی صرف ایک وجہ تھی اور وہ بھی میری خاص قابلیت کہ مریض کو کس طرح

کم سے کم دوا استعمال کروا کر درد سے چھٹکارا دلایا جاسکتا تھا۔ امید تھی کہ دو چار سال میں کلینک جم جائے گا۔ اسی لیے جیسے تیسے کر کے کام چلاتا رہا۔ کلینک کا کرایہ، ٹیکس، اپنے اخراجات اور پھر کلینک کی واحد ملازمہ کینسولا کی تنخواہ کو کہ وہ بہت کم تھی مگر پھر بھی مہینے کے آخر میں ان سب اخراجات کو پورا کرتے کرتے مجھے دانتوں پسینا آجاتا تھا مگر سب کچھ صرف امید پہ چل رہا تھا۔

شروع شروع کے مہینوں میں کلینک پر بہت کم مریض آتے تھے۔ زیادہ تر وہ تھے جن کا پنشن پہ گزارا تھا اور معروف ڈاکٹروں کی بھاری فیسیں ادا کرنے کے قابل نہ تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے کہ جن کا مرض پرانا تھا اور وہ شفا کی تلاش میں ایک کے بعد ایک ڈاکٹر آزمائے جا رہے تھے۔ ان سے زیادہ فیس وصول کرنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ اس لیے جو ملتا، صبر شکر کر کے پکڑ لیتا تھا لیکن ایک بات ضرور تھی، میرے کلینک پہ جو آتا، شروع شروع میں تو اسے اعتبار نہیں ہوتا تھا مگر جب بہت جلد افاقہ محسوس ہوتا تو میرا گرویدہ ہوجاتا تھا۔ کسی معروف ڈاکٹر کو بنا ایمرجنسی کے فون کرو تو کم از کم تین دن بعد کا اپائنٹمنٹ ملتا ہے مگر میرے ہاں ابھی فون کرو، گھنٹا بھر بعد آجاؤ۔ گو کہ مریضوں کی تعداد بہت ہی کم تھی مگر پھر بھی میں نے تمام تکلفات کیے ہوئے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ مریض پہنچا اور سیدھے میرے کمرے میں بلکہ پہلے وہ استقبالیہ پر پہنچتا، کوائف درج کرواتا۔ اس کے بعد کینسولا مریض کی فائل تیار کرتی جس کے بعد اسے ویٹنگ روم میں کچھ انتظار کرنا پڑتا تھا، تب کہیں جا کر وہ میرے پاس آتا۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی سوچتا تھا کہ ویٹنگ روم کا تکلف کس لیے.....؟ مگر یہ بات خود میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ ویٹنگ روم عموماً مریضوں سے خالی رہتا تھا۔

سچ پوچھو تو میری زندگی میں جتنی ناکامیاں آئی تھیں، وہ کسی بھی شخص کو بہ آسانی خودکشی پہ اُکسا سکتی تھیں مگر جم اور کسرت نے نفسیاتی طور پر مجھے بہت سہارا دیا تھا۔ میں ہفتے کے چھ دن باقاعدگی سے جم کی کلاسیں اٹینڈ کرتا تھا۔ اس سے مجھ میں اعتماد آیا۔ بُرے حالات سے لڑنے کی طاقت آئی ورنہ تو میں کب کا حوصلہ چھوڑ دیتا۔ دوسری بات میرا اطمینان تھا۔ مریض آئیں یا نہ آئیں مگر میں اپنے مقررہ وقت پر کلینک پہنچتا اور طے شدہ وقت تک بیٹھتا تھا۔ مجھے کم از کم اتنا تو یقین تھا کہ اپنی کوشش پوری کر رہا ہوں اگر اس کے بعد بھی ناکامی مقدر بنتی ہے تو اس میں میرا نہیں کسی اور چیز کا قصور ہوگا، شاید قسمت... سب کچھ کرنے کے باوجود اگر صلہ نہ ملے تو پھر قسمت کو ذمے دار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

میں نے کسرت کر کے اپنی جسمانی حالت بہت بہتر بنالی تھی۔ پر میری زندگی محبت سے خالی تھی۔ ذرا جسمانی حالت بہتر ہوئی تو میں نے کئی لڑکیوں پہ دوڑے ڈالنے کی کوشش کی مگر ہر بار جس لڑکی کے قریب ہونے کی کوشش کی وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر کسی اور کے جال میں پھنس گئی۔ اب تو میں نے بھی خود کو کسی حد تک سمجھا لیا تھا کہ فی الوقت اس دنیا میں کوئی لڑکی میرے لیے نہیں۔

☆☆☆

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ تلاشی جاری تھی۔ انہوں نے ہر شے اُلٹ پلٹ کر دی تھی۔ کمرے کو کھنگالنے والے پولیس افسر ایڈی نے جب سے مجھے وارنٹ تھمائے تھے، تب سے تیسرے وارنٹ کو دیکھتے ہی میری جو حالت غیر ہوئی تھی، وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکی تھی۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ دل کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ کان کی لویں، سر اور چہرہ تمتمانے لگا تھا یہ سوچ کر کہ کینسولا... میں نے وارنٹ پڑھ کر ایڈی کو واپس کر دیا تھا مگر جو دھچکا مجھے تیسرے وارنٹ کو دیکھ کر لگا وہ بہ دستور پریشان کیے ہوئے تھا۔ ''شکریہ۔'' میں نے ایڈی کو وارنٹ کی فائل لوٹاتے ہوئے کہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ میرے چہرے کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔

اس کے دیکھنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ ماتھے پہ پسینا نمودار ہو چکا ہے۔ شاید اس پسینے کو دیکھ کر ہی پولیس والا مطمئن ہوا ہوگا کہ یہ گھبراہٹ کی نشانی ہے اور انہیں کوئی دھماکے دار ثبوت ملے گا۔ شاید اسی وجہ سے وارنٹ واپس لیتے وقت اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی، جس سے اس کی بڑی بڑی مونچھوں میں بھی ہلکی سے جنبش ہوئی تھی۔

وہ بہ دستور کمرے کی تلاشی میں مصروف تھے لیکن اُن کے چہروں کو دیکھ کر یہ نہیں لگتا تھا کہ اب تک کوئی خاص چیز انہیں مل سکی ہے۔ یہ بات میرے لیے اطمینان کا باعث تھی۔ اس دوران میں بہ دستور انہیں دیکھتا ہوا گودام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اپنے خلاف تمام ثبوت مٹانے کے لیے صرف پندرہ منٹ چاہیے تھے۔ یہ بہت زیادہ وقت نہیں تھا مگر اس صورتِ حال میں یہ موقع ملنا بھی محال تھا۔ دل چاہتا تھا کہ تیزی سے اٹھوں، کمرے کی کنڈی چڑھاؤں۔ بھاگ کر یہاں سے نکل جاؤں اور ہر وہ شے تلف کر دوں جو میرے خلاف ثبوت بن سکتی ہے۔ مجھے صرف پندرہ منٹ چاہیے تھے مگر... یقین نہیں تھا کہ جو سوچ رہا ہوں ویسا کر بھی سکوں گا۔

دفتر اور گھر، ان کی تلاشی پہ مجھے کوئی اعتراض تھا اور نہ ہی کوئی خوف مگر گودام... یہ خطرے کی بات تھی۔ پولیس والے جب اس گودام کی تلاشی لیتے تو میرا پھنسنا یقینی تھا اور آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔ میرے خیال میں یہ ترکیب کارگر ہو سکتی تھی مگر پولیس کے سامنے نہیں، جج کے روبرو۔ مجھے اپنی چال کا ٹرمپ پتا عدالت میں کھیلنا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ گودام سے مکمل لاتعلقی ظاہر کروں گا۔ مجھے پولیس سے بچنا محال نظر آ رہا تھا اس لیے میں نے ممکنہ گرفتاری کے بعد عدالت میں پیشی کے حوالے سے لائحہ عمل تیار کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ سچ کہوں گا تو مروں گا، اسی لیے جھوٹ سے کام لینے کا پکا تہیہ کرلیا تھا۔

''جناب والا یہ گودام میرا ہے اور نہ ہی اس میں رکھی کسی شے سے میرا کوئی تعلق۔ یہ تو میرے نام پر بھی نہیں پھر میں کیسے اس میں موجود کسی شے کے باعث مجرم بن سکتا ہوں۔''

میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ جب مجھے جج کے روبرو پیش کیا جائے گا تو کس طرح اپنا دفاع کروں گا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دلیل پولیس کیس کو کمزور کر دے گی۔

گودام میرے استعمال میں تھا اور اکثر مجھے اس کی ضرورت رہتی تھی۔ جج کے روبرو اس کی ملکیت سے انکار صرف جان بچانے کا ذریعہ تھا۔ یہ گودام اس بات کا ثبوت تھا کہ پچھلے چند سالوں میں میری زندگی نے کس طرح اپنا رخ بدلا تھا۔ ویسے اس گودام اور میری ترقی، دونوں کا تعلق میرے تن سازی کے شوق اور جم سے جڑا تھا۔

بات یہ ہے کہ جب شروع شروع کے دنوں میں، کلینک سے اٹھ کر جم جاتا تھا تو وہاں میری ملاقات ایک موٹے، بھدے اور بڑی عمر کے شخص اسٹین سے ہوئی تھی۔ وہ بہ ظاہر جوس بیچتا تھا مگر یہ پورا سچ نہیں تھا۔ وہ ورزش کے لیے آنے والے ایتھلیٹس کو ایسی ممنوع ادویات بیچتا تھا جس سے اُن کا اسٹیمنا بڑھتا تھا لیکن بہ طور ڈاکٹر میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اسٹرائیڈز کا استعمال زیادہ مقدار میں کافی عرصے تک کیا جائے تو اس سے صحت پر مضر اثرات پڑتے ہیں۔ ایسے اثرات جو جان لیوا بھی ہو سکتے ہیں۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایک ڈاکٹر کس طرح ایسی ادویات کے استعمال کی اجازت دے سکتا ہے یا وہ خود انہیں استعمال کر سکتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اگر اسٹرائیڈز کا محتاط استعمال کیا جائے تو نہ صرف کھلاڑی کھیل میں اچھی کارکردگی دکھا سکتا ہے بلکہ اس کے استعمال سے کسی مریض کے درد کی شدت میں بھی فوری کمی بھی لائی جا سکتی ہے۔ اسٹرائیڈز کا استعمال ایتھلیٹ، تن سازی سمیت تمام کھیلوں میں ممنوع ہے۔ حتیٰ کہ کھلاڑی کوئی اعزاز حاصل کرلے اور بعد میں ڈوپ ٹیسٹ سے اسٹرائیڈز کا استعمال ثابت ہو تو نہ صرف اعزاز واپس لے لیا جاتا ہے بلکہ وہ کھلاڑی بلیک لسٹ بھی کر دیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود چوری چھپے استعمال جاری ہے۔ جوس فروش اسٹین جسے سب انکل کہتے تھے، جم آنے والے تن سازوں اور پیشہ ور ایتھلیٹس کو چوری چھپے ممنوعہ ادویات فروخت کرتا تھا۔ یہ بات میں بھی جان چکا تھا۔ ویسے اسٹین بہت محتاط شخص تھا۔ وہ ہر ایرے غیرے کو ادویات بیچنے سے کتراتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ راز کھلا تو اسے جیل جانا پڑے گا۔ وہ اتنا محتاط تھا کہ اس کے صرف چند مستقل گاہک تھے اور کسی ایک کو دوسرے کو بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

انکل اسٹین نے مجھے مشورہ دیا کہ اپنے دُبلے پتلے جسم کو بہتر بنانے، سینے کو چوڑا کرنے، بازوؤں کی مچھلیوں کو پھلانے کے لیے میں کچھ دن ان ادویات کو استعمال کروں۔ میں ڈاکٹر تھا۔ انکل جس شے کا مشورہ دے رہا تھا، اس کا کیمیائی اثر جانتا تھا۔ آخر کافی سوچنے کے بعد میں نے اسٹرائیڈز کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی سائڈ ایفیکٹ ہوا تو میں خود اپنا علاج کرلوں گا۔ چند ہفتوں کے استعمال سے ہی فرق ظاہر ہونے لگا۔ میں بہت خوش تھا۔ بازوؤں کی پھڑکتی مچھلیاں، چوڑا سینہ، تنی ہوئی گردن... میرا جسم بھرتا جا رہا تھا۔ مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اب کسی بار میں جا کر ناچتے ہوئے میں اپنی شرٹ اتار کر ہوا میں اچھال سکتا ہوں۔ میں نے دیکھا تھا کہ بار میں آنے والی لڑکیاں تن ساز لڑکوں کو بہت پسند کرتی تھیں۔

اسٹرائیڈز کسی ایک خاص دوا کا نام نہیں۔ بہ طور ڈاکٹر میرا علم اسٹرائیڈز کے بارے میں انکل اسٹین سے بہت زیادہ تھا۔ جب ان کے استعمال سے مجھے اپنے اندر واضح تبدیلیاں نظر آئیں تو رفتہ رفتہ میں نے اپنے مریضوں کو بھی اس کا استعمال کرانا شروع کر دیا۔

اِدھر تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا، دوسری طرف میری جسمانی تبدیلی نے جم کے ٹرینروں کو ہی نہیں، وہاں مجھ سے پہلے آنے والے کئی لوگوں کو بھی سخت حیران کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جب میں پہلی بار آیا تو کتنا نحیف تھا مگر جتنی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں، وہ سب کے لیے حیران کن تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ سب اس بارے میں سوچ رہے تھے مگر مجھ سے بات کرنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ تو جانتے تھے کہ میں ڈاکٹر ہوں اور کلینک چلاتا ہوں اس لیے شاید وہ یہ سوچتے ہوں کہ میں نے اسٹرائیڈز کے بجائے کسی اور خاص دوا کے استعمال سے اپنا وزن اور اسٹیمنا بڑھایا ہے۔

''تمہارا اسٹیمنا تو بہت شاندار ہے۔'' اُس روز ورزش کرتے ہوئے ٹرینر نے جب میری تعریف کی تو اس کی آنکھوں میں سوال بھی پوشیدہ تھا۔ ''لگتا ہے تم نے اپنے لیے کوئی خاص نسخہ تیار کیا ہے۔ کر سکتے ہو بھئی، ڈاکٹر جو ٹھہرے۔'' بہ ظاہر اس نے دوستانہ لہجے میں یہ بات کہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ متجسس تھا کہ اتنی قلیل مدت میں یہ تبدیلی کیسے آئی تھی مگر پوچھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اسی لیے گول مول بات کہی تھی۔ میں نے بھی جواب دینے کے بجائے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

جب سے میں نے اپنے مریضوں کو اسٹرائیڈز ملی گولیاں اور شربت پلانا شروع کیا تھا، اُس سے انہوں نے اپنی زندگی میں خوشگوار تبدیلیوں اور پُرمسرت احساسات کا اظہار کیا تھا۔ میرے مریض زیادہ تر وہ بوڑھے جوڑے تھے جو جسم کے جوڑوں کے درد، کمزوری اور اسی طرح کے بڑھاپے کے دیگر امراض کا شکار تھے۔ کئی جوڑوں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ وہ دوا کے استعمال کے بعد اب اپنی ازدواجی زندگی میں وہی پرانے جذبات ایک بار پھر محسوس کرنے لگے ہیں جو نوجوانی کے عالم میں تھے۔ وہ خوش تھے کہ انہیں مرض میں افاقے کے ساتھ ساتھ جذباتی تازگی بونس میں مل گئی تھی۔ بس! پھر کیا تھا، میری شہرت پھیلتی گئی۔

بہت جلد میرے پاس کافی تعداد میں مریض آنے لگے تھے۔ کمائی اچھی ہو گئی تھی۔ یہ اور بات کہ میں جو کچھ کر رہا تھا وہ غیر قانونی تھا۔ میری ادویات کا طویل عرصے تک استعمال مضرِ صحت تھا۔ مریضوں کے جگر ناکارہ ہو سکتے تھے، دل کا دورہ پڑنے کا خطرہ تھا۔ گردے کام کرنا چھوڑ سکتے تھے مگر مجھے کیا... مجھے تو زندگی میں پہلی بار کامیابی مل رہی تھی۔ کامیابی اور زندگی میں پہلی بار، اس نشے نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ نہ ہی انسانیت یاد رہی اور نہ ہی قانون کا ڈر۔

ایک دن میں حسبِ معمول کلینک پہ تھا کہ ایک فون آیا۔ میں نے اسے فوراً سہ پہر کا ٹائم دے دیا۔ جب وہ آیا تو مجھے حیرت ہوئی۔ بہ ظاہر وہ مضبوط ہاتھ پاؤں والا تیس پینتیس سال کا مرد تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔ اسے نہایت نجی قسم کی تکلیف تھی۔ میں نے اس کے کچھ ٹیسٹ لیے اور پھر پتا چل گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ بہ ظاہر وہ صحت مند تھا مگر جذباتی لحاظ سے کمزوری میں اس کی کمزوری کا راز جان چکا تھا۔

''تمہیں بہت ہی خاص دوا دوں گا۔'' میں نے ٹیسٹ رپورٹس پڑھنے کے بعد آہستہ سے اُس کے کان میں کہا۔ ''تمہاری ساری مشکل دور ہو جائے گی۔''

''کیا...'' اس نے مجھے خوش گوار حیرت سے دیکھا۔

واقعی...'' میں نے یقین سے جواب دیا۔

میں نے اسے 'خاص دوا' دی اور پھر ایک ہفتے بعد آنے کو کہا۔ وہ مقررہ دن پہنچا تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

''تمہیں یہ علاج مستقل جاری رکھنا ہوگا۔'' میں نے اس کی رُوداد سن کر کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ نیو جرسی پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ایک افسر تھا۔ اُس کے بعد میرے پاس کئی پولیس والے آئے لیکن مریض بن کر۔ سب صحتمند اور مضبوط جسم و جاں کے مالک تھے لیکن ان سب کا مرض ایک ہی تھا، وہی جو میرے پہلے پولیس والے مریض کو لاحق تھا۔ سب مرد پولیس والوں کو میری دوا سے خاصا 'افاقہ' ہوا۔ اُن کی معرفت بعد کے دنوں میں کئی مریض آئے۔ اسٹرائیڈز بیماری کا علاج نہیں مگر یہ بات میں جانتا تھا وہ نہیں۔ سو، جو ایک بار میرے پاس آیا، وہ بار بار آتا رہا۔ میرا دھندا ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔

جب سے پولیس والے میرے پاس آنا شروع ہوئے تھے، تب سے میں اُن کا بہ غور تجزیہ کر رہا تھا۔ اس سے تین باتیں سمجھ میں آئیں۔ اول تو یہ کہ کچھ جوان پولیس والے پیشہ ور تن سازوں کی طرح اپنے مسلز بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔ دوسرا یہ کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے انہیں بھاری میڈیکل انشورنس حاصل تھی، جس کی وجہ سے علاج و معالجے پر خرچ کی انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ تیسری قسم اُن بوڑھے پولیس والوں کی تھی جو عمر کے اس حصے میں نہ تو ہیرو کی طرح اپنا جسم بنانے کے خواہشمند تھے اور نہ ہی کارکردگی دکھانے کے قائل۔ میرے پاس آنے کی وجہ ایک ہوتی تھی یعنی ڈھلتی عمر میں مردانگی برقرار رکھنے کا نسخہ۔ تو ایسے میں میرے لیے بھی دل کھول کر نسخہ لکھنے اور بھاری فیس وصول کرنے میں کوئی مذائقہ نہیں تھا۔

کلینک کھولے دو سال ہو گئے تھے اور اس دوران شروع کے پانچ چھ ماہ چھوڑ کر میرا دھندا ترقی کی منازل طے کرنے لگا تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ مریضوں کے لیے ویٹنگ روم کی ضرورت نہیں تھی مگر اب وہ مجھے چھوٹا لگنے لگا تھا۔ پہلے کینسو لا بھی دن کا بیشتر وقت کھیاں مارنے میں گزار دیتی تھی مگر اب اس کی مدد کے لیے ایک فل

ٹائم کلرک موجود تھا جو مریضوں کا ریکارڈ رکھنے، بلوں کی تیاری اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں اُس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ کلینک اتنے زور و شور سے چل رہا تھا کہ اکثر میں مقررہ وقت کے بعد بھی کلینک پر رہتا، حتیٰ کہ چھٹی کے دن بھی کئی گھنٹے مریضوں کے معائنے میں گزار دیتا تھا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے بہت جلد پرانی کار سے چھٹکارا حاصل کیا۔ نئی سیلون سوک کار خریدی، دریائے ہڈسن کے کنارے ہا بکون کمپلیکس میں پُرآسائش گھر بھی خرید لیا تھا۔ دریا میں سیر کے لیے میں نے پینتیس فٹ لمبی پُرآسائش کشتی خرید لی تھی۔ دو سال کے اندر ساری کایا پلٹ گئی تھی۔

نئے دوست، نیا شہر، نئے کلب، نئی زندگی اور خرچ کرنے کو بے تحاشا پیسا۔۔۔ اب میں خود کو کامیاب انسان سمجھنے لگا تھا۔ میری ساری کامیابیوں کا سہرا جم اور انکل اسٹین کے سر تھا۔ کامیابی کا نسخہ تو مجھے وہیں سے ملا تھا۔

دولت میرے پاس تھی پر ماضی کی محرومیاں اور تنہائی برقرار تھی جنہیں بھلانے کے لیے میں عیاشی میں پڑ گیا۔ اسی دوران میری ملاقات ایک نہایت خوبصورت لڑکی سے ہوئی۔ یہ اونچے طبقے کی دلدادہ تھی۔ وہ بیس بال کے بڑے بڑے ٹورنامنٹ میں چیئر لیڈر کے طور پر بھاری معاوضہ لے کر اُچھل کود کرتی تھی۔ میری اُس کی ملاقات ایک کلب میں ہوئی اور اسی وقت میں نے آئندہ ویک اینڈ کے لیے اُسے ساتھ لے کر لاس ویگاس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ بھی مان گئی۔ ہم دونوں نے وہ ویک اینڈ لاس ویگاس میں گزارا۔ نہ جانے اس میں ایسی کیا بات تھی کہ میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی رضامندی کی وجہ میں جانتا تھا، بہت دولت تھی میرے پاس۔

شادی کے فوراً بعد میں نے میری اسٹون کے پوش علاقے میں ایک لاکھ تیس ہزار ڈالرز کا منی مینشن خرید لیا۔ لیزا بہت خوش تھی۔ وہ جیسی زندگی گزارنا چاہتی تھی، وہ میں اسے دے سکتا تھا۔ ہم دونوں بڑے عیش سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

شادی کیے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ایک پولیس افسر کے ذریعے میرا رابطہ مقامی دواساز کمپنی سے ہوا۔ اُس کمپنی نے جنسی ادویات کی ایک بہت بڑی کھیپ چین سے درآمد کی تھی۔ انہیں ایسے ڈاکٹر کی ضرورت تھی جو اُن سے تعاون کرے۔ اس کے لیے مجھ سے زیادہ مناسب آدمی انہیں نہیں مل سکتا تھا۔ کمپنی نے مجھ سے معاہدہ کرلیا کہ میں دوا کا نسخہ لکھوں گا اور مریضوں کو تاکید کروں گا کہ وہ صرف اُنہی کی فارمیسی سے دوا خریدیں۔ معاہدہ طے پاتے ہی مجھے دو لاکھ ڈالرز پیشگی مل گئے۔ مجھے یقین تھا کہ چند مہینوں میں ہی انہیں مزید رقم ادا کرنا پڑے گی۔ وہ جو چاہتے تھے، میں اُس کام کا ماہر تھا۔

چینی دوا اگرچہ بہت سستی مگر زود اثر تھی۔ میں نے کچھ مریضوں کو یہ استعمال کروائی۔ انہیں بہت فائدہ ہوا۔ میں نے زیادہ پیسا کمانے کی لالچ میں وہ دوا براہِ راست چین سے درآمد کی اور اسے ذخیرہ کرلیا۔ میں اپنے دوستوں، معاف کیجیے گا مریضوں کو بنا کسی نسخے یا ریکارڈ میں اس حوالے سے کیفیت درج کیے بغیر یہ دوا بیچتا رہا۔ امریکا میں نسخے کے بغیر دوا کی فروخت قانوناً جرم ہے مگر میں سب کچھ کر رہا تھا۔ جس نے بھی وہ دوا استعمال کی، اگلی بار مزید لینے آیا۔ میرے مریضوں کی تعداد ہزاروں میں تھی اور صرف چار سالوں میں میرا دھندا کہیں سے کہیں پہنچ چکا تھا۔ میرے گودام میں اس طرح کی دواؤں کی بھاری مقدار موجود تھی۔ یہ سب کی سب غیر قانونی طریقے سے منگائی گئی تھی جس کی درآمد کا کوئی ریکارڈ یا قانونی جواز موجود نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ امریکی قانون میں بھی ان دواؤں کی حیثیت غیر قانونی ہوگی۔

میرے اسٹاف میں اب کئی لوگ شامل تھے مگر میں ان میں سے کسی پر بھروسا نہیں کرتا تھا۔ مجھے یہ تو علم تھا کہ کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے ہوتے ہی ہیں۔ کبھی بھی پولیس کے ہتھے چڑھ سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے بڑی چالاکی سے جعلی نام پہ گودام خریدا تھا۔ وہاں بھاری مقدار میں غیر قانونی جنسی اشتہا بڑھانے کی درآمدی ادویات موجود تھیں۔ پہلے تو میں نے کوشش کی کہ خود گودام کا انتظام سنبھالوں مگر ایک مشکل تھی، کلینک میں مصروفیات بہت تھیں اور گودام کو سنبھالنا بھی وقت طلب کام تھا۔ کینسولا کئی سال سے میرے پاس کام کر رہی تھی اس لیے میں نے گودام میں موجود ادویات کے انتظام کی ذمے داری اسے سونپ دی۔ میرے خیال میں وہ بہت سادہ بلکہ بڑی حد تک کُند تھی مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ وہ ہرگز بے وقوف نہیں تھی۔ یہ احساس مجھے اُس لمحے ہوا تھا جب پولیس افسر نے وارنٹ مجھے تھمائے۔ کینسولا کے سوا، گودام کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی مگر پولیس یہ بات جان چکی تھی۔ کلینک اور گھر کے بعد وہ گودام کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔ یہی میری سب سے بڑی پریشانی تھی مگر پھر بھی۔۔۔ میرے شیطانی دماغ میں بچاؤ کا نسخہ آ گیا تھا۔ یعنی عدالت میں گودام سے لاتعلقی کا بیان۔

☆☆☆

میں نے کن انکھیوں سے پولیس افسران کو دیکھا۔ وہ نہایت باریک بینی سے ہر چیز کی تلاشی لینے میں مصروف تھے۔ میں آگے جھکا اور کمپیوٹر مانیٹر آن کردیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر کینسولا کاغذات اُلٹ پلٹ رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کا بہ غور جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ تھوڑا سا پریشان ضرور تھی مگر ایسا نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس غیر متوقع صورتِ حال نے اسے شدید پریشان کیا ہو۔ استقبالیہ مریضوں سے خالی تھا۔ صرف دو تین پولیس والے فائلوں کی پڑتال کر کے انہیں گتے کے بڑے بڑے ڈبوں میں بند کر رہے تھے۔ کینسولا ان کی مدد کر رہی تھی۔ "کیا کینسولا نے مجھ سے غداری کی ہے؟" میں نے دل میں کہا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ پولیس کے آنے کے بعد وہ پریشانی کے عالم میں سر پکڑ کر بیٹھی ہوگی مگر وہ تو پولیس والوں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔

میں نے کینسولا کو اُس وقت ملازم رکھا، جب میں استقبالیہ کلرک نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس وقت میری آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی، اسی لیے میں بے شمار کوتاہیوں کے باوجود اسے برداشت کرتا رہا مگر میرے حالات بہت جلد بدل گئے۔ اُس وقت میں نے کئی بار اُسے ملازمت سے فارغ کرنے کا سوچا مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ جو تنخواہ وہ لیتی ہے وہ سمندر میں گلاس بھر پانی کے برابر ہے۔ میں نے اسے فارغ کردیا تو نہ جانے بے چاری کب تک بے روزگار رہے مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اُس وقت ایسا نہ کر کے بڑی غلطی کی۔ بہ ظاہر کینسولا میری وفادار تھی اور وہ یہ بات اکثر جتاتی بھی رہتی تھی مگر اب۔۔۔ اس کی وفاداری پہ سوالیہ نشان لگ چکا تھا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر سوالات سر اُبھار رہے تھے۔

☆☆☆

میرے کمرے کی تلاشی مکمل ہوئی تو دو پولیس والے میرے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ اس دوران ایک اور شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اسے میں مانیٹر پر دیکھ چکا تھا۔ وہ چھوٹی پرائیویٹ کار میں اُن کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے کار سے باہر نکلتے وقت اپنے مانیٹر پر بھی اسے دیکھا تھا۔

"مجھے یہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ بیک وقت نیو جرسی پولیس ڈپارٹمنٹ کے سیکڑوں پولیس افسر ہارمونز کی ایک جیسی بیماری کا شکار کیوں کر ہوئے؟" اس کا تعلق انشورنس کمپنی سے تھا۔ "مجھے سخت حیرت ہے کہ چار سال میں پولیس والوں کی بیماری اتنی تیزی سے پھیلی کہ ہم توجہ دیے بغیر نہ رہ سکے۔ عجب بات ہے کہ ایک جیسی بیماری، ایک جیسی دوا اور ایک ہی ڈاکٹر۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور میری آنکھوں کے سامنے اس نے چند نسخے لہرائے۔ "یہ تمہارے ہاتھ کے ہی لکھے ہوئے ہیں نا؟"

میں نے اثبات میں خفیف سا اشارہ کیا۔

"فارمیسی انتظامیہ سے بھی پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔" پولیس افسر ایڈی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہڈسن کنٹری آفس کے تفتیش کاران سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔"

میں نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نیو جرسی پولیس ڈیپارٹمنٹ کے متعدد افسران اور اہلکاروں کو ذاتی طور پر جانتا تھا مگر میرے کلینک پر اس وقت جو پولیس والے دندناتے۔۔۔ پھر رہے تھے، وہ سب میرے لیے اجنبی تھے۔

"سر۔۔۔" ایک پولیس والا کمرے میں داخل ہوا اور ایڈی کو مخاطب کیا۔ "ریکارڈ ڈبوں میں بند کر کے سربمہر کر دیا ہے۔۔۔ اب چلیں؟"

"ہمیں گودام کی تلاشی لینا ہے اور گھر کی بھی۔" ایڈی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "فی الحال ہمیں یہاں سے کوئی مشتبہ چیز نہیں ملی ہے۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف جھکا۔ "میرا نام ایڈی ہے اور میں سخت گیری میں بدنام ہوں۔ بہتر ہے کہ جب تک پولیس آپ کو کلیئر نہ کرے، تب تک آپ شہر سے باہر جانے کی کوشش نہ کریں۔"

میں نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس والے جا چکے تھے۔ مریضوں کو تو

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور چیونٹیاں

ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے عرض کیا۔ "الٰہی جس شہر کے لوگوں نے تیری نافرمانی کی ہو جب تیرا عذاب اس شہر پر نازل ہوتا ہے۔ تو تو سارے شہر کو ہلاک کر دیتا ہے حالانکہ اس میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔" حضرت موسیٰؑ کو گرمی سی محسوس ہوئی اور آپؑ ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے، پھر آپ کو نیند آ گئی اور وہیں سو گئے۔ درخت کے پاس چیونٹیوں کا مسکن تھا ایک چیونٹی کے کاٹنے سے حضرت موسیٰؑ جلال میں اٹھے اور اپنے قدم سے ساری چیونٹیوں کو مسل ڈالا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ "اے موسیٰ تمہیں کاٹا تو ایک چیونٹی نے تھا مگر اس کی پاداش میں مسلی سب گئیں۔" خدا تعالیٰ نے پھر فرمایا۔ "میرا عذاب مطیع و عاصی دونوں پر آتا ہے مگر عاصی کے لیے تو عذاب ہی ہوتا ہے مگر مطیع کے لیے رحمت برائے آخرت ہوتا ہے۔"

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

پولیس نے پہلے ہی واپس بھیج دیا تھا جبکہ اسٹاف کو میں نے کافی دیر پہلے ہی چھٹی دے دی تھی۔ کچھ دیر بعد کلینک میں کینسولا اور میں تنہا رہ گئے تھے۔ اس دوران میں مانیٹر پر سی سی ٹی وی کیمرے کے ذریعے اس کا بہ غور جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب کلینک میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے، تب میں نے انٹرکام کے ذریعے اسے اندر آنے کا کو کہا۔ چند لمحوں بعد وہ میرے سامنے میز کے دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھی تھی۔ میز کے داہنی ہاتھ کی اوپری دراز میں اعشاریہ چوالیس کی پستول موجود تھی جسے میں ہمیشہ لوڈ رکھتا تھا۔

گودام میری ملکیت تھا مگر میں نے اس کی خریداری کے لیے ایک جعلی شناخت ظاہر کی تھی۔ اب پولیس گودام کی تلاشی لے گی تو میرے خلاف انہیں سب ثبوت مل جائیں گے مگر وہ چاہے کتنی کوشش کرلیں، میرا تعلق گودام سے ثابت نہیں کر پائیں گے، بس خطرہ صرف ایک تھا۔ میں تو اس گودام کی ملکیت کو چھوڑیے، اس سے کسی قسم کے تعلق سے بھی صاف انکار کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا مگر کینسولا... میرے بعد وہی ایک تھی جو گودام اور میرے تعلق کو ثابت کرنے کے لیے گواہی دے سکتی تھی۔ اس کی گواہی مجھے پھنسا سکتی تھی۔ میرے بعد وہی تو ایک تھی جسے گودام میں رکھی ہر دوا کے بارے میں علم تھا۔ گودام اور میرے درمیان تعلق ثابت کرنے کا واحد ذریعہ کینسولا تھی۔ وہی نہ رہتی تو پھر میں اس کیس سے مکھن میں پڑے بال کی طرح باہر نکل جاتا۔

کینسولا خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ پریشان نظر آرہی تھی مگر ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اس کے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع ہو۔ ہم دونوں خاموش تھے۔

آہستہ آہستہ میرا ہاتھ ارادی یا غیر ارادی طور پر میز کی سب سے اوپری دراز کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے آہستہ سے دراز کھولی۔ اگلے لمحے میرا ہاتھ پستول کے دستے پر تھا۔ میں اعشاریہ چوالیس کی پستول کو محسوس کرسکتا تھا۔ کینسولا نظریں جھکائے بہ دستور خاموش بیٹھی تھی۔ دراز کھلنے کی ہلکی سی آواز پر بھی اس نے نظریں اوپر نہ اٹھائیں۔

میں نے دل ہی دل میں سارا منصوبہ تیار کرلیا تھا۔ کینسولا کو گولی مار کر اس کی لاش کار کی ڈکی میں ٹھونس کر دریائے ہڈسن لے جاتا، جہاں میری کشتی کھڑی تھی۔ لاش کو کشتی کے ذریعے سمندر کے دہانے تک لے جاتا اور پھر لوہے کے بھاری لنگر سے لاش باندھ کر سمندر میں بہا دیتا۔ قصہ ختم ہوجاتا۔ نہ رہتا بانس نہ بجتی بانسری۔

میں پستول ہاتھ میں لے کر اس کو تول رہا تھا۔ کینسولا بہ دستور نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ جس طرح وہ بیٹھی تھی، اس سے تو میں یہی سمجھ پایا کہ وہ پولیس کے لیے سلطانی گواہ بن چکی ہے یا پھر اس نے انعام کے لالچ میں مجھے پھنسوا دیا اور اب شرمندگی کے مارے نظریں نہیں ملا پارہی ہے۔

میں پچھلے دو گھنٹوں سے بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ بڑے سکون سے اٹھا۔ میرے پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ یہ سب اُن اسٹرائیڈز کی بدولت ہو رہا تھا جو میں پہلے تن سازی اور پھر عیاشی کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ کئی سال سے مسلسل ادویات کے استعمال کی وجہ سے اب میری صحت پر بھی اس کے مضر اثرات نمودار ہونے لگے تھے۔ اس وقت بھی میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میری کنپٹیاں جھنجھنا رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے۔ اچانک مجھے اپنے دل میں کینسولا کے خلاف شدید نفرت کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے میں نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اس کی کنپٹی کی طرف نال کرکے ٹرائیگر دبا دیا۔ کلک کی آواز آئی مگر گولی چلنے کا دھماکا نہیں ہوا۔ کینسولا بہ دستور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، کمرے کا دروازہ کھلا اور ایڈی اندر داخل ہوا۔ وہ جاتے جاتے اپنی سخت گیری کا خوف دلا کر گیا تھا۔

''ڈاکٹر جیمسن... گولیاں یہ رہیں۔'' اس نے اپنی ہتھیلی میری طرف پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم ایسا کرسکتے ہو اسی لیے...'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور کینسولا کو دیکھنے لگا۔ ''میری بہن بہت بے وقوف ہے مگر انسانیت فروش نہیں۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ فارماسسٹ بھی ہے۔''

''کیا...!'' میں نے یہ انکشاف سن کر حیرت سے کہا۔ ''مگر اس نے تو یہ کبھی نہیں بتایا کہ...''

''آخری سمسٹر میں بیمار پڑ گئی تھی دماغی بخار کی وجہ سے۔'' ایڈی نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''اس کے بعد بے چاری اس قابل ہی نہ رہی کہ امتحان دے سکے ورنہ آج یہ فارماسسٹ کی ملازمت کررہی ہوتی۔''

اچانک مجھے سینے میں درد کی تیز لہر محسوس ہوئی۔ میں نے میز کا کونا پکڑا اور فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔ میں ڈاکٹر تھا، سمجھ گیا کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ تین بار پہلے بھی ایسا ہوچکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چوتھی بار دل کا دورہ جان لیوا ہوگا۔ میری آنکھوں کے سامنے تیزی سے اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں شوقِ مردانگی اور دولت کے حصول کی قیمت جان دے کر چکا رہا تھا۔

بقیہ

برجستہ اور بروقت فیصلے کرنا ایک ایسا کمال ہے جس پر ہر ایک کی دسترس ممکن نہیں... اور جسے یہ ہنر آتا ہو، وہ واقعی باکمال ہوتا ہے مگر... یہاں جس دوراہے پر یہ کردار کھڑے تھے وہاں سے کہانی کو ایک ایسا موڑ لینا تھا، جس کے بعد کسی کی زندگی پچھتاوئوں کا مظہر ٹھہرتی اور کوئی پرچھائیوں کے پیچھے بھاگتا اور ان دونوں صورتوں میں ایک کسک ہمیشہ تعاقب میں رہتی، لیکن ان تمام کرداروں کے درمیان کوئی ایک تو ایسا بھی تھا جس کی من کی مراد بر آتی۔

دورانا

طاہر جاوید مغل

بہکتے جذبوں اور بے کل لمحات کی ادھوری داستان

والد وسیع جائداد چھوڑ گئے تھے۔ ایک چھوٹی بہن ارسہ کے سوا دنیا میں میرا اور کوئی نہیں تھا اور اگر دو چار رشتے دار تھے بھی تو وہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ لہٰذا جونہی ارسہ کی شادی ہوئی میں سب کچھ چھوڑ کر یورپ کی سیر کو نکل گیا۔ شروع میں یہ پروگرام پانچ چھ ماہ کا تھا لیکن آزاد، بے فکر اور تنہا زندگی کا کچھ ایسا مزہ آیا کہ میں اگلے قریباً ڈیڑھ برس تک پاکستان سے بالکل لاتعلق بنا۔ یورپ اور امریکا کے دور دراز علاقوں میں گھومتا رہا۔ میرے پاس جو موبائل فون تھا اس کا نمبر صرف اور صرف میرے منیجر سلطان بخاری کے پاس تھا۔ میری ہدایت کے مطابق ان ڈیڑھ برسوں میں بخاری

صاحب نے مجھ سے بہت کم رابطہ کیا اور یہ رابطہ بھی اشد ضرورت کے وقت ہی ہوتا تھا۔

یہ بہار کا موسم تھا۔ میں ان دنوں اٹلی کے شہر روم میں تھا۔ جب ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھے ہوئے، بیئر پینے کے دوران میں ایک تازہ بیسٹ سیلر انگلش ناول پڑھتے پڑھتے اچانک دل میں کچھ پرانی یادوں نے چٹکی بھری اور دماغ میں سوچ ابھری کہ اب واپس پلٹنا چاہیے۔ اکیلے پن کا مزہ بہت لے لیا۔ اب دوبارہ شناسا چہرے دیکھنے چاہئیں۔ میرے اندر بیدار ہونے والی اس کیفیت کی ایک وجہ یقیناً ماہا عبیر بھی تھی۔ ماہا عبیر جو میری کلاس فیلو تھی، ہم مزاج تھی، دوست..... اور یقیناً..... کچھ اور بھی تھی۔

ٹھیک پانچ روز بعد میں اپنے اطالوی دوست فریزر، اس کی گرل فرینڈ اور گرل فرینڈ کی دوست کرسٹی کو الوداع کہہ کر پاکستان کے لیے واپس روانہ ہو رہا تھا۔

میں ڈیڑھ سال پہلے جس طرح خاموشی سے روانہ ہوا تھا، اسی طرح میری واپسی بھی مکمل خاموشی سے ہوئی۔ ایک ہفتے تک منیجر بخاری صاحب کے علاوہ کسی کو پتا نہیں چلا کہ میں واپس آچکا ہوں اور اب لاہور کے ڈی ایچ اے میں اپنی تین کینال کی کوٹھی میں موجود ہوں۔ آٹھویں دن میں نے اپنے دو قریبی دوستوں عدنان اور مشہود سے رابطے کیے اور انہیں آگاہ کیا کہ خیر سے بدھو گھر کو لوٹ آیا ہے اور اب اپنی واپسی کا جشن منانا چاہتا ہے۔

عدنان اور مشہود کو زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ میں انہیں لاہور کے مضافات میں اپنے ملتان روڈ والے فارم ہاؤس میں مدعو کر رہا ہوں۔ ڈیڑھ سال پہلے تک یہی فارم ہاؤس ہم پانچ چھ کلاس فیلوز کی مستیوں خرمستیوں اور تفریحات کا مرکز ہوا کرتا تھا۔

وہ مارچ کی ایک خوشگوار دوپہر تھی، ہفتے کا روز تھا۔ ہم تین دوست فارم ہاؤس میں اکٹھے ہو گئے۔ دیر تک ایک دوجے سے گلے ملتے اور شکوے شکایات کرتے رہے۔ یہ فارم تقریباً تین ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ وسط میں دس بارہ مرلے جگہ پر میں نے ایک خوبصورت و آرام دہ کاٹیج بنوایا تھا۔ میں لاہور سے دو ملازم ساتھ لایا تھا، وہ کاٹیج کو کھول کر اس کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہو گئے۔ ہم تینوں دوست فش فارم کے پاس دھوپ میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور یادیں تازہ کرتے رہے۔ مشہود کی شادی ہو چکی تھی۔ مشہود اور عدنان نے میرے ساتھ ہی ایم بی اے کیا تھا۔ اب وہ اچھی ملازمتیں کر رہے تھے۔

حسب توقع ہماری گفتگو شروع ہونے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی ماہا عبیر کا ذکر چھڑ گیا۔ ماہا عبیر کو ہم ماہا عجیب بھی کہا کرتے تھے۔ ایسا اس کی افتادِ طبع اور سیلانی پن کی وجہ سے تھا۔ وہ اپنی ہی طرز کی لڑکی تھی اور ان لوگوں میں سے تھی جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ نہیں بہتے بلکہ ان کا ایک اپنا طرزِ فکر اور اپنا رستہ ہوتا ہے۔ یوں وہ بہت خوش اخلاق اور سوشل بھی تھی۔ ماہا اور ایمن ہمارے ان کلاس فیلوز میں شامل تھیں جو یہاں فارم ہاؤس میں آتے تھے۔ ہم لڑکے تو کئی بار رات بھی یہیں گزارتے تھے لیکن یہ لڑکیاں شام تک لاہور واپس لوٹ جاتی تھیں۔ ان میں سے ایمن کی شادی تو مشہود کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ماہا سے میری طرح میرے دوستوں کا رابطہ بھی منقطع تھا۔ ماہا ہی کی طرح ایک دو دوست اور بھی تھے جو کسی کے رابطے میں نہیں تھے۔

مشہود نے مجھ سے کہا۔ ''یار آصف، ایک بار تو سب کو اکٹھا ہونا چاہیے پھر مزہ آئے گا۔''

عدنان بولا۔ ''ٹھیک ہے، اگلے ویک اینڈ کا رکھ لو۔ کوشش کرو کہ سب سے رابطہ ہو جائے۔''

مشہود بولا۔ ''ایک کی شرکت تو یقینی ہے۔ یعنی ایکی (ایمن) کی۔''

''بیوی کے علاوہ بھی کسی پر زور چلاؤ نا بھئی۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''ماہا پر تو تمہارا ہی چل سکتا تھا لیکن تم نے کبھی چلایا ہی نہیں۔ اب پتا نہیں چل بھی سکے گا یا نہیں۔''

''اگر شادی نہ ہو گئی ہو گی تو ضرور چلے گا۔'' عدنان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یار! تم میں سے کسی کے پاس اس کا کوئی اتا پتا تو ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے سٹپٹا کر کہا۔

مشہود بولا۔ ''اچھا ایک منٹ ٹھہرو، میں ایکی کو فون کرتا ہوں۔ اس کی ایک فرینڈ ہے کراچی میں۔ اس نے ایک مرتبہ ایکی کو بتایا تھا کہ اس نے ماہا صاحبہ کو کراچی کے کسی شاپنگ مال میں دیکھا تھا۔''

مشہود نے اپنی بیوی ایکی کو فون کیا۔ مجھ سے بھی علیک سلیک کرائی۔ پھر اس سے ماہا کے بارے میں بات کی۔ ایکی نے کہا۔ ''وہ کراچی والی فرینڈ تو دبئی چلی گئی ہے۔ ہاں اس کی ایک چھوٹی بہن ہے اس سے سن گن لیتی ہوں۔ اگر اس سے رابطہ ہوا تو میں تھوڑی دیر میں تمہیں کال کروں گی۔''

ایکی نے تھوڑی دیر کا کہا تھا۔ اس کی کال تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد آئی۔ وہ اپنے شوہر مشہود سے مخاطب ہو کر ہانپتی آواز

میں بولی۔ ''ڈارلنگ تم نے بھگا بھگا کر آدھا کر دیا ہے۔''

''بھگا بھگا کر؟''

''اور کیا۔ فون پر بھاگی ہوں۔ کوئی دس جگہ رابطہ کیا ہے اور نتیجہ پتا ہے کیا نکلا ہے.....؟ بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ محترمہ ماہا صاحبہ یہیں لاہور میں موجود ہیں اور پچھلے چھ ہفتے سے موجود ہیں لیکن ایسی کمینی ہیں محترمہ کہ کسی سے رابطہ ہی نہیں کیا۔ اس کا نمبر لکھوا رہی ہوں، خود بات کرو۔''

ایکی نے ایک نمبر لکھوایا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ماہا کی جانی پہچانی، جلترنگ بجاتی آواز ابھری۔ ''بڑی جلدی یاد آ گئی میری؟''

''یاد تو اس کی آتی ہے جو بھولا ہوا ہو۔''

''کوئی اس سے زیادہ گھسا پٹا فقرہ نہیں سوجھا تمہیں؟''

''وہ بھی ہے لیکن بالمشافہ سناؤں گا۔ کب آ رہی ہو؟''

''آج تو مشکل ہے۔''

''تمہیں پتا ہے، ہم ہر مشکل کو آسان کرتے رہے ہیں۔''

تقریباً دو گھنٹے بعد ایکی اور ماہا دونوں ہمارے ساتھ موجود تھیں۔ اب بھی ایک دو دوستوں کی کمی تھی پھر بھی ایک زبردست کمپنی بن چکی تھی۔ اب سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ تھوڑی سی خنکی بھی بڑھ گئی تھی، ہم کاٹیج کے اندر آ گئے۔ دوسری منزل سے دور تک ہریالی اور درخت دکھائی دیتے تھے۔ باتیں شروع ہوئیں تو فوراً ہی ایک اور موضوع زیرِ بحث آ گیا۔ سب سے پہلے مشہود نے ہی ذکر چھیڑا۔

''ہاں بھئی، کسی کو آرزو صاحب کی بھی کوئی خبر ہے یا نہیں؟ جناب جیتے ہیں، مرتے ہیں یا ان دونوں حالتوں میں نہیں ہیں۔''

''واقعی یار، ہم نے تو پلٹ کر ان کی خبر ہی نہیں لی۔ اپنی مرضی سے کھیل شروع کیا اور اپنی مرضی سے ہی ایک دم ختم بھی کر دیا..... پتا نہیں اس تو، تو، نو، والی تاریخ کا کیا ہوا ہو گا؟''

مشہود بولا۔ ''ہوا کیا ہو گا۔ بے چارہ بھٹکتا رہا ہو گا گلشن اقبال کے مین گیٹ پر۔ پھر ایک دردناک قسم کی غزل لکھی ہو گی۔ تکیے کے نیچے رکھی ہو گی اور اس پر سر رکھ کر سو گیا ہو گا۔''

''ویسے یار، ہم سے ہوئی زیادتی تھی۔ ہمیں اس معاملے کو اتنا آگے نہیں لے جانا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔

ایک دم مجھے کچھ یاد آیا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھہرو ٹھہرو، میں ایک چیز دیکھتا ہوں۔'' میں اٹھ کر نچلی منزل پر آیا۔ ایک چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر ایک الماری کھولی اور ایک گرد آلود موبائل سیٹ لے کر اوپر آ گیا۔

''ادے یہ کیا ہے؟'' عدنان نے پوچھا۔

''وہی موبائل جس پر تم لوگ آرزو کو ''ماموں'' بناتے رہے ہو۔''

ایکی کے پاس ایک باریک پن والا چارجر موجود تھا۔ ہم نے اس کے ذریعے موبائل سیٹ کو چارج کیا اور چند منٹ کے اندر وہ زندہ ہو گیا۔ اس کے زندہ ہوتے ہی قریباً دو برس پہلے کے سارے روز و شب زندہ ہو گئے۔ میں نے میسج میں جا کر ان باکس کھولا اور نیچے کی طرف گیا۔ ان گنت میسج تھے اور سب تقریباً ایک ہی نمبر سے تھے۔ 21 فروری 2009ء کی تاریخ میں پہلا میسج اس سم میں موجود تھا۔ جو کچھ یوں تھا۔

''آپ کون ہیں محترمہ، میں آپ کو نہیں جانتا۔''

''او گاڈ۔ آپ کون ہیں محترمہ، میں آپ کو نہیں جانتا۔'' میں نے زیرِ لب دہرایا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ قریباً دو برس پرانے مناظر نگاہوں کے سامنے کھلتے چلے گئے۔

وہ فروری کے آخری دن تھے۔ وہی موسم جب طبیعتوں میں شوخی جاگتی ہے۔ جوان دلوں میں لہریں لینے والی امنگ ترنگ بڑھ جاتی ہے۔ ان دنوں ہماری چنڈال چوکڑی نئی نئی شرارتیں کر رہی تھی۔ ایکی ان دنوں پڑھائی سے فارغ ہو کر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں انٹرن شپ کر رہی تھی۔ یہاں ایک شاعر نما دبلا پتلا نوجوان بھی جونیئر کلرک کی جاب کر رہا تھا۔ اس کا نام مسلم آرزو تھا، مسلم آرزو کے ایک بازو میں کسی پرانی چوٹ کی وجہ سے تھوڑا سا نقص تھا جس کے سبب اسے لکھنے اور موٹر سائیکل وغیرہ چلانے میں کچھ دقت پیش آتی تھی۔ اس کی چند تخلیقات ادبی پرچوں میں چھپی تھیں اور وہ آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر یہاں ہر شعبے میں ایسے بڑے بڑے مگرمچھ موجود ہیں جو چھوٹی موٹی مچھلیوں کو لمحوں میں ناپید کر دیتے ہیں، اگر کوئی آگے بڑھنا چاہے تو اسے ان کا پیٹ پھاڑ کر نکلنا پڑتا ہے۔

آرزو کو دیکھ کر ایکی کی رگِ شرارت پھڑک چکی تھی۔ اسے آرزو کا موبائل نمبر بھی مل گیا تھا۔ ایک دن اس نے یہ نمبر مجھے اور مشہود کو دکھایا۔ میرے پاس ایک نئی سم رکھی تھی۔ میں نے اسے ایک خالی موبائل سیٹ میں ڈالا اور ایک میسج آرزو کو لکھ مارا۔ ''اخبار و رسائل میں آپ کی نظمیں پڑھتی ہوں۔ آپ اتنا اچھا کس طرح لکھ لیتے ہیں۔ کیا آپ نے کسی سے محبت کی تھی.....؟ نوشابہ!''

یہ میسج اس کہانی کا نکتۂ آغاز ثابت ہوا جس نے اگلے

پانچ چھ ماہ میں کئی مرحلے طے کیے اور کئی موقعوں پر ہم سب دوستوں کے لیے زبردست تفریح کا باعث بھی بنی۔

ہم سب اور خاص طور سے عدنان اور مشہود گاہے بہ گاہے آرزو کو میسج کرتے رہے اور اسے بے وقوف بناتے رہے۔ وہ نوشابہ میں الو الو ہوتا چلا گیا۔ پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ان پیغامات سے ہی پتا چلا کہ آرزو کا تعلق ایک کم آمدنی والے گھرانے سے ہے۔ باپ فوت ہو چکا ہے، وہ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہے اور گھر کا کفیل بھی ہے، کچھ عرصہ پہلے اس کا دل ٹوٹا تھا۔ اکثر شاعروں کی طرح وہ بھی بے حد جذباتی اور حساس تھا۔ ہم اس کی اس جذباتیت کو استعمال کر رہے تھے۔ وہ نوشابہ سے ملنا چاہتا تھا۔ جب اس کا اصرار بڑھا تو ہم نے اسے اتنی سی رعایت دی کہ اسے نوشابہ کی آواز سنا دی۔ یہ آواز دراصل ماہا ہی کی تھی، ماہا اس سے نوشابہ کے طور پر بات کرتی رہی۔ ہم نے آرزو کے حوالے سے نئے نئے تماشے لگائے۔

ماہا نے نوشابہ کی حیثیت سے آرزو کو باور کرایا تھا کہ وہ اسے تقریباً ہر روز دیکھتی ہے لیکن ابھی خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی کہ سامنے آسکے۔ کبھی ماہا اور ایمی اسے کوئی خاص قسم کے کپڑے پہننے پر مجبور کر دیتیں۔ کبھی وہ ان کے کہنے پر کوئی خاص قسم کا ہیئر اسٹائل اپناتا۔ ایک بار ہم سب نے اسے گلشن اقبال میں بلایا اور اس کے اردگرد رہ کر اس کی بے چینی اور انتظار کی کیفیت کا لطف اٹھایا۔

دن گزرتے رہے۔ وہ نوشابہ سے ملنا چاہتا تھا لیکن نوشابہ کہیں نہیں تھی۔ دوسری طرف ہم بھی اس کھیل سے اب بور ہونے لگے تھے۔ ایک روز مشہود نے آرزو سے جان چھڑانے کے لیے اسے نو نو نو والا میسج بھیج دیا۔ یعنی اس نے آرزو سے کہا کہ وہ اس خوبصورت تاریخ یعنی 9-9-2009 کو اس سے ملے گی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اب اس تاریخ تک وہ دونوں ایک دوسرے سے کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔

ہم تو یہ وعدہ کر کے دوسری مصروفیات میں کھو گئے لیکن آرزو کچھ نہیں بھولا۔ نہ ہی وہ نو نو نو کی تہ تک پہنچا جس میں انکار کے سوا اور کچھ نہیں تھا یعنی نہیں نہیں نہیں۔

اس نے اپنے آخری میسج میں لکھا تھا۔ ”نوشابہ! انجانی، ان دیکھی محبت کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ ان دیکھے شخص سے بھی اتنی ہی شدت سے محبت کی جاسکتی ہے جتنی کسی جانے پہچانے شخص سے۔ میرے دل کی گواہی ہے کہ تم ویسی ہی ہو گی جیسا میں نے سوچ رکھا ہے۔ تم سے ملاقات ہونے میں ابھی چار مہینے باقی ہیں۔ میں نے ان چار مہینوں کے گھنٹے، گھڑیاں اور پل ابھی سے گننا شروع کر دیے ہیں۔ یہ بڑا لمبا سفر ہے لیکن تمہاری محبت کے وجدان کے سہارے میں اسے ضرور طے کرلوں گا۔ تو ٹھیک ہے میں نو ستمبر کی اس نیم گرم شام کا اور اس شام میں موجود سارے خوبصورت امکانات کا راستہ دیکھوں گا۔ اس شام تک کے لیے خدا حافظ۔“

اس کے بعد موبائل میں آرزو کا کوئی میسج موجود نہیں تھا۔ ہاں اس کے بعد اس نے نو نو نو کے حوالے سے ایک طویل نظم ضرور لکھی تھی۔ یہ نظم ایک مؤقر اخبار کے ادبی ایڈیشن میں آرزو کی تصویر کے ساتھ شائع بھی ہوئی تھی۔ اس نظم میں ان دیکھے محبوب کی چاہ اور اس چاہ کے دکھ درد بیان کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ انتظار کے جاں گسل مرحلوں کا ذکر تھا۔

ہم نے ان باکس میں موجود بیسیوں پرانے میسج پڑھے اور وہ ساری کہانی ذہنوں میں تازہ ہو گئی۔

میں نے موبائل بند کر کے ایک طرف رکھا اور لمبی سانس لے کر مشہود اور عدنان سے پوچھا۔ ”ہاں بھئی..... میں تو یہاں تھا نہیں۔ پر تم سب لوگ تو یہاں تھے، تمہیں آرزو کا خیال نہیں آیا؟“

”مجھے آیا تھا تھوڑا سا۔“ ایمی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”میں نے مشہود سے کہا تھا کہ نو نو نو کو گلشن اقبال جائیں گے اور دیکھیں گے کہ آرزو وہاں آتا ہے؟ اور اگر آتا ہے تو کیا کرتا ہے؟“

”پھر.....؟“ میں نے پوچھا۔

”پھر کیا؟ یہ ایک جگہ ٹکتے تھوڑی ہی ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے ان کا تبادلہ کوئٹہ ہو گیا۔ آناً فاناً مجھے بھی لیا اور کوئٹہ پہنچ گئے۔“

”یار، کہیں اس نے خودکشی وغیرہ ہی نہ کر لی ہو۔ یہ شاعر حضرات ہوتے تو جھلے ہیں۔“ عدنان نے کہا۔

”خیر ایسی بات بھی نہیں۔“ مشہود بولا۔ ”اگر ایسا ہوتا تو اخبار میں دو تین کالمی خبر ضرور چھپتی جس کا کیپشن کچھ اس طرح کا ہوتا۔ ایک اور چراغ بجھا..... کچھ اور کم ہوئی روشنی، وغیرہ وغیرہ۔“

”ویسے یار اس سے ہوئی زیادتی ہے۔ وہ دکھی تو بہت ہوا ہو گا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

ماہا بڑی دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔ ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دھوپ چھاؤں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ”نو ستمبر کو میں دیکھنے گئی تھی!

اسے..... اور شاید آپ سب کو یہ جان کر بہت حیرانی ہو کہ نو ستمبر کی اس شام کو آرزو گلشن اقبال سے مایوس نہیں گیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ مشہود اور عدنان نے تقریباً ایک ساتھ پوچھا۔

وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ”نوشابہ اسے ملی تھی۔ مجھے بھی ہرگز توقع نہیں تھی کہ ایسا ہو گا لیکن ہوا۔ وہ اندھیرا گہرا ہونے تک وہاں بیٹھا رہا تھا۔ مایوسی اور دکھ کی تصویر نظر آتا تھا۔ بار بار فون کرتا تھا لیکن دوسری طرف سے جواب نہیں آتا تھا اور پھر جب وہ وہاں سے جانے والا تھا۔ بالکل آخری لمحوں میں..... نوشابہ آ گئی۔“

”یار! کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ایمی نے اسے کندھے سے ہلا کر کہا۔ ”نوشابہ تھی ہی نہیں تو اسے ملتی کیسے؟“

ہم دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ ماہا کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو لڑھکے اور اس کے رخساروں پر لکیریں بناتے چلے گئے۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”نوشابہ تھی..... ہم سب نے نوشابہ کو وجود دے دیا تھا..... اور میں نوشابہ کو سب سے زیادہ جانتی ہوں، وہ بہت حساس تھی..... بہت دردمند۔ وہ کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آرزو کا بھی نہیں..... وہ آرزو سے ملے بغیر نہیں رہ سکی۔“

اچانک میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ ماہا کیا کہہ رہی ہے۔ شاید باقی بھی سمجھ گئے تھے۔ میں کتنی ہی دیر تک یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ غم کی کیفیت میں اس کا ملیح چہرہ کچھ اور بھی دلکش نظر آ رہا تھا۔ کانوں کے روپہلی جھمکے ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”ماہا! کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تم نوشابہ کے طور پر آرزو سے ملی تھیں؟“

”ہاں آصف..... میں ملی تھی اور نہ صرف ملی تھی بلکہ ملتی رہی تھی۔ ہم دونوں بہت قریب آ گئے تھے.....“ وہ پلکیں اٹھائے بغیر بولتی چلی گئی۔ اس کا چہرہ جیسے بخار میں تپ رہا تھا۔

ماہا کی نہایت سنجیدہ صورت دیکھنے کے باوجود ہمیں..... اور خاص طور پر مجھے..... اس کی بات کا بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ ہمیں لگ رہا تھا، شاید وہ ابھی بلند آواز میں ہنس پڑے گی اور ہم سب سے اپنی اداکاری کی داد چاہے گی لیکن ایسا نہیں تھا..... جب ہمیں یقین ہو گیا کہ ایسا نہیں ہے تو ہم نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ حواس باختہ سی ہو گئی لیکن پھر دھیرے دھیرے سنبھل گئی۔ اس نے ہمارے ہر سوال کا جواب مدلل انداز میں تسلی سے دیا۔ اس کا لہجہ

برجستگی

ایک اندھا پولیس میں بھرتی ہونے آیا تو پولیس آفیسر نے پوچھا۔ ”تمہیں کس لیے رکھیں؟“

اندھے نے جواب دیا۔ ”اندھا دھند فائرنگ کے لیے۔“

☆☆☆

ایک لڑکا بس اسٹاپ پہ لڑکی کو دیکھ کر بولا۔ ”تو تو میری جان ہے تو میرا ایمان ہے۔“ لڑکی نے جوتی اتاری تو لڑکا بولا۔

”میں بھی پاکستان ہوں، تو بھی پاکستان ہے۔“

☆☆☆

آپریشن سے پہلے ڈاکٹر نے پھولوں کا ہار منگوایا۔

مریض۔ ”یہ کس لیے ہیں؟“

ڈاکٹر۔ ”میرا یہ فرسٹ آپریشن ہے اگر کامیاب ہوا تو میرے لیے ورنہ تمہارے لیے۔“

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور، ضلع مظفر گڑھ

نہایت کمبھیر لیکن بہت پُراعتماد تھا۔ وہ ایک بدلی ہوئی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ میں اسے سن رہا تھا اور میرے سینے میں کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا..... مجھے زخمی کر رہا تھا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں ماہا نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا۔

”اس کے دل میں آرزو کے لیے ترس اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ جوں جوں نو نو نو کی تاریخ قریب آئی یہ جذبہ اور قوی ہوتا گیا۔ اس اداس شام کو وہ گلشن اقبال کی جھیل کے اس کنارے پر موجود تھی جہاں آرزو کو اپنی آس امید کی ڈور تھام کر آنا تھا، اس نے آرزو کو دیکھا اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر ایک ایسے فیصلے پر پہنچ گئی جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ نوشابہ کے طور پر آرزو سے ملی۔ وہ، جو مایوس اور دل شکستگی کی انتہا کو چھو رہا تھا، اس سے مل کر جھوم اٹھا۔ اگلے دو تین ہفتوں میں ان کی ملاقاتیں تواتر سے ہوئیں۔ نوشابہ نے بتایا کہ اس کا اصل نام ماہا ہے۔ اس نے اپنی نجی زندگی کے بارے میں آرزو کو سب کچھ بتا دیا۔ اس نے بھی کچھ نہیں چھپایا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب

آتے چلے گئے۔"

میرے دل کی دھڑکنیں بری طرح زیروزبر ہو رہی تھیں۔ ہم سب اور خاص طور سے میں یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اب موجودہ صورت حال کیا ہے؟ ماہا اور آرزو کے تعلقات کس مرحلے میں ہیں؟ آرزو کہاں ہے؟ اور اس کے حوالے سے ماہا کے ارادے کیا ہیں، وغیرہ وغیرہ؟

ان سارے سوالوں کا ماہا نے ایک ہی جواب دیا اور یہ ایسا جواب تھا جس نے مجھے وہیں بیٹھے بیٹھے مسمار کر کے رکھ دیا اور اس جواب کے بعد ماہا زیادہ دیر وہاں ٹھہری بھی نہیں۔ ایک اجنبی سی خاموشی کی چادر اوڑھ کر فوراً ہی اٹھ کر چلی گئی اور وہ بے رحم جواب یہ تھا۔ "میں آپ لوگوں سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی، میں آرزو سے شادی کر چکی ہوں، ہم پچھلے ایک برس سے میاں بیوی ہیں۔"

•••

میں اپنی وسیع کوٹھی کے وسیع بیڈروم میں سب روشنیاں بجھائے لیٹا تھا۔ غم ایک آرے کی طرح دل کو کاٹ رہا تھا۔ پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ کچھ چیزوں کی اصل قدر و قیمت کا پتا انہیں کھونے کے بعد چلتا ہے۔ مجھے بھی یہ پتا چل رہا تھا کہ میں ماہا سے بہت محبت کرتا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ میں ماہا سے جدائی کا یہ دکھ برداشت ہی نہیں کر سکوں گا۔ سب کچھ درہم برہم کر کے رکھ دوں گا۔ کبھی لگتا تھا کہ شاید وقت کے ساتھ یہ سب کچھ جھیل لوں گا..... میں ماہا کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا کوئی اقرار نہیں تھا، کوئی وعدہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ خاموشی سے "یورپ یاترا" کے لیے روانہ ہوتے وقت بھی میں نے اس کے ساتھ اس معاملے پر کھل کر بات نہیں کی تھی۔ بس دو طرفہ خاموش انڈراسٹینڈنگ ضرور تھی لیکن خاموش جذبوں کو جب تک زبان نہ دی جائے وہ وجود اور عدم وجود کے درمیان ہی بھٹکتے رہتے ہیں۔

کئی دن تک میں اپنے اردگرد سے کٹا رہا اور ماہا کے غم سے لڑتا رہا۔ کبھی کبھی دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف حرکت کرنے لگیں۔ پھر ڈیڑھ سال پہلے کا وقت آجائے، میں کسی خوبصورت شام میں کسی خوبصورت باغ کے کسی تنہا گوشے میں ماہا کے سرخ و سپید ہاتھ تھاموں اور اس سے کہوں، میں تم سے پیار کرتا ہوں..... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن وقت کسی کے لیے ٹھہرتا نہیں، پلٹنا تو بہت دور کی بات ہے۔

کسی وقت لگتا کہ ماہا مکمل طور پر بے قصور بھی نہیں ہے، وہ میرے اور اپنے خاموش تعلق کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ پھر اس نے یہ بے حسی کیوں دکھائی؟ ایک ایسے شخص کے لیے مجھے دکھ کے دریا میں دھکیلا جو کسی طرح بھی اس کے لائق نہیں تھا۔ کیا ماہا نے مجھ سے میری بے پروائی اور خاموشی کا بدلہ لیا ہے۔ جب خیال آتا تو میرے اندر میرا تیموری خون جوش مارنے لگتا۔ جی چاہتا الماری سے اپنا بریٹا پستول نکالوں اور اسے اپنے لباس میں رکھ کر براستہ سڑک لاہور سے کراچی روانہ ہو جاؤں۔ ماہا اور آرزو کو ڈھونڈوں۔ اس ٹیڑھے بازو والے خبیث شاعر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں اور ان دونوں کا جینا حرام کر دوں۔ ایک موقع تو ایسا آیا جب میں واقعی تیار ہو گیا۔ میں نے مشہود کو مجبور کیا کہ وہ ایمی کے ذریعے کراچی میں ماہا کا اتا پتا معلوم کرے اور مجھے بتائے۔

انہی دنوں اٹلی سے میرا دوست فریزر، اس کی گرل فرینڈ مارتھا اور اس کی سہیلی کرسٹی لاہور آ گئے۔ جس طرح ان لوگوں نے بڑی محبت سے مجھے پورا اٹلی گھمایا تھا، اب میری بھی ذمے داری پاکستان گھمانے کی تھی۔ وہ لوگ پاکستان کے شمالی علاقہ جات دیکھنے کے شدید خواہش مند تھے۔ مجھے ان کے ساتھ روانہ ہونا پڑا۔ تین چار مقامی دوست بھی اس سیاحتی ٹور میں شریک ہو گئے، مشہود اور ایمی بھی ان میں شامل تھے۔ اگلے چھ سات ہفتے تک ہم شمالی علاقوں کے دور دراز ہل اسٹیشنز پر گھومتے رہے۔ اس ٹور نے مجھے میرے غم سے سنبھلنے میں کافی مدد دی۔ اس میں کچھ کردار سنہرے بالوں اور ہلکی نیلی آنکھوں والی کرسٹی کا بھی تھا۔ وہ ہر موضوع پر گھنٹوں تک مجھ سے باتیں کرتی۔ وہ ہمارے گروپ کے خوش اخلاق اور ملنسار ممبرز میں سے تھی۔ اس ٹور کے دوران میں بھی میرے کہنے پر ایمی بذریعہ فون، ماہا کا سراغ لگانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ناکامی ہوئی۔ ماہا نے جو موبائل فون نمبر ایمی کو دیا تھا، وہ بھی مستقل طور پر خاموش تھا۔

اس ٹور کے بعد میرے تینوں اطالوی دوست تھائی لینڈ اور ملائیشیا کی سیر کو جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے بے حد اصرار کیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگلے ڈھائی تین ماہ تک سیاحت اور ماہا کا غم ساتھ ساتھ چلتے رہے..... پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔ غم کی دھار کچھ کند ہونے لگی تھی۔

•••

ان واقعات کو اب ایک سال سے زائد وقت گزر چکا ہے۔ میں آج کل اٹلی میں ہوں، یہاں میلان میں، میں نے ایک چھوٹا لیکن آرام دہ اپارٹمنٹ خریدا ہوا ہے۔ کرسٹی میری زندگی میں داخل ہو چکی ہے اور میں اس سے شادی کر چکا ہوں۔ زندگی جو کچھ عرصہ پہلے تک پہاڑی ندی کی طرح تھی، اب ہموار میدانوں میں داخل ہو رہی ہے اور اس نے اب لگی بندھی رفتار سے بہنا شروع کر دیا ہے لیکن جس طرح ہموار پٹے والی ندیوں میں بھی کسی وجہ سے اچانک ہلچل پیدا ہو جاتی ہے..... میرے شب و روز میں بھی پانچ چھ دن پہلے ایک شدید ہلچل پیدا ہوئی ہے۔ کافی عرصے بعد پاکستان سے مشہود نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ انٹرنیٹ کی وڈیو کال کے ذریعے ہم نے کوئی ایک گھنٹا بات چیت کی ہے۔

اس انکشاف انگیز بات چیت کے بعد مجھے پتا چلا ہے کہ عورت کو پہیلی کیوں کہا جاتا ہے؟ کیوں اس کے دل کی گہرائی ناپنے میں دنیا کے دانش مند ترین مرد بھی ناکام رہے ہیں۔ اپنی اس وڈیو کال میں مشہود نے مجھ پر انکشاف کیا ہے کہ ایک سال پہلے جب ہم لاہور کے مضافاتی فارم ہاؤس میں ملے تھے اور ماہا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آرزو سے شادی کر چکی ہے..... تو اس نے جھوٹ بولا تھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔ میرا سارا جسم لرزنے لگا تھا۔

"ہاں آصف۔" مشہود ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "تب آرزو سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، آرزو سے اس کی شادی اب ہوئی ہے، صرف دو ماہ پہلے۔"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو مشہود۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"شروع میں میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا آصف..... لیکن اب آہستہ آہستہ آنا شروع ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کچھ ایمی نے بھی میری مدد کی ہے۔ ایمی بھی ایک عورت ہے اور عورت کے دل و دماغ کو ہم سے بہتر سمجھتی ہے..... میں نے اور ایمی نے بہت گہرائی میں جا کر تجزیہ کیا ہے آصف..... اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ماہا کو تم نے ہار کھویا ہے۔ ایک بار، جب تم اس سے اظہار محبت کیے بغیر یورپ چلے گئے..... اور دوسری بار، جب تم نے آرزو کے ساتھ اس کی شادی کی خبر سنی اور اس کو سہہ لیا۔"

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "مشہود! میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ تم مجھے الجھا رہے ہو۔"

مشہود نے جواب میں جو کچھ بتایا، اسے میں اختصار کے ساتھ بیان کر دیتا ہوں اور اب میں بھی اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ جو کچھ مشہود نے بتایا..... وہی صحیح ہے، سو فیصد درست ہے۔

"ماہا عبیرہ جسے ہم ماہا عجیب بھی کہتے تھے، محبت کرنے اور کرنے کے بارے میں بھی عجیب ہی رہی۔ وہ دل میں میری چاہ رکھتی تھی۔ میری بدقسمتی کہ میں دل میں اس کی چاہ رکھنے کے باوجود اس کے بارے میں جلد ہی سنجیدہ نہ ہو سکا۔ اسی دوران میں مسلم آرزو والا چکر چل گیا۔ ہم دوستوں نے مسلم آرزو کو بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا اور اپنی اپنی مصروفیتوں میں کھو گئے لیکن حساس ماہا اسے مکمل نظر انداز نہ کر سکی۔ تو نو کی شام وہ گلشن اقبال میں اس سے ملی۔ شروع میں ان دونوں کے درمیان دوستی کا ناتا بنا لیکن ماہا تادیر مسلم آرزو کو دوستی کی حد میں نہ رکھ سکی۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہنے لگا اور ماہا کے بغیر اس کے لیے زندگی کا تصور کرنا بھی محال ہو گیا۔ دوسری طرف ماہا بھی جو پہلے پہل آرزو کے لیے صرف ہمدردی رکھتی تھی اب اس کے لیے کچھ اور بھی محسوس کرنے لگی۔ اس کو "ہمدردی جمع محبت" کہا جا سکتا تھا۔ اس موقعے پر ماہا دو حصوں میں بٹی ہوئی لڑکی بن گئی۔ اس کے دل کے نہاں خانوں میں میرے لیے نرم گوشے موجود رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ میں اسے چاہتا ہوں لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ تعلق ایک دھند جیسا ہے۔ نظر آتا ہے اور نہیں بھی آتا۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ایک طرف وہ دکھی آرزو کو مزید دکھوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتی تھی، دوسری طرف اس کی چھٹی حس اسے ایک خطرے سے بھی آگاہ کرتی رہتی تھی۔ اسے میرا خیال بھی تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اگر اس نے آرزو سے شادی کر لی تو میرا ردعمل کیا ہوگا۔ میں اس صدمے کو کتنی شدت سے لوں گا؟ میں سنبھل پاؤں گا یا بکھر جاؤں گا؟ وہ ایک دوراہے پر تھی۔ اس کی شدید حساسیت اسے کسی طرف بھی جانے نہیں دیتی تھی..... اور پھر میں پاکستان واپس آ گیا۔ لاہور کے فارم ہاؤس میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ ماہا نے میرے جذبات کو پرکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ وہ مسلم آرزو سے شادی کر چکی ہے۔ یہ ایک طرح سے میرے ردعمل کا امتحان بھی تھا۔ اگلے کئی ماہ تک اس نے مجھ سے دور رہ کر بھی میرے ردعمل پر نظر رکھی۔ اگر میرا ردعمل واقعی شدید تر ہوتا..... یعنی میرے ضبط کا پانی کناروں سے چھلک جاتا تو پھر یقیناً ماہا کے فیصلے کچھ اور طرح کے ہوتے لیکن میں سہہ گیا اور میرے اس "سہہ جانے" نے ماہا کے لیے اگلے فیصلے آسان کر دیے۔ وہ دوراہے سے حرکت میں آئی اور اس راستے پر مڑ گئی جو مسلم آرزو کی طرف جاتا تھا۔ مسلم آرزو، جو سرتاپا شوق اور انتظار اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کرسٹی سے میری شادی کے قریباً دو ماہ بعد ماہا نے آرزو سے شادی کر لی..... کیونکہ وہ ماہا عجیب ہی تھی۔

XXX

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

دسویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

محبت کی یہ داستان نوشہرہ کے لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا انا پرست باپ سردار سرفراز خان طبقاتی فرق کی وجہ سے اپنے بیٹے کی محبت کا مخالف ہے۔ لیاقت اپنی چاہت فرمین سے شادی کر کے کراچی آجاتا ہے۔ باپ مخالف مگر ماں اس کی ہمدرد تھی۔ یہ جوڑا کراچی کی ایک کچی آبادی میں گل خان اور اس کی بیوی دربینہ کے ساتھ مشترکہ طور پر کرائے کے مکان میں قیام کرتا ہے۔ مکان سے متصل قبرستان میں فرمین ایک ہندو عامل پرتاب گھوش کو برہنہ حالت میں پر اسرار عمل و رقص کرتے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے اسی دوران لیاقت حسین کو ایک قبر سے عمل کیا ہوا تعویذ ملتا ہے وہ اللہ کا نام لے کر اس عمل کو ختم کر دیتا ہے۔ لیاقت ملازمت کے لیے پریشان تھا کہ راہ میں ایک جلتے مکان سے جان پر کھیل کر ایک عورت کو نکال لانے پر اس کے بیٹے کے ذریعے اسے سیٹھ عثمان کے ہاں ملازمت مل جاتی ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی مسز راحیلہ بیگم بہت سلجھے ہوئے ہمدرد انسان اور کامیاب بزنس مین ہیں جبکہ شیخ حامد بظاہر ان کا رفیق مگر درحقیقت

حریف ہے اور اپنے دست راست افضل خان کے ذریعے اپنے مخالفین کو نقصان پہنچاتے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین جسے ایک نابینا بزرگ کی جانب سے ایک ماورائی قوت یعنی ہمزاد میسر آ گیا ہے جو مشکل وقت میں اس کے کام آتا ہے لیکن لیاقت حسین کو اس کے متعلق کوئی ادراک نہیں ہے اسی پراسرار قوت کے باعث وہ ہر بار شیخ حامد کے منصوبوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ میڈم روبی ایک دولت مند بیوہ ہے جو اپنے شوہر کی حادثاتی موت کے بعد بزنس اور سماجی مصروفیات میں شامل ہوتی ہے اور شوہر کی موت کا انتقام لینا چاہتی ہے اور اسی سلسلے میں شیخ حامد کے دست راست افضل خان سے راہ و رسم بڑھاتی ہے اس کے علاوہ شیخ حامد جو کہ مافیا کا سرغنہ ہے اور کوڈورڈ بلیک ٹائیگر کے تحت کئی خفیہ سرگرمیوں میں ملوث ہے، اس کے آفس کی ایک ورکر شبنم بھی بگ باس کے خلاف میڈم جیسے ہی مخالف جذبات رکھتی ہے اور اپنی ماں کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ لیاقت حسین کے علاوہ سیٹھ عثمان کا ایک پولیس آفیسر دوست ڈی ایس پی سراج بھی اس کا مددگار ہے جو کہ ایک ایماندار افسر ہے اور افسر اعلیٰ علیم احمد کا قابل اعتماد ہے۔ شیخ حامد میڈم کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے افضل خان کو استعمال کرتا ہے اور وہ شراب کے نشے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں میڈم کی قابل اعتراض تصاویر حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن عین وقت پر ایک پراسرار کال کے سبب وہ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ متعدد مواقع پر لیاقت حسین شیخ حامد کے آڑے آتا رہا۔ لہٰذا وہ لیاقت حسین کا دشمن بن گیا اور اسے مجبور کرنے کے لیے فرحین کو اغوا کرا لیتا ہے لیکن یہاں بھی لیاقت حسین اپنے ہمزاد کے ذریعے کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ناکامی کے بعد بگ باس شیخ حامد افضل خان کو سخت عتاب کا نشانہ بناتا ہے۔ دوسری جانب شبنم میڈم روبی سے ملتی ہے اور مشترکہ مقصد کے لیے تعاون کی درخواست کرتی ہے۔ اسی دوران اعلیٰ افسر علیم احمد ریٹائر ہو جاتا ہے اور آغا منظور اس کی جگہ لیتا ہے جو کہ ایک کرپٹ افسر ہے لیکن میڈم روبی کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ردوبدل کے نتیجے میں نیا ڈی ایس پی لودھی تعینات ہوتا ہے جبکہ ایس پی کے عہدے پر اور نکریب جوائن کرتا ہے جو کہ ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ سراج حکمت عملی کے تحت در پردہ شیخ حامد سے تعلقات استوار رکھتا ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا کی کال سراج کو موصول ہوتی ہے جس میں وہ اپنی خودکشی کی اطلاع دیتی ہے اور اپنی ایک خفیہ تحریر کے متعلق بتاتی ہے جو اس نے سراج کے نام لکھی ہے جس میں کچھ انکشافات کیے گئے ہیں۔ سراج پریشان ہو جاتا ہے کہ موبائل پر اس کے نمبر زد دیکھ کر شیخ حامد اس سے برگشتہ ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا، حامد نے سراج کو مزہ چکھانے کے لیے اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیا لیکن اس بار پھر لیاقت حسین کے ہمزاد نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ صبا بیگم کی موت کو تحقیقات کے لیے اور نگ زیب تندہی سے تفتیش کرتا ہے شیخ حامد انسپکٹر لودھی کے ذریعے جو اس کا گماشتہ ہے منصوبہ بندی کرتا ہے۔ سیٹھ عثمان لیاقت حسین کو اپنے یہاں ہی انیکسی میں رہائش دے دیتا ہے جبکہ فرحین بھی اپنے علاقے کا ایک چکر لگا کر آتی ہے اور وہاں کا احوال لیاقت حسین کو بتاتی ہے۔ دوران تفتیش انسپکٹر دانش سراج کو ایک اہم فائل کے متعلق بتاتا ہے، دوسری جانب شیخ حامد سخت مشتعل ہو کر انسپکٹر لودھی کی ملی بھگت سے بلیک ٹائیگر کے ذریعے تھانے پر حملہ کر کے انسپکٹر دانش کو قتل کرا دیتا ہے اور تھانے کا تمام ریکارڈ جلا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ جبکہ افضل خان اسپتال سے فارغ ہو کر بے یار و مددگار مایوسی کے عالم میں خودکشی کے بارے میں سوچتا ہے کہ اسے شبنم اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ لے جاتی ہے۔ شبنم بگ باس کے زیر اثر اسی کی ہدایت پر افضل خان کو اپنے فلیٹ میں لائی تھی اور اس کا مقصد آخری چانس طور پر شیخ حامد کے مخالفین کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو اغوا کرایا جاتا ہے جہاں ہمزاد پہنچ کر اسے آزاد کرا لیتا ہے۔ اور نگ زیب سراج سے مل کر باہمی اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ شیخ حامد کے گھر پر حملہ ہوتا ہے اور وہ چراغ پا ہو کر انسپکٹر لودھی سے باز پرس کرتا ہے اور ایک نئے حریف رستم علی آغا خانی کا کردار سامنے آتا ہے۔ مذکورہ حملہ بین الاقوامی ایجنٹ رکھنے والی سیون اسٹار سیکیورٹی نے اپنے ایجنٹ ہاشم اینڈ کمپنی اور مقامی گینگسٹر جہانگیر بٹ عرف جگا کی مدد سے کیا تھا۔ شیخ حامد اپنی سیکریٹری کنول سے خفیہ شادی کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہاشم بھی بگ باس سے ذاتی خاصمت رکھتا ہے اور اسی سلسلے میں جگا سے ملتا ہے جبکہ شبنم افضل خان کو بگ باس کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس کے دشمن رستم علی کے خلاف کارروائی پر آمادہ کرتی ہے اور بگ باس کے مخصوص طریقہ کار کے مطابق رستم علی کی اپنی بیوی کے ساتھ نازیبا تصاویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اس کے مستقبل کا فیصلہ ابھی نہیں کیا گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایس پی اورنگ زیب کے لیے وہ چٹ غیر متوقع نہیں تھی جو ڈیوٹی کانسٹیبل نے اس کی میز پر رکھی تھی۔ اس پر ڈی ایس پی لودھی کا نام درج تھا۔ اورنگ زیب نے ایک لمحہ کچھ سوچا پھر کانسٹیبل سے بولا۔

"تم مسٹر لودھی کو آدھے گھنٹے تک ملاقاتی کمرے میں بٹھاؤ پھر اندر بھیج دینا۔"

"رائٹ سر....."

کانسٹیبل سیلیوٹ کر کے باہر چلا گیا تو اورنگ زیب نے وہ فائل دراز سے نکال کر سامنے رکھ لی جس کی وجہ سے اس نے لودھی کو اس وقت طلب کیا تھا، اس فائل میں لودھی کے فوری طور پر معطل کیے جانے کے احکام موجود تھے جو اسے براہِ راست ہوم سیکریٹری کی طرف سے ملے تھے۔ ان احکامات کی پشت پر خود اورنگ زیب کا ہاتھ تھا جس کا علم اس کے بعد مرکزی حکومت کے ایک ذمے دار آفیسر کے علاوہ کسی اور کو نہیں تھا۔ اس تمام کارروائی میں سراج کا غائبانہ ہاتھ بھی شامل تھا۔ اورنگ زیب کے اصرار پر اس نے الماس کا نام درمیان سے نکال کر وہ تمام کہانی سنا دی تھی جو اسے معلوم تھی۔ لیاقت حسین کا نام بھی اس نے درمیان سے حذف کر دیا تھا لیکن خود سراج کو بھی اس بات کی بھنک نہیں تھی کہ اورنگ زیب، لودھی کو اپنے مخصوص ذرائع استعمال کر کے معطل بھی کرا دے گا۔

آدھے گھنٹے بعد لودھی نے کمرے میں داخل ہو کر اورنگ زیب کو سیلیوٹ کیا پھر اس کا اشارہ پا کر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مسٹر لودھی....." اورنگ زیب نے سنبھل کر سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔ "انسپکٹر دانش کی پراسرار موت اور تھانے کی تباہی کے سلسلے میں آپ نے اب تک کیا انکوائری کی ہے؟"

"سر..... مجھے اس میں فرنانڈس فوٹو گرافر اور اس کی پشت پناہی کرنے والی مافیا کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔"

"گویا یہ بات آپ کے علم میں تھی کہ فرنانڈس کسی گھناؤنے کام میں ملوث تھا اور..... کوئی مافیا بھی اس کی پشت پناہی کر رہی تھی؟"

لودھی ایک لمحے کو گڑبڑا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ "میری کوشش تھی سر کہ کسی طرح فرنانڈس پر بھرپور ہاتھ ڈالوں لیکن کوئی ٹھوس ثبوت میرے ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔"

"کیا آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ انسپکٹر دانش نے اسے مافیا کے درمیان میں آنے سے قبل کہاں اور کن حالات میں گرفتار کیا تھا جبکہ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ تھانے کے لاک اپ میں تھا۔"

"میں وہی بتانا چاہتا ہوں سر..... انسپکٹر دانش نے اسے گرفتار کرنے کے بعد مجھے فون پر اطلاع دی تھی، میں نے اس کے فوراً بعد ہی اس کی چھان بین بھی شروع کر دی لیکن پھر جو صورت حال سامنے آئی وہ دوسروں کی طرح خود میرے لیے بھی ناقابل یقین ہی تھی۔" لودھی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے اس بات کی توقع نہیں تھی کہ فرنانڈس کی پشت پناہی کرنے والے اتنا سنگین قدم اٹھانے کی بھی جرأت کر سکتے ہیں۔"

"یو آر رائٹ....." اورنگ زیب نے زہرخند سے کہا۔ "اس بات کا افسوس مجھے بھی ہے کہ دہشت گرد یا مافیا کے لوگ کوئی خطرناک قدم اٹھانے سے پیشتر ہم پولیس والوں کو اپنے ارادے سے آگاہ کیوں نہیں کرتے۔"

لودھی جواب میں کسمسا کر رہ گیا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟" اورنگ زیب نے دوبارہ جارحانہ انداز اختیار کیا۔ "کیا فرنانڈس بغیر پولیس کی ملی بھگت کے حوالات سے نکل کر چلا گیا ہوگا؟"

"ڈیوٹی روسٹر بھی تھانے کے دیگر ریکارڈ کے ساتھ ہی ضائع ہو گیا ورنہ....."

"میں آپ کا ہم خیال نہیں ہوں۔" اورنگ زیب نے اس کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہا۔ "میری اطلاع کے مطابق کسی بڑے مگرمچھ کے اشارے پر فرنانڈس کو گرفتار کرنے کی کوششیں بھی نہیں کی گئیں۔"

لودھی اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا۔ اورنگ زیب نے لوہا گرم دیکھ کر سرسراتے لہجے میں کہا۔

"میرے پاس اس آؤٹ سرچ مشیر نامے کی ایک نقل بھی ہے جس کو منظر عام پر لانے سے روکنے کی خاطر یہ سارا ناٹک کھیلا گیا تھا۔ اگر وہ مشیر نامہ سامنے آ جائے تو اب بھی کچھ بڑے لوگوں کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔"

"سر....." لودھی نے ڈھیٹ بن کر جوتوں سمیت اورنگ زیب کی آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کی۔ "ہم اس مشیر نامے کی روشنی میں اب بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"سوری....." اورنگ زیب کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ "میں کچا کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ کسی خاص سرغنہ کے گرد اپنا گھیرا مضبوط کرنے کے بعد ہی میں کوئی قدم اٹھانے کا عادی ہوں۔"

"میں ہر طرح آپ کے ساتھ ہوں سر..... آپ آزما کر دیکھ لیں۔"

"آپ جس علاقے میں تعینات ہیں اس میں آپ کو کتنا عرصہ گزر گیا؟" چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا گیا۔

"تبادلہ کسی افسر کے ذاتی اختیار میں نہیں ہوتا سر....."

لودھی پھر تذبذب کی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔

"گڈ..... اب آپ نے ایک مطلب کی بات کی ہے۔" اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ "میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ کوئی ایسا شخص درمیان میں ضرور ہے جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر آپ کا تبادلہ پسند نہیں کرتا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"یہ آپ کی ذاتی رائے ہے سر..... ورنہ میں ایسے کسی آدمی سے....."

"مسٹر لودھی....." اورنگ زیب نے جھلا کر میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو یہاں کسوٹی کھیلنے کی غرض سے طلب نہیں کیا تھا۔ یہ بھی باور کرا دوں کہ کسی سے مرعوب ہونے کا عادی نہیں ہوں اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ میرے ساتھ سیدھی طرح تعاون کریں۔"

"آپ حکم دیں سر..... میں انکار نہیں کروں گا۔" لودھی نے پھر معصومیت کا اظہار کیا۔

"جس رات انسپکٹر دانش نے فرنانڈس کو حوالات سے دور گرفتار کیا تھا..... اس رات وہ کس کی تصویریں بنانے کی خاطر وہاں گیا تھا؟"

"یہ بات میں کیسے بتا سکتا ہوں، اگر فرنانڈس زندہ ہوتا تو میں اس کے فرشتوں سے بھی سب کچھ اگلوا لیتا۔"

"آئی سی....." اورنگ زیب نے اسے حقارت سے گھورا۔ "گویا تم اب بھی کسی کے اشارے پر زبان بند ہی رکھنے کی پالیسی جاری رکھو گے؟"

"سر..... میں پروٹسٹ کرتا ہوں۔" لودھی نے تلملا کر کہا۔ "آپ میرے اوپر بغیر کسی ثبوت کے بے بنیاد الزام....."

"شٹ اپ....." اورنگ زیب نے چیخ کر کہا پھر اس کی معطلی کے حکم نامے کو فائل سے نکال کر سامنے ڈالتے ہوئے بڑے سفاک لہجے میں حکم دیا۔ "ریسیوائٹ..... اینڈ گٹ لاسٹ!"

لودھی نے ایک نظر اس آرڈر پر ڈالی۔ ایک ثانیے کے لیے ہونٹ چبائے پھر اس کی کاپی وصول کرنے کے دستخط کرتا ہوا اٹھا اور اورنگ زیب کو سیلوٹ کیے بغیر نکل گیا۔

"کھیل اب شروع ہوگا بامٹرڈ..... میں تمہیں اور تمہارے گندے مگرمچھ کو بتاؤں گا کہ قانون کے ہاتھ کتنے دراز اور طاقت ور ہوتے ہیں۔" لودھی کے جانے کے بعد اورنگ زیب نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

❁❁❁

سیون اسٹار کی جانب سے شیخ حامد سے دو دو ہاتھ کرنے کی کلین چٹ مل جانے کے بعد ہاشم کی دلی مراد بر آئی تھی، اگر وہ سیون اسٹار کا پابند نہ ہوتا تو شاید اب تک سکون سے نہ بیٹھتا۔ اس کا تعلق جنوبی افریقا کے ایک ایسے غیر مہذب قبیلے سے تھا جہاں صرف طاقت کی پوجا کی جاتی تھی، کسی کو مار دینا یا مر جانا ان کے لیے ایک پسندیدہ کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا، اپنی اسی بے جگری اور موت کی آگ میں کود جانے کی عادت نے اس کی شہرت قبیلے کے دور دراز علاقوں میں پھیلا دی تھی۔ اس کے بعد جب ایک بار اس کی خدمات کو مہذب دنیا کی ایک تنظیم نے منہ مانگے داموں خریدا تو ہاشم کو بھی اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو گیا۔ اپنے پہلے ہی مشن میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ دوسری ایسی تنظیموں کی فہرست میں بھی شامل ہو گیا جو تخریبی کارروائیوں کی خاطر مختلف حکومتوں کو اپنے ایجنٹ سپلائی کرتی تھیں۔ ایسی ہی ایک تنظیم کے ذریعے پہلی بار کسی ایشیائی ملک میں اسے خدمت کا موقع ملا تھا۔ یہاں بھی ایک مخصوص پاس ورڈ کے ذریعے حرکت میں آنے کا حکم ملا تھا۔

جگا سے ملنے کے بعد ہاشم کا پروگرام تھا کہ وہ پہلی فرصت میں منصوبہ بندی کر کے اپنے اس دشمن کو چیونٹی کی طرح مسل دے گا جس کے گرگے اسے پھانسنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اگر لوچن نے بروقت اپنی ذہانت سے پانسا پلٹنے کی خاطر موت کا رسک نہ لیا ہوتا تو شاید دونوں ہی مارے جاتے۔

وہ جگا کی اصول پسندی اور دوستانہ رویے سے مطمئن ہونے کے بعد ہی باہر نکل رہا تھا جب اس کی نظر اچانک دراز قد والے کسرتی جسم کے مالک اور سنہری فریم کا چشمہ لگائے ہوئے فرد پر پڑی۔ ہاشم اسے اپنے ہوٹل کے باہر بھی ایک دو بار منڈلاتے دیکھ چکا تھا۔ سیون اسٹار نے جگا کا ذکر کرتے وقت یہ حوالہ بھی دیا تھا کہ شیخ حامد کے نمائندے بھی کوٹھی پر ہونے والی فائرنگ اور دو مقامی بدمعاشوں کی لاش ملنے کے بعد جگا کو کھنگالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہاشم کے ذہن میں اس مشتبہ شخص کو دیکھ کر فوری طور پر یہی خیال آیا تھا کہ وہ بڑے مگرمچھ کا کوئی خاص آدمی ہوگا۔ ہوٹل کے آس پاس اسے منڈلاتا دیکھنے کے بعد اسے جگا کے اڈے پر بھی دیکھ کر ہی ہاشم کی چھٹی حس اچانک بیدار ہو گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جگا سے ملنے کے بجائے خود ہاشم کا تعاقب کرتا ہوا وہاں تک پہنچا ہو۔ بہرحال، دونوں ہی صورتوں میں ہاشم اس درمیانی خطرے کو بھی دور کرنے کے بارے میں طے کر چکا تھا، راستے کے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کیے بغیر وہ عام حالات میں بھی منزل تک الل ٹپ جانے کا عادی نہیں تھا۔

اس نے واپسی میں بھی کسی تعاقب پر خاص توجہ رکھی تھی لیکن اس بات کا یقین آ جانے کے بعد کہ اس کا پیچھا نہیں کیا گیا اس کا یہ شبہ اور بھی پختہ ہو گیا کہ نظریں چار ہو جانے کے بعد شاید وہ بھی محتاط ہو گیا ہو۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے دو روز تک خود کو ہوٹل کے کمرے تک ہی محدود رکھا۔ صرف سیون اسٹار کے حوالے سے اس نے احتیاطاً بیرونی ایجنٹ ڈوما کو تاکید کر دی تھی کہ وہ دور دور رہ کر ہاشم پر کسی متوقع حملے کے پیشِ نظر پوری طرح چوکس رہے۔ دبلی زبان سے اس نے اپنی نظروں میں آنے والے مشکوک شخص کا سرسری حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ اس کی خبر لوچن کو نہ دی جائے۔

دو روز سے اس نے خود کو اپنے کمرے تک ہی محدود کر رکھا تھا۔ کھانا اور ناشتا بھی روم سروس کے ذریعے منگواتا رہا۔ اس عرصے میں اسے مجبوراً روم سروس کی اس میزبان خاتون سے بھی دوستی نبھانی پڑی جو اس وقت بھی اس کا سر کھانے میں مصروف تھی۔

"آپ دروازے سے باہر نہیں گئے؟" اس نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔ "کمرے میں تنہا بند بند آپ کا دل نہیں گھبراتا؟"

"جی نہیں..... آپ کی وجہ سے دل لگا رہتا ہے۔" ہاشم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔" میزبان خاتون نے اس کی نظروں میں دور تک جھانکا، اس کی نظروں میں کھلی دعوت سی تھی۔

"میں کسی وجہ سے زیادہ سنجیدہ بھی نہیں ہو سکتا۔" ہاشم نے یکلخت سنجیدگی اختیار کر لی۔

"کوئی خاص وجہ.....؟"

"میرا تعلق جس قبیلے سے ہے وہاں کے رسم و رواج بھی عجیب و غریب ہیں۔ ہم اپنے دیوتاؤں کو خوش کیے بغیر کسی غیر عورت کے زیادہ قریب نہیں جا سکتے ورنہ....." ہاشم نے دیدہ دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے.....؟ اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے آپ کو کیا کرنا پڑتا ہے؟"

"ایک ایسی رسم کی ادائیگی جسے مہذب دنیا کی عورتیں پسند نہیں کرتیں۔" ہاشم نے بہ دستور سنجیدگی سے میزبان خاتون کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم اس کے پابند ہیں، ایسا نہ ہوتا تو شاید ہم اس وقت دور دور نہ بیٹھے ہوتے۔"

"کہہ کر دیکھیں۔" وہ بے تکلف ہونے لگی۔ "ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی رسم کی ادائیگی میں بھی آپ کے ساتھ تعاون کروں۔"

"اگر آپ آمادہ ہو جائیں تو مجھے خوشی ہوگی لیکن..... ایسا ہونا اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔" ہاشم کے لہجے میں اداسی اترنے لگی۔ "ہم اس معاملے میں بڑے بدنصیب ہیں، دیوتاؤں کی ناراضی ہمارے اوپر جو آسمانی عتاب نازل کرتی ہے اس کا تصور ہی بڑا بھیانک ہوتا ہے، اس لیے..... ہم سب کچھ ہوتے ہوئے بھی..... کچھ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔"

"آپ ہمارے غیر ملکی مہمان ہیں مسٹر ہاشم....." وہ اٹھ کر ہاشم کے اور قریب چلی آئی۔ "آپ کو خوش رکھنا ہمارا فرض بھی ہے۔ ایسی کیا رسم ہے جو آپ کی خاطر پوری نہیں کر سکتی؟" اس نے بے تکلفی سے ہاشم کا ہاتھ تھام کر آہستہ سے دبایا۔ "ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔"

"ایک گلاس خون....." ہاشم نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "ہم جہاں بھی جاتے ہیں دیوتا کی ایک مورتی ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ کسی عورت سے ملاپ کرنے سے پیشتر ہمیں اس مورتی کو تازہ خون سے غسل دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم ایک ہو سکتے ہیں۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے ہاشم نے اسے جذباتی انداز میں خود سے قریب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "تمہارا قرب میرے لیے قیامت سے کم نہیں۔ گگ..... کیا..... تم ایک گلاس خون دے کر دیوتا کی خوشنودی حاصل کرنے میں میری مدد کرو گی، میں اس کے عوض تمہیں منہ مانگا انعام دے سکتا ہوں۔"

"مم..... میں..... کل رات کی ڈیوٹی پر ہوں۔" میزبان خاتون نے کسمسا کر خود کو ہاشم سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی مجھے دوسرے کمروں کو بھی اٹینڈ کرنا ہے..... کل..... کل..... میں سوچ کر جواب دوں گی۔"

"پلیز....." ہاشم اس کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ خود کو بے حد جذباتی پوز کر رہا تھا۔ "قریب آ کر اب تم دور جانے کی بات نہ کرنا ورنہ..... ورنہ شاید دیوتاؤں کو خوش کرنے کی خاطر مجھے زبردستی کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ ہم جس کے پجاری ہیں اس نے مرد کو پتھر بنا دیا تھا۔ دیوتا اپنے کسی پجاری کی بزدلی بھی برداشت نہیں کرتا۔ ہم اس کی خوشی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا۔"

"ٹھ..... ٹھیک ہے..... مم..... مم..... میں کل تمہارے ساتھ ہی ہوں گی۔" خاتون نے سہمے ہوئے انداز میں جھوٹی ہامی بھری۔ "تمہاری خاطر مم..... میں ایک کے بجائے دو دو..... گلاس..... خون بھی دے سکتی ہوں۔"

"تھینکس سویٹ ہنی۔" ہاشم نے اس کا ہاتھ گھسیٹ کر زبردستی چوم لیا۔ "کل میں بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گا۔"

میزبان خاتون ہاشم کے دور ہوتے ہی جبراً مسکراتی ہوئی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہاشم نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسرے دن اس نازک ادا خاتون کی جگہ اس کا استعفیٰ ہی ہوٹل والوں کو موصول ہوگا۔ خاصی دیر تک وہ خود اپنے ڈرامے سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر اس نے سکون کا سانس لے کر بیٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ تیزی سے اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اس پر ڈوما کے نام کا کوڈ چمک رہا تھا۔

"ہیلو....." ہاشم نے سنجیدگی سے کال اٹینڈ کی۔

"دو روز کے تھکا دینے والے انتظار کے بعد آج مجھے تمہارا مطلوبہ شکار نظر آ گیا۔" ڈوما نے مدھم آواز میں کہا۔ "اس وقت تمہاری بالکونی کے عین سامنے والے ڈرگ اسٹور

میں گیا ہے، تم بھی ایک نظر دیکھ کر تصدیق کرلو۔"

"تم اس وقت کہاں ہو.....؟" ہاشم نے بالکونی کی طرف جاتے ہوئے سوال کیا۔

"فکر مت کرو..... میں جہاں ہوں وہاں تک اس کی نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔"

"ہولڈ رکھنا..... میں دیکھتا ہوں۔" ہاشم ٹہلتا ہوا بالکونی میں آکر اس طرح انگڑائی لینے لگا جیسے دیر تک سونے کے بعد تھکن اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بالکونی میں گئے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے اپنا مطلوبہ شخص نظر آگیا۔ اس وقت وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے پر حسب دستور سنہری فریم کا لائٹ کلر والا چشمہ بھی موجود تھا۔

ڈرگ اسٹور سے نکل کر وہ اپنی اسپورٹس کار میں بیٹھا۔ دائیں بائیں دیکھنے کے بعد اس نے ایک سرسری نظر ہاشم کے کمرے کی طرف بھی ڈالی تھی۔ ہاشم اس وقت دوسری سمت دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نگاہ کا وسیع دائرہ اپنے شکار کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ ہاشم نے ایک اور انگڑائی لی پھر پلٹ کر کمرے میں آگیا۔ "تم نے جس شخص کو اسپاٹ کیا ہے، وہی میرا مطلوبہ آدمی ہے۔" اس نے دروازے کی آڑ میں ہو کر ڈوما سے رابطہ کیا۔

"پھر..... کیا کرنا ہے.....؟" دوسری جانب سے سپاٹ لہجے میں سوال کیا گیا۔

"کیا تم اس پوزیشن میں ہو کہ کسی طرح اسے قابو کر سکو؟"

"نہیں....." جواب ملا۔ "میں تنہا ہوں اس لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ البتہ اس کا تعاقب کیا جاسکتا ہے۔"

"اس میں بھی رسک ہے۔ ممکن ہے اس کا کوئی دوسرا ساتھی بھی آس پاس موجود ہو۔" ہاشم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کی نظریں دروازے کی آڑ سے مطلوبہ شخص پر تھیں جو اس وقت موبائل پر کسی کے نمبر پنچ کر رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں سیون اسٹار کی جانب سے کیا احکامات ملے ہیں لیکن..... میرا ذاتی خیال ہے کہ اسے فوری طور پر ٹھکانے لگانے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئے گی، زیادہ رسک لینا بھی ہمارے اصول کے خلاف ہے۔"

"ٹھیک ہے..... اگر وہ کہیں جائے تو اس کا تعاقب کرو۔ میں سیون اسٹار کی مرضی معلوم کر کے تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔"

ہاشم نے سلسلہ منقطع کر کے نظریں دوبارہ اسپورٹس کار پر جمادیں جو ایک لمحے بعد ہی حرکت میں آگئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ڈوما اس کے تعاقب میں کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ اسپورٹس کار نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی ہاشم کا ذہن اپنے شکار کے بارے میں کوئی آخری نتیجہ اخذ کرتا رہا۔ پانچ سات منٹ بعد اس نے دوبارہ ڈوما سے رابطہ قائم کرلیا۔ "تم اس وقت کہاں ہو.....؟"

"اسپتال روڈ پر....."

"کیا اندازہ ہے..... کوئی دوسری کار تو تمہارا تعاقب نہیں کر رہی؟"

"نہیں....."

"میں نے سیون اسٹار سے بات کرلی ہے۔" ہاشم نے ایک آخری فیصلہ کر کے پرسکون انداز میں کہا۔ "ادھر سے بھی تمہارے مشورے کو پسند کیا گیا ہے۔ کسی مناسب جگہ موقع دیکھ کر سوٹ کیس پارسل کردو..... میں دو گھنٹے بعد تم سے دوبارہ رابطہ قائم کروں گا۔"

"ایک مشورہ میں بھی دینا چاہوں گا۔" دوسری جانب سے ڈوما نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کہ کچھ اور نفری بھی تمہاری نگرانی پر مامور ہو..... ایسی شکل میں تمہارا کسی دوسری جگہ شفٹ ہوجانا زیادہ بہتر ہوگا۔"

"پریشان مت ہو مائی ڈیئر..... میں خطرات سے کھیلنے کا عادی ہوں۔" ہاشم نے اپنے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کردیا۔

فرحین کے بار بار سمجھانے کے بعد لیاقت حسین نے بھی ان پراسرار واقعات سے الجھنا کم کردیا تھا جو دوسروں کے کہنے کے مطابق رونما تو ہوئے تھے۔ جبکہ وہ بھی شریک ہوتا تھا لیکن ان واقعات کی تفصیل دوسروں کو معلوم ہوتی تھی۔ خود لیاقت حسین بھول جاتا تھا۔ دوسرے اس سے معلومات کرتے تو اس کا الجھ جانا قدرتی امر تھا لیکن فرحین کے سمجھانے کے بعد اس نے اپنے ذہن کو اس ایک بات سے مطمئن کرلیا تھا کہ جو کچھ ناقابل یقین صورتیں اس کے ساتھ پیش آرہی تھیں ان کا کوئی نہ کوئی تعلق اس ایک چٹکی خاک سے ضرور تھا جس سے بزرگ نے اسے نوازا تھا اور پھر غائب ہوگیا تھا۔ نابینا بزرگ کی نصیحت کے پیش نظر اس نے وہ بات ذہن کے سات پردوں میں چھپالی تھی۔ اس سے یہی کہا گیا تھا کہ اگر اس نے اس سربستہ راز کو زبان پر لانے کی غلطی کی تو شدید خسارے سے دوچار ہوجائے گا۔

اس وقت وہ صبح کا ناشتا کرنے کے بعد ڈیوٹی پر جانے کو تیار ہو رہا تھا کہ فرحین نے اس کے قریب آکر کہا۔

"کیا بات ہے۔ آج تو کچھ زیادہ ہی کنگھی پھیر رہا ہے سر میں۔"

"سچ بتادوں....." لیاقت حسین نے فرحین کے سراپا پر نظر ڈال کر اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ "تو برا تو نہیں مانے گی؟"

"چل نہ بتا....." فرحین نے نخرے سے جواب دیا۔ "جب تیرے پیٹ میں مروڑ ہوگی تو خود ہی اگل دے گا۔"

"بیگم صاحب کی وجہ سے اب تو نے بھی خاصی پٹر پٹر باتیں کرنی سیکھ لی ہیں۔"

"سراج صاحب کی صحبت نے تجھے بھی چکر بازی کے راستے بتادیے ہیں۔" فرحین نے سنجیدگی سے چھیڑا۔ "تب ہی تو بھول جانے والی باتیں کر کے اصلیت پر پردہ ڈالتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ کہیں تیرا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔"

جواب میں لیاقت حسین نے فرحین کے چہرے پر پھوٹتی شفق کو دیکھا تو اس کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے فرحین کو دبوچا پھر سرسراتی آواز میں کہا۔ "اگر میں ڈیوٹی پر جانے میں آدھے گھنٹے کی دیر کردوں تو بیگم صاحب سے میری سفارش کردے گی۔"

"دماغ چل گیا ہے تیرا؟" فرحین اس کا مقصد بھانپ کر شرماتے ہوئے بولی۔ "زیادہ مستی نہ کیا کر..... جلدی سے تیار ہوکر ڈیوٹی پر جا..... مجھے بھی بیگم صاحب کی طرف جانا ہے۔"

لیاقت حسین نے اس کی بات مان لی۔ وہ خود بھی ڈیوٹی کے معاملے میں پابندی وقت کا قائل تھا لیکن جاتے جاتے بھی وہ حسب معمول اس کی پیشانی کا بوسہ لینا نہیں بھولا تھا جو روزمرہ کا معمول تھا۔ لیکسی سے نکل کر وہ سیدھا برابر والے بنگلے پہنچا تو باہر سراج کی گاڑی دیکھ کر رک گیا۔

"ڈپٹی صاحب کب آئے؟" اس نے گارڈ سے پوچھا۔

"ابھی دس منٹ پہلے ہی آئے ہیں۔"

لیاقت حسین گاڑی کو گیراج سے نکال کر پورٹیکو میں لے آیا۔ دس منٹ بعد سراج اور عثمان صاحب ایک ساتھ ہی نکلے تھے۔ سراج سرسری طور پر لیاقت حسین سے اس کی خیریت دریافت کر کے چلا گیا، عثمان صاحب اپنے دفتر آگئے۔ حسب معمول لیاقت حسین نے ان کے دفتر میں جانے کے بعد ان کا بریف کیس پہلی نشست سے اٹھایا اور دفتر میں چلا گیا جہاں عثمان صاحب کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ لیاقت حسین خاموشی سے بریف کیس رکھ کر

حاضر جوابی

تیمور لنگ بادشاہ نے جب سمرقند فتح کیا تو ایک اندھی عورت پکڑی گئی۔ بادشاہ نے پوچھا۔

"تیرا کیا نام ہے؟"

عورت بولی "میرا نام دولت ہے۔"

بادشاہ نے ہنس کر کہا "کیا دولت اندھی ہوتی ہے؟"

عورت بولی "اگر دولت اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے گھر کیوں آتی؟"

حذیفہ کاشکوفہ، کراچی سے

حساب برابر

ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا غالب پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا۔

"بھائی! تو سید زادہ ہے، مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے؟"

انہوں نے نہ مانا اور کہا۔ "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دے دیجئے گا۔"

مرزا نے کہا۔ "اس کا مضائقہ نہیں۔"

جب وہ پیر داب چکے، انہوں نے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا۔

"بھیا! کیسی اجرت..... تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمہارے پیسے دابے، برابر ہوا۔"

مرسلہ: شعیل متین، یو ایس اے

جانے لگا تو عثمان صاحب نے اسے اشارے سے رکنے کو کہا۔ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ دو منٹ بعد انہوں نے فون سے فارغ ہو کر لیاقت حسین سے کہا۔

"سراج آج مجھ سے تمہارے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔"

"سب خیریت تو ہے صاحب.....؟"

"وہ تمہیں ہفتہ دس دن کسی خاص وجہ سے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔"

"جیسا آپ کا حکم ہوگا میں ویسا ہی کروں گا۔" اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"لیاقت حسین....." سیٹھ عثمان نے قدرے سنجیدگی

سے دریافت کیا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کچھ دن تمہیں اپنے ساتھ کیوں رکھنا چاہتا ہے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب، کوئی کام ہوگا ڈپٹی صاحب کو۔''

''ایک بات کہوں..... لیکن شرط یہ ہے کہ تم برا نہیں مانو گے۔''

''آپ شرمندہ کر رہے ہیں صاحب..... میں بھلا آپ کی کسی بات کا برا کیسے مان سکتا ہوں۔''

''سراج کے علاوہ میرا اور بیگم صاحبہ کا بھی یہی خیال ہے کہ اکثر ایسی باتیں ہمارے ہوش وحواس میں ہوتی ہیں جس میں تم بھی شریک ہوتے ہو لیکن..... وہ باتیں بعد میں تمہارے ذہن میں محفوظ نہیں رہتیں۔''

لیاقت حسین ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ جو بات عثمان صاحب دریافت کر رہے تھے وہ خود بھی اس پر بارہا الجھ چکا تھا لیکن..... ڈور کا کوئی سرا تلاش نہیں کر سکا تھا۔ اس وقت بھی سٹپٹا کر رہ گیا۔ کچھ تامل سے بولا۔

''صاحب..... میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ.....''

''نہیں..... نہیں۔'' عثمان صاحب نے اس کی الجھن کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ''ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ تمہیں کچھ باتیں یاد نہیں رہتیں۔ تم جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش نہیں کرتے..... سراج اور بیگم صاحبہ کی بھی یہی سوچ ہے۔''

''ایسا کیوں ہوتا ہے صاحب؟'' لیاقت حسین نے اس بار بڑی عاجزی سے دریافت کیا۔

''اللہ کی مصلحتیں وہی بہتر جانتا ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں تم نے اب تک انجانے میں جو بھی قدم اٹھایا ہے اس میں دوسروں کی بھلائی ہی شامل تھی۔'' سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ تمہاری ایمانداری یا کوئی اور ادا خدا کو پسند آگئی ہو جس کے سبب وہ تمہیں نواز رہا ہو۔ تم نے اب تک میرے اور سراج کے علاوہ..... دوسرے جن لوگوں پر بھی جو احسان کیا ہے، وہ سب اس کے شکر گزار ہیں۔''

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ذہن میں پھر بگولے اٹھنے لگے۔ سیٹھ عثمان نے اس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ سراج آج یا کل کسی وقت تمہیں لینے آجائے۔ تم فرحین کی طرف سے پریشان مت ہونا۔ بیگم صاحبہ اس کا خیال رکھیں گی۔''

لیاقت حسین جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ سیٹھ عثمان نے ریسیور اٹھا کر ''ہیلو!'' کہا لیکن دوسری جانب سے بولنے والے کی آواز سنتے ہی وہ بے حد سنجیدگی سے بولے۔

''پانچ لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی خان صاحب، بزنس میں کوئی بڑی رقم ایک جگہ پھنس جائے تو ساری رولنگ خراب ہوجاتی ہے..... میں مانتا ہوں کہ اب تک آپ نے میری ڈیمانڈ وقت پر پوری کی ہے لیکن میری مجبوریوں پر بھی غور کریں۔ بات اگر صرف رقم کی ہوتی تو میں سابقہ تعلقات کی وجہ سے آپ سے تقاضا بھی نہ کرتا لیکن بیرون ملک سے جن کاروباری لوگوں کے آرڈر پورے نہیں ہو رہے..... وہ بھی تقاضا کر رہے ہیں..... میں نے کسی وجہ سے اس نئے کام میں انویسٹ کیا تھا لیکن مال کی سپلائی میں اگر بے قاعدگی ہوگی تو ہماری فرم کی ریپوٹیشن بھی متاثر ہوگی۔ سارا کھیل ساکھ کا ہے۔ یہ آپ بھی سمجھتے ہوں گے۔ میں آپ کی پریشانی سمجھ رہا ہوں لیکن کسی سے آپ کی دوستی یا دشمنی آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میرا بھلا اس سے کیا تعلق..... جی ہاں، اونچ نیچ بھی ہوتی رہتی ہے لیکن آپ کی طرف سے مال سپلائی نہ ہونے کے سبب ہمارے بزنس پر کیا اثر پڑے گا۔ آپ بھی اس پر غور کریں۔'' سیٹھ عثمان کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ چند لمحے وہ دوسری جانب سے کی جانے والی بات سنتے رہے پھر تلملا کر بولے۔ ''ٹھیک ہے، میں ایک ہفتے اور انتظار کر لیتا ہوں لیکن اس کے بعد باہر والوں کی ڈیمانڈ پوری کرنے کی خاطر مجھے لوکل مارکیٹ سے جو چیزیں خریدنی ہوں گی ان کی قیمت کا آپ کو بھی اندازہ ہوگا..... معاہدے کی رو سے جو زیادہ لاگت آئے گی اس کی ساری ذمے داری آپ پر ہوگی..... یہ سوچنا آپ کی دردسری ہے، میری نہیں۔'' سیٹھ عثمان نے جھلا کر فون بند کر دیا۔

''کیا بات ہے صاحب..... کس کا فون تھا؟'' لیاقت حسین نے غیر اختیاری طور پر پوچھ لیا۔

''ہے ایک ماربل سپلائی کرنے والی پارٹی جس نے وقت پر مال نہیں بھیجا اور اب مزید مہلت مانگ رہے ہیں۔''

ماربل کے کاروبار کا حوالہ سن کر لیاقت حسین کے دل میں اپنے والد سردار سرفراز خان کا خیال ابھر آیا۔ وہ بھی بڑے پیمانے پر ماربل سپلائی کا کام کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ سوات (بونیر) سے آنے والا قیمتی پتھر اسی کے علاقے میں آتا تھا جہاں اسے کرش کرنے کے بعد مختلف صورتوں میں ڈھالا جاتا تھا، نوشہرہ سے جہانگیرہ تک بے شمار چھوٹے بڑے

تاجر اس کام میں ملوث تھے جو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی خاطر اوچھے ہتھکنڈے بھی اختیار کرتے تھے۔ بعد میں ان کی دشمنیاں پشت در پشت چلتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ لیاقت حسین اس بات سے بھی واقف تھا اس کا باپ خان سرفراز خان ماربل سپلائی کرنے والے بڑے تاجروں میں شمار ہوتا تھا۔ ایک دو بار کچھ دوسرے کاروباری لوگوں نے اسے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی لیکن بعد میں ہونے والی سخت کارروائی کے بعد وہ بھی ایک ایک کر کے سردار سرفراز خان کی اونچی حویلی تک ہاتھ باندھے چلے آئے تھے۔ لیاقت حسین اپنے خیالوں میں گم تھا جب سیٹھ عثمان نے اسے مخاطب کیا۔

''تم کیا سوچنے لگے؟''

''آپ کو نقصان ہو اور مجھے دکھ نہ ہو.....'' لیاقت حسین نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''یہ تمہارا دردسر نہیں ہے لیاقت حسین..... بزنس میں اس قسم کے کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ تم فکر مت کرو، میرا جو نقصان ہوگا وہ معاہدے کی رو سے مال سپلائی کرنے والے کو بھگتنا پڑے گا۔''

لیاقت حسین خاموشی سے دفتر سے باہر آگیا لیکن اس کے ذہن میں باپ کا جو خیال آیا تھا اس نے اسے اندر سے مضطرب ضرور کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کسی معاملے میں لچک دکھانے کا عادی نہیں تھا۔ پتھر کا کاروبار کرتے کرتے اس کا دل بھی پتھر ہوگیا تھا جو اس نے فرحین کے ساتھ اسے شادی کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی اپنی حویلی کے دروازے بھی اس پر بند کر دیے تھے لیکن لیاقت حسین اولاد ہونے کے ناتے باپ کی اس شفقت اور محبت کو بھی فراموش نہیں کر سکا تھا جو اس نے لیاقت حسین کو پال پوس کر جوان کرنے کی خاطر کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جو خلیج اس کے اور باپ کے درمیان پیدا ہوئی تھی وہ کبھی نہ کبھی ضرور بھر جائے گی لیکن وہ وقت کب آئے گا؟ اسے اس کا ادراک نہیں تھا۔ ہر چند کہ سیٹھ عثمان نے کاروباری پارٹی کا کوئی نام یا حوالہ نہیں دیا تھا لیکن ایک خلش تھی جو اندر ہی اندر اس کے خون کو جوش دلا رہی تھی۔ اس کی رگوں میں گردش والا خون بھی فراز خان کے علاوہ کسی اور کا نہیں تھا۔

سیٹھ عثمان کے آفس سے نکل کر وہ باہر لان میں رکھی ہوئی ایک بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ قریب ہی آفس کا چپراسی بھی موجود تھا۔

''کیا بات ہے لیاقت بھائی؟'' اس نے کریدنے کی کوشش کی۔ ''تم اس وقت اپنی عادت کے برخلاف موڈ میں نہیں نظر آرہے۔ جی تو اچھا ہے؟''

''رات دیر سے نیند آئی، اسی کی کچھ تھکن باقی رہ گئی ہوگی۔'' لیاقت حسین نے بات بنانے کی خاطر جواب دیا۔

''تم گھر جا کر دو گھڑی اور کمر سیدھی کر لو۔ صاحب نے یاد کیا تو میں لپک کر تمہیں آواز دے لوں گا۔''

''نہیں..... میں ڈیوٹی کے وقت آرام نہیں کرتا۔ طبیعت میں تھوڑی بہت اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔'' لیاقت حسین چپراسی سے باتیں کر کے دل بہلانے لگا۔ کچھ دیر بعد آفس کی گھنٹی بجی تو چپراسی قدم اٹھاتا اندر چلا گیا۔ لیاقت حسین نے اس بات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی جو اسے الجھا رہی تھی۔ کیا ضروری ہے کہ حقیقت جانے بغیر وہ اپنی جان ہلکان کرتا؟ اس نے طویل انگڑائی لے کر اس سوچ سے نجات حاصل کرنی چاہی۔ اسی وقت ایک مانوس آواز اس کے وجود کے احاطے میں گونجی۔

''قدرت کا نظام اور اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں لیاقت حسین۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔'' یہ آواز لیاقت حسین کی اپنی آواز تھی جو اس کے اندر سے آرہی تھی۔

''ہم زاد.....'' لیاقت حسین سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''جو دھڑکنیں دل کی گہرائیوں سے ابھریں وہ بے سبب نہیں ہوتیں۔ اس میں بھی خدا کی کاریگری مضمر ہوتی ہے۔''

''تو کیا وہ.....''

''وقت کا انتظار کرو۔'' اس کی بات رد کر کے کہا گیا۔ ''ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس کے کارخانے میں دیر سویر بھی نہیں ہوتی۔ تمہاری بے چینی بے وجہ نہیں ہے لیکن فی الحال اسے کھنگالنے کی کوشش نہ کرو..... جو تم نہیں دیکھ سکتے وہ میں دیکھ سکتا ہوں اس لیے یہی مشورہ دوں گا کہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا۔ وقت اور حالات خود تمہاری رہنمائی کریں گے۔''

''تم جب چاہتے ہو ہدایت دینے آجاتے ہو لیکن اگر کبھی مجھے تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو.....؟''

''تمہاری یہی معصوم باتیں کائنات کے مالک کو بھی پسند ہیں۔ احمق نہ بنو۔ میں تمہارا ہمزاد ہوں تو تم سے کبھی دور بھی نہیں رہتا لیکن..... جب مجھے اجازت ہوتی ہے تو تمہیں اچھے برے سے آگاہ بھی کر دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے اختیار بھی نہیں ہے۔''

''ماربل کا ٹرک بھیجنے والی پارٹی کون ہے؟'' لیاقت حسین نے بے چینی سے سوال کیا۔

''میں نے تمہیں کریدنے سے منع کیا ہے۔ دوبارہ اس معاملے میں زبان کو قابو میں رکھنا۔ جو کچھ ہانڈی میں ہے وہ خود باہر آجائے گا۔ اس کے علاوہ ایک اشارہ اور دے رہا ہوں..... کچھ قوتیں پھر سر ابھارنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، ان سے ہوشیار رہنا۔''

''کس کی بات کررہے ہو.....؟'' لیاقت حسین نے بے چینی سے دریافت کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا تو وہ اندر ہی اندر الجھنے لگا۔

شبنم اس وقت شیخ حامد کے ساؤنڈ پروف کمرے میں ہی تھی جب کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی فاتحانہ مسکراہٹ ابھر رہی تھی۔ اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے وہ شبنم کے قریب آکر رکا۔ ایک لمحے اس کے سراپا کا بہ غور جائزہ لیا پھر معنی خیز لہجے میں بولا۔

''کیا تم اس خوبصورت مووی کو دیکھ چکی ہو؟''

''نہیں۔'' شبنم نے تیزی سے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے افضل خان سے جو کام لیا ہے اس کے نتائج میری توقع سے کہیں زیادہ خوبصورت اور شاندار ہیں۔''

شبنم بات کی تہ تک پہنچ کر مسکرادی۔ وہ سمجھ گئی کہ بگ باس رستم علی اور اس کی بیوی کی مووی کو دیکھنے ہی کی خاطر کمرے سے گیا ہوگا۔ اس نے سکون کا سانس لیا لیکن اس گھناؤنے مسئلے پر وہ کھل کر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''تم اپنی اس شاندار کارکردگی پر مجھ سے کیا توقع رکھتی ہو؟'' شیخ حامد نے بے تکلفی سے اس کے دونوں شانوں پر بیک وقت ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

شبنم خوش ہونے کے بجائے اندر ہی اندر سہم گئی، دل پر جبر کرکے بولی۔ ''آپ نے جو مراعات مجھے دے رکھی ہیں وہی بہت ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ تم اب ایک ایسے انعام کی مستحق ہو جو افضل خان کو بھی اس بات کا احساس دلا سکے کہ پالتو کتے صرف مالک کے اشارے پر دم ہلانے کے عادی ہوتے ہیں۔ کسی وجہ سے بھی بھونکنا ان کے لیے فائدہ مند ثابت نہیں ہوتا۔''

''میں سمجھی نہیں باس؟''

''افضل خان کا خوبصورت اپارٹمنٹ یاد ہے تمہیں.....؟''

''ہاں..... اسے شاید پولیس نے ابھی تک سیل کررکھا ہے؟'' شبنم کا تجسس جاگنے لگا۔

''وہ بھی میری مرضی سے ہوا تھا اور اب.....'' شیخ حامد نے شبنم کے قریب ہوتے ہوئے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''اب جو کچھ ہوگا وہ بھی میرے اشارے پر ہوگا۔''

شبنم کسمسانے لگی۔ وہ شیخ حامد کے بڑھتے ہوئے قدم اور ارادے بھانپ چکی تھی لیکن اس کی خفیہ طور پر اتاری ہوئی مخرب اخلاق تصویریں اس کے پیروں میں طوق غلامی ثابت ہوئی تھیں۔ اس سے پیشتر کہ وہ کوئی درخواست کرتی، شیخ حامد نے اپنے بھدے ہونٹوں سے اس کے ہونٹ لگا دیے، ایک لمحے تک اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر علیحدہ ہوکر بولا۔

''میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں..... دس روز بعد تم افضل خان کے فلیٹ کی مالک ہوگی۔ اس عرصے میں اسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت انداز میں ڈیکوریٹ کیا جائے گا۔ اس کے بعد تم اگر چاہو تو افضل خان کو بھی سر چھپانے کی جگہ دے سکتی ہو۔''

''کیا اسے ساتھ رکھنا مناسب ہوگا؟'' شبنم نے اپنے نازک اور مہکتے رومال سے اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

''ہاں..... جب تک میں اسے پوری طرح آزمانہ لوں، اسے آزادی سے کھلا نہیں رکھا جاسکتا۔''

شبنم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شیخ حامد نے اپنی ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''جو افراد تیزی سے ترقی کرتے ہیں کبھی ایک معمولی سی بھول انہیں دوبارہ زمین پر لے آتی ہے۔ تمہیں بھی میرے لیے کام کرتے ہوئے ہر لمحے اس اہم نکتے کا خیال رکھنا ہوگا۔''

''کچھ میں بھی کہنا چاہوں گی۔'' بگ باس کے بعد شبنم نے بھی سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

''کہو.....''

''رستم علی کے خلاف حسب منشا کامیابی حاصل کرلینے کے بعد میں بھی آپ سے ایک پرانی خواہش پر غور کرنے کی درخواست کروں گی۔''

''سمجھ رہا ہوں۔'' وہ شبنم کو دیکھ کر زہرخند سے بولا۔ ''بلی اور چوہے کے کھیل میں چوہا بار بار اس کے پنجوں سے

نکل کر آزادی کے ارادے سے ادھر ادھر بھاگتا ہے لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے.....؟ بلی ایک جست لگا کر اسے دوبارہ دبوچ لیتی ہے۔''

''میں اس مثال سے کیا سمجھوں؟'' شبنم نے ڈرتے ڈرتے وضاحتی نظروں سے سوال کیا۔

''میرا وعدہ قائم رہے گا۔ جو فاصلہ ہمارے درمیان ہے میں اسے پھلانگنے سے حتی الامکان گریز کروں گا لیکن تمہاری آزادی کا پروانہ جاری کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

''میری تصویریں اور اس کا نگیٹو.....'' شبنم نے نظریں جھکا کر مردہ سی آواز میں کہا۔ ''اس کا احساس مجھے کچوکے لگاتا رہے گا۔''

''کیوں؟..... کیا تمہیں میرے وعدے پر یقین نہیں ہے؟'' شیخ حامد کا لہجہ جارحانہ ہوگیا۔

''سر..... میرا یہ مطلب.....؟''

''پلیز.....'' اس نے ہاتھ اٹھا کر حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنادیا۔ ''دوبارہ اس ذکر کو نہ چھیڑنا..... ویسے میں کوشش کروں گا کہ تمہاری درخواست پر بھی فرصت سے غور کرسکوں۔'' پھر اس سے پیشتر کہ شبنم اس موضوع پر کوئی احتجاج کرتی اس نے بات بدل کر دریافت کیا۔ ''میڈم روبی پر تمہارے اختیار کی سطح کس حد تک بلند ہوچکی ہے؟ کیا وہ تم پر مکمل اعتماد کرنے لگی ہے۔''

''یہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے.....'' شبنم نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''پچھلی ملاقات میں میڈم نے بتایا تھا کہ وہ آپ سے مل چکی ہیں اور آپ سے ان کے تعلقات بھی خاصے پرانے ہیں۔''

''ہاں.....'' شیخ حامد نے خلا میں بہت دور تک گھورتے ہوئے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ''ان ہی سابقہ تعلقات کی روشنی میں مجھے میڈم کی زیادہ فکر بھی رہتی ہے۔''

''آئی۔سی.....'' اس نے جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کی۔ ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ میڈم کا اس حد تک خیال رکھتے ہیں۔''

جواب میں اس نے شبنم کو تیز نظروں سے گھورا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کے جملے کی کوپرکھ رہا ہو۔ ان نظروں کی سرد مہری سے شبنم بھی سٹپٹا کر رہ گئی۔

''تم نے افضل خان کے ذریعے سیٹھ رستم علی آغا خانی کے خلاف ایک بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس تاثر کو میرے ذہن پر قائم رہنے دو۔'' اس بار بگ باس کا لہجہ یکسر

کون کہتا ہے کہ؟
اولاد نہیں ہوسکتی
آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کرکے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔
المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787
فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک
آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے۔

تبدیل ہوگیا۔" افضل خان کا اپارٹمنٹ دس بارہ روز بعد تمہاری ملکیت ہوگا اور..... تمہیں اسے اپنے ساتھ رہنے پر رضامند بھی کرنا ہوگا..... یہ..... میری درخواست نہیں، میرا حکم ہے۔"

"او۔کے باس....." جواب میں تابعداری کا انداز اختیار کیا گیا۔ "میں نے پہلے بھی اسے آپ کی ہی خواہش پر لفٹ دی تھی۔"

"تم اب جاسکتی ہو۔"

شبنم جانے کے ارادے سے اٹھی تو اسے اشارے سے روک کر بڑے سرد اور خشک لہجے میں باور کرایا گیا۔

"میں نے تمہارے استعفے کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ مجھے یاد ہے..... اس لیے، اب تم دوبارہ ریزائنڈ کرانے کی کوشش بھول کر بھی نہ کرنا۔"

"رائٹ باس....."

شبنم تیزی سے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی، اس نے چہرے سے اپنے تاثرات کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا مگر اندر ہی اندر جھلس کر رہ گئی تھی۔ اس کے لیے شیخ حامد کی یہی حد سے زیادہ دور اندیشی بڑی کارآمد ثابت ہوسکتی تھی کہ اس نے افضل خان کے سلسلے میں اسے ساتھ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ ایک اور ایک مل کر گیارہ بھی ثابت ہوسکتے تھے۔ اس کے ذہن میں کل کے بارے میں مختلف منصوبے ابھرنے لگے۔

شبنم کے جانے کے بعد شیخ حامد نے انٹرکام کے ذریعے کنول کو دوبارہ طلب کیا۔ صبح سے اسے دو خوشخبریاں مل چکی تھیں۔ دو شاندار کامیابیاں..... ایک شادی کے سلسلے میں کنول کی ماں کی رضامندی..... دوسری وہ خفیہ مووی جواب سینیٹر رستم علی آغا خانی کو اس کے سامنے کسی پالتو جانور کی طرح دم ہلانے پر مجبور کرسکتی تھی۔

کنول شرماتی، بل کھاتی اپنے آفس سے نکل کر دوبارہ سامنے آئی تو شیخ حامد کے چہرے پر ایک لمحہ پیشتر نظر آنے والے تلخ تاثرات یک لخت غائب ہونے لگے، اس کی نظریں اس چھلکتے ارغوانی جام پر منڈلانے لگیں جو نشے سے معمور تھا۔ ایسا خواب آور نشہ جو شیخ حامد کو ہمیشہ سے مرغوب تھا۔ کنول نظریں نیچی کیے اس کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تو شیخ حامد نے بڑی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ آج میں کتنا خوش ہوں۔ تمہاری ماں کی ہاں نے میری اس خواہش کو پورا کیا ہے جو روز اول سے میرے دل میں مچل رہی تھی۔"

"میں بھی اسے اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گی۔" کنول کے شبنمی ہونٹ کپکپانے لگے۔

"میری کوشش ہوگی کہ میں بہت جلد تم سے نکاح کر لوں لیکن..... میں نے کہا تھا کہ یہ شادی خفیہ رہے گی۔ تمہیں ہر وہ چیز حاصل ہوگی جس کا میں وعدہ کر چکا ہوں مگر..... تمہیں بہرصورت اپنی زبان بندی رکھنی ہوگی اور میں..... میں تم سے بے وفائی نہیں کروں گا۔"

"مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔"

"دفتر یا باہر کسی کو اس بات کی بھنک بھی نہیں ہونی چاہیے اور....." اس نے بڑی اپنایت سے کنول کے کپکپاتے ہاتھوں کو مضبوطی سے گرفت میں لے کر کہا۔ "کل تم دفتر آنے کے بجائے اپنا استعفیٰ کسی کے ہاتھ روانہ کردینا۔"

کنول نے اسے حیرت اور وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"میں اسٹاف کو یہی تاثر دوں گا کہ تم نے اپنی والدہ کی بیماری کی وجہ سے ملازمت چھوڑی ہے، اس کے بعد....."

شیخ حامد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے ہاتھ پر پیار سے دباؤ ڈالا تو کنول کا چہرہ تپ کر گلنار ہوگیا، شیخ حامد کے اندر کا عیاش آدمی بھی سر ابھارنے لگا لیکن اسی وقت فون کی گھنٹی بجی اور کنول نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ شیخ حامد نے جھلا کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔ "کون.....؟"

"میں لودھی بول رہا ہوں سر.....!"

"اب کیا بکواس کرنا چاہتے ہو.....؟" شیخ حامد کے چہرے پر کھنچاؤ کی کیفیت بتدریج بڑھنے لگی۔ "تم نے اس باسٹرڈ کے آفس جانے سے پہلے مجھ سے اجازت نہیں لی تو اب کیا بتانا چاہتے ہو.....؟"

"سر..... وہ....." لودھی ہکلانے لگا۔

"مجھے حالات کا علم اپنے ذرائع سے ہوگیا ہے۔ جو کچھ ہوچکا اسے بھول جاؤ اور..... اپنی زبان بند ہی رکھنا، سیلاب کے ریلوں کا زور توڑنے کی خاطر انسان کو کبھی کبھی اپنے باندھے ہوئے بند بھی توڑنے پڑتے ہیں۔ تمہاری حیثیت کسی معمولی بند سے زیادہ نہیں ہے۔ تم شاید میرا مطلب سمجھ رہے ہوگے۔"

"یس باس..... لیکن وہ....."

"گیٹ لاسٹ.....!" اس بار غرا کر کہا گیا۔ "جو کہا گیا ہے اس کا دھیان رکھنا ورنہ....."

شیخ حامد نے جھلا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا، کنول اس کا موڈ خراب دیکھ کر بولی۔

"آپ اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کریں، ذرا ذرا سی بات پر....."

"تم فی الحال اپنے کمرے میں جاؤ۔" شیخ حامد نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔

کنول کے جانے کے بعد شیخ حامد نے اپنا خاص موبائل نکال کر بلیک ٹائیگر کے مخصوص کوڈ پنچ کیے۔ دوسری جانب سے نون سنائی دیتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ وہ جھلا گیا۔ اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے سلسلہ منقطع کر کے دو تین بار نئے سرے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں۔

لودھی کی فون کال نے اس کا موڈ خراب کردیا تھا، اب بلیک ٹائیگر کی خاموشی اسے گراں گزر رہی تھی، وہ مٹھیاں بھینچ کر ہونٹ کاٹنے لگا، اسے کسی بھی ماتحت کی عدم توجہی برداشت کرنے کی عادت نہیں تھی، ایک لمحہ تامل کے بعد اس نے دوسرے خاص آدمی کو کال کرنے کی خاطر موبائل اٹھایا۔ اسی وقت اس کا اپنا موبائل گنگنانے لگا۔ روشن ڈائل پر وہی نمبر ابھرا جس سے وہ رابطہ کرنا چاہتا تھا۔

"تم اس وقت کہاں ہو.....؟" سپاٹ لہجے میں سوال کیا گیا۔

"سر..... میں اس وقت نمبر ون کی تباہ شدہ گاڑی سے خاصی دور کھڑا حالات کا جائزہ لے رہا ہوں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو.....؟" شیخ حامد حیرت سے اچھل پڑا۔ "یہ حادثہ کیسے ہوا؟"

"ابھی تفصیل نہیں بتا سکتا سر لیکن..... ایک بری خبر ضرور دے سکتا ہوں۔" دبی زبان میں جواب ملا۔ "تباہ شدہ گاڑی سے اس کی ڈیڈ باڈی ہی برآمد ہوئی ہے، غالباً کسی دوسری گاڑی نے قریب سے گزرتے ہوئے اسے نشانہ بنایا اور ہجوم میں گم ہوگئی۔"

"تفصیل معلوم کر کے مجھے دوبارہ کال کرو۔" شیخ حامد کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے شدت سے انتظار رہے گا۔"

دوسری جانب سے "یس سر" کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ شیخ حامد کے چہرے پر تفکرات کے گہرے بادل منڈلانے لگے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر نمبر ٹو کی اطلاع درست ثابت ہوئی؟ بلیک ٹائیگر کو اس کے خیال کے مطابق ٹھکانے لگا دیا تھا تو یہ ایک بڑا نقصان تھا۔ بلیک ٹائیگر جس مشن پر کام کر رہا تھا اس کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ کرنے والے کون لوگ تھے۔ آج صبح بھی اسے گھر سے نکلتے ہوئے بلیک ٹائیگر کی کال موصول ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "باس، میں نے ایک ایسا ٹریس تلاش کرلیا ہے جس کے بعد مجھے ان لوگوں تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا جنہوں نے آپ پر حملہ کر کے اپنی موت ہی کو دعوت دی تھی۔"

"کون لوگ ہیں.....؟"

"زیادہ سے زیادہ دس بارہ گھنٹے اور انتظار کرلیں، اس کے بعد میں تفصیل سے ان کی نشاندہی کردوں گا۔"

"کیا اس سازش میں ایک سے زیادہ پارٹیاں ملوث ہیں؟"

"شام تک پارٹی کی نشاندہی بھی ہوجائے گی۔ فی الحال ایک سراغ ملا ہے۔ اسے قابو کرنے کے بعد باقی گرہیں بھی خود بخود کھلتی چلی جائیں گی۔" بڑے اعتماد سے کہا گیا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں، میں انہیں پاتال کی تہ سے بھی نکال کر جہنم رسید کردوں گا۔"

"گڈ..... کام ہوشیاری سے کرنا..... بساط کب پلٹ جائے؟ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ آئی وش یو گڈ لک اینڈ آل دی بیسٹ۔"

شیخ حامد کو بلیک ٹائیگر کی صلاحیتوں پر بڑا گھمنڈ تھا لیکن اب..... یہ گھمنڈ بھی خاک میں مل گیا تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید نمبر ٹو نے دور سے جو اندازہ قائم کیا تھا وہ غلط ثابت ہو لیکن..... دو گھنٹے کے بعد اس کی تصدیق بھی ہوگئی تو وہ کسی زخمی درندے کے مانند اپنا ہی زخم چاٹنے پر مجبور ہوگیا..... اسے بلیک ٹائیگر کی موت سے زیادہ اس بات کا ملال تھا کہ اس کے دشمنوں کا نام اس کی زبان پر آتے آتے کیوں رہ گیا تھا؟

لیاقت حسین اس وقت سراج کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔

جس روز سیٹھ عثمان نے اسے بتایا تھا کہ سراج اس کو لینے آئے گا اسی رات تقریباً گیارہ بجے سراج اسے لینے آبھی گیا تھا۔ اس وقت لیاقت حسین فرحین کے ساتھ بیٹھا گفتگو میں مصروف تھا۔ سراج والی بات اس نے فرحین کو بھی بتادی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فرحین دس روز تک اس سے علیحدہ رہنے پر احتجاج کرے گی لیکن فرحین نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا تھا۔

"تمہارے سراج صاحب بھی مجھے چھپے رستم نظر آتے ہیں۔ پولیس والے ایک بے چاری بیوی کو بیڑیاں پہنا کر گھر

میں ڈال لیتے ہیں، اس کی طرف کوئی غلط نظروں سے دیکھے تو اسے تھانے میں بند کر کے پرانی روئی کی طرح دھن ڈالتے ہیں لیکن خود ادھر ادھر منہ مارنے سے بھی باز نہیں آتے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" لیاقت حسین نے فرحین کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "اپنے سراج صاحب ایسے نہیں ہیں۔ میں نے انہیں کبھی غلط راستے پر چلتے نہیں دیکھا۔"

"نہیں دیکھا، تو اب دیکھ لے گا۔" فرحین نے بہ دستور معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "پولیس کے محکموں میں کیا نفری کی کمی ہے جو وہ تجھے کوئی توپ سمجھ کر لے جا رہے ہیں۔ ضرور کوئی خاص چکر ہوگا۔ میری مان تو انکار کر دے کوئی خوبصورت بہانہ بنا کر۔ بزرگوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ پولیس والوں کی دوستی اور دشمنی سے اللہ ہی محفوظ رکھے۔"

"چھوڑ ان باتوں کو..... یہ بتا، تو میرے بغیر رہ لے گی، اکیلے دس بارہ دن؟" لیاقت حسین نے بڑی محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"سچ بتا دوں....."

"ہاں..... تجھے میری قسم....." لیاقت حسین اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا، اس کی زلفوں سے کھیلنے لگا۔

"مم..... میں بیگم صاحب کی طرف چلی جاؤں گی۔"

اس بار فرحین اپنے پیار کو چھپا نہ سکی۔ "تیرے بنا اس اکیلی اٹیکسی میں میرا دل نہیں لگے گا۔"

"یہی بات تو سراج صاحب کے سامنے کہہ دینا۔" لیاقت نے معصومیت سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ تیرا کہا کبھی نہیں ٹالیں گے۔"

"دماغ چل گیا ہے تیرا....." فرحین نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ "ایسی باتیں کسی اور کے سامنے زبان سے نہیں نکالی جاتیں اور..... تیرے سراج صاحب، وہ تو ایک نمبر کے گھاگ ہوں گے..... کیا سوچیں گے میرے بارے میں؟"

ان کے درمیان یہ باتیں ہو رہی تھیں جب سراج بھی آ گیا۔ لیاقت حسین نے اٹھ کر دروازہ کھولا، فرحین بھاگ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ سراج نے پہلی بار اٹیکسی کے اس حصے میں قدم رکھا تھا۔ وہاں کے رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر بولا۔

"فائن....." اس نے لیاقت حسین سے کہا۔ "تمہاری گھر والی نے تو اسے بڑی خوبصورتی سے سجا رکھا ہے۔"

"یہ سب بیگم صاحبہ کی مہربانی ہے، ورنہ ہمارے پاس دو ٹوٹے پھوٹے بکسوں اور ایک بستر کے علاوہ اور کیا تھا۔" لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کہا۔

"سب سے قیمتی چیز تمہارا خلوص اور جاں نثاری ہے، لیاقت حسین! جس کے سامنے ان عارضی سجاوٹی چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں۔"

لیاقت حسین انکساری سے کسمسا کر رہ گیا۔ اس کے اصرار پر سراج بیٹھ گیا تو فرحین جلدی سے چائے کی ٹرے لیے سامنے آ گئی، کچھ بسکٹس اور نمکین چیزیں بھی ٹرے میں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" سراج نے کہا پھر لیاقت حسین کے ساتھ چائے پینے لگا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی پھر سراج اصل مقصد کی طرف آیا تو لیاقت حسین نے مسکرا کر کہا۔

"میں آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔ صاحب نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آپ لینے آئیں گے۔"

"تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا فرحین.....؟" سراج نے اس بار فرحین کے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے دریافت کیا۔

"ملازمت تو ملازمت ہوئی صاحب۔" فرحین نے نظریں جھکا کر مدھم لہجے میں کہا۔ "اس میں فرمانبرداری کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ لیاقت کی طرح میں بھی آپ کے کسی حکم سے انکار تو نہیں کر سکتی۔"

"آئی۔سی.....!" سراج نے پولیس والوں کی چال چلی۔ "ٹھیک ہے، میں لیاقت کو ساتھ نہیں لے جا رہا۔ اب تو خوش ہو۔"

"میں نے منع تو نہیں کیا صاحب؟" فرحین اپنی صاف گوئی پر سہم کر کھڑی ہو گئی۔ "آپ شوق سے لے جائیں لیاقت کو۔ یہ اگر آپ کے کسی کام آ گیا تو یہ بھی ہمارے لیے بڑی عزت والی بات ہوگی۔"

"دل سے کہہ رہی ہو.....؟" سراج نے اسے ٹٹولا لیکن اس کا پولیس تجربہ بتا رہا تھا کہ فرحین کو لیاقت حسین کی جدائی منظور نہیں ہے۔

"دل میرے پاس کہاں ہے صاحب....." وہ نظریں جھکا کر شوخی سے بولی۔ "وہ تو آپ کے لیاقت حسین کے پاس ہے۔"

فرحین کے جواب پر سراج بھی لاجواب ہو گیا۔ خود لیاقت حسین کو بھی حیرت تھی کہ فرحین نے ایک ہی جملے میں سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد لیاقت جانے لگا تو سراج نے جیب سے ایک نیا موبائل نکال کر فرحین کو دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں لیاقت حسین کے علاوہ میرا اور الماس کا

نمبر بھی موجود ہے، تم جب چاہو ہم سے بات کر سکتی ہو۔ کوئی دشواری پیش آئے تو راحیلہ بھابی تمہاری رہنمائی کر دیں گی۔"

گھر سے جاتے وقت بھی فرحین نے لیاقت کو بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ اس وقت لیاقت انہی آنکھوں کے تاثرات میں غوطہ لگا رہا تھا جب سراج نے اسے بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

"لیاقت حسین..... جانتے ہو..... میں تم کو دس بارہ روز تک اپنے ساتھ کیوں رکھنا چاہتا ہوں؟ مجھے تمہاری ان پوشیدہ قوتوں کی ضرورت ہے جو تمہاری رہنمائی کرتی ہیں لیکن اس طرح کہ بعد میں تمہیں بھی کچھ یاد نہیں رہتا۔"

لیاقت حسین خاموش رہا۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا، سراج نے بات جاری رکھی۔

"میں نے محسوس کیا ہے کہ جب بھی تم نے خدا کی راہ میں کوئی نیک کام کی ٹھانی..... وہ مخفی قوتیں تمہارے کام آتی رہیں، میں بھی خدا کو حاضر و ناظر جان کر کچھ ایسے ہی شیطان صفت مردود لوگوں کے غرور کو خاک میں ملانا چاہتا ہوں جو فرعون بن بیٹھے ہیں، ان کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ قانون کی بالادستی بھی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ایسے بدکرداروں کی سرکوبی کرنے میں اگر تم میرے کام آئے تو مجھے بھی سرخرو ہونے کا موقع مل جائے گا۔"

"لیکن صاحب..... جب مجھے کچھ یاد نہیں رہتا تو میں بھلا آپ کی کیا رہنمائی کر سکوں گا؟" لیاقت حسین نے سادگی سے جواب دیا۔

"یہ سب اس قادر مطلق پر چھوڑ دو..... جو دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔" سراج نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ "میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب بھی تمہارے دل میں کوئی انوکھا خیال آئے۔ کوئی بھی ایسی بات جو خود تمہاری سمجھ سے بالاتر ہو۔ وہ تم بلا تکلف مجھ سے کہہ دو گے۔"

"میں اب بھی آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا صاحب....." لیاقت حسین نے الجھتے ہوئے کہا۔ "جب مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا تو میں اس بات کا فیصلہ کس طرح کروں گا کہ کون سی بات آپ کے مقصد کی ہوگی؟"

"تم صرف میری کہی ہوئی بات پر عمل کرو..... کیا صحیح ہے کیا غلط، یہ اوپر والے کی مرضی پر چھوڑ دو۔"

"ایک درخواست میں بھی کروں گا۔"

"کہو....."

"جو بات میری زبان سے غیر اختیاری طور پر نکلے تو

گھریلو مسائل کا بہترین حل

بیوی: "ایک بات بولوں؟"
شوہر۔ "نہیں۔"

☆ بیوی بازار سے گھر آنے کے بعد بولی۔
"یہ ڈبا اٹھا لو۔"
شوہر۔ "اس میں ضرور میرے کھانے کی چیز ہوگی۔"
بیوی۔ "ہاں، سینڈل ہیں۔"

☆ بیوی اور بے عزتی ایک جیسی ہوتی ہیں اچھی تب ہی لگتی ہیں جب دوسرے کی ہوں۔

☆☆☆

☆ ایک شریف آدمی کو کیا چاہیے۔
ایک بیوی جو نیک ہو۔
ایک بیوی جو خوب صورت ہو۔
ایک بیوی جو عقل مند ہو۔
ایک بیوی جو گھڑ ہو۔
اور یہ چاروں بیویاں بڑے پیار سے مل جل کر رہیں۔

مرسلہ: شارقہ سلجوق، جہانگیر آباد

آپ اس کا تذکرہ مجھ سے بعد میں بھی نہ کریں۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہتا تو بلاوجہ ذہن میں ایک کانٹا سا چبھا رہ جاتا ہے۔"

"میں نے تمہیں ہمیشہ دوست سمجھا ہے لیاقت حسین، اب بھی ایک دوست کی طرح تمہاری بات کا خیال رکھوں گا۔"

"شکریہ صاحب۔" لیاقت حسین نے اسے تشکرانہ نظروں سے دیکھا پھر وہ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ کچھ بھولی بسری یادیں اس کے ذہن میں کلبلانے لگیں، خاص طور سے اس کے ذہن میں ایک بار پھر صبیح سیٹھ عثمان اور کسی ماربل سپلائی کرنے والی پارٹی کی باتیں گونجنے لگیں، وہ سیٹھ عثمان اور سراج کے دوستانہ تعلق سے بخوبی واقف تھا۔ شاید سراج اس پارٹی کے سلسلے میں لیاقت حسین کی ذہنی کشمکش کو دور کرنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہو؟ ایک پل کو اس کا دل چاہا کہ وہ سراج کو اس سلسلے میں کریدے لیکن..... دوسرے ہی لمحے ہمزاد کے جملے اس کی سماعت میں صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگے۔ "ان باتوں کو فی الحال کھنگالنے کی کوشش نہ کرو..... وقت کا انتظار کرو..... وقت اور حالات خود تمہاری

رہنمائی کریں گے..... اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔ جو کچھ ہانڈی میں ہے وہ خود باہر آجائے گا۔"

"کس خیال میں گم ہو لیاقت حسین؟" سراج نے بے تکلفی سے سوال کیا۔ "کیا تمہیں بھی فرحین سے وقتی دوری پسند نہیں ہے؟"

"نہیں صاحب....." اس نے چونک کر جواب دیا۔ "میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"اور کیا سوچ رہے تھے.....؟"

"اگر میں آپ کے کسی کام نہ آسکا تو....."

"اس سلسلے میں اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو..... صرف ایک بات یاد رکھو، زندگی اور موت کی طرح کامیابی یا ناکامی بھی اللہ ہی کے اختیار کی بات ہے..... ہمیں ہر حال میں صراط مستقیم پر چلنے کو کہا گیا ہے، آگے جو اسے منظور ہو۔"

لیاقت کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ سراج کا موبائل گنگنانے لگا۔ دوسری طرف سے ڈی آئی جی کرائمز آغا منظور کے نمبر روشن دیکھ کر وہ چونکا۔ "اس وقت کیسے یاد کیا سر.....؟" اس نے موبائل آن کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"ابھی کسی نامعلوم شخص نے مجھے ایک حیرت انگیز اطلاع دی ہے۔" ڈی آئی جی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا تعلق سی سائڈ کے اس کمرشل ایریا سے ہے جہاں آج ہی ایک اسپورٹس کار کا حادثہ ہوا تھا، پولیس کو اس میں سے ایک خون آلود لاش بھی ملی تھی جسے کولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ بعد میں ضروری کارروائی کے بعد لاش کو سرد خانے میں شناخت کے لیے محفوظ کرا دیا گیا..... جانتے ہو وہ لاش کس کی تھی؟"

"جی نہیں....."

"اطلاع دینے والے کے مطابق اس شخص کی حیثیت بگ باس کی نظروں میں اس سے زیادہ اہم تھی جو شطرنج کی بساط پر کسی گھوڑے کی ہوتی ہے..... اسے بلیک فورس گروپ کا سرغنہ سمجھا جاتا تھا۔"

"کیا متاثرہ پارٹی نے بھی اس سلسلے میں کوئی بیان دیا ہے؟" سراج نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"ابھی تک وہ خاموش ہی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں ان لوگوں پر نظر رکھنی ہوگی جو سرد خانے سے لاش وصول کرنے آتے ہیں۔"

"میں اس کی ہدایت متعلقہ تھانے کے ایس پی کو دے چکا ہوں۔" ڈی آئی جی نے کہا پھر سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ایس پی اورنگ زیب کے بارے میں آپ کے پاس کیا اطلاع ہے؟"

"میں سمجھا نہیں سر.....؟" سراج نے محتاط انداز اختیار کیا۔ "کیا آپ کو کوئی اور خاص رپورٹ بھی ملی ہے؟"

"میں نے کل اسے دفتر آنے کو کہا ہے۔ آپ بھی ساڑھے دس بجے تک آجائیں تو مناسب ہوگا۔"

"او کے سر..... میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔"

دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہوا تو سراج بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ اگر مرنے والا شیخ حامد کا خاص آدمی تھا تو اس کے قتل میں کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے.....؟ ایک تانیے کے لیے اس کے ذہن میں میڈم روبی کا نام گونجا لیکن پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور اس بات پر غور کرنے لگا کہ ڈی آئی جی نے ایس پی اورنگ زیب کو کس مقصد سے بلایا ہوگا؟ کیا جس لاش کو سرد خانے میں رکھوایا گیا تھا، اس کا کچھ تعلق اورنگ زیب سے بھی ہوسکتا تھا؟

♣♣♣

رستم علی آغا خانی نے پورے دس روز بعد اپنے آفس میں قدم رکھا تو پورا عملہ اس کی مزاج پرسی کو جمع ہوگیا۔ اسٹاف کو اس کی بیماری کی خبریں فراہم کی گئی تھیں۔ خود رستم علی نے بیٹے اور بہو پر بھی اپنی اچانک بیماری کا نہ صرف اظہار کیا تھا بلکہ ایک مہنگے پرائیویٹ اسپتال کے دی آئی پی روم میں بھی پورے آٹھ دن رہنا برداشت کرلیا تھا۔ ڈاکٹروں کی واقف کار ٹیم نے بھی ان کی بھرپور مدد کی تھی، کچھ ایسے امراض کا شبہ ظاہر کیا تھا جس کی تصدیق کے بغیر کوئی یقینی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔

دارا رستم علی اور اس کی بیوی روشن کو بھی بہ ظاہر یہی کچھ بتایا گیا تھا۔ اسپتال میں رہنے کے دوران سوائے دارا اور شائلہ بیگم کے کسی کو بھی مریض سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہر بات کو راز رکھا گیا تھا لیکن دارا جو بیرونی ملک سے ایم بی اے کی ڈگری لے کر آیا تھا۔ وہ اتنا طفل کتب بھی نہیں تھا کہ کسی میٹھی گولی کی طرح ان باتوں کو حلق کے نیچے اتار لیتا۔ وقتی طور پر جس انداز میں ایمرجنسی کا اظہار کیا گیا۔ ایمبولینس کے ذریعے رستم علی کو اسپتال شفٹ کیا گیا تھا، اس نے دارا کے اعصاب کو بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ اس کو بھی دال میں کہیں کالا نظر آنے لگا تھا۔

اس رات دارا اور روشن نے، رستم علی اور شائلہ کے ساتھ ہی ڈنر لیا تھا، ڈنر کرتے وقت اس نے باپ یا ماں کے چہرے پر کوئی ایسی علامت نہیں محسوس کی تھی جس سے وہ اندازہ لگا سکتا کہ اس کا باپ جو اپنی صحت اور خوراک پر خاص

توجہ دینے کے معاملے میں کسی سے سمجھوتا نہیں کرتا تھا، اچانک کسی مرض میں مبتلا ہوکر اسپتال میں بھی داخل ہوسکتا ہے۔ دو روز تک وہ ڈاکٹروں سے سر کھپاتا رہا۔ سب کا ایک ہی جواب تھا کہ ضروری تفتیش اور رپورٹ آنے تک حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ماں کے تاریک چہرے کو بھی دیکھ کر وہ پریشان ہو جاتا لیکن تیسرے دن جب وہ ماں کے کمرے میں بیٹھا تھا تو روشن نے ساس کا سر سہلاتے ہوئے بڑی اپنایت سے پوچھا تھا۔

"مام..... ڈیڈ کو اچانک کیا ہوگیا..... کیا آپ کو بھی کچھ نہیں معلوم؟"

"سب مقدر کی بات ہے بیٹے....." شائلہ بیگم نے منہ بسورتے ہوئے سرد آہ بھر کر کہا۔ "بیماری اور موت کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔"

"کیا ڈیڈ نے کبھی اپنی کسی بیماری کا ذکر آپ سے بھی نہیں کیا تھا؟" دارا نے ماں کا ہاتھ تھام کر بڑے لاڈ سے دریافت کیا۔

"کچھ دنوں سے وہ پریشان ضرور تھے۔ میں نے کئی بار کریدا بھی لیکن انہوں نے مسکرا کر بات ٹال دی۔" شائلہ بیگم نے خلا میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ان پر جو کچھ گزر چکی تھی اس کے تصور ہی نے اتنا نڈھال کردیا تھا کہ وہ بیٹے اور بہو سے آنکھ ملا کر باتیں کرنے سے بھی کترا رہی تھیں۔

"آپ کو کس بات کا شبہ ہے؟"

"یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی....." شائلہ بیگم نے بات ٹالنے کی خاطر کچھ سوچ کر کہا۔ "ادھر کئی بار وہ سینے میں تکلیف کی شکایت ضرور کرچکے تھے لیکن بات اتنی بڑھ جائے گی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔"

"جس رات ڈیڈ کو اسپتال شفٹ کیا گیا..... کیا اس روز انہیں زیادہ تکلیف تھی؟" روشن نے معلوم کیا۔

"ایک بڑی الٹی ضرور ہوئی تھی جس کے بعد انہوں نے لاکھ سمجھانے کے باوجود اسی وقت قالین پر اسٹین کلینر (STAIN CLEANER) اسپرے کیا، منع کرنے پر نہیں مانے۔ گھنٹوں صفائی میں لگے رہے پھر بستر پر واپس آئے تو ان کا سانس پھول رہا تھا، اس کے بعد..... انہوں نے خود ہی اسپتال کو فون بھی کیا تھا۔"

دارا نے ماں کا جواز ٹھنڈے دل سے سنا۔ سن کر حلق کے نیچے بھی اتار لیا لیکن اس کا دل اس کہانی کو ماننے پر تیار نہیں تھا۔ کہیں نہ کہیں کوئی جھول ضرور تھا جو اس کے اندر کے تجسس کو ابھار رہا تھا۔ بزنس میں باپ کے ساتھ شریک ہونے کے ناتے اسے بھی تمام کیفیت کا احساس تھا، بازار کی اونچ نیچ، بزنس کی رولنگ اور دیگر حالات کی خبریں بھی اسے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے ملتی رہتی تھیں۔ اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ بزنس کا ایک اہم شعبہ بزنس رائیولری (BUSINESS RIVALRY) بھی ہے۔ اس ضمن میں اس کی ذاتی فہرست میں بھی شیخ حامد ایسوسی ایٹس کا نام ٹاپ پر تھا۔ ان ہی شبہات کی بنا پر رستم علی نے اپنی اور گھر کی حفاظت کی خاطر اسپیشل سیکیورٹی گارڈز کی خدمات حاصل کی تھیں۔ دارا نے اس سلسلے میں باپ سے دبی زبان میں استفسار بھی کیا تھا لیکن رستم علی نے اسے حفاظتی احتیاط ظاہر کر کے بات ٹال دی تھی۔

باپ کے اسپتال میں داخل ہونے کے بعد اس نے ڈیوٹی گارڈز کو کسی اور ذریعے سے ٹٹولنے کی کوشش کی تھی۔ گارڈز کے متضاد بیانات بھی اسے پوری طرح ہضم نہیں ہوسکے، ماں کی وضاحتیں بھی اسے مطمئن نہیں کرسکی تھیں۔ صرف اس کی چھٹی حس متواتر اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسی اہم بات ضرور ہے جس کو ظاہر کرنے سے گریز کیا جارہا ہے۔

"ماں....." اچانک دارا نے بڑی سنجیدگی سے ماں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ لگاتے ہوئے ڈور کا کوئی سرا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی کاروباری الجھن کی وجہ سے ڈیڈ نے اپنے دل پر زیادہ اثر لے لیا ہو؟"

"م..... میں..... میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" شائلہ بیگم کسمسا کر ہونٹ چباتے ہوئے بولیں۔ "وہ مجھ سے اپنے کاروبار کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔"

"او۔کے، آپ پریشان نہ ہوں، خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔"

چار چھ روز تک..... دارا ذاتی طور پر معاملے کی کرید کرتا رہا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ چھٹے روز وہ اسپتال سے گھر آیا تو روشن نے دبی زبان میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کے ڈیڈ کو کوئی بیماری لاحق نہیں ہے، اسپتال میں شفٹ ہوکر شاید وہ اپنے کسی دشمن کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ سرینڈر (SURRENDER) کرنے کی پالیسی پر عمل کرنے کو تیار ہیں۔"

"وہاٹ.....؟" دارا نے روشن کو پرتجسس نظروں سے گھورا۔ "تم اس قدر یقین سے یہ بات کیسے کہہ رہی ہو؟"

''آج میں نے اپنی خاص ملازمہ کو ٹٹولنے کی کوشش کی تھی۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے مجھے پریشان نظر آرہی تھی۔''

''نتیجہ کیا نکلا.....؟'' دارا نے بے صبری سے دریافت کیا۔

''وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے زبان کھولی ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ اگر اس کا حوالہ درمیان میں ہوگا تو اس کی لگی لگائی ملازمت بھی جاتی رہے گی۔'' روشن نے بات جاری رکھی۔ ''جس رات آپ کے ڈیڈ اسپتال شفٹ ہوئے تھے۔ اسی رات ہماری ایک ملازمہ کو بھی ایک اسپتال میں خفیہ طریقے سے داخل کرایا گیا تھا۔ میرا اشارہ گلابو کی طرف ہے۔ اس کے بائیں شانے پر گولی لگی تھی۔''

''گولی لگی تھی؟'' دارا نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ خبر تمہاری ملازمہ کو کس طرح معلوم ہوئی؟''

''جو ڈرائیور ٹیکسی کے ذریعے گلابو کو خفیہ طور پر لے گیا تھا اس نے رازداری کی قسم دے کر یہ بات بڑی مشکل سے اگلی ہے۔'' روشن نے مزید وضاحت کرتے وقت مسکرا کر کہا۔ ''وہ ڈرائیور اور میری ملازمہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔''

دارا یک لخت بے حد سنجیدہ ہوگیا، گلابو کی خبر سننے کے بعد اس کے ذہن میں بے شمار سوال گڈمڈ ہونے لگے۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ ''وہ واردات کوٹھی کے اندر ہوئی تھی تو گلابو کو زخمی کرنے والا باہر ہی سے آیا ہوگا مگر..... کیا وہ صرف گلابو کو زخمی کرنے کی خاطر اسپیشل گارڈز کا حلقہ توڑنے کا رسک مول لے سکتا تھا؟ اگر نہیں..... تو پھر اس کا اصل ٹارگٹ کون تھا؟..... اس کی پشت پر یقیناً کسی خطرناک دشمن کا ہاتھ شامل ہوگا جس نے اپنے کسی تجربے کار آدمی کو اپنا مقصد پورا کرنے کی خاطر جان کی بازی لگانے پر آمادہ کیا ہوگا..... وہ کون تھا؟ اور..... اور ماں نے ڈیڈ کو الٹی ہونے اور..... کارپٹ کا داغ صاف کرنے کی جو کہانی سنائی تھی اس میں کس حد تک صداقت تھی.....؟''

پھر دماغ پر زور دینے کے بعد درمیان کی تمام گرہیں خود بخود کھلتی گئیں۔ ایک امکانی خاکہ اس کے ذہن میں بڑی سرعت سے تکمیل پانے لگا۔

''گلابو کسی کام سے ڈیڈ کے کمرے میں گئی ہوگی۔ اسی وقت دشمن کا ہرکارہ دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ گلابو نے خوفزدہ ہوکر بھاگنے یا شور مچانے کی حماقت کی ہوگی، تو وہ بھی لپیٹ میں آگئی۔ محض گلابو کی خاطر کوئی دیوانہ رستم علی کی خواب گاہ میں رات گئے داخل ہونے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا..... اس کا اصل ٹارگٹ یقیناً رستم علی ہی رہا ہوگا لیکن..... وہ منزل تک پہنچنے کے بعد واپس کیوں چلا گیا؟ اپنے ٹارگٹ کو زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ ماں نے ڈیڈ کی ''الٹی'' والی بات اس حقیقت کو چھپانے کی خاطر گھڑنے کی کوشش کی ہوگی کہ گلابو کے زخم سے ٹپکنے والے خون کو ڈیڈ نے صاف کیا ہوگا۔ اس کام کو انجام دینے کی خاطر وہ کسی ملازم کو طلب نہیں کرسکتے تھے۔ ایک حقیقت کو مسخ کرنے کی خاطر کئی کہانیاں بن لی گئی تھیں۔ آٹھ روز بعد ڈیڈ ڈاکٹروں سے کلیئرنس حاصل کرکے گھر آگئے، دو روز آرام کرنے کے بعد دفتر جانا بھی شروع کردیا؟''

دارا کی الجھن بڑھتی چلی گئی، وہ معاملے کی تہ تک پہنچنے کی خاطر اس وقت بھی بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا جب روشن کھسک کر قریب آگئی، دارا کے خوبصورت بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

''یہ اٹ ایزی ڈارلنگ..... ڈیڈ نے جو کچھ کیا اس میں ان کی کوئی مصلحت بھی ضرور رہی ہوگی۔''

''آئی ایگری ود یو لیکن..... جو شخص ڈیڈ کے بیڈروم تک پہنچ گیا تھا۔ وہ خالی ہاتھ کیوں لوٹ گیا؟''

''دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔'' روشن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہوسکتا ہے کہ گلابو کے زخمی ہونے کے بعد وہ بوکھلا کر فرار ہوگیا ہو یا پھر تمہارے ڈیڈ نے اس کی ڈیمانڈ پوری کردی ہو۔''

''کیسی ڈیمانڈ.....؟'' دارا نے بیوی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم رین سم (RANSOM) کے امکانات کو کیوں نظرانداز کررہے ہو۔ ممکن ہے ڈیڈ نے اس کی مطلوبہ رقم دے کر جان چھڑالی ہو۔''

''ایسی صورت میں بھی ہماری خاموشی دشمنوں کا حوصلہ مزید بڑھادے گی۔''

''میں تمہیں کسی مہم جوئی کا مشورہ نہیں دوں گی۔ فوری طور پر تمہاری دخل اندازی ڈیڈ کے کسی سوچے سمجھے منصوبے کو نقصان بھی پہنچاسکتی ہے۔''

دارا نے حالات کی روشنی میں روشن کی بات سے اتفاق کیا۔ بات گھر کی چہار دیواری سے نکل کر اگر میڈیا تک پہنچ جاتی تو بزنس کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پولیس درمیان میں آجاتی تو رستم علی کی زندگی کو خطرے کے امکان کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتے۔ جو خطرناک لوگ ایک بار گارڈز کا حلقہ پھلانگ کر اپنے مطلوبہ بیڈروم تک پہنچ سکتے

تھے، وہ بات بڑھ جانے کی صورت میں رستم علی آغا خانی کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے میں بھی دیر نہ لگاتے۔ بہت کچھ ممکن تھا۔

"ہمیں بہت سوچ سمجھ کر اور ڈیڈ کو اعتماد میں لینے کے بعد ہی کوئی ایسا پلان بنانا ہوگا کہ کسی طرح سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

دارا رستم علی نے وقتی طور پر اپنا اضطراب کم کرنے کی خاطر روشن کے مہکتے وجود کو اپنے اور قریب کرلیا لیکن...... زندگی میں پہلی بار اسے خطرے کے بادل اپنے گرد بھی منڈلاتے نظر آرہے تھے۔

☙☙☙

شبنم ذہنی طور پر بری طرح الجھ کر رہ گئی تھی۔ عام حالات میں شاید وہ ایک دن بھی ملازمت برقرار نہ رکھتی لیکن بگ باس نے کسی خطرناک آکٹوپس کی طرح اسے بھی اس طرح اپنے پنجوں میں جکڑا تھا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور اب...... جب اس کی قابل اعتراض تصویریں اس کی لاعلمی میں اتار کر محفوظ کرلی گئی تھیں۔ وہ جال میں پھنسی کسی بے بس مچھلی ہی کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

شیخ حامد نے اس سے مروتاً پر کہا تھا کہ اس کے کچھ ضروری کام نمٹ جائیں تو وہ اس کے استعفیٰ پر ہمدردی سے غور کرے گا لیکن اب شبنم کو اس کی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ غیر اخلاقی حرکتوں کے سلسلے میں بھی ایک حد سے تجاوز نہ کرنے کا یقین دلانے کے باوجود اب وہ رفتہ رفتہ حدود کو پھلانگنے کی کوشش کررہا تھا۔ شبنم کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ خاص طور پر جب بگ باس نے رستم علی آغا خانی والی مخرب اخلاق مووی دیکھنے کے بعد شبنم کو سراہتے ہوئے خوشی کے اظہار کے طور پر بے تکلفی سے اس کے ہونٹوں کو چوم لیا تھا، شبنم نے اس زہر کو بھی دل پر جبر کر کے برداشت کرلیا لیکن اب وہ بڑی سنجیدگی سے غور کررہی تھی کہ اگر بگ باس کی شکل میں "آکٹوپس" کی پیش قدمی اسی طرح جاری رہی تو شاید وہ بعد میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ کوئی ایسا وقت آنے سے پیشتر اگر اس کے اختیار میں ہوا تو موت کو زندگی پر ترجیح دینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔

اس وقت بھی وہ بستر پر نیم دراز ان ہی خیالات کی پریشان کن کشمکش سے دوچار تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار افضل خان کا تصور سا ابھر رہا تھا۔ افضل خان کی تمام قربانیوں کے باوجود اسے میڈم کے اغوا والے معاملے میں، جس میں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی، بگ باس نے محض اپنی مصلحتوں کے پیش نظر بڑی سنگین صورت سے دوچار کردیا تھا۔ عرش سے اتار کر فرش پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ اگر قسمت نے یاوری نہ کی ہوتی۔ رستم علی آغا خانی اور ایس پی اورنگ زیب کی سرکوبی کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو شاید افضل خان اسپتال سے نکالے جانے کے بعد موت ہی کو ترجیح دیتا۔ اس آڑے وقت پر بھی بگ باس نے شبنم کے ذریعے افضل خان کو داؤ لگانے کا منصوبہ بنالیا تھا جس میں افضل خان قسمت کی یاوری سے کامیاب ہوگیا۔ ناکامی کی صورت میں وہ یا تو موت کو گلے لگالیتا یا پھر باقی زندگی قید کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے گزار دیتا۔ لاٹری اپنے نام نکلنے کے بعد بگ باس نے اس کے حق میں کچھ رعایت کردی تھی لیکن اب بھی وہ اس خیال سے کہ "کہیں افضل خان پلٹ کر اسے ڈنک نہ ماردے" اس کی طرف سے محتاط رہنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اس نے شبنم کو یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ افضل خان کے فلیٹ میں منتقل ہونے کے بعد اسے بھی ساتھ رکھے تاکہ اس کی ایک ایک پل کی نگرانی کی جاسکے۔

عام حالات میں شاید شبنم افضل خان کو ساتھ رکھنے پر آمادہ نہ ہوتی لیکن موجودہ صورت حال میں صرف ایک اہم کہاوت "کبھی کبھی پیروں تلے چیونٹی بھی پلٹ کر اپنے دشمن کو کاٹ لینے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔" اس کے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔ "ہاتھی مرنے کے بعد بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔" اس روایت کے مطابق شاید افضل خان کی ماضی کی ناقابل بیان سختیاں بھی اس کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں ضرور گونج رہی ہوں گی۔ شبنم اس تحریک کو اپنے خوبصورت قرب سے ایک ٹھیس پہنچا کر چنگاری سے شعلہ بناسکتی تھی۔ یہ خیال کئی دنوں سے اس کے ذہن میں رہ رہ کر ابھر رہا تھا۔ اس منصوبے پر عمل کر کے وہ اپنا پرانا انتقام بھی پورا کرسکتی تھی جس کے پیش نظر اس نے حامد ایسوسی ایٹس میں ملازمت حاصل کی تھی۔

افضل خان کو اپنے حق میں پوری طرح ہموار کرنے کے بعد وہ میڈم روبی کو بھی ساتھ ملا کر ایک مضبوط محاذ قائم کرسکتی تھی۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ بگ باس کے اندھے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیڈیز پرس میں کوئی آتشیں اسلحہ چھپا کر ساؤنڈ پروف کمرے میں اس سے ملاقات کرتی۔ دل پر جبر کر کے اس خطرناک آکٹوپس کو اس کا من پسند چارا ڈالتی اور پھر خاموش پستول کی تمام گولیاں اس کے منحوس وجود میں اتار دیتی لیکن...... اس نے ابھی تک کبھی اس خطرناک

منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسے اس بات کا خیال بھی تھا کہ جو شخص اپنی پرچھائیں سے بھی محتاط رہنے کا عادی ہو، وہ اپنی حفاظتی تدابیر اختیار کرنے سے غافل نہ ہوگا۔ کہیں نہ کہیں کوئی ایسا خفیہ نظام ضرور ہوگا جو اس کے پاس پہنچنے سے پہلے اس کی نظروں میں آنے والے کا پورا پورا ایکسرے ضرور پیش کردیتا ہوگا۔ اس شبہے کے بعد شبنم بھی کوئی رسک نہیں لے سکتی تھی۔

دیوار گیر کلاک نے رات گیارہ کا اعلان کیا تو وہ چونکی۔ پرسکون نیند کی خاطر اس نے ذہنی خلفشار کو جھٹک کر نائٹ بلب روشن کیا۔ لائٹ آف کی پھر بستر پر دراز ہوگئی۔ طویل جماہی لے کر اس نے آنکھیں موندیں تو موبائل پر ہونے والی گنگناہٹ نے اس کے ذہن کو پھر منتشر کردیا۔ روشن اسکرین پر بگ باس کا کوڈ نمبر دیکھ کر اس کا سکون پھر غارت ہوگیا۔

"یس باس!" اس نے دل پر جبر کر کے فون آن کرلیا۔ وہ رات دس بجے کے بعد ہی موبائل آف کرنے کی مجاز تھی۔

"میں نے اس وقت تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" سرسری انداز میں پوچھا گیا۔

"آپ حکم دیں سر...... اس وقت کیسے یاد کیا؟" شبنم نے محتاط انداز اختیار کیا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ افضل خان آج دوپہر "اسٹار ان" نامی ہوٹل میں شفٹ ہوگیا ہے۔ تم میرے طے شدہ منصوبے کے تحت اس سے مل سکتی ہو لیکن...... اس بات کا خیال رکھنا کہ کوئی تمہارا تعاقب نہ کررہا ہو۔"

"کوئی خاص بات......؟" شبنم نے تعاقب کے حوالے سے دبی زبان میں دریافت کیا۔

"کچھ چیونٹیوں کے پر نکل آئے ہیں......" معنی خیز انداز میں کہا گیا۔ "آج میرے اعتماد کا ایک آدمی بھی کام آگیا۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارا ممکنہ تعاقب بھی کیا جائے...... ویسے میں نے تمہاری سیکیورٹی پر کسی کو تعینات کردیا ہے۔ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں اپنے خاص لوگوں کا خاص خیال رکھتا ہوں۔"

"تھینکس باس...... ویسے بائی دی وے، کیا ہمارے آدمی کی موت کسی ردعمل کا نتیجہ تو نہیں ہے؟"

"ہو بھی سکتا ہے لیکن سمندر میں ایک قطرہ کم ہوجانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"یو آر۔ ریلی گریٹ باس۔" شبنم نے مجبوراً ستائشی جملے اختیار کیے۔

"مطلوبہ اپارٹمنٹ کچھ دنوں میں مکمل ہوجائے گا۔ اس کے بعد تمہیں ویسا ہی عمل کرنا ہے جیسا میں نے پلان کیا ہے۔"

"میں انکار نہیں کروں گی باس لیکن اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہوں گی۔"

"کہو...... مگر اس بات کا خیال رکھنا کہ میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔" دوسری جانب سے سپاٹ لہجے میں جواب دیا گیا۔

"میں انکار کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں۔" وہ روانی میں کہہ گئی پھر تیزی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "کیا کچھ مخالف گروپ کے لوگ یا ایجنسی والے افضل خان کی طرف سے بالکل ہی بے خبر ہوں گے؟"

"اوہ......" کچھ توقف سے بات جاری رکھی گئی۔ "میں تمہاری دور اندیشی سے انکار نہیں کروں گا لیکن تم نے شاید تصویر کے دوسرے رخ پر غور نہیں کیا ہوگا۔ جس طرح دوسرے ہماری سن گن لینے کی فکر میں ہوں گے اسی طرح ہم بھی ایسے بہت سارے چہروں کو بے نقاب دیکھ لیں گے۔ شطرنج کے کھیل میں کچھ غلط چالیں بھی سامنے والے کھلاڑی کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی خاطر دیدہ و دانستہ چلی جاتی ہیں۔"

"میں نے اس پر پہلے غور نہیں کیا تھا سر......" شبنم نے بگ باس کی عیارانہ چال پر ششدر ہوتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے اس حد تک گہرائی میں نہیں جھانکا تھا۔ آپ کی اسکیم لاجواب ہے۔"

"میری باتوں پر عمل کرو گی تو تم بھی کندن بن جاؤ گی۔"

"مجھے یقین ہے باس......" شبنم نے اس کی کمینگی کا ستائشی انداز میں اعتراف کیا پھر وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

شبنم کا ذہن پھر مستقبل کے غیر یقینی حالات سے نبرد آزما ہونے کے مختلف منصوبوں پر غور کرنے لگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہر حال میں اس دلدل سے نکلنا چاہتی تھی جس میں وہ روز بہ روز دھنستی جارہی تھی۔

☙☙☙

سراج صبح سے دو تین بار ایس پی اورنگ زیب کو فون کرچکا تھا لیکن اس سے رابطہ ممکن نہیں ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈی آئی جی کی میٹنگ میں جانے سے پیشتر اورنگ زیب سے

اس سلسلے میں گفتگو ہو جاتی۔ اسے میٹنگ کی نوعیت کا بھی علم ہو جاتا۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے وہ اپنے آفس سے نکلا۔ اس کے ذہن میں کئی خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ لودھی کے معطل کیے جانے کی اطلاع اسے اپنے ذرائع سے مل گئی تھی۔ یہ کوئی ایسی سیکریٹ بات بھی نہیں تھی جو چھپی رہ سکتی لیکن ڈی آئی جی نے اسپورٹس کار کے حوالے سے کسی آدمی کی موت کی اطلاع دے کر اسے چونکا دیا تھا جو شیخ حامد کا دست راست تھا۔ وہ ایسی کئی دیکھی بھالی صورتوں سے واقف تھا جو اس کے تعاقب میں لگے رہتے تھے لیکن اہم بات یہ تھی کہ حادثے میں موت کا شکار ہونے والے کے بارے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ بگ باس کی بلیک فورس کا سرغنہ تھا۔ اس خبر کی اطلاع کس نے دی تھی؟ اس اہم سوال کی روشنی میں یہی سوچا جا سکتا تھا کہ اطلاع دینے والا بھی بڑے مگرمچھ کا کوئی قریبی آدمی ہوگا مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے کن بنیادوں پر شیخ حامد کے خلاف وہ اطلاع ڈی آئی جی کو دی ہوگی؟ کیا کسی وجہ سے وہ بھی شیخ حامد کے مخالف ہو گیا تھا؟ یا یہ محض ایک ڈراما تھا جو خطرناک مگرمچھ کے اشارے پر رچایا جا رہا تھا اور بھی بہت سے امکانات ہو سکتے تھے لیکن ڈی آئی جی نے اسے میٹنگ میں آنے کی دعوت دینے سے پیشتر ایس پی اورنگ زیب کے سلسلے میں بھی کریدنے کی کوشش کی تھی، آخر کیوں؟ کیا اس اسپورٹس کار کے حادثے سے ایس پی کا کوئی تعلق تھا؟ یا لودھی کے معطلی کے آرڈر کی وجہ سے ڈی آئی جی کو شیخ حامد کی طرف سے کسی خفگی کا خدشہ لاحق تھا؟

آفس سے نکلنے کے پانچ منٹ بعد ہی اسے اپنے مخصوص نمبر پر میڈم روبی کی کال موصول ہوئی۔ سراج نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا پھر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت میری یاد کیسے آ گئی؟ بڑے آدمی اور آپ جیسی مالدار خواتین تو دوپہر تک سونے کی عادی ہوتی ہیں؟''

''الماس نے کیا صبح صبح ہی آپ سے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو آپ اس وقت مرچیں چبانے کے موڈ میں ہیں۔'' دوسری جانب سے بھی اسی انداز میں جواب ملا جس انداز میں سراج نے بات چھیڑی تھی۔

''اس وقت کیسے فون کر لیا؟'' سراج نے مسکرا کر کہا۔ ''میں دراصل ڈی آئی جی کی میٹنگ اٹینڈ کرنے جا رہا ہوں۔''

''کوئی اہم بات ہے؟'' سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

''یہ میٹنگ بغیر کسی ایجنڈے کے ہے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''او۔کے، میں آپ کو پھر کسی وقت اطمینان سے فون کر لوں گی۔''

''اطمینان ہم پولیس والوں کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ آپ کم از کم کال کرنے کا مقصد ہی بتا دیں، ورنہ ایک بے چینی سی رہے گی۔'' سراج نے اسے ٹٹولنے کی خاطر سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''ہیں کچھ اہم باتیں جو میں آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے..... میں میٹنگ سے فارغ ہو کر آپ کو پہلی فرصت میں کال کر لوں گا۔'' اس نے جواب دے کر موبائل آف کر دیا۔

میڈم روبی کے فون نے سراج کو اور الجھا دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میڈم نے صبح ہی صبح فون کیا ہوگا تو اس کی کوئی خاص وجہ بھی ہوگی ورنہ وہ آفس ٹائم میں اس سے رابطہ قائم کرنے کی غلطی کبھی نہ کرتی۔ ایک خیال اس کے ذہن میں یہ بھی آیا کہ کہیں میڈم روبی نے جن اہم باتوں کا حوالہ دیا تھا اس کا تعلق بھی کسی نہ کسی طور لودھی کی معطلی یا اسپورٹس کار کے حادثے میں ہلاک ہونے سے تو نہیں تھا؟

ٹھیک پونے گیارہ بجے سراج نے اپنی گاڑی ڈی آئی جی کے دفتر کے قریب پارک کی جہاں اورنگ زیب کی کار بھی اسے نظر آ گئی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ آفس کے اندر داخل ہوا۔ چپراسی سے اپنی آمد کی اطلاع کرانے کے بعد اسے فوراً بلا لیا گیا، کمرے میں ایس پی اورنگ زیب پہلے سے موجود تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات یہی ظاہر کرتے تھے کہ شاید ابھی تک ڈی آئی جی نے باقاعدہ اس اچانک کال کی جانے والی میٹنگ کا آغاز نہیں کیا تھا۔ سراج ڈی آئی جی کو سیلوٹ اور اورنگ زیب سے ہاتھ ملانے کے بعد بیٹھ گیا تو ڈی آئی جی نے ڈیوٹی کانسٹیبل کو اندر طلب کر کے اسے ہدایت دی کہ جب تک وہ اسے خود سے طلب نہ کرے نہ کسی کو اندر آنے دیا جائے نہ ہی ڈسٹرب کیا جائے۔ ان احکامات کو جاری کرنے کے بعد وہ اپنی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ باری باری سراج اور اورنگ زیب کو سنجیدگی سے دیکھا پھر تیکھے لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ''اس سے پیشتر کہ میں آپ حضرات کو زحمت دینے کا اصل مقصد بیان کروں، یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ پولیس کی ملازمت پھولوں کی سیج سے زیادہ کانٹوں کا بستر ہے جس پر

ہمیں مشکل ہی سے سکون ملتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی ہمیں نہ چاہنے کے باوجود حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ ایک عام مثال ہے کہ زیادہ کھینچنے سے مضبوط سے مضبوط رسی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایمانداری اور قانون پسندی ہماری اہم ضرورت ہے لیکن..... صورتِ حال اکثر ہمیں کسی نہ کسی مجبوری سے بھی دوچار کر دیتی ہے۔ اوپر والوں کے احکامات اور حکومت کی پالیسیاں بھی آڑے آ جاتی ہیں۔ موسم کی طرح حالات بھی اپنا رخ بدلتے رہتے ہیں، چنانچہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ وقت کے دھارے کا بھی خیال رکھیں۔ آپ حضرات کا کیا خیال ہے؟''

آغا منظور نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد سامنے بیٹھے دونوں افسروں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں آپ سے متفق ہوں سر.....'' سراج نے جواب دینے میں پہل کی۔ ''دشمن کو شکنجوں میں پھانسنے کی خاطر ہمیں کچھ سنہری جال بھی بننے پڑتے ہیں اور ایسے وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جب ہم جال کا دوسرا کونا گھسیٹ کر اسے بے بس کر سکیں۔''

''ون منٹ.....'' آغا منظور نے کہا۔ ''اور اگر آپ کو جال کا دوسرا سرا کھینچنے سے پیشتر ہی دشمن اپنا وار کر جائے تو.....؟''

''رسک تو بہرحال لینا پڑتا ہے۔'' سراج نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ''پانسا الٹا پڑ جائے تو ہماری اسکیم بھی چوپٹ ہو جاتی ہے۔ شکار کے بجائے ہم خود شکار بن جاتے ہیں۔''

''آپ کیا کہیں گے؟'' آغا منظور نے ایس پی اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔

''میں آپ دونوں کی رائے سے اگری کرتا ہوں لیکن اگر پولیس آفیسر کی اپنی پوزیشن کسی مجرم سے زیادہ مضبوط ہو تو اسے بلاوجہ جال بننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔''

''میں انفرادی نہیں..... اجتماعی بات کر رہا ہوں۔'' آغا منظور نے کسمسا کر وضاحت کی۔ ''جہاں ٹیم ورک نہ ہو وہاں کسی ایک انفرادی کھلاڑی کا کھیل پوری ٹیم کو شکست سے بھی دوچار کر دیتا ہے۔''

''میں اس پوائنٹ سے ڈس اگری نہیں کروں گا۔''

''پھر آپ یہ بھی مانیں گے کہ ٹیم کی خفت کی تمام تر ذمے داری یا تو کپتان کے سر تھوپ دی جاتی ہے یا سلیکٹرز کو مورد الزام ٹھہرا دیا جاتا ہے؟''

''عام حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔'' اورنگ زیب نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔

''سر.....'' سراج نے اس میٹنگ کی غرض و غایت سمجھنے کی خاطر دبی زبان میں کہا۔ ''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم کھل کر اصل مقصد کی بات کریں؟''

''میرا خیال ہے کہ کسی ایسے دیدہ دلیر مجرم نے ہمارے خلاف کوئی زہرا گلا ہے جو ابھی تک کسی پہاڑ کے نیچے نہیں آیا، اس لیے خود کو سب سے زیادہ قدآور سمجھ رہا ہے۔'' اورنگ زیب نے ایک امکانی وضاحت کی تو آغا منظور نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

''یو آر رائٹ مسٹر اورنگ زیب۔'' وہ تلملا کر بولا۔ ''آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ میں اس وقت کسی ایسے ہی مجرم کی بات کر رہا ہوں جو تنہا نہیں ہے۔ اس خرانٹ نے کچھ ایسے غداروں کو بھی اپنا ہم خیال بنا رکھا ہے جو ہم سے بہت اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ جنہیں ہم نے اور آپ ہی نے اپنا قیمتی ووٹ دے کر اسمبلیوں تک پہنچایا ہے۔ وہ جو چال چل رہے ہیں ہمیں اس کا توڑ کرنے کی خاطر اجتماعی انداز میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔''

''بات کیا ہے سر.....'' سراج نے پھر براہ راست ڈی آئی جی سے دریافت کیا۔

''مجھے علم ہے کہ ڈی ایس پی لودھی کے معطلی کے احکامات آپ کے اشارے پر ہوم سیکریٹری نے جاری کیے تھے۔'' ڈی آئی جی نے ایس پی اورنگ زیب کو دیکھ کر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''وہ اس کا مستحق بھی تھا لیکن آپ نے وہ آرڈر اسے براہ راست دینے کے بجائے میرے ذریعے سروکرائے ہوتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔''

سراج صورت حال کی نزاکت جان کر چپ ہی رہا۔ اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کی بات سن کر ایک لمحہ توقف کیا پھر بڑے پرسکون انداز میں وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں سر..... کہ شیخ حامد جو مجھے اپنا دشمن سمجھ رہا ہے اسے لودھی کی معطلی ہضم نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ لودھی کو میری ذاتی رپورٹ پر سسپینڈ کیا گیا لیکن میں نے وہ آرڈر آپ کے بجائے خود تعمیل کیے۔ اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ میں اپنی وجہ سے آپ کو یا کسی اور کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔''

''لیکن اب آپ کے بجائے جو سوالات مجھ سے پوچھے جا رہے ہیں ان کا جواب کون دے گا؟''

''اگر بات تحریر میں ہے تو آپ اس ضمن میں بھی میرا تحریری جواب طلب کر لیں۔ میں ساری ذمے داری قبول

کرنے کو تیار ہوں۔"

"پلیز مسٹر اورنگ زیب۔" آغا منظور تلملا کر بولا۔ "بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ لوگوں سے الگ نہیں ہوں، ممکن ہے کہ آپ جو شکار کھل کر کھیلنا چاہتے ہوں میں اس کے لیے میدان تیار کر رہا ہوں۔ تجربہ کار شکاری کسی بدمست ہاتھی کے سامنے کھڑے ہو کر اسے شوٹ کرنے کا رسک کبھی نہیں لیتے لیکن..... اگر آپ مجھے اب تک غلط سمجھتے رہے ہیں تو پھر آج میں کھل کر آپ دونوں سے اس بات کا اعتراف بھی کر لوں کہ میرا اور آپ کا دشمن الگ الگ نہیں..... ایک ہی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ میں اپنے حالات کے پیش نظر کسی مناسب موقعے اور وقت کا منتظر ہوں جبکہ آپ کسی اور وجہ سے خطرہ مول لینے کو پوری طرح آمادہ ہیں..... مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا۔"

اورنگ زیب نے آغا منظور کا وہ رنگ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ غلط بھی نہیں تھا، اس کی تجربہ کار نظریں ڈی آئی جی کی تصویر کا دوسرا رخ دیکھ کر کچھ دیر اپنے حلقوں میں گردش کرتی رہیں پھر..... اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"آئی۔ ایم سوری سر..... میں کوشش کروں گا کہ آئندہ جو قدم بھی اٹھاؤں اس میں آپ کا مشورہ بھی شامل ہو مگر ایک بات قبل از وقت واضح کر دوں، میں صرف آپ کا لحاظ کر سکتا ہوں، کسی اور نے اگر میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تو اسے اینٹ کا جواب پتھر ہی سے ملے گا۔"

سراج نے سکون کا سانس لیا۔ ماحول کا تناؤ جس انداز میں ڈی آئی جی نے کم کیا تھا وہ اس سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، لودھی کی بحث ختم ہوئی تو آغا منظور نے اس اسپورٹس کار کا ذکر چھیڑ دیا جس میں ہلاک ہونے والے کی لاش اس نے سرد خانے میں رکھوا دی تھی۔ وہ بی زبان میں یہ بھی بتا دیا کہ کسی مخبر نے فون پر اس کے بارے میں کیا معلومات فراہم کی تھیں۔

"سر..... کیا مخبر کے بارے میں آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟" سراج نے سوال کیا۔

"نہیں..... میں نے اس کی آواز پہلی بار سنی ہے۔ بعد میں یہ بھی تصدیق ہو گئی کہ اس نے کسی بوتھ سے کال کی تھی۔"

"فون بوتھ کس علاقے میں ہے.....؟"

"اس کا جواب میں دے سکتا ہوں۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "جس علاقے میں بوتھ ہوگا، مخبر کا تعلق اس علاقے سے نہیں ہو سکتا۔ اس نے اگر آکٹوپس کے بارے میں زبان کھولی ہے تو ہر طرح سے اپنے بچاؤ کی تدابیر بھی ضرور اختیار کی ہوں گی۔"

"یو۔ آر۔ رائٹ!" آغا منظور نے اس کی تائید کی۔

"اس سلسلے میں کچھ شبہات کا اظہار میں بھی کروں گا۔" اورنگ زیب نے کچھ توقف سے کہا۔ "لاش سرد خانے سے جو بھی وصول کرے گا ہم اس کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جو آدمی اس کام پر تعینات کیے گئے ہیں انہیں سرد خانے سے ہٹا لیا جائے۔"

"میں سمجھا نہیں....." آغا منظور نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ "کیا ہمارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں ہے کہ اس کی موت حادثاتی تھی یا....."

"اسے کسی دشمن نے گولی مار کر ہلاک کیا ہے....."

"وہاٹ....." ڈی آئی جی چونکا۔ "آپ یہ بات اس قدر یقین سے کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"میں اپنے ذرائع سے اس کی تصدیق کرا چکا ہوں۔"

اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ "وہ میرے مشکوک افراد کی لسٹ پر تھا۔"

"آئی۔ سی....." سراج نے نظریں گھما کر ایس پی کو دیکھا۔ "اگر وہ آپ کی لسٹ پر تھا تو آپ کے پاس اس کے بارے میں کچھ ضروری معلومات بھی ہوں گی؟"

"مخبر کا یہ اندازہ غلط نہیں ہے کہ وہ آکٹوپس کا خاص آدمی تھا۔" اورنگ زیب نے جواب دیا۔ "میرے جو آدمی اس کی نگرانی کر رہے تھے ان کا یہی بیان ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ محتاط رہنے کا عادی تھا۔ کبھی اسے آکٹوپس کے دفتر کے آس پاس بھی نہیں دیکھا گیا۔ البتہ ایک بار اتفاق سے میرے سادہ لباس والے نے اسے بلیک ٹائیگر کا کوڈ استعمال کر کے کسی سے بات کرتے سنا تھا۔"

"کیا اسے گولی مارنے کی اطلاع بھی آپ کو اسی....."

"جی نہیں....." اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کا سوال کاٹ کر جواب دیا۔ "گولی مارے جانے کی تصدیق مجھے بھی پولیس کے ذریعے ملی تھی۔"

"او۔ کے۔" ڈی آئی جی نے مسکرا کر دوستانہ انداز میں کہا۔ "مرنے والے کا کھوج لگانا بھی اب آپ کی ذمے داری ہے۔ میں نے جو آدمی تعینات کیے تھے ان کو ہٹا دیتا ہوں۔"

"میں آپ سے ہر بات شیئر کرنے کو تیار ہوں سر..... لیکن یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ اگر کبھی میرا اور آکٹوپس کا آمنا سامنا ہوا تو میں کسی بھی مصلحت کے پیش نظر خود کو کنٹرول نہیں

کروں گا۔"

"آکٹوپس....." ڈی آئی جی نے بہ دستور مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ "آپ نے اس کے لیے بے حد مناسب نام رکھا ہے۔"

میٹنگ کا اختتام بڑے دوستانہ ماحول میں ہوا۔ باہر آ کر اورنگ زیب نے سراج سے پوچھا۔

"آپ کو اس میٹنگ کی اطلاع کیسے ہوئی؟"

"ڈی آئی جی نے فون کر کے بتایا تھا اور شریک ہونے کو بھی ان ہی نے کہا تھا۔"

"کیا رائے ہے اب آپ کی میٹنگ کے بعد.....؟"

"میرا خیال ہے کسی انتہائی ٹاپ سیکریٹ بات کے علاوہ اگر ہم مل کر کام کریں تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے....."

"میں نے بھی یہی سوچا ہے۔" اورنگ زیب نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "آج رات کو آپ کا کوئی خاص پروگرام تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں....."

"پھر آپ آج میرے ساتھ ڈنر کریں، کچھ ضروری باتیں اور بھی ہیں جو میں آپ سے ڈسکس کرنا چاہوں گا۔"

سراج نے پروگرام طے کیا پھر دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے کسی ممکنہ تعاقب کا شبہ دور کرنے کے بعد حسب وعدہ میڈم روبی کو کال کیا۔

"شکر ہے کہ آپ کو جلدی اپنا وعدہ یاد آ گیا۔" دوسری جانب سے میڈم کی آواز ابھری۔ "میں تو سمجھی تھی کہ شاید میٹنگ کے بعد آپ بھول ہی جائیں۔"

"اوہ....." سراج نے شوخی سے کہا۔ "کیا الماس کے کہنے پر آپ نے اب میری نگرانی کی ذمے داری بھی مول لے لی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ بس اتفاق ہی ہے کہ مجھے کسی ذریعے سے آپ کی مصروفیت کا علم ہو گیا۔"

"آپ مجھ سے کچھ اہم باتیں کرنے کو کہہ رہی تھیں۔" سراج نے اسے سنجیدگی سے یاد دلایا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ شاید جگا کے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔"

"جی ہاں..... بہ ظاہر وہ ایک دو کاروبار چلا رہا ہے لیکن یہ بات ہمارے ریکارڈ پر ہے کہ درپردہ ایک باقاعدہ گینگ کا لیڈر بھی ہے۔" سراج نے جگا کے نام پر چونکتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک بار سزا بھی کاٹ چکا ہے۔"

"اور شاید اسی سزا کی مہربانی نے اسے مجرم بنا دیا۔"

"میں سمجھا نہیں....."

"ہمارے جیل خانوں کا ماحول کس قدر صاف ستھرا ہے یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ ایک بار کوئی شریف آدمی بھی دس پندرہ روز کے لیے وہاں کی یاترا کرلے تو وہ بھی پورا پنڈت ہوجاتا ہے۔"

"آپ جگا کو کس طرح جانتی ہیں؟" سراج نے سنبھل کر سوال کیا۔

"زیادہ نہیں۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ پہلی بار اس نے جو سزا کاٹی تھی وہ آپ کے قانون کی مہربانی تھی۔" میڈم روبی نے اس بار بھی تنقیدی انداز اختیار کیا۔ "زندہ رہنے کے لیے جب کوئی راستہ نہ رہے تو پھر انسان جہانگیر بٹ کے بجائے جگا ہی کا روپ اختیار کرلیتا ہے۔"

"آپ مجھے اس وقت کیا باور کرانا چاہتی ہیں؟" سراج نے کسمسا کر سوال کیا۔ "خاص طور پر آپ نے اس وقت جگا ہی کا موضوع کیوں چھیڑ دیا؟"

"اس لیے کہ اب وہ خطرناک مگرمچھ کی آنکھوں میں بھی بری طرح کھٹک رہا ہے۔ کسی کانٹے کی طرح، جسے زیادہ چبھنے پر بے دردی سے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔" میڈیم نے بڑے زہریلے لہجے میں کہا۔ "آپ کا قانون بھی شاید اس کی لاش کو سکون کی سانس لے کر دفن کردے گا۔"

"کیا آپ اپنی ان معلومات کا ذریعہ بتانا پسند کریں گی؟" اس بار سراج نے محتاط لہجے میں سوال کیا۔

"آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ مگرمچھ سے میرے مراسم کس قسم کے ہیں؟"

"اسی لیے تو دریافت کررہا ہوں کہ آپ کو اندر کی باتیں کس طرح معلوم ہوگئیں.....؟"

"جو لاش سردخانے میں رکھوائی گئی ہے اس کی خبر تو غالباً آپ کو بھی مل چکی ہوگی اس لیے اب یہ بات اندر کی نہیں رہی۔" میڈم نے بدستور شیخ حامد سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "فی الحال میں آپ کو اتنا ضرور بتاسکتی ہوں کہ مرنے والا خطرناک مگرمچھ کا بہت قیمتی آدمی تھا اور مرنے سے دو روز قبل وہ جگا کے خفیہ ٹھکانے پر دیکھا گیا تھا۔"

"آئی۔سی۔" سراج چونکا۔ "کیا اسپورٹس کار والے کی موت میں جگا کا ہاتھ تھا یا..... ایسا سمجھا جارہا ہے؟"

"جگا کے فرشتوں کو بھی اس کا علم بعد میں ہوا ہے کہ مرنے والا کون تھا اور مگرمچھ کے لیے اس کی کیا اہمیت تھی لیکن بہرحال اب اسی کو قابل عتاب سمجھا جارہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اب جگا کو بھی محض شبہے کی بنا پر ٹھکانے لگا دیا جائے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن آپ کو ان تمام باتوں کا علم کس طرح ہوا؟"

"سوری مسٹر سراج..... میں اس وقت آپ کو جو کچھ بتا رہی ہوں اس کی تفصیل سے آگاہ نہیں کرسکتی لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اگر قانون کسی طرح جگا کو اس نازک موقع پر تحفظ فراہم کردے تو وہ کسی فرعون کے حق میں موسیٰ ہی ثابت ہوگا۔"

"ممکن ہے آپ کا اندازہ درست ہو لیکن میرے لیے یہ تقریباً ناممکن ہی ہے۔" سراج نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "اگر کوئی ٹھوس ثبوت ہو تو بھی شاید اوپر والے مگرمچھ کے مقابلے میں پولیس کی اس انوکھی درخواست کو قبول نہیں کریں گے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے کھرا جواب دیا۔ میں نے آپ کی بات کا برا نہیں مانا، میرا ذاتی اندازہ بھی یہی تھا کہ یہ کام مشکل ہوگا لیکن خدا اگر چاہے تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔"

"وہ بھی اس لیے کہ وہاں کسی مگرمچھ یا ایک چیونٹی کے درمیان بھی کوئی مروت نہیں ہوگی۔ جو کچھ نامہ اعمال میں لکھا ہوگا اسی کے مطابق انصاف بھی ہوگا۔"

"ایک اطلاع اور بھی آپ کو فراہم کررہی ہوں۔" میڈم روبی نے سنجیدگی برقرار رکھی۔ "افضل خان، تین چار دن انڈر گراؤنڈ رہنے کے بعد اسٹار ان میں قیام پذیر ہوگیا ہے۔"

"یہ اطلاع میرے لیے اہم ہے لیکن....."

"میں سمجھ رہی ہوں گی کہ آپ پھر میری سرگرمیوں کے بارے میں کوئی سوال کریں گے۔" میڈم نے بات درمیان سے اچک کر کہا۔

"کیا مجھے اس کا حق نہیں ہے؟" سراج نے اپنایت کا اظہار کیا۔

"الماس کے رشتے سے اب آپ کو پہلے سے زیادہ حق حاصل ہے مگر فی الحال آپ میری فکر نہ کریں۔ ہوسکتا ہے میں ایک دو روز میں آپ کو پھر فون کرکے کچھ نئی معلومات بھی فراہم کردوں۔"

"جو اہم آدمی بھی سردخانے میں آرام کررہا ہے کہیں اس میں....."

"میرا ہاتھ براہ راست شامل نہیں ہے۔" میڈم نے اس بار بھی معنی خیز انداز میں جواب دیا پھر ساتھ ہی رابطہ بھی

ختم کردیا۔

سراج کا ذہن میڈم کی گفتگو کی روشنی میں قیاس آرائیوں کے سوا اور کچھ نہ کرسکا لیکن جگا والی کہانی سن کر وہ بڑی سنجیدگی سے اس بات کو محسوس کررہا تھا کہ میڈم جس راستے پر تیزی سے قدم اٹھا رہی ہے وہ اس کے لیے ایک عورت ہونے کے سبب بے حد خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ آفس پہنچنے تک وہ ان ہی خیالات میں الجھا رہا پھر..... دفتر میں قدم رکھتے ہی اسے ایک نئی فکر لاحق ہوگئی۔ وہ لیاقت حسین کو دفتر میں چھوڑ کر گیا تھا لیکن واپسی میں لیاقت حسین اسے دفتر میں نہیں ملا۔ اس نے سپاہی سے دریافت کیا تو اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

"دس منٹ پہلے تک وہ آفس ہی میں تھا سر..... پھر کسی ضروری کام کا کہہ کر چلا گیا، ہوسکتا ہے کوئی خاص حاجت کی وجہ سے کہیں قریب گیا ہو۔"

"ہاں، ہوسکتا ہے۔" سراج نے اپنے ڈیوٹی کانسٹیبل کا مطلب سمجھ کر اطمینان کا سانس لیا مگر لیاقت حسین ایک گھنٹے بعد بھی واپس نہیں لوٹا تو اس کی تشویش میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔

■■■

جگا کو جیل میں سزا کاٹنے کے بعد جو تجربہ ہوا تھا اس نے اسے وقت سے پہلے بہت کچھ سکھا دیا تھا جیل سے باہر آنے کے بعد اس نے محسوس کیا تھا کہ جو حالات پہلے تھے، اب نہیں رہے جو، اب تھے وہ آئندہ نہیں رہیں گے؟ اسے ہفتے میں تین دن باقاعدہ تھانے میں حاضری لگانی پڑتی، پولیس آفیسروں کی بلاوجہ جھڑکیاں سننی پڑتیں۔ دو فیتوں والوں کے علاوہ تمام کانسٹیبل بھی اسے ایسی نظروں سے دیکھتے جیسے وہ انسان نہیں کوئی پالتو جانور تھا جس کو اپنے نہیں صرف دوسروں کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ اس کی اپنی مرضی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

جگا ان حالات میں بھی بہت دنوں تک پرانی ڈگر پر چلنے کی کوشش میں بھٹکتا رہا لیکن جب فاقوں کی نوبت آگئی تو اس کے ذہن میں پولیس کے ایک ہیڈ کانسٹیبل کی بات گونجنے لگی۔ جیل جانے سے پیشتر بھی وہ اس سے واقف تھا، جیل سے واپس آنے کے بعد بھی اس نے ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اسی سے رابطہ کیا۔ اس کا نام امداد علی تھا، بہ ظاہر وہ بھی متوسط طبقے کا ایک آدمی لگتا تھا لیکن جگا جانتا تھا کہ اس کا اصل کیا تھا، اس نے ملنے جلنے والوں پر اپنی حیثیت قائم رکھنے کی خاطر شرافت اور ایمانداری کا جو خول چڑھا رکھا تھا وہ اصلی نہیں تھا۔ اس کی مالی حالت ان لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر تھی جو پوش علاقے کے بنگلوں میں رہتے تھے، بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومتے تھے۔ امداد علی ان لوگوں سے کہیں زیادہ دولت مند تھا۔ اس نے فرضی نام سے کئی کاروبار کر رکھے تھے جہاں بہ ظاہر اس سے کم حیثیت کے لوگ بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازمت کرتے تھے، اس نے کئی ناموں سے مختلف اپارٹمنٹس اور پلازا میں دو، تین اور چار کمروں کے لگژری فلیٹس خرید رکھے تھے جن سے ہر ماہ ایک خطیر رقم بہ طور کرایہ وصول ہوتی تھی۔ اس کی پشت پر اس کا ایک پڑھا لکھا عزیز دار جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا تمام سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ امداد علی نے اسے ایسے داؤ پیچ سکھا دیے تھے جن کی وجہ سے کوئی اس پر شبہ نہیں کرتا تھا۔

امداد علی کی اصل حیثیت کا علم بھی کچھ لوگوں کو تھا جن میں ایک جگا بھی تھا جو جیل جانے سے قبل اس کے پڑوس میں رہتا تھا، امداد علی سے اس کی دوستی پرانی تھی۔ جیل کی مشکلات میں بھی امداد علی اس کے کام آتا رہا تھا۔ جیل سے رہائی ملنے کے بعد امداد علی نے اسے دبی زبان میں سمجھایا بھی تھا۔ "دیکھ جہانگیرے، تیرے اوپر حوالاتی ہونے کا ٹھپا لگ گیا ہے جو دھوبی کا کپڑوں پر لگایا ہوا وہ سیاہ نشان ہے جو پچاس دھلائیوں کے بعد بھی جوں کا توں رہتا ہے۔ لباس پھٹ کر چیتھڑا ہوجاتا ہے لیکن وہ نشان نہیں مٹتا۔ اب تیری اس شرافت کو بھی ایسا ہی داغ لگ گیا ہے اور وہ وقت کے ساتھ کم ہونے کے بجائے اور چوکھا ہوتا جائے گا اس لیے میری مان تو شرافت کا لبادہ اتار پھینک۔ تیرے پیچھے اب کوئی رونے دھونے والا بھی نہیں رہا۔ ایک ندی، تالاب یا دریا کا پانی ختم ہوجائے تو پنچھی بھی زندگی کی آس لیے پنکھ مار کر دوسری منزل کی طرف اونچی اڑان بھرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ تو بھی انہی سے سبق حاصل کر۔ جیل یاترا کرآیا تو اب پرانا لباس بھی اتار پھینک، میری طرح ساہوکار بن کر رام رام جپنا شروع کردے۔ میں تیرا پرانا لنگوٹیا ہوں، جو مدد ہوسکی اس سے منہ بھی نہیں پھیروں گا جب چاہے آزما کر دیکھ لینا۔"

جگا کو اس کی دہری شخصیت کی اصل حقیقت معلوم تھی، وہ ان راستوں پر چلنے پر آمادہ نہیں ہوا اور محلہ ہی چھوڑ کر ایک دوسری بستی میں آباد ہوگیا۔ مہینوں بھٹکتا رہا، سیدھی اور سچی راہ کی تلاش میں۔ کئی بار اس نے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں بھی کیں۔ ایمانداری سے کام کیا تو اس کی قدر بھی کی گئی لیکن جب بھی اس کے مالکوں کو کسی ذریعے سے اس کے جیل جانے اور سزا کاٹنے کی اطلاع ملتی، وہ اسے نفرت سے دھتکار کر

برطرف کر دیتے۔ بار بار کے تجربوں کے بعد جب فاقوں کی قوت بھی جواب دینے لگی تو وہ تھک ہار کر تن بہ تقدیر دوبارہ امداد علی کے پاس آ گیا۔ امداد علی نے اس کی حالت کسی تجربے کار جوہری کی طرح پرکھی تو مسکرا کر بولا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا جہانگیرے کہ جو ٹھپا لگ چکا ہے وہ چھپائے نہیں چھپے گا، پر تو نے میرا کہا نہیں مانا۔ اب تو نے کیا ٹھانی ہے؟''

''میں تھک ہار کر تیرے پاس آ گیا ہوں۔'' اس نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ''ایک ناکردہ گناہ کی سزا اتنی کٹھن ہو گی، میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔''

''تجربہ انسان کو سب کچھ سکھا دیتا ہے میرے یار...... اس دنیا میں جینے کی خاطر انسان کو بار بار چولے بدلنے پڑتے ہیں۔'' امداد علی لے کہا۔ ''کتے کی مثال لے لے، سب سے وفادار جانور ہوتا ہے۔ وقت پڑے تو مالک کی زندگی بچانے کی خاطر اپنا آپ داؤ پر لگا دیتا ہے لیکن پھر بھی مالک کے ساتھ ایک دسترخوان پر نہیں بیٹھ سکتا......گلی میں رفع حاجت کے لیے نکلے تو بچے بھی اسے پتھر مارنے سے نہیں چوکتے......''

''تیری باتیں دل کو لگتی ہیں لیکن......''

''چل پھر رہنے دے......'' امداد علی نے دوستی نبھانے کی خاطر کہا۔ ''میں کل بھی تیرا لنگوٹیا تھا...... آج بھی ہوں، تو ایسا کر ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو آ کر مجھ سے پانچ ہزار لے جایا کر...... اتنی رقم میں بری بھلی ہی سہی لیکن تیری شرافت سے گزر بسر ہو جائے گی۔''

''یہ تو کیا کہہ رہا ہے امداد علی؟'' جگا نے اسے حیرت سے گھورا۔ ''تو اگر میرا لنگوٹیا ہونے کی بات کرتا ہے تو یہ بھی جانتا ہو گا کہ جہانگیر نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔''

''دوسرا طریقہ بھی تجھ سے اختیار نہیں ہو سکے گا۔'' امداد علی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''اس میں محنت کی ضرور ملے گی لیکن اس حلیے میں نہیں...... تجھے روز روز اپنا بھیس بھی بدلنا پڑے گا۔''

''کیا کسی تھیٹر کمپنی میں کام دلوائے گا؟''

''تو اب کہاں کھڑا ہے......؟'' جواب میں امداد علی نے اسے معنی خیز انداز میں گھورا۔ ''یہ دنیا بھی ایک تھیٹر ہی ہے جہانگیرے، لوگ یہاں بھی آئے دن کردار لیتے ہیں۔ موسم کے ساتھ ساتھ رنگ ڈھنگ بھی بدلتے ہیں۔ سیدھے سچے اور کھرے راستے پر بھی جب اوپر والا کسی کو سخت امتحان میں ڈالتا ہے تو وہ بھی سٹ پٹا کر چوکھا راستہ بدل کر بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک ہوں، جمعہ کی نماز بھی گنڈے دار پڑھتا ہوں، ایک بار پیش امام صاحب فرما رہے تھے کہ انسان کو جنت بھی آسانی سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے نہیں مل جائے گی۔ بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے، سخت امتحانوں سے گزرنا ہو گا پھر پرمٹ ملنے کی کچھ امید ہو گی۔ چھوٹے بڑے سب اس بات سے بھی واقف ہیں کہ یہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے یا چند روز کے کھیل تماشے ہیں۔ اصلی اور پکی زندگی اوپر ہی کی ہو گی لیکن...... کتنے لوگ اسے سمجھتے ہیں، سمجھ بھی لیں تو امتحان سے گھبرا کر ان کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ پیر پیغمبروں کی بات اور ہے جو کھجور کی ایک گٹھلی چار چار دن چوس کر گزارہ کر لیتے تھے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر ہر امتحان سے گزر جاتے تھے لیکن اب...... ایسے اجلے لوگ آٹے میں نمک برابر ہو کر رہ گئے ہیں۔ کل کے بارے میں ان کی بھس بھری کھوپڑی کام نہیں کرتی۔ آج دو اور دو چار کس طرح کرنا ہے؟ اس کا غم سب کو اندر ہی اندر میٹھے آم کی گٹھلی کی طرح گھلاتا رہتا ہے...... میں تجھ سے زور زبردستی نہیں کر رہا۔ حساب کتاب والے دن سب کو اپنی اپنی بھیڑنی پڑے گی۔ میں نے دوست سمجھ کر تجھے اچھی بری دونوں سمجھا دیں۔ آگے جو تیری مرضی۔ چھین جھپٹ کر اپنا حق مانگ یا پھر فقیروں کی طرح زندگی گزار دے۔''

جگا کئی روز تک کھوٹے اور کھرے کی فکر میں گھلتا رہا پھر ایک روز تھانے کی حاضری کے وقت ایک پھول والے نے ذرا سی بات پر اس کو ماں بہن کی گندی گندی گالیوں سے نوازا تو وہ برداشت نہ کر سکا۔ اسی روز وہ جلد بازی پر عمل کرتے ہوئے جہانگیر بٹ سے جگا بن گیا۔ امداد علی نے اسے زندہ رہنے کے نئے نئے گر بتائے تو اس نے قانون کے ستائے ہوئے لوگوں کا ایک گروہ بھی بنا لیا۔ امداد علی نے اس کی مالی مدد کر کے ایک دو بزنس بھی کرا دیے۔ اسی نے کہا تھا۔ ''جہانگیرے، میری ایک بات دھیان سے سن اور گانٹھ لگا لے۔ یہ جو بڑے بڑے راجپوت اور مغل بادشاہ گزرے ہیں، جن کی کہانیاں میرے تیرے بچے کتابوں میں پڑھتے ہیں، یہ سب سیاہ و سفید کے مالک ہوتے تھے۔ کوئی ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا لیکن ان کے محلوں کے اندر بھی چور راستے ضرور ہوتے تھے جو اپنے لوگوں کی بغاوت یا کسی طاقت ور بادشاہ کے حملے کے آڑے وقت دبا کر ان ہی چور راستوں سے بھاگنے میں کام آتے

تھے...... آج کے دور میں بھی ہر بدمعاش کسی نہ کسی بزنس کی آڑ لیتا ہے۔ یہ بڑے گُر کی باتیں ہیں میرے یار...... پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں لیکن ہمارے تمہارے دھندے میں بھی چور راستے ضروری ہوتے ہیں جو برے وقت میں کام آتے ہیں۔ بزنس کی آڑ میں سارے دھندے چھپ جاتے ہیں۔ کیا سمجھا؟''

جہانگیر بٹ نے جگا بننے سے پہلے امداد علی کی ایک بات کو گرہ سے باندھ لیا، بزنس کی آڑ میں وہ اپنی سفید پوشی بھی قائم کیے ہوئے تھا۔ کل تک جو پولیس کے اہلکار اسے دیکھ کر اس کی ماں بہن کو کھنگالنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے، رفتہ رفتہ اسے سلام کرنے لگے۔ جگا نے گینگ لیڈر بننے کے بعد ہر ایک کے وظیفے باندھ دیے تو وہ بھی اس کے آگے پیچھے دم ہلانے لگے۔

امداد علی کے چور راستے والی بات نے اسے اپنی پرچھائیں سے بھی چوکس رہنا سکھا دیا تھا، اس نے ایک اصول بنا رکھا تھا۔ دو تین راتوں سے زیادہ ایک ٹھکانے پر بسر نہیں کرتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے انہیں بدلتا رہتا تھا۔ شراب اس کے پیشے کی کمزوری تھی لیکن بازاری عورتوں کے سلسلے میں اس نے لنگوٹ کو کبھی ڈھیلا نہیں ہونے دیا۔ بزنس میں ترقی کرنے کے بعد اس نے امداد علی کی پائی پائی مع سود بیاج کے ادا کر دی۔ ہفتہ پندرہ دن میں دونوں کی ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں، پولیس کے کسی اقدام کی اندرونی خبریں اسے امداد علی کے ذریعے بھی ملتی رہتی تھیں۔ اس روز بھی جب اسپورٹس کار میں بلیک ٹائیگر زندگی کی بازی ہار گیا تھا تو امداد علی ہی نے اسے فون کیا تھا۔

''جگا...... تجھے خبر ہے کہ مرنے والا کون تھا؟''

''شیخ حامد کا کوئی خاص بندہ تھا۔''

''خاص نہیں...... خالص الخالص۔'' امداد علی نے اسے باور کرایا۔ ''وہ اس وڈے پھنے خان کا دست راست تھا۔ نمبرون، اس کی موت پر پھنے خان کی بیٹھک میں کیڑے کلبلا رہے ہیں۔ اس کے دوسرے زرخرید شکاری کتے بھی ہر طرف دشمن کی بو سونگھتے رہے ہیں۔ سرکاری چمچے بھی گھات لگائے نمک حلال کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔''

''کیا تمہیں پتا ہے کہ اسے کس نے شکار کیا......؟''

''نہیں...... لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ مرنے سے پیشتر کن کن لوگوں سے ملا تھا۔ پھنے خان نے حکم دیا ہے کہ ایسے تمام لوگوں کو خاص طور پر چھان پھٹک کر دیکھا جائے۔ جس پر ذرا بھی شبہ ہوا اسے دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹا دیا

بین الاقوامی کہاوتیں

☆ آزادی کی تکلیف، غلامی کے آرام سے بہتر ہے (عربی کہاوت)

☆ بغیر دیکھے کوئی چیز منہ میں نہ ڈالو اور نہ ہی بغیر پڑھے کبھی دستخط کرو (اسپینی کہاوت)

☆ احسانات سے دبی ہوئی زندگی انسان کے شایانِ شان نہیں (چینی کہاوت)

☆ ہمت والے خدا کی بخشی ہوئی طاقتوں سے کام لیتے ہیں (جرمن کہاوت)

☆ کامل شخص کے پاس وقت نہیں ہوتا (اطالوی کہاوت)

☆ گناہ کے آغاز میں اتنی لذت نہیں، جتنی اس کے اختتام میں تلخی ہے (ملایائی کہاوت)

☆ سب سے بڑی ہوشیاری یہ ہے کہ کوئی چالاکی نہ کی جائے (فرانسیسی کہاوت)

مرسلہ: ایس۔ امتیاز احمد، کراچی

جائے۔ میں تمہیں بھی محتاط رہنے کا مشورہ دوں گا۔ دائیں بائیں نظر رکھنا۔ رب راکھا۔''

''رب راکھا......''

جگا نے موبائل بند کر دیا پھر اسے اچانک خیال آ گیا کہ وہ خالص الخاص آدمی مرنے سے دو روز پیشتر اس سے ملنے بھی آیا تھا۔ اس روز وہ دراز قد کا سیاہ فام افریقی بھی آیا تھا جو پھنے خان کے کسی مخالف گروہ کے لیے کام کر رہا تھا۔ ممکن ہے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیا ہو، ایسی صورت میں جگا کی شخصیت پر بھی بلاوجہ ''ملی بھگت'' کا شبہ کیا جا سکتا تھا۔ اس اچانک خیال کے بعد جگا نے فوری طور پر عملی طور پر روپوشی ضروری سمجھی۔ اس نے اپنے اعتماد کے آدمیوں کو کسی جوابی کارروائی کے ممکنہ اندیشوں سے نمٹنے کے لیے ضروری تاکید بھی کر دی۔

دو روز سے وہ ہر بارہ گھنٹے بعد اپنے ٹھکانے بھی تبدیل کر رہا تھا، امداد علی کے ذریعے اسے ضروری معلومات بھی مل رہی تھیں۔ ذاتی طور پر بھی وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ شیخ حامد ایک معمولی سی چوٹ بھی لگنے پر آپے سے باہر

ہوجاتا تھا، اس کے گرگے اس کے اشارے پر خود اپنی کنپٹیوں پر بھی پستول رکھ کر گولی داغنے کے عادی تھے۔ ایک معمولی سا شبہ بھی اسے ممکنہ دشمن کو راستے سے ہٹا دینے کے لیے بہت ہوتا۔

اس وقت بھی جگا اپنے ایک محفوظ ٹھکانے پر تھا، رات اس نے اسی چھت کے نیچے بسر کی تھی، دوپہر کے کھانے کے بعد وہ حسب معمول دوسرے ٹھکانے پر جانے کا پروگرام طے کرچکا تھا، وہ جس چھت کے نیچے رات بسر کرتا وہاں اس کے دوسرے جاں نثار ساتھی بھی آس پاس رہتے تھے، کسی کو جگا کے کمرے تک جانے کی اجازت نہیں تھی، اس کے اپنے کسی کارندے کو بھی اس تک کئی مرحلوں سے ہوکر گزرنے کے بعد رسائی کی اجازت ملتی تھی۔ امداد علی کے بعد اس کے اپنے آدمیوں نے بھی یہ بوسونگھ لی تھی کہ شیخ حامد کے گرگے اس کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے۔ مقصد ایک ہی ہوسکتا تھا کہ جگا کو محض مرنے والے کا ممکنہ قاتل تصور کرکے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ خود جگا بھی کسی ایک ایسے لمحے کی تلاش میں تھا کہ اس خطرناک دشمن کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک کردے، شاید وہ رسک لینے سے بھی گریز نہ کرتا لیکن امداد علی نے اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ شیخ حامد کے سلسلے میں وہ کسی جلد بازی کا مظاہرہ کرنے سے گریز ہی کرے۔ اس نے امداد علی کے اس مشورے کو بھی قبول کرلیا۔ گروہ کا سرغنہ ہونے کے باوجود وہ بات بات پر خون خرابہ کرنے کا عادی نہیں تھا۔ ہاتھ پاؤں بچا کر اپنی ساکھ برقرار رکھنے کا مشورہ بھی اسے امداد علی نے دیا تھا جس پر وہ روز اول سے کاربند تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے پہلی بار اپنی زندگی بچانے کی خاطر بلاوجہ حالات کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کا ناخوشگوار عمل اختیار کرنا پڑ رہا تھا۔

جگا کے ذاتی اصول دوسرے گروہ کے سرغناؤں سے مختلف تھے، وہ بدمعاشی میں بھی ایمانداری کا قائل تھا، دولت کے لالچ یا اپنی بات اونچی رکھنے کی خاطر اس نے کبھی کسی دوسرے چھوٹے بدمعاشوں کو تنگ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے اس کے اصولوں کو دوسرے گروہ کے بڑے بھی سراہتے تھے۔

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا شیخ حامد کے بارے میں مختلف زاویوں سے غور کررہا تھا جب اس کے کمرے کا دروازہ اچانک کھلا۔ اپنے کسی آدمی کے بجائے ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر اسے خطرے کا احساس ہوا، پلک جھپکتے میں اس نے نہایت پھرتی سے اپنا پستول اٹھا کر آنے والے پر تان لیا، جگا کی للکارتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔

”کون ہو تم؟“

آنے والے نے جگا کی گھن گرج کا نوٹس نہیں لیا، اطمینان سے کھڑا جگا کو دیکھتا رہا، اس کا وہ اطمینان بھی جگا کے لیے حیرت انگیز ہی تھا۔ ”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ جگا کے لہجے میں سفا کی گھلنے لگی۔ ”کیا زندگی سے تنگ آچکے ہو؟“

نو وارد نے اس بار بھی کوئی نوٹس نہیں لیا، پلکیں جھپکائے بغیر وہ جگا کو خوابیدہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی، اس کی سپاٹ آواز کمرے میں گونجی۔ ”جتنی جلدی ممکن ہو میرے ساتھ نکل چلو، اسی میں تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔“

”تم نے شاید صرف جگا کا نام سنا ہے۔ اگر پوری طرح واقف ہوتے تو......“

”فضول باتیں کبھی اطمینان سے کرلینا۔“ نو وارد طلسمی انداز میں جگا کو تیز نظروں سے گھورتا رہا، اس کی پلکیں ایک بار بھی نہیں جھپکی تھیں۔ اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھا، جگا کا ہاتھ تھامتے ہوئے بھی اس نے پستول پر کوئی توجہ نہیں دی جو جگا کے میرے ہاتھ میں موجود تھا۔

جگا بلاوجہ خون خرابے کا عادی نہیں تھا، اس کے ایک اشارے پر اس کے جاں نثار نو وارد کی تکا بوٹی کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی نہ کرتے۔ نو وارد کی جسارت جگا کے لیے ناقابل فہم تھی، اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ کامیاب نہ ہوسکا تو اس نے دوسرا ہاتھ استعمال کرتے ہوئے پستول نو وارد کی کنپٹی پر رکھ دیا، بڑے سفاک لہجے میں غرایا۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے؟“

”میں بھی تم کو یہی بات باور کرانا چاہتا ہوں۔“ نو وارد نے مشینی انداز میں جگا کے دوسرے ہاتھ پر ضرب لگائی تو پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی جگا کے لیے کسی ہارر فلم کے طلسماتی منظر سے زیادہ تعجب خیز تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود نو وارد اس کو اطمینان سے کمرے سے نکال کر باہر آیا تو دروازے پر موجود مسلح ساتھی نے جگا کو بڑی حیرت سے مخاطب کیا۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

داتا کاپو

عاشف ملک

غلطی کوئی کرے... سزا کسی اور کے حصے میں آئے... یہ تو اس جہاں کی پرانی ریت ہے اور پریت کے جھمیلوں میں ایسے معاملات ہو ہی جاتے ہیں۔ البتہ محبتوں کے حصول کے لیے ایک لمبا سفر اور لامتناہی انتظار کی اذیت اٹھانے سے پہلے اگر سوچ میں ذرا سی لچک آجائے تو بہت سے رشتوں اور جذبوں کو قرار مل جائے مگر... سوچ کی اس روش پر چلنا کب ہر ایک کے اختیار میں ہوتا ہے۔ ہوش تو تب آتا ہے جب آنکھوں میں بسنے والے چہرے خواب ہوجاتے ہیں۔

ایک وفا شعار بیوی اور ایک ماں کی ممتا کا امتحان

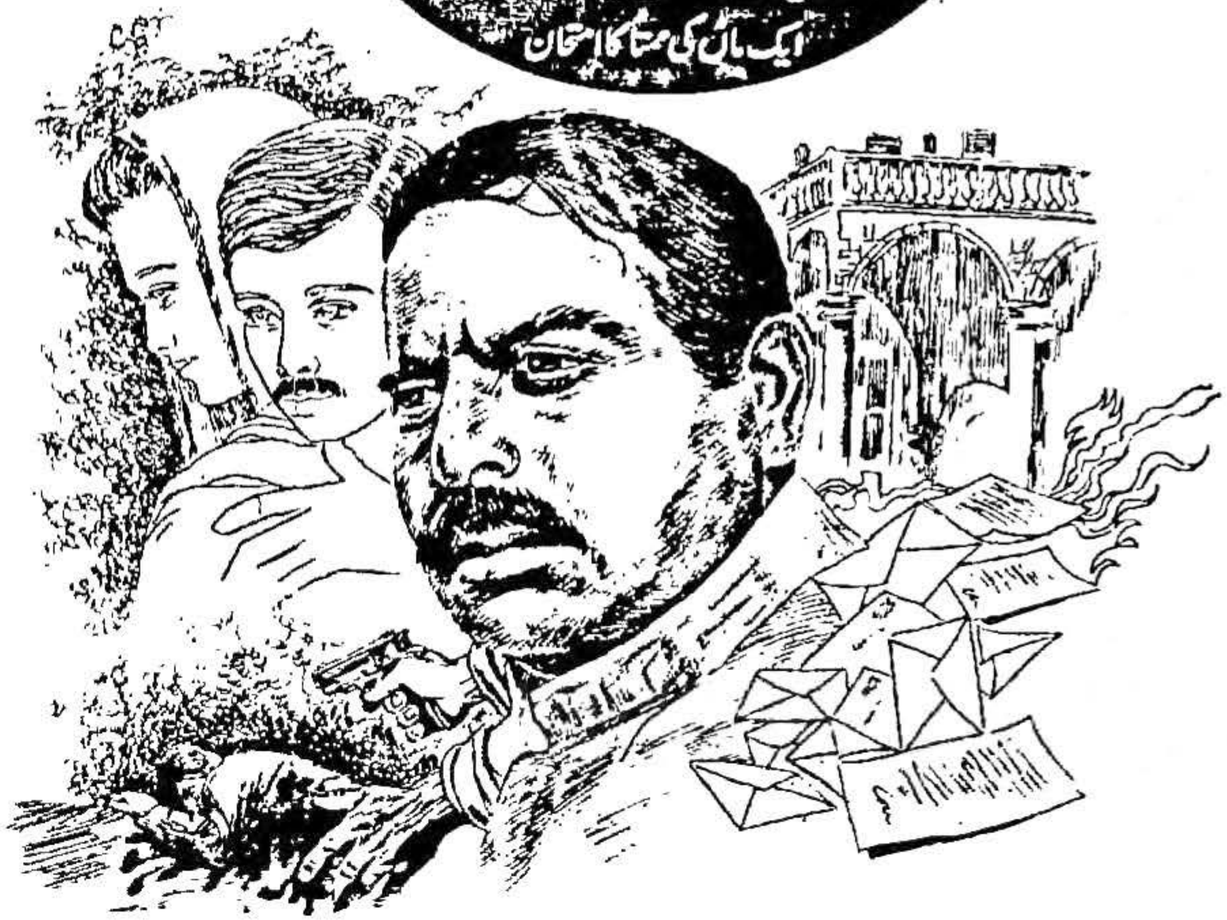

گھر کتنا ہی بڑا ہو، پیروں کی گردش کے لیے کم ہی ہوتا ہے۔ انسان کولہو کا بیل نہیں ہوتا کہ ایک دائرے میں گھومتا رہے۔ ایک کمرے سے دوسرے کی مسافت طے کرتا رہے۔ گھر تو ایک ٹھکانا ہوتا ہے۔ اس ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے اسے کئی میدان پار کرنے ہوتے ہیں۔ پرندے بھی آشیانے کی وسعت ناپتے رہنے میں دن نہیں گزارتے۔ پر کھولتے ہیں، اڑان بھرتے ہیں، ہوا میں ڈبکیاں لگاتے پھرتے ہیں۔ وجاہت اللہ خاں نے ایسی ہر مثال کو غلط ثابت کردیا تھا۔ وہ پچھلے بیس برسوں سے گھر میں بند تھے۔ شاید دو چار مرتبہ گھر کے دروازے پر کھڑے ہوکر یہ دیکھ آئے

ہوں کہ لوگ چلتے پھرتے بھی ہیں۔ پورا دن گھر میں بنی چھوٹی سی لائبریری میں گزارتے، شام کو چھت پر چلے جاتے۔ بے چینی سے ٹہلتے رہتے، خود سے باتیں کرتے رہتے اور پھر نیچے اتر آتے۔ اس وقت تک صحن میں چارپائیاں بچھ چکی ہوتی تھیں۔ ایک نوکرانی حقہ لاکر رکھ دیتی۔ ان کی بیوی جہاں آرا بیگم دوسری چارپائی پر بیٹھ جاتیں۔ کبھی کبھی دونوں کے درمیان کوئی بات ہو جاتی ورنہ حقے کی گڑگڑاہٹ ہی واحد آواز ہوتی۔

گھر کے کام کاج کے لیے ایک ملازمہ تھی اور سودا سلف لانے یا باہر کے دوسرے کام نمٹانے کے لیے ایک مرد ملازم موجود تھا جسے گھر کے دروازے کے باہر بنی ہوئی کوٹھری دے دی تھی۔ جب کوئی کام ہوتا اسے دروازے پر بلالیا جاتا۔ اسے گھر میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے نہیں کہ کسی پردے وغیرہ کا اہتمام تھا۔ گھر میں تھا ہی کون جس کے لیے پردے کھینچے جاتے۔ بیگم تھیں، وہ تو اب بوڑھی ہو چکی تھیں۔ اس پابندی کے پیچھے خان صاحب کی وہ نفسیات تھی جس کی ابتدا بیس سال پہلے ہوئی تھی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا تھا۔ انہیں مردوں سے خصوصاً نوجوان مردوں سے نفرت ہوگئی تھی حالانکہ وہ خود بھی مرد تھے۔ اس نفرت کا سبب ان کا اکلوتا بیٹا تھا جو بیس سال پہلے انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ اس کا ایک جذباتی قدم تھا۔ اس کے بعد اس نے بہت چاہا کہ وہ گھر لوٹ آئے لیکن خان صاحب نے شرط رکھ دی کہ پہلے اپنی بیوی کو طلاق دو اس کے بعد بے شک گھر لوٹ آؤ۔ اس نے بیوی کو نہیں چھوڑا، باپ کو چھوڑ دیا البتہ خط برابر لکھتا رہتا تھا۔ وجاہت اللہ خاں نے خط غائب کرنے کی حرکت کبھی نہیں کی لیکن کوئی خط کبھی پڑھا بھی نہیں۔ جب کوئی خط آتا وہ جہاں آرا بیگم کی طرف بڑھا دیتے۔

"تمہارے لاڈلے کا خط آیا ہے۔ اسے پانی میں گھول کے پی لینا۔"

"تمہارا تو جیسے وہ کوئی ہے ہی نہیں۔" جہاں آرا بیگم لفافہ جھپٹتے ہوئے کہتیں۔

"وہ اس قابل نہیں ہے کہ ہم اسے اپنی اولاد کہیں بلکہ اب تو ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ گاؤں ہی چھوڑ دیں تاکہ خط آنے کا سلسلہ بھی بند ہو۔"

"یہاں کچھ زمینیں ہیں جن کی آمدنی سے اتنا بڑا گھر چل رہا ہے۔ انہیں بھی کیا سر پر اٹھا کر لے جاؤ گے۔"

"سر پر کیوں اٹھائیں گے۔ اس سے پہلے بھی تو آخر شہر میں رہتے تھے، زمینیں یہاں تھیں۔ گھر بیٹھے رقم پہنچ ہی جاتی تھی۔"

"اس وقت کی بات اور تھی۔ آپ یہاں کے چوہدری لگا کرتے تھے۔ اب آپ میں اتنی جان ہے؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو جہاں آرا۔ اب تو یہیں مرنا جینا ہے۔ اب تم خود کو ہی دیکھ لو۔ تمہارے بیٹے کو شہر ہی نے تم سے چھین لیا۔"

"شہر نے نہیں، میرے بیٹے کو آپ نے مجھ سے چھینا ہے۔ آپ ہی اسے نہیں آنے دیتے۔ وہ تو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آنا چاہتا ہے۔"

"اگر تمہاری مامتا نے زیادہ شور مچایا تو تمہیں بھی میں اس کے پاس شہر بھیج دوں گا۔"

"مجھے جانا ہوتا تو کبھی کی چلی جاتی مگر میرے پاؤں تو آپ کے ساتھ بندھے ہیں۔"

"تو پھر پڑی رہو یہیں۔ نہ وہ یہاں آئے گا نہ تم جاؤ گی۔ اس نے مجھے اس قابل چھوڑا ہے کہ میں گھر سے باہر نکل کر کسی کو منہ دکھا سکوں۔"

"میں مانتی ہوں اس کی غلطی تھی لیکن اسے اتنی بڑی سزا تو مت دو۔"

"وہ کیا اب اس کی کوئی اولاد بھی یہاں نہیں آسکتی۔ وہ مر گیا ہے میرے لیے۔"

یہ باتیں صرف اس دن نکلا کرتی تھیں جب ان کے بیٹے کا خط آتا تھا۔ پھر سکوت طاری ہو جاتا۔ خان صاحب لائبریری میں بند ہو کر رہ جاتے۔ جہاں آرا بیگم تک کو ان سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ دو چار دن یہی ماحول رہتا، پھر رفتہ رفتہ خاموشی ٹوٹنے لگتی۔

"ذرا کتب خانے سے نکلو تو فاخرہ سے کہہ کر یہاں کی جھاڑ پونچھ کروا دوں۔"

"اچھا نکلتا ہوں، اس سے کہو میرا حقہ اٹھا کر باہر رکھ دے۔"

"پان بناؤں، کھاؤ گے؟"

"بنا دو، چونا ذرا کم لگانا، تم ہمیشہ منہ کاٹ دیتی ہو۔"

بات چیت شروع ہو جاتی۔ ان کی زمین پر کام کرنے والوں کو اجازت مل جاتی کہ وہ خان صاحب سے مل سکتے ہیں۔ کچھ دنوں زندگی کھیلتی رہتی۔ پھر ٹھوکر لگتی۔ پھر خط آجاتا۔

"تمہارے لاڈلے کا خط آیا ہے۔" باتیں پھر نکلتیں، پھر خاموشی، پھر اداسی۔

☆☆☆

وجاہت اللہ خاں ایک انا پرست انسان تھے اور یہ کیفیت ان پر ہر وقت طاری رہتی تھی۔ اسی کیفیت نے انہیں سرکاری نوکری چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا حالانکہ وہ بہت اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ترقی کے امکانات بھی بہت تھے لیکن افسروں کی ماتحتی ان کے مزاج میں نہیں تھی۔ ان کے افسر بھی ان کے مزاج کو سمجھتے تھے اور برابری کے برتاؤ سے انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن جب ایک افسر ٹرانسفر ہو کر نیا نیا آیا تو خان صاحب کی اس سے ٹھن گئی۔ استعفیٰ دیا اور گھر بیٹھ گئے۔

"کوئی ایسے چھوڑتا ہے نوکری اور وہ بھی سرکاری نوکری۔"

"اور کیا کرتا۔ سالا افسر ہو کر بزدل نکلا۔ لڑنے کی ہمت نہیں تھی، لکھ لکھ کر شکایتیں اوپر پہنچاتا تھا۔ اب میں لکھ کر تو جواب دینے سے رہا۔ میں نے استعفیٰ دے دیا۔ دشمن اگر بزدل ہو تو لڑنے کا مزہ جاتا رہتا ہے۔"

"اب کیا کرو گے؟"

"بلاسپور اچھا بڑا گاؤں ہے، وہاں جا کر رہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری زمین ہے۔ زمین کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی۔ زمین سونا اگلے گی اور تم عیش کرو گی۔"

"مجھے اپنے عیش کی پروا نہیں ہے۔ ہمارا ایک ہی تو بیٹا ہے۔ گاؤں میں رہ کر اس کی تعلیم کا کیا ہوگا؟"

"بلاس پور گاؤں نہیں ہے۔ اب تو اسے قصبے کا درجہ ملنے والا ہے۔ وہاں ایک ہائی اسکول ہے۔ ہدایت اللہ وہاں پڑھے گا۔ کالج بھی کھل ہی جائے گا۔ نہیں کھلا تو ہم اسے پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیں گے۔"

"شہر کی بات اور ہوتی ہے۔" جہاں آرا نے اتنے آہستہ سے کہا جیسے انہیں ڈر ہو کہ وجاہت اللہ خاں سن نہ لیں۔

"بس تم اس وقت تک یہاں ہو جب تک میں وہاں اچھی سی زمین دیکھ کر مکان نہ بنوالوں، میں کل جاؤں گا بلاسپور۔"

اس سے آگے جہاں آرا بیگم کی کیا ہمت تھی جو انکار کے لیے ایک لفظ بھی منہ سے نکالتیں۔ سر جھکا کر چپ ہو گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا شوہر جو بات منہ سے نکال دیتا ہے پھر بندوق کی گولی کی طرح ان کی بات واپس نہیں آتی۔ دیوار سے سر پھوڑنے سے کیا حاصل۔

دوسرے دن وجاہت اللہ خاں بلاسپور روانہ ہو گئے۔ ایک ہفتے بعد واپس آئے تو اس خوش خبری کے ساتھ آئے کہ اتفاق سے بہت اچھی جگہ زمین مل گئی ہے۔ بس دفتری کام مکمل ہوتے ہی تعمیر کا آغاز ہو جائے گا۔

مکان بن جانے کے بعد جہاں آرا بیگم پہلی مرتبہ مکان دیکھنے کے لیے بلاسپور گئیں اور مکان دیکھا تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"آپ نے تو دہلی کے بادشاہ کا قلعہ بنوالیا۔"

"ہمیں معلوم تھا کہ شاہ جہاں پور کی شہزادی یہاں اترنے والی ہے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

☆☆☆

چوہدری ملک دین اپنے ڈیرے پر تھا کہ اپنی رعایا میں تین بندوں کے اضافے کی خبر اس تک پہنچ گئی۔ اس نے اب تک کے تجربے سے یہی سیکھا تھا کہ پھن اٹھانے سے پہلے سانپ کو کچل دو۔ اس نے اپنے دو کارندے وجاہت اللہ خاں کو بلانے کے لیے بھیج دیے۔

وجاہت اللہ خاں ابھی اپنے نو تعمیر گھر کو اچھی طرح دیکھ بھی نہیں پائے تھے کہ کارندے وہاں پہنچ گئے۔ چوہدری نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ابھی نئے آنے والے کے مزاج کا کچھ پتا نہیں لہٰذا نہایت عزت سے پیش آنا۔ اس کے بعد وہ جیسے تعلقات رکھنا چاہے گا ہم اس سے اسی طرح پیش آئیں گے۔ کارندوں نے وجاہت اللہ کی خدمت میں چوہدری کا پیغام پہنچا دیا۔

"گاؤں کے چوہدری ملک دین صاحب نے آپ کو سلام پہنچایا ہے۔"

"ان سے کہنا ہم نے ان کا سلام قبول کیا اور کہنا کبھی اس طرف سے گزریں تو ہماری طرف ضرور آئیں۔"

"انہوں نے تو آپ کو بلایا ہے کہ آکر ملاقات کریں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" خان صاحب ہتھے سے اکھڑ گئے۔ "تمہارے چوہدری صاحب چل پھر نہیں سکتے؟"

"وہ تو چنگے بھلے ہیں۔"

"چنگے بھلے ہیں تو اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ پہل وہ کریں، اس کے بعد ہم بھی ملاقات کرلیں گے۔"

چوہدری کے بندے ایسی سخت بات سننے کے عادی نہیں تھے۔ تھوڑی دیر کو ان کے تیور بدلے لیکن پھر انہیں چوہدری کی ہدایت یاد آگئی۔ اتنی دیر میں خان صاحب دروازہ بند کر کے اندر جا بھی چکے تھے۔ کارندے الٹے پاؤں لوٹ گئے اور جو بات ہوئی اس میں نمک مرچ لگا کر چوہدری تک پہنچا دی۔

"آدمی ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے، ذرا پتا کرو کون ہے، کہاں سے آیا ہے، پولیس کا مخبر تو نہیں ہے؟ مجھے اس طرح

جواب دینے کی اسے ہمت کیسے ہوئی۔ یہ تو دیکھنا پڑے گا اور ہاں، میں صرف کل تک انتظار کروں گا۔ اس کے بعد میں خود جاؤں گا۔"

چودھری سانپ کی طرح بل کھا کر رہ گیا تھا لیکن اجنبی بل میں ہاتھ بھی نہیں ڈالا جاسکتا تھا۔ یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ بل میں چھپا ہوا جانور کس ہتھیار سے مارا جائے گا۔

دوسرے دن اس کے آدمیوں نے خبر لاکر دی کہ وجاہت اللہ خاں عام سا آدمی ہے۔ اس کا کسی ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی اکڑ صرف اس لیے ہے کہ وہ چودھری کو جانتا نہیں۔ ایک دو رگڑوں کے بعد راہ راست پر آجائے گا۔

چودھری نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ جیپ نکالیں۔ چار مسلح محافظوں کو ساتھ لیا اور وجاہت اللہ خاں کے دروازے پر پہنچ گیا۔ خان صاحب نے چودھری کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور نہایت عزت کے ساتھ اپنے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

"خان صاحب، اگر آپ ڈیرے پر آجاتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

"مقصد تو ملاقات تھا وہ یہاں بھی ہو رہی ہے۔"

"تم یہاں نئے ہو اس لیے اس گستاخی کو نظر انداز کر دیا اور یہ سمجھانے چلا آیا کہ یہاں کی ریت رسمیں کیا ہیں۔ بھئی یہاں کے رواج کو سمجھو گے تو یہاں رہ سکو گے نا۔"

"یہ علاقہ کیا کوئی الگ ملک ہے جو یہاں کے قوانین دوسرے ہوں گے۔ ہمیں معلوم ہے ہمیں کیسے رہنا ہے۔"

"آپ کو یہاں کوئی بھی تنگ کرے، آپ میرے پاس چلے آیئے۔ میں اپنے بندوق برداروں کو آپ کے ساتھ کر دوں گا۔"

"ان کاموں کے لیے تھانے اور عدالتیں ہوتی ہیں، چودھری کا دربار نہیں۔ ویسے دوستوں سے نہیں کہوں گا تو کس سے کہوں گا۔"

"آپ سمجھے نہیں۔ تھانے دار بھی میرے پاس آکر بیٹھتا ہے۔"

"اس میں کیا ہے۔ اب وہ میرے پاس بیٹھنے لگے گا۔"

"آپ سمجھے نہیں۔ میں چودھری ہوں نا اس لیے۔"

"چودھری صاحب۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ اب پرائیویٹ عدالتوں اور نجی جیلوں کا رواج نہیں۔"

"میں خود ان کا قائل نہیں لیکن پنچایت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"کوشش کروں گا کہ آپ کی سلطنت میں مجھ سے کوئی جرم سرزد نہ ہو۔"

"آپ ویسے ہیں سمجھ دار۔"

"پندرہ سال ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کام کر کے آیا ہوں۔ اتنی اونچ نیچ تو سمجھ میں آہی گئی ہے۔"

"پھر امید کروں کہ آپ کسی دن حویلی میں حاضری دیں گے۔ مجھے بھی تو میزبانی کا موقع دیں۔ آپ کے تو بڑے تعلقات ہوں گے، چھوٹے موٹے کام ہمارے بھی پڑتے رہتے ہیں۔"

چودھری شیر بن کر آیا تھا، لومڑی بن کر واپس جا رہا تھا۔ لومڑی اس لیے کہ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر شیر بن کر سامنے آیا تو سامنا اچھے شکاری سے ہے۔ چلی ہوئی گولی سیدھی بھیجے کے پار جائے گی۔ لومڑی کی طرح چالاکی سے کام لینا ہوگا۔

اس نے ڈیرے پر پہنچتے ہی اپنے آدمیوں کو بے نقط سنائیں۔ "تم نے یہ کیوں نہیں معلوم کیا کہ وہ کس اثر رسوخ کا آدمی ہے۔ میں نے اسے کئی سخت سست سنا دیں تب اس نے بتایا کہ وہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کام کر چکا ہے۔ اب اس سے دوستی رکھ کر اس کی کمزوریاں تلاش کرتی ہوں گی۔"

وجاہت اللہ خاں کے لیے اب ضروری ہو گیا تھا کہ وہ پولیس سے راہ و رسم پیدا کریں۔ چودھری کے تیور دیکھ کر وہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے تھے۔ انہیں اپنی اس سفارش پر بڑا ناز تھا کہ وہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کام کر چکے ہیں۔ اسی سفارش کو لے کر وہ پولیس اسٹیشن چلے گئے۔ اب یہ ان کی خوش قسمتی کہ ایس ایچ او کی تختی پر سبحان اللہ قادری کا نام لکھا ہوا تھا۔

"تمہارے صاحب سے ملنا ہے۔" انہوں نے باہر بیٹھے ہوئے ایک پولیس والے سے کہا۔

"برابر کے کمرے میں جا کر اندراج کرایئے۔ صاحب کہیں گے تو بلا لیں گے۔"

"جو میں کہہ رہا ہوں وہ سنو۔"

"یہ تھانا ہے، زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں ہے۔ صاحب ابھی کسی سے نہیں مل سکتے۔ اندر چودھری کے آدمی بیٹھے ہیں۔"

"ان سے جا کر کہہ دو وجاہت اللہ خان آیا ہے..... ورنہ پٹی اتروا دوں گا۔"

جس وقت یہ تکرار ہو رہی تھی اسی وقت کمرے کے دروازے پر پڑا ہوا پردہ ہٹا اور چودھری اور اس کے دو آدمی باہر نکلے۔ چودھری، خان صاحب کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔

"خان صاحب، اس پولیس والے سے کیوں جھگڑ رہے ہو، ہم سے کہہ دیا ہوتا۔ ہم ملوا دیتے قادری سے، یار ہے ہمارا۔"

اسی وقت ایس ایچ او کسی کام سے کمرے سے باہر نکلا اور وجاہت اللہ خاں کو دیکھتے ہی ان کی طرف لپکا۔ "ارے خان صاحب، آپ اور یہاں، بلاسپور میں؟" اس نے کہا اور ان سے لپٹ گیا۔

چودھری کی آنکھیں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو۔ تھانے دار نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وجاہت اللہ خاں جب ملازمت میں تھے تو انہوں نے کمشنر سے کہہ کر قادری کے بھائی کو پولیس میں بھرتی کرایا تھا۔ اس دن سے قادری ان کا احسان مند ہو گیا تھا۔ خان صاحب کی شخصیت اور لہجے دار باتیں بھی ایسی تھیں کہ جو ان سے ملتا متاثر ضرور ہوتا تھا۔

چھوٹی جگہوں پر ایس ایچ او بادشاہ ہوتا ہے۔ عام آدمی کی تو ہمت بھی نہیں ہوتی کہ اس سے مل سکے اور پھر جس انداز سے وہ خان صاحب سے ملا تھا، چودھری اس کا چشم دید تھا۔ اب اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خان صاحب سے دشمنی کا رشتہ جوڑتا۔ اب اسی میں عافیت تھی کہ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ وہ اپنے باغ کے تازہ پھلوں کے ٹوکروں کے ساتھ خان صاحب کے گھر پہنچ گیا اور بڑا اصرار کر کے خان صاحب کو اپنے ساتھ حویلی لے آیا۔

"خان صاحب، ایک بات بتا دوں۔ یہاں جتنے کم ذات کمینے لوگ ہیں انہیں ذرا بھی رعایت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں جتنا منہ لگاؤ گے اتنے ہی یہ ہاتھ پاؤں پھیلائیں گے۔ انہیں ہمیشہ دبا کر رکھنا، جیسے میں رکھتا ہوں۔"

"چودھری صاحب، میرے بڑوں نے ہمیشہ زمینداری کی ہے، مجھے معلوم ہے کتے کیسے سدھائے جاتے ہیں۔"

"خان صاحب، آپ تو ہمارے قبیلے کے نکلے۔"

"بس فرق یہ ہے کہ میں ظالم نہیں ہوں۔"

"آپ تو مذاق کرنے لگے خان صاحب۔" چودھری نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم بھی ظالم کب ہیں مگر رعب تو رکھنا پڑتا ہے۔"

"ظالم کا رعب زیادہ دن قائم نہیں رہتا۔"

چودھری نے پھر ہنسنا شروع کر دیا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ اسے خان صاحب کی شخصیت ہر پہلو سے دلچسپ اور پراسرار نظر آرہی تھی۔ بے تحاشا تعجب تو اسے اس وقت ہوا جب قراب آئی اور خان صاحب لاحول پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ اگر میرے سامنے یہ شغل کیا کریں گے تو سمجھو میری دوستی تو ختم۔"

"خان صاحب، میں بھی کہاں کرتا ہوں لیکن مہمانوں کی دلداری تو کرنی پڑتی ہے۔ میں سمجھا تھا آپ بڑے آدمی ہیں اس لیے ضرور پیتے ہوں گے۔"

"ارے اسے بڑے آدمی نہیں گھٹیا آدمی پیتے ہیں۔"

چودھری اس جملے کے بعد بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اس ہنسی کے پیچھے یہ مفہوم چھپا ہوا تھا کہ وجاہت اللہ وہ آدمی ہے جس سے نہ دشمنی رکھی جاسکتی ہے، نہ دوستی بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاوقتیکہ وہ خود کسی کمزوری کا مظاہرہ نہ کرے۔

وجاہت اللہ خاں کو بھی چودھری کچھ جچا نہیں تھا، لہٰذا انہوں نے بھی کسی رغبت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہاں کبھی کبھی مل جاتے تو اچھی طرح ملتے تھے۔

چودھری کے آدمیوں کے ذریعے یہ بات حویلی سے باہر نکل گئی تھی کہ وجاہت اللہ خاں نہایت بااثر آدمی ہے۔ اتنا بااثر کہ خود چودھری بھی اس سے ڈرتا ہے۔

اس اطلاع کا اثر یہ ہوا کہ عام لوگ خان صاحب کی بے پناہ عزت کرنے لگے تھے۔ خان صاحب کو بچوں سے بہت پیار تھا لہٰذا ان کا حویلی نما مکان ہر وقت بچوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ ان بچوں کے ساتھ بچہ بن کر کھیلتے رہتے تھے۔ ایک روز تو حد ہی ہو گئی۔ ایس ایچ او سبحان اللہ قادری ان سے ملنے آیا ہوا تھا، انہوں نے یہ کہہ کر اسے انتظار کرنے کو کہہ دیا کہ میں ابھی بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ کھیل ختم ہو جائے تو میں حاضر ہوتا ہوں اور کھیل ختم ہونے میں پورا ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔

جب وہ دوسرے بچوں سے اتنا پیار کرتے تھے تو ہدایت اللہ تو ان کی اپنی اولاد تھا۔ اس سے خان صاحب کا پیار ضرب المثل بن گیا تھا۔ وہ اسے پاؤں زمین پر نہیں رکھنے دیتے تھے۔ چھوٹی سی کار لے لی تھی یا پھر ان کے کندھے اس کی سواری بنتے تھے۔ اسکول چھوڑنے جاتے تو بڑی دیر تک اسکول کے باہر بیٹھے رہتے۔ ان کا جی ہی نہیں چاہتا تھا کہ آئے تو ہدایت اللہ کے ساتھ تھے اب اکیلے کیسے چلے جائیں۔ جہاں آرا کہتی بھی تھیں کہ اتنا لاڈ مت کرو، بچہ بگڑ جائے گا مگر وہ بیوی پر بگڑ جاتے تھے۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ لاڈ پیار سے کبھی کوئی نہیں بگڑتا۔ ہدایت اللہ کی سعادت مندی دیکھ کر ان کا یہ فلسفہ درست ثابت ہوتا تھا۔ ہدایت اللہ ان سے ڈرتا بھی تھا حالانکہ انہوں نے اسے کبھی نہیں ڈانٹا تھا۔

بلاسپور میں خان صاحب کے قدم جم گئے تھے۔ چودھری سے زیادہ ان کی عزت تھی بلکہ اب چودھری کے ستائے ہوئے لوگ ان کے پاس سفارش کے لیے آتے تھے۔ چودھری نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ اس کے معاملات میں دخل نہ دیا کریں لیکن خان صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ غریبوں سے انہیں خاص ہمدردی تھی۔ کسی کا قرض معاف کرانے کے لیے چودھری کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ کسی کے گھر فاقے دیکھتے تو چودھری کو مجبور کرتے کہ اس کے گھر اناج ڈلوا دیں۔

اسی طرح ایک طویل سفر کٹ گیا۔ ان کے بیٹے ہدایت اللہ نے میٹرک پاس کرلیا۔ اس وقت تک یہاں کالج کھل گیا تھا۔ ہدایت اللہ کو انہوں نے کالج میں داخل کرا دیا۔

یہ کالج صرف انٹر تک تھا۔ دو سال پورے کرنے کے بعد انہوں نے ہدایت اللہ کو پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا۔ کہاں تو بیٹے کی جدائی انہیں پل بھر کے لیے گوارا نہیں تھی اور اب وہ پانچ سال کے لیے جا رہا تھا۔ اسے ان کی نظروں سے دور ہاسٹل میں رہنا تھا۔ خان صاحب کی حالت اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ ہدایت اللہ انہیں سمجھا رہا تھا، احباب سمجھا رہے تھے کہ شہر دور ہی کتنا ہے۔ بیرون ملک تو پڑھنے کے لیے نہیں جا رہا ہے۔ چھٹیوں میں آتا رہے گا۔ تم جا کر اس سے ملتے رہو گے۔ اب ہدایت اللہ بڑا ہوگیا ہے۔ اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے مگر خان صاحب مچل رہے تھے کہ وہ ہدایت اللہ کو روز کیسے دیکھا کریں گے۔

"اگر تمہیں جدائی گوارا نہیں تو مت بھیجو پڑھنے کے لیے۔" جہاں آرا نے ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنی طرح تم چاہتی ہو تمہارا بیٹا بھی جاہل رہے۔ ارے تم کیا جانو پڑھائی کی قدر۔ اللہ بخشے تمہارے باپ کون سے پڑھے لکھے تھے۔"

"تمہارے باپ تو بی۔ اے، ایم۔ اے تھے۔"

"وہ نہیں تھے مگر ہدایت اللہ کا باپ تو پرانے وقتوں کا بی اے ہے۔ وہ ضرور پڑھے گا۔"

"پھر اس کے جانے پر آنسو کیوں بہا رہے ہو؟"

ہدایت اللہ پڑھنے کے لیے شہر چلا گیا۔ وجاہت اللہ خاں نے اپنا عہد پورا کیا۔ اس دن کے بعد سے کسی نے انہیں روتے ہوئے نہیں دیکھا مگر اتنا تھا کہ ہر تیسرے چوتھے دن سامان باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ "ہم جا رہے ہیں ہدایت اللہ سے ملنے۔" جہاں آرا یاد دلاتیں، ابھی دو دن پہلے تو ہو کر آئے ہو۔ خان صاحب بھڑک اٹھتے، تمہارے خاندان میں بیٹے ہوتے ہی کہاں تھے، ہر گھر میں بیٹیوں کی لائن لگی ہوتی تھی۔ تم کیا جانو بیٹے کی محبت۔ ایک مرتبہ پھر دونوں میں جھڑپ ہوتی اور خان صاحب بیٹے سے ملنے شہر پہنچ جاتے۔ جہاں آرا اپنی مامتا کی آنکھیں صرف اس وقت ٹھنڈی کرتیں جب چھٹیوں میں ہدایت اللہ گھر آتا۔

ہدایت اللہ کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ چھ مہینے بعد وہ انجینئر بن کر لوٹنے والا تھا۔ اس مرتبہ وہ گھر آیا تھا تو اس نے یہ مژدہ سنا دیا تھا۔ خان صاحب نے بہت دنوں بعد اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ ہے میرا پوت۔ انجینئر بن کر لوٹے گا، انجینئر بن کر۔"

اس وقت رات بہت بیت گئی تھی لیکن خان صاحب کروٹیں لے رہے تھے۔ یہ حالت ان کی صرف اسی وقت ہوتی تھی جب کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو ورنہ تو نیند ان سے پہلے ان کے بستر پر پہنچ جاتی تھی۔

نیند کسی صورت نہیں آئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ دوسرے پلنگ پر جہاں آرا بے خبر سو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر ساکت بیٹھے رہے۔ پھر بیوی کو آواز دی۔ آواز کا اثر نہیں ہوا تو انہوں نے جہاں آرا کی کلائی پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"کیا ہوا ہدایت کے ابا۔"

"بیٹے کے آنے میں تین مہینے رہ گئے ہیں اور تم آرام سے پڑی سو رہی ہو۔"

"اسے آنے تو دو۔ پھر اس کے ساتھ جاگتی رہوں گی۔"

"سنو تو۔ میری بات تو سنو۔"

"سناؤ۔" اب وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"بیٹا انجینئر بن کر آ رہا ہے۔ اس کی شادی کے لیے بھی کچھ سوچو۔"

"توبہ ہے۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ ابھی اسے آنے تو دو۔ کہیں نوکری تو لگنے دو۔ لڑکی بھی دیکھ لیں گے۔"

"اس کی شادی کیا نوکری کی وجہ سے رکی رہے گی۔ وہ کسی فقیر کا بیٹا نہیں ہے۔ شادی کے دوسرے دن وہ دفتر چلا جائے۔ تمہیں اچھا لگے گا۔ بھئی شادی کر کے سال دو سال مزے کرے گا۔ پھر نوکری کرے گا۔"

"آپ کی تو ہر معاملے میں منطق الٹی ہے۔"

"میرے پاس جو وکیل صاحب آتے ہیں تم نے ان کی بیٹی کو دیکھا ہے۔"

"ہاں، ایک مرتبہ دیکھا تو ہے۔"

"تم نے غور بھی نہیں کیا ہوگا۔ کل میرے ساتھ چلو۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں ہدایت کے لیے وکیل صاحب سے بات کرلوں گا۔"

جہاں آرا جانتی تھیں کہ وہ جو کہہ دیتے ہیں پتھر کی لکیر ہوتا ہے، اس لیے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ دوسرے دن وکیل صاحب کے گھر پہنچ گئیں۔ لڑکی دیکھی تو واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دیکھتے ہی دل میں اتر گئی۔ میرے ہدایت کے لیے اس سے اچھی لڑکی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اب وہ بھی خان صاحب کی ہم خیال تھیں۔ انہوں نے خان صاحب کو مشورہ دیا کہ شادی یا منگنی تو ہدایت کے آنے کے بعد ہی ہوگی۔ وکیل صاحب سے پہلے ان کا عندیہ معلوم کرلیا جائے کہ وہ تیار بھی ہیں۔ زندگی میں پہلی بار جہاں آرا کی بات خان صاحب کی سمجھ میں آئی، ورنہ وہ تو منگنی بیاہ سب ابھی کرنے کو بے تاب تھے۔

وجاہت اللہ خان دوسرے دن پھر وکیل صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ کوئی بات ڈھکے چھپے انداز میں کہنے کے عادی تو تھے نہیں، بیٹھتے ہی مطلب پر آ گئے۔

"تم کہو گے میں کل تو آیا تھا آج پھر آ گیا۔ تو بات یہ ہے کہ کل ہم آئے تھے ایک نظر عارفہ بیٹی کو دیکھنے اور آج آئے ہیں یہ بتانے کہ ہم نے اسے بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"خان صاحب۔ ذرا وضاحت سے بتایئے۔"

"وکیل میاں، تم نے ہمارے بیٹے ہدایت اللہ کو تو دیکھا ہوگا۔"

"جی ہاں، کوئی ایک مرتبہ۔ ماشاءاللہ بہت پیارا بیٹا ہے۔"

"وہ انجینئر بن گیا ہے اور آنے والا ہے۔ ہم چاہتے ہیں اسے کوئی تحفہ دیں اور وہ تحفہ ہوگی عارفہ۔ آتے ہی ہم اس کی شادی عارفہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ بتایئے آپ کو منظور ہے؟"

"خان صاحب، یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی لیکن اسے آنے تو دیجیے۔ اس کی رضامندی بھی تو لیجیے۔"

"کمال ہے۔ اس کی کیا رضامندی۔ وہ کوئی ہمارے حکم سے باہر تھوڑی ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے، میرا۔ اس نے آج تک میرا حکم نہیں ٹالا اور پھر عارفہ جیسی لڑکی اس الو کے پٹھے کو کہیں اور ملے گی؟"

وکیل صاحب نے ہنس کر ہامی بھر لی۔ "مجھے منظور ہے خان صاحب۔"

ان کی طرف سے اجازت مل گئی تو خان صاحب نے باقاعدہ مٹھائی، ہار پھول وغیرہ خریدے اور بیوی کے ساتھ جا کر باقاعدہ رشتہ طے کر آئے۔ طے ہوا کہ ہدایت اللہ کے آنے کے ایک ہفتے بعد نکاح ہو جائے گا، رخصتی سہولت دیکھ کر کسی وقت کرلی جائے گی۔

تین مہینے، کئی مہینوں کی طرح گزرے بالآخر ایک دن ہدایت اللہ آ گیا۔ خان صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے لیے کیا کریں، اسی دن شام کو وہ اسے لے کر وکیل صاحب کے گھر بھی چلے گئے لیکن اسے بتایا کچھ نہیں تھا۔

وکیل صاحب کے گھر ظاہر ہے ان کی غیر معمولی خاطر مدارات ہوئی۔ ان لوگوں نے عارفہ کو بھی سامنے کر دیا تاکہ ہدایت اللہ دیکھ لے۔

خان صاحب واپس گھر پہنچے تو انہوں نے ہدایت اللہ سے پوچھا۔ "برخوردار، وہ جو لڑکی تم نے وہاں دیکھی، کیسی لگی؟"

"ٹھیک ہے ابا۔"

"بس ٹھیک ہے۔ اچھی نہیں ہے؟"

"اچھی ہے۔"

"ابے اچھی نہیں ہے، بہت اچھی ہے۔"

"جی ہاں بہت اچھی ہے۔"

"میں نے وکیل صاحب سے بات کرلی ہے۔ ایک ہفتے بعد تمہارا نکاح ہو جائے گا۔"

"جی ابا۔"

"ابے کیا جی، جی لگا رکھی ہے۔ تمہیں ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔"

"ہوئی ہے، بہت خوشی ہوئی ہے لیکن ابھی تو مجھے اچھی سی نوکری ڈھونڈنی ہے۔"

"ڈھونڈ لینا وہ بھی۔ ایک ہفتے بعد نکاح ہے۔"

"جی ابا۔"

"جاؤ گھومو پھرو۔ پھر تو ہماری طرح بیوی کے قدموں میں بیٹھ جاؤ گے۔"

اسے کہاں گھومنا تھا، وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ کئی مرتبہ ہمت کی کہ انکار کر دے۔ جو حقیقت ہے وہ باپ پر ظاہر کر دے۔ باپ سے نہیں کہہ سکتا تو ماں ہی کو بتا دے لیکن خان صاحب کا رعب ایسا تھا کہ ہدایت کی زبان پر تالے پڑ گئے۔ ماں سے بھی وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ ماں سے کہنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ بات باپ تک پہنچتی اور پھر جو قیامت آتی اس کا سامنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے بھی بچپن

سے یہی دیکھا تھا کہ خان صاحب نے جو کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی تھی۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے وہ اپنی بات منوا کر رہتے تھے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ عارفہ سے نکاح ہوگا تو ہوگا۔ ماں سے یا کسی سے کچھ کہنا فضول تھا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ وہ وکیل صاحب سے بات کرے لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکا اور وہ رات آ گئی جس کی صبح اسے برات لے کر وکیل صاحب کے گھر جانا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے غور کیا۔ وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا کہ ایک طرف جاتا تھا تو گھر چھوڑنا پڑتا تھا، دوسری طرف جاتا تو غزل سے بے وفائی کا مرتکب ہوتا۔ غزل وہ لڑکی تھی جس سے اس کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ ان پانچ برسوں میں ان دونوں نے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ وہ غزل سے یہ کہہ کر گاؤں آیا تھا کہ اپنے والدین سے اس کا ذکر کرے گا بلکہ انہیں مجبور کرے گا کہ وہ رشتہ لے کر آئیں۔ وہ یہ ذکر کر بھی چکا ہوتا لیکن درمیان میں عارفہ آ گئی۔ اب اگر وہ غزل کا تذکرہ کرتا تو خان صاحب عارفہ پر اسے ترجیح نہ دیتے کیونکہ عارفہ ان کی پسند تھی۔ اب یا تو غزل کو چھوڑ جائے یا عارفہ کو۔ عارفہ کو چھوڑنے کا مطلب تھا ماں باپ کو چھوڑنا۔ اس نے سوچا ماں باپ ہمیشہ کے لیے کہاں چھوٹتے ہیں۔ شہر جا کر غزل سے شادی کر لوں گا۔ کچھ دن ناراضی رہے گی پھر واپس چلا آؤں گا۔ اس موقعے پر وہ یہ بھول گیا کہ اس کے باپ وجاہت اللہ خاں ہیں۔ وہ رات کو کسی وقت اٹھا اور گھر سے نکل کر اسٹیشن پہنچ گیا۔

وجاہت اللہ خاں اور جہاں آرا صبح سو کر اٹھے تو ہدایت اللہ غائب تھا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھتے رہے کہ صبح صبح اٹھ کر کسی دوست کی طرف چلا گیا ہوگا لیکن جب دوپہر ہوئی تو تشویش لازمی تھی۔ چند ہی گھنٹے رہ گئے تھے کہ اسے دلہا بننا تھا۔ جہاں آرا نے اس کے کمرے میں جا کر دیکھا تو اس کا سوٹ کیس بھی نہیں تھا۔ کچھ کچھ انہیں شک ہوا کہ کہیں چلا گیا ہے۔ پھر ان کی نظر اس کے سرہانے رکھے ایک پرچے پر پڑی۔

''یہ پرچہ اس کے بستر سے ملا ہے۔ ذرا پڑھیے تو۔'' انہوں نے باہر نکل کر خان صاحب کی طرف کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔

خان صاحب نے پرچہ پڑھا اور پھر گالیوں کا فوارہ ان کے منہ سے نکلا۔ ''الو کے پٹھے نے لکھا ہے وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے اس لیے عارفہ سے شادی نہیں کر سکتا۔ شہر جا کر اس لڑکی سے شادی کرے گا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔''

''ہائے میں مر گئی۔ میرا بچہ۔''

''وہ بچہ نہیں ہے، سور کا بچہ ہے۔ میرا خون ہی نہیں ہے وہ۔ مت رو اس کے لیے۔''

''کیوں نہ روؤں۔ میرے بیٹے کو چار دن بھی تم نے میرے پاس رہنے نہیں دیا۔''

''اور اب ایک دن کے لیے بھی وہ یہاں نہیں آ سکتا۔ یہ دروازے ہمیشہ کے لیے اس پر بند ہو چکے۔''

''میں جب تک اس گھر میں ہوں وہ آئے گا۔''

''میری موچھیں نیچی کرا کے چلا گیا۔ اس کا تمہیں دکھ نہیں؟ بزدل نکلا وہ۔ بزدلوں کے لیے میرے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ صاف انکار کر دیتا۔ مجھے اس کا دکھ نہیں دکھ ہے تو یہ ہے کہ میرا بیٹا اور بزدل..... تف ہے تجھ پر ہدایت اللہ۔''

''میں کہتی ہوں ابھی شہر جاؤ اور اسے منا کر لے آؤ۔''

''شہر کوئی یہاں رکھا ہے۔ میں اس بڑھاپے میں کہاں جاتا پھروں گا۔''

''آپ جاتے ہی تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن جاتے تھے۔''

''اس وقت میرا بیٹا شہر میں رہتا تھا۔ شہر مجھے قریب نظر آتا تھا۔ اب کس کے لیے کالے کوس چل کر جاؤں گا۔''

انہوں نے یہ بات اس دکھ سے کہی کہ جہاں آرا بیگم پچھاڑ کھا کر بستر پر گر گئیں۔ خان صاحب بھاگے اور پانی لا کر جہاں آرا کے منہ پر چھینٹے دیے۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ گئیں اور پھر رونے لگیں۔ خان صاحب بیوی کی گردن ہاتھوں پر رکھے بیٹھے تھے اور تسلیاں دے رہے تھے۔

''فکر کیوں کرتی ہو ہدایت کی ماں۔ وہ ناراض ہو کر چلا گیا ہے، لوٹ آئے گا۔''

''وہ نہیں آئے گا۔ وہ بھی ضد کا پکا ہے۔ آخر بیٹا کس کا ہے۔''

''نہیں بھی آیا تو جہاں بھی ہوگا خوش تو ہوگا۔''

''مجھے میرا بیٹا چاہیے۔''

''وہ نامعقول بھی اگر یہ سوچ لیتا تو کیا بات تھی۔''

یہ باتیں ہی ایسی تھیں کہ دونوں کو خیال ہی نہ آیا کہ شام ہو گئی ہے اور برات لے کر وکیل صاحب کے گھر جانا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

''ٹھہریے، میں دیکھتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر دروازے پر گئیں۔ دیکھا تو سامنے وکیل صاحب کھڑے تھے۔ دل دھک سے رہ گیا۔ اب انہیں یاد آیا کہ انہیں تو بیٹے کی برات لے کر جانا تھا۔

''بھابی، تمام مہمان آ چکے ہیں۔ آپ لوگوں کا انتظار ہو رہا ہے۔ میں پوچھنے آیا ہوں آپ لوگوں کو اور کتنی دیر لگے گی؟''

''شاید بہت دیر لگ جائے۔''

''میں سمجھا نہیں بھابی۔''

''آؤ، اندر آ کر خود دیکھ لو۔''

وہ اندر آئے تو عجیب احوال دیکھا۔ وجاہت اللہ خاں فرش پر بیٹھے تھے۔ کرتہ گریبان سے دامن تک چاک تھا۔ بال بکھرے ہوئے، آنکھیں سرخ انگارہ۔

''خان صاحب، خیریت تو ہے، یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟''

''وکیل میاں، پہلے تو اپنے پاؤں کی جوتی اتاریے اور ہمارے سر پر تڑاتڑ برسائیے، اس کے بعد ہم بتائیں گے کہ خیریت ہے یا نہیں۔''

''خان صاحب۔'' وکیل صاحب نے گھبرا کر جہاں آرا کی طرف دیکھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کی شان میں ایسی گستاخی اور میں کروں گا۔''

''وکیل صاحب، میں اسی قابل ہوں۔ مجھے میری اوقات یاد دلایئے۔ بہت اکڑتا پھرتا تھا، نکل گئی سب اکڑ۔''

اس میں اب کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ خان صاحب کا دماغ چل گیا ہے۔ وکیل صاحب نے جہاں آرا سے حقیقت جاننے کی کوشش کی۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن بول نہیں سکیں۔ دوپٹے سے چہرہ چھپا کر سسکنے لگیں۔ اب وکیل صاحب پریشان تھے کہ پوچھیں تو کس سے پوچھیں۔ وہ ایک مرتبہ پھر خان صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

''کچھ پتا تو چلے ہوا کیا ہے؟''

''ہونا کیا تھا، ہم نے جس آدمی سے تمہاری بیٹی کا رشتہ طے کیا تھا، وہ رات سے غائب ہے۔''

''غائب ہے؟''

''ہاں، وہ مردود کسی اور سے محبت کرتا تھا۔ یہاں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ایک پرچہ چھوڑ گیا ہے۔ تم بھی پڑھ لو۔'' پرچہ ابھی تک خان صاحب کی مٹھی میں دبا ہوا تھا، وہ پرچہ انہوں نے وکیل صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ ''وکیل میاں، اب میں تو گھر سے باہر نکل نہیں سکتا تھا اور نہ لوگ کہتے، یہ وہ شخص ہے جس کے بیٹے نے بدعہدی کی۔ میرے منہ پر لوگ تھوکتے، میں کیسے تمہاری طرف آتا اور یہ بتاتا۔''

وکیل صاحب نے اس پرچے کو پڑھا اور ان کا لہجہ بدل گیا۔ ''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ پہلے اپنے بیٹے سے پوچھ لو مگر آپ نہیں مانے۔ میری عزت آپ نے خاک میں ملوا دی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے اور آپ کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے نافرمان بیٹے کی کہانی دن میں کسی وقت آ کر سنا دیتے۔ آپ کے نزدیک دوسرے کی عزت، عزت ہی نہیں۔''

''میں نے آپ سے کہا تو، میں گھر سے کیسے نکلتا۔ اب میں گھر سے نکل ہی نہیں سکتا۔''

''میں بیٹی کا باپ نہ ہوتا تو اسی وقت آپ کا منہ توڑ کر چلا جاتا۔ آپ کا بیٹا نہیں، آپ ہی خراب ہیں۔ اتنا بڑا فیصلہ آپ نے خود کر لیا۔ بیٹے سے پوچھا تک نہیں۔''

وکیل صاحب جا چکے تھے۔ دونوں میاں بیوی خاموش تھے جیسے دو مردے بیٹھے ہوں۔ آخر وجاہت اللہ خاں نے زندہ ہونے کا ثبوت دیا مگر آواز زندہ نہیں تھی۔

''دیکھا جہاں آرا بیگم۔ دو پیسے کا وکیل میری کیسی بے عزتی کر کے گیا ہے۔ کس وجہ سے؟ میرے بزدل بیٹے کی وجہ سے۔ وہ کم بخت اگر میرے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا ہوتا تو میں وکیل کے سامنے سر جھکائے نہ بیٹھا ہوتا۔ اسی وقت کہہ دیتا، بھئی اپنی بیٹی رکھ سنبھال کے۔ ہم شہر جا رہے ہیں اپنے بیٹے کی دلہن لانے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ کٹ گئی ناک وجاہت اللہ خاں کی۔ کیا اب بھی کہو گی، شہر جاؤں اس بزدل کو منانے کے لیے؟''

''میں تو وہی چاہوں گی جو آپ چاہیں گے۔''

''تو پھر سن لو۔ ہدایت اللہ خاں پر یہ دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔ وہ مر جائے تو مجھے اطلاع مت دینا۔''

وہ تو یہ بات کہنے کے بعد نہایت اطمینان کے ساتھ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور جہاں آرا وہیں بیٹھے بیٹھے سسکنے لگیں۔ بیٹا بھی یاد آ رہا تھا اور سہاگ کی بے عزتی کا بھی احساس تھا۔

کچھ دنوں بعد ہدایت اللہ کا خط آیا۔ اس نے شادی کر لی تھی اور اپنی اس حرکت پر معافی چاہی تھی۔ جہاں آرا بیگم کی آنکھوں میں جو آنسو بچ گئے تھے وہ اس خط کو پڑھ کر بہہ گئے۔

وجاہت اللہ خاں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اس دن کے بعد سے کسی نے انہیں گھر سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جسے ملنا ہوتا ان سے آ کر مل لیتا تھا۔ کبھی کبھی چودھری بھی آ نکلتا اور ہدایت اللہ کے خلاف انہیں مزید بھڑکا کر چلا جاتا تھا۔ اب وہ جہاں آرا سے بھی کم ہی بات کیا کرتے تھے۔

ہدایت اللہ کا پھر خط آیا تھا۔ اس نے پھر معافی مانگی تھی

اور اجازت چاہی تھی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ گاؤں چلا آئے۔ جہاں آرا نے بہت ضد کی کہ خان صاحب بیٹے کو معاف کردیں اور اسے گھر آنے کی اجازت دے دیں لیکن وہ گھر ہی کے نہیں، دل کے دروازے بھی بند کر چکے تھے۔ ہدایت اللہ کے خط آتے رہے۔ ہر خط میں وہ گھر آنے کی ضد کررہا تھا لیکن خان صاحب کی اجازت نہیں تھی۔

خان صاحب کی ضد نے بیس برس گزار دیے۔ جہاں آرا بیگم کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہدایت اللہ کے ایک بیٹا ہوا ہے اور پانچ سال بعد بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ وہ ہر سال حساب لگاتی تھیں کہ پوتا اب اتنا بڑا ہوگیا ہوگا۔ پوتی کی عمر اتنی ہوگئی ہوگی۔ اب انہیں بیٹے سے زیادہ پوتے اور پوتی کو دیکھنے کی خواہش تھی۔

''ہدایت کے ابا، اب تو بیٹے کا قصور معاف کردو، برسوں گزر گئے۔ نہ جانے کیسا ہوگیا ہوگا میرا بیٹا۔''

''مجھ سے اس کی سفارش مت کیا کرو۔''

''اس کے بچوں کا کیا قصور، میں مرنے سے پہلے اپنے پوتے پوتی کو تو دیکھ لوں۔ اب تو جوان ہوگئے ہوں گے ماشاءاللہ۔''

''اصل رقم ہی ڈوب گئی تو سود کیسا۔''

وجاہت اللہ خان کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھے۔ مگر وہ لوہے کی بنی ہوئی نہیں تھیں۔ اعصاب کمزور پڑ گئے تھے۔ خان صاحب کی حالت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔ اکیلے میں روتے تھے اور بیوی کو دیکھتے ہی آنسو پونچھ لیتے تھے۔ فیصلے میں اور سختی آجاتی کہ کہیں کمزوری ظاہر نہ ہوجائے۔

''اے ہدایت کے ابا۔ میں کہوں بہت دن ہوگئے، ہدایت کا خط نہیں آیا۔''

''تھک گیا ہوگا۔ کب تک لکھے گا خط۔ سمجھ میں بات آگئی ہوگی کہ وجاہت اللہ خاں سے ٹکرانے کا مطلب کیا ہے۔''

''تم کیسے باپ ہو، دل میں ذرا بھی رحم نہیں۔''

''بزدلوں کے لیے میرے دل میں کوئی رحم نہیں۔''

''وہ تمہاری اولاد ہے۔''

''میں بھی یہی سمجھتا تھا مگر اس نے خود سمجھا دیا کہ میں اس کا باپ نہیں ہوں۔''

''یہ یاد رکھو، مٹانے سے ہاتھ کی لکیریں مٹ نہیں جاتیں۔''

جب وہ غصے میں ہوتی تھیں تو ہدایت کے ابا کہنے کے بجائے خان صاحب کہنے پر اکتفا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ اتنے غصے میں تھیں کہ زندگی میں پہلی بار انہوں نے خان صاحب سے سچ مچ لڑائی کی اور جو منہ میں آیا کہتی چلی گئیں۔ خان صاحب، جو لڑائی شروع ہوتے ہی ان کے خاندان کو سنانے پر اتر آتے تھے، اس دن بالکل خاموش تھے۔

ابھی جہاں آرا کا غصہ کم نہیں ہوا تھا کہ خط آگیا۔

''تمہارے لاڈلے کا خط آیا ہے۔'' خان صاحب نے لفافہ ان کی طرف اچھال دیا۔

''پڑھ کر نہیں سناؤ گے؟'' انہوں نے خان صاحب کو منانے کے لیے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ خان صاحب نے ان کی طرف دیکھا، لفافہ چاک کرلیا۔ یہ بھی ایک انہونی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی خط کو نہیں پڑھا تھا۔ جہاں آرا بیگم محلے کے کسی بچے کو بلا کر پڑھوا لیتی تھیں۔

خان صاحب نے خط نکال کر ایک نظر ڈالی اور خط دوبارہ جہاں آرا کے ہاتھ میں دے دیا۔ ''میں نے اس سے پہلے کوئی خط پڑھا ہے جو، اب پڑھوں گا۔ کسی کو بلا کر پڑھوا لو۔'' انہوں نے کہا اور لائبریری میں جا کر دروازہ بند کرلیا۔ جہاں آرا بیگم کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ دل ہی دل میں بیٹے کو مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں مگر ناک ایسی عزیز ہے کہ کبھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ سمجھتے ہیں ایک یہی پڑھے لکھے ہیں، میں ابھی کسی بچے کو بلاتی ہوں۔ دروازے پر جا کر ایک بچے کو آواز دی، ذرا یہ خط تو پڑھ دے۔ میرے بیٹے کا خط آیا ہے۔

بچے نے خط پڑھنا شروع کیا۔ یہ خط ہدایت اللہ نے نہیں اس کی بیوی نے لکھا تھا۔ ابھی بچے نے آدھا خط پڑھا تھا کہ جہاں آرا نے ایک دل دوز چیخ ماری اور لائبریری کی طرف بھاگیں۔ دروازے پر جا کر جھول گئیں اور ہاتھوں کے بجائے اپنے سر سے دروازہ پیٹ ڈالا۔ خان صاحب کو معلوم تھا، تھوڑی دیر میں کیا ہونے والا ہے۔ دروازے سے لگے بیٹھے تھے۔ اٹھے اور دروازہ کھول دیا۔

''میرا بچہ، میرا ہدایت۔ سنتے ہو میرا بچہ مرگیا۔ تمہاری ضد نے اسے مار دیا۔ تم نے اپنی قسم دے دی تھی ورنہ میں خود جا کر اسے دیکھ آتی۔ میں اسے دیکھ بھی نہیں سکی اور وہ مرگیا۔''

خان صاحب نے جہاں آرا کو اپنی چوڑی چھاتی میں چھپالیا۔ ان کے اندر کا انسان ہار گیا تھا۔ ان کے بہتے ہوئے آنسو اعلانِ شکست کررہے تھے۔

شکست کی آواز ان کے کانوں میں بھی آرہی تھی لیکن اپنا لشکر پیچھے ہٹانے کو تیار نہیں تھے۔ بس اتنا ہوا تھا کہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے بیوی کی پیٹھ تھپتھپا رہے تھے۔

جہاں آرا روتے روتے تھک گئیں تو خان صاحب نے قریب کھڑی ملازمہ کو للکارا۔ ''کھڑی کھڑی دیکھ کیا رہی ہے۔ دوڑ کے جا، پانی لے کر آ۔''

جہاں آرا نے پانی پیا۔ کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو خان صاحب کے پیروں پر گر گئیں۔ ''مجھے شہر لے کر چلو۔ اپنے بیٹے کو تو دیکھ نہیں سکی۔ یتیم پوتے کو تو دیکھ آؤں۔''

''چلیں گے، چلیں گے۔ ذرا دل ہلکا ہوجائے پھر چلیں گے۔''

جہاں آرا نے ان کی آنکھوں میں ابھرنے والے آنسو دیکھ لیے تھے۔ بیٹے کا سارا غم بھول گئیں۔ یہ پچھتاوا ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔

رات ہوئی اور خان صاحب بستر پر لیٹے تو پاؤں دبانے کے بہانے جہاں آرا بھی آبیٹھیں۔

''پھر کب چل رہے ہو؟''

''کہاں؟''

''شہر چلو، بہو سے تعزیت نہیں کرو گے؟''

''جہاں آرا بیگم، اب کیا کرو گی وہاں جا کر جب بیٹا ہی نہ رہا۔'' خان صاحب نے پھر قلابازی کھائی۔

''بیٹے کی نشانیاں تو ہیں، انہیں دیکھ لوں گی۔''

''سو جاؤ جہاں آرا بیگم۔ جس بہو نے ہمارا بیٹا ہم سے چھین لیا، ہم اسے دیکھنے جائیں۔''

جہاں آرا بیگم ضد کرتی رہیں لیکن خان صاحب کے خراٹوں نے ان کا حوصلہ توڑ دیا۔ خاموشی سے اتریں اور اپنے بستر پر آگئیں۔ سونے کے لیے آئی تھیں، صبح تک جاگتی رہیں۔

جہاں آرا جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ کوئی اور عورت ہوتی تو میاں کے روکنے کے باوجود بیٹے سے مل چکی ہوتی لیکن انہوں نے سہاگ پر بیٹے کو قربان کردیا تھا۔ اب بھی وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ اگر شوہر کی حکم عدولی ہی کرنی تھی تو بیٹے کی زندگی میں کرتیں۔ خان صاحب ٹھیک کہتے ہیں، میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔ ہدایت تو وہاں ہوگا نہیں۔

کچھ دن بعد پھر خط آیا۔ یہ خط بھی ان کی بہو کی طرف سے تھا۔ انہوں نے لکھا تھا، بچے کہتے ہیں انہوں نے اپنے دادا دادی کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میرے سسر سے کہیے گا اب غصہ تھوک دیں اور بچوں کو موقع دیں کہ وہ آکر آپ لوگوں کو دیکھ لیں۔ ہدایت یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر کسی وقت ان کے والد کا غصہ کم ہوجائے اور وہ آنے کی اجازت دے دیں تو تم ان کے پاس جا کر رہنا۔ میں نے جو زخم انہیں دیے ہیں تم ان پر مرہم رکھنا۔ مجھے آپ لوگوں کو دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے۔ کیا آپ مجھے بلائیں گی۔

جہاں آرا کا پیمانۂ صبر ایک مرتبہ پھر لبریز ہوگیا۔ انہوں نے خان صاحب کو مجبور کرنا شروع کردیا کہ وہ ان کے پوتے پوتیوں کو بلالیں۔

وہ دیکھ رہی تھیں کہ خان صاحب میں اب وہ پہلی جیسی اکڑ نہیں رہ گئی ہے۔ وہ انکار کر ضرور کررہے ہیں لیکن اس انکار میں اب وہ شدت نہیں رہی ہے۔ وہ تقاضے کرتی رہیں اور پھر خان صاحب کی زبان سے ہاں نکل گئی۔

''تم اگر چاہتی ہو تو بلالو لیکن میں ان میں سے کسی سے بات نہیں کروں گا۔''

''ہاں تم مت کرنا۔ میں ان سے باتیں کرنے کے لیے بہت ہوں۔ میرا پوتا ہوگا، میری پوتی ہوگی، ہدایت کی دلہن ہوگی۔ پھر مجھے تمہاری پروا نہیں ہوگی۔ پڑے رہنا اکیلے۔''

''تم تو چاہتی یہی ہو۔ جیسے تمہارے باپ اکیلے پڑے رہتے تھے، میں بھی پڑا رہوں۔ تمہارا تو یہ خاندانی کھیل ہے۔''

جہاں آرا مسکراتی ہوئی ان کے سامنے سے ہٹ گئیں۔ بہت دنوں بعد انہوں نے جہاں آرا کو خاندان کا طعنہ دیا تھا۔ جب وہ پیار کی لڑائی لڑا کرتے تھے تو ایسے ہی طعنے دیا کرتے تھے۔

جہاں آرا بیگم نے خط لکھ دیا کہ تم پر اس گھر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ جب جی چاہے بچوں کو لے کر چلی آؤ۔

اسی دن سے انہوں نے گھر کو سجانا شروع کردیا۔ محلے کے بچے ان کی مدد کے لیے ہر وقت حاضر تھے۔ جہاں آرا کی ہڈیوں میں پھر سے طاقت آگئی تھی۔ خان صاحب بڑی دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

تانگا دروازے پر آکر رکا۔ ملازمہ فاخرہ چیل کی طرح دروازے کی طرف بھاگی۔ اس کے پیچھے جہاں آرا بھی پہنچیں۔ ان کا ہدایت اللہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی نقشہ، وہی قد، وہی رنگ۔ اللہ نے میری گود دوبارہ بھر دی۔ وہ بھی دادی جان کہہ کر لپٹا تو جہاں آرا کی آنکھیں دریا بن گئیں۔ انہیں پوتا بھی ملا تھا اور بیٹا بھی۔

''یہ آپ کی پوتی فوزیہ ہے۔''

جہاں آرا نے بہو اور پوتی کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ سامان اندر پہنچ چکا تھا۔ جہاں آرا بھی ان سب کو لے کر گھر میں آئیں۔ خان صاحب اپنی لائبریری میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ شاید منتظر تھے کہ کوئی انہیں بھی بلائے۔

''داداجان کہاں ہیں؟'' جہاں آرا کے پوتے عنایت

اللہ نے پوچھا۔

''بیٹا ایک بات کہوں۔ وہ ابھی تک تم لوگوں سے ناراض ہیں لیکن تم لوگوں کو آنے کی اجازت دے دی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دل میں کچھ جگہ پیدا ہوئی ہے۔ کچھ دن ناراض رہیں گے پھر ٹھیک ہو جائیں گے۔ دماغ کے ذرا ایسے ہی ہیں مگر دل کے برے نہیں ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں انہیں منالوں گا۔ ڈیڈی تو دادا کی طرح ہی ضدی تھے۔ میں ہوتا تو اب تک منا چکا ہوتا۔ وہ ہیں کہاں۔ میں ابھی جا کر ان کے پاؤں پکڑتا ہوں۔''

''تم ٹھہرو، میں انہیں لے کر آتی ہوں۔''

وہ لائبریری میں گئیں تو خان صاحب بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔

''ذرا چل کر اپنے پوتے کو تو دیکھو۔ کیا نظام ہے قدرت کا۔ بالکل ہدایت کی جوانی ہے جو ہمارے آنگن میں کھڑی ہے۔''

''تم دیکھو اس کی جوانی، میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

''آپ کو ہماری قسم! مت کیجیے گا بات۔ چل کر دیکھو تو۔''

''تم نے اپنی قسم دے دی ہے تو چلو۔''

وہ آنگن میں آئے اور پوتے پر نظر پڑی تو وہ بھی دنگ رہ گئے۔ باپ بیٹے میں اتنی مشابہت بھی ہو سکتی ہے۔ بہت دنوں بعد ان کا ہاتھ مونچھوں پر تاؤ دینے کے لیے بڑھا تھا لیکن پھر رک گیا۔

''کیا نام رکھا ہے تیرے باپ نے تیرا؟''

''عنایت اللہ خاں۔''

''نام تو اچھا رکھا ہے اس.....'' وہ گالی دینا چاہتے تھے لیکن پھر خیال آیا مردے کو برا نہیں کہتے۔

عنایت اللہ ان سے گلے ملنے کے لیے آگے بڑھا لیکن خان صاحب دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ جب تک جی چاہے یہاں رہو لیکن بزدل بن کر نہیں بہادری کے ساتھ۔'' انہوں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ان کا یہ طرز عمل کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا لیکن جہاں آرا بیگم پہلے ہی بتا چکی تھیں کہ یہی سب کچھ ہوگا اس لیے کسی نے بھی اسے اپنی بے عزتی نہیں سمجھا بلکہ عنایت نے تو اپنی ماں کو سمجھایا کہ وہ دادا جان کے طرز عمل کو دل پر نہ لیں ایک دن وہ ان کا دل جیت کر دکھائے گا۔ اسی دن سے وہ اس کوشش میں لگ گیا تھا۔

ہر وقت کی قربت نے خان صاحب کو بھی پگھلانا شروع کر دیا تھا لیکن برسوں کی اکڑ ایک دن میں جانے والی نہیں تھی۔ وہ چھپ چھپ کر سب کو دیکھتے رہتے لیکن کسی کو یہ موقع نہیں دیا کہ کوئی ان سے براہ راست بات کر سکتا، عنایت کو دیکھ کر انہیں اپنا بیٹا یاد آ جاتا تھا اور یہی غلط بات تھی۔ بیٹے کے ساتھ یہ بھی یاد آ جاتا تھا کہ وہ انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ آگے بڑھتے بڑھتے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

عنایت جان بوجھ کر ان کے کمرے کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ وہ جب باہر نکلتے، انہیں سلام ضرور کرتا، چاہے جواب ملے نہ ملے۔ ان تک چائے پہنچانے کا کام تو اس نے اپنے ہی ہاتھ میں لے لیا تھا لیکن یہ سب کام کسی مشین کی طرح چل رہے تھے۔ عنایت چاہتا تھا کہ بزرگوں کی طرح وہ اسے دعائیں دیں لیکن وہ نہ برا کہہ رہے تھے نہ اچھا۔

■■■

چودھری ملک دین بوڑھا ہو چکا تھا۔ اب اس کے بیٹے محمد دین کی حکمرانی تھی۔ باپ کی شہ تھی اور جوانی کی ترنگ تھی۔ طاقت کے نشے میں کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتا تھا۔ اس وقت بھی وہ کسی ملازم پر ہنٹر برسا رہا تھا کہ چودھری چیخ اٹھا۔

''ارے کیا مار ڈالے گا۔ اس میں دم ہی کتنا ہے۔ کسی سور ما کو مارتا کہ تیری دھاک بیٹھے۔''

''کوئی سور ما تم نے چھوڑا ہے۔ سب تو مجھے دیکھ کر بلوں میں چھپ جاتے ہیں۔''

''ارے ادھر تو آ۔ ایک بات یاد آئی۔ یار ایک کام کر۔ وہ جو اپنا یار وجاہت اللہ خاں ہے۔ اس سے ایک پرانا حساب چکتا نا ہے۔ سنا ہے اس کا پوتا آیا ہوا ہے۔ پوری جوانی پر ہے۔ اگر اس کا سر جھکا دے تو وجاہت اللہ کی مونچھیں لٹک جائیں گی۔''

''اس کی پوتی بھی تو آئی ہوئی ہے۔ کہو تو اٹھا لوں۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کر، پہلے سانپ کو ٹھکانے لگا پھر بل میں ہاتھ ڈالنا۔''

''وہ شہری چھوکرا کتنی دیر میرے سامنے ٹکے گا۔ چڑھنے دے ہتھے۔''

عنایت نے دادی سے بڑی مشکل سے اجازت لی تھی کہ وہ کسی ملازم کو ساتھ لے کر دادا کے کھیتوں پر چلا جائے۔ ملازم کے ساتھ کھیتوں کی طرف جا رہا تھا کہ چودھری محمد دین سے آمنا سامنا ہو گیا۔ محمد دین جیپ میں تھا اور عنایت گھوڑے پر۔ محمد دین نے جیپ کو اس طرح روک لیا کہ پتلی سی کچی سڑک بالکل بند ہو گئی۔

''اے کون ہو تم۔ ہمیں دیکھ کر رک کیوں نہیں گئے؟''

''یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم کون ہو جو میں تمہارے استقبال کے لیے رک جاتا۔''

''میں چودھری ملک دین کا بیٹا ہوں جس کی حکومت ہے اس علاقے پر۔''

''میں بھی کوئی غیر نہیں ہوں۔ تم مجھے پہلی بار دیکھ رہے ہو اس لیے اجنبی سمجھ رہے ہو۔ میں شہر سے آیا ہوں، وجاہت اللہ خاں کا پوتا عنایت اللہ ہوں۔''

''اچھا! بابا بتا تو رہے تھے کہ اس بھگوڑے کا بیٹا آیا ہوا ہے جو اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی لونڈیا کی خاطر بھاگ گیا تھا۔''

''زبان سنبھال کر بات کر چودھری کے بیٹے۔''

عنایت گھوڑے سے نیچے کود گیا۔

''زبان سنبھال کر بات نہ کروں۔ تو کیا کر لے گا؟''

''زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔''

''تیری یہ مجال۔'' دین محمد نے کہا اور ایک گھونسا عنایت کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ عنایت اچھل کر دور جا پڑا۔ ملازم درمیان میں آیا تو دین محمد کے ملازم نے اسے پکڑ لیا۔

عنایت ایک لمحے کو گر ضرور گیا تھا لیکن اٹھنے کا موقع مل گیا۔ بس اتنا ہی بہت تھا۔ اس نے شہر میں رہ کر جوڈو کراٹے کی تربیت حاصل کی تھی جسے آزمانے کا اس وقت موقع مل گیا۔ دین محمد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ اس کا ہر وار خالی جا رہا تھا۔ دین محمد کبھی ایک طرف جھول جاتا کبھی دوسری طرف۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ناک سے خون جاری تھا۔ وہ پھر کر جیپ کی طرف گیا اور جیپ میں رکھی ہوئی لاٹھی نکال لایا۔ وہ لاٹھی چلانا جانتا تھا لیکن اس وقت تو لاٹھی ہوا میں گھوم رہی تھی۔ عنایت ہر بار بچ جاتا تھا اور پھر لاٹھی عنایت کے ہاتھ میں آ گئی۔

اس لڑائی میں کسی نے غور ہی نہیں کیا اور عنایت کا ملازم گھوڑا لے کر گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ وجاہت اللہ خاں بیس بائیس برس ہو گئے تھے گھر سے باہر نہیں نکلے تھے لیکن اس وقت پوتے کی محبت نے ایسا جوش مارا کہ اسی گھوڑے پر بیٹھ کر اس جگہ پہنچ گئے جہاں لڑائی ہو رہی تھی۔ اس وقت منظر یہ تھا کہ دین محمد زمین پر لیٹا ہوا تھا اور ہاتھ جوڑ کر عنایت سے معافی مانگ رہا تھا۔ عنایت نے دادا کی طرف دیکھا اور دین محمد کے بھاری بھرکم وجود پر ایک ٹھوکر رسید کی۔

''میرے دادا سے معافی مانگ جن کے لیے تو نے ابھی کہا تھا، زنخوں کی طرح گھر میں پڑے رہتے ہیں۔''

''وجاہت خاں، مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔'' دین محمد نے ہاتھ جوڑے۔

وجاہت اللہ خاں کا ہاتھ اپنی مونچھوں کی طرف گیا مگر یہ ہاتھ آج واپس نہیں آیا۔ انہوں نے تاؤ دے کر مونچھوں کو اوپر کیا اور عنایت سے کہا اسے جانے دے۔

دین محمد کی حالت یہ تھی کہ اٹھنا مشکل تھا۔ عنایت نے اور اس کے ملازم نے مل کر اسے جیپ میں ڈالا اور دین محمد کا ملازم جیپ لے کر روانہ ہو گیا۔

جہاں آرا گھبرا کر دروازے پر آ گئی تھیں۔ پھر انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک گھوڑے پر دو سوار۔ ایک دادا ایک پوتا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے ستارہ بن گئیں۔

''بیٹا، تمہیں آئے اتنے دن ہو گئے، تم نے اپنے دادا کو گلے سے نہیں لگایا۔''

عنایت آگے بڑھا اور وجاہت خاں کی چھاتی سے لپٹ گیا۔ ''اب دیکھنا چودھری آئے گا ضرور۔ تیرا دادا بہت دن بعد اس کے سامنے اکڑ کر بیٹھے گا۔ تیرے باپ نے میری گردن جھکا دی تھی، تو نے میرا سر بلند کر دیا۔ جا ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جا۔ چودھری آتا ہی ہوگا۔''

انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ کوئی گھنٹا بھر گزرا ہوگا کہ چودھری دروازے پر تھا۔ وجاہت اللہ نے پھر مونچھوں کو تاؤ دیا اور خود دروازے پر گئے اور عزت سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

''وجاہت خاں، آج بچوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ دین محمد تو رپٹ لکھوانے تھانے جا رہا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ بھئی آپس کا معاملہ ہے آپس میں طے ہو جانا چاہیے۔''

''اچھا ہوا ورنہ پولیس کو بھی معلوم ہو جاتا کہ دین محمد کے جسم پر تو بہت زخم آئے ہیں۔''

''وجاہت خاں، میں اپنے بیٹے کی طرف سے معافی مانگنے آیا ہوں۔''

''معافی کیسی چودھری۔ بزدلی اور بہادری کے ایسے کھیل تو چلتے ہی رہتے ہیں۔''

وجاہت اللہ خاں نے آواز دے کر عنایت اللہ کو بھی بلا لیا تاکہ چودھری بھی دیکھ لے کہ اس کے بیٹے کی ٹھکائی کرنے والے کو ایک خراش تک نہیں آئی۔

''یہ ہے میرا پوتا عنایت اللہ خاں۔ ہدایت اللہ خاں کا بیٹا۔''

"بھئی کیا کھیل ہوتے ہیں قدرت کے۔ یہ کیسا بہادر اور سعادت مند ہے۔ ایک تمہارا بیٹا تھا۔ کیسی بزدلی دکھائی تھی۔"

"کیسی بزدلی چودھری۔ اس نے گاؤں کی لڑکی ٹھکرا کر شہر کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ وہ نر تھا، نر۔"

"کمال ہے خان صاحب۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا وہ بزدل تھا، بزدل۔"

"ہمارا بیٹا ہے، ہم کچھ کہہ لیں۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا۔ ہمارے خاندان میں آج تک کوئی بزدل پیدا نہیں ہوا۔"

چودھری حیرت سے خان صاحب کا منہ تک رہا تھا۔ یہ شخص بھی کیا ہے۔ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ۔ اس نے چپ رہنے ہی میں عافیت جانی اور عنایت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے خان صاحب سے اجازت چاہی۔

اس جھگڑے کو اور اس معافی تلافی کو چند دن گزرے تھے کہ بستی میں شور مچ گیا اور شور بھی ایسا کہ جو سنتا افسوس کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ غریب موچی کی بیٹی کھیلنے نکلی تھی اور پھر واپس نہیں آئی۔ موچی غریب اسے دن بھر ڈھونڈتا پھرا۔ دوسرے دن چنے کے کھیت سے اس کی لاش مل گئی۔ کسی نے دس سال کی اس بچی کی بے حرمتی کی تھی اور پھر اسے قتل کر دیا تھا۔ یہاں تھانے سے پہلے ہر معاملہ چودھری کے پاس جاتا تھا۔ پھر وہ مناسب سمجھتا تو بات آگے بڑھاتا ورنہ پنچایت ہی میں فیصلہ ہو جاتا تھا۔ لوگ اس بچی کی لاش لے کر چودھری کی حویلی پہنچ گئے۔

"دیکھو پنچو!" چودھری مخاطب ہوا۔ "اس گاؤں کے سب رہنے والے یہاں کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ آج تک یہاں کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ یہ کام تو کسی باہر سے آنے والے کا لگتا ہے۔"

"ایسا کون ہے چودھری؟"

"وجاہت اللہ کا پوتا عنایت اللہ اور کون۔ تمہیں معلوم ہے، دین محمد سے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔ کیوں ہوا تھا؟ کچھ معلوم ہے۔ تمہیں کہاں معلوم ہوگا۔ وجاہت اللہ نے میرے آگے ہاتھ جوڑ لیے تھے اور مجھے چپ ہونا پڑا تھا مگر آج بتاتا ہوں۔ اس کے پوتے نے گاؤں میں کام کرتے ہوئے ایک عورت پر بری نظر ڈالی تھی۔ دین محمد نے اسے سمجھایا کہ یہ گاؤں ہے شہر نہیں ہے۔ بس جی وہ تو لال پیلا ہو گیا۔ خوب لٹھ بازی ہوئی۔ وہ تو وجاہت اللہ وہاں پہنچ گئے اور دین محمد نے بزرگ کا احترام کرتے ہوئے عنایت کو جانے دیا۔ وہ جو کہتے ہیں چور، چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ عنایت اللہ باز نہیں آیا۔ کریم اللہ کی معصوم بچی اسے مل گئی۔ وہ بہلا پھسلا کر اسے کھیتوں میں لے گیا۔ اس سے آگے کہتے ہوئے مجھے تو لاج آتی ہے۔"

چودھری کے ایک ملازم نے کھڑے ہو کر تصدیق کی۔

"ہاں چودھری صاحب، میں کل ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا عنایت اپنی بائیک پر بڑی تیزی سے آ رہا تھا۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ مجھے اسی وقت شک ہوا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے۔"

"دیکھ لیا تم لوگوں نے۔" چودھری نے لوگوں سے کہا۔ "اب تو ساری بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔"

چودھری کی تقریر سے لوگوں میں اشتعال پھیل گیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ ہم وجاہت اللہ کے گھر کو آگ لگا دیں گے لیکن چودھری نے انہیں روک دیا۔

"قانون کو اپنے ہاتھ میں مت لو۔ بچی کی لاش اٹھا کر تھانے جاؤ اور عنایت اللہ کے خلاف رپٹ درج کراؤ۔ اگر پولیس کوئی کارروائی نہ کرے تو بے شک وجاہت اللہ کے مکان کو آگ لگا دینا۔"

مجمع وجاہت اللہ کے گھر جانے کے بجائے تھانے کی طرف بڑھ گیا۔ ایک زمانہ تھا جب سبحان اللہ قادری ایس ایچ او تھا۔ اب اس کی جگہ کوئی اور آ گیا تھا۔ خان صاحب نے برسوں سے گھر کے باہر قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ کون جانتا تھا کہ کون وجاہت اللہ۔ یہ معاملہ بھی ایسا تھا کہ پولیس اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ فوراً پرچہ کٹا اور عنایت اللہ کی گرفتاری کے لیے پولیس روانہ کر دی گئی۔

پولیس دروازے پر کھڑی تھی اور وجاہت اللہ خاں سینہ تانے کھڑے تھے۔ "میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کام کر چکا ہوں۔ ایک ذرا سا جھگڑا کیا ہو گیا تم میرے پوتے کو گرفتار کرنے آ گئے۔"

وہ سمجھ رہے تھے چودھری کے بیٹے سے جو جھگڑا ہوا تھا یہ اس کا شاخسانہ ہے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے تو وہ یوں سامنے سے ہٹ گئے جیسے موت آدمی کو زندگی سے دور کر دیتی ہے۔ ان کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے اور ان کی مونچھیں نیچے لٹک گئیں۔

"قسم خدا کی! اس نے بڑی بزدلی کا کام کیا۔ اگر کسی جوان عورت کو اٹھا کر لے آتا تو تم میری لاش سے گزر کر ہی عنایت تک پہنچ سکتے تھے لیکن اب میں خود اسے تمہارے حوالے کروں گا۔" وہ اندر گئے اور عنایت کو لے کر آ گئے۔

"اگر اس کا جرم ثابت ہو جائے تو اسے قتل کر کے اسی چنے کے کھیت میں پھینک دینا۔"

عنایت کہتا رہا کہ وہ بے قصور ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ ہر جرم کرنے والا یہی کہتا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ پولیس نے اسے جیپ میں بٹھا دیا۔

وہ اندر گئے تو جہاں آرا اور عنایت کی ماں دونوں ان سے لپٹ گئیں مگر ان کے تیور اب کچھ اور تھے۔ انہوں نے دونوں کو خود سے الگ کیا اور اپنے کمرے میں بند ہو گئے۔ جہاں آرا کسی نہ کسی طرح اندر گئیں تو خان صاحب نے صرف اتنا کہا۔ "میں بزدلوں کی سفارش نہیں کرتا۔"

"آپ معلوم تو کریں۔ ضروری تو نہیں یہ جرم اس نے کیا ہو۔"

"نہیں کیا ہوگا تو چھوٹ کر گھر آ جائے گا۔"

"ایسے نہیں آ جائے گا۔ آپ کوشش کریں گے تو چھوٹے گا۔"

"جہاں آرا بیگم، اب ہمیں کون جانتا ہے۔ ہم تو بھولی ہوئی داستان ہیں۔ تمہارے بیٹے نے اور اس کے بعد اس کے بیٹے نے ہمیں اتنا ذلیل کیا ہے کہ اب خودکشی کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔"

"اللہ نہ کرے۔ ایسے الفاظ اپنے منہ سے کیوں ادا کرتے ہیں۔"

"جاؤ ہدایت کی ماں جاؤ، بے فکر رہو۔ میں اپنے پوتے کو پھانسی چڑھتے ہوئے دیکھ لوں گا، خودکشی نہیں کروں گا۔"

عنایت کی ماں کا رو رو کر برا حال تھا۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ جو الزام عنایت پر لگا ہے وہ اس کا مرتکب ہوا ہوگا۔ یہ ضرور کسی کی سازش ہے۔ سازش کا پردہ کیسے چاک ہو۔ کوئی بھاگ دوڑ کرنے والا ہو تو حقیقت سامنے آئے۔ وہ خان صاحب کے ہاتھ پاؤں جوڑتی رہیں کہ اپنے تعلقات کو کام میں لائیں، کسی وکیل سے مشورہ کریں۔ کسی طرح عنایت کو بچا لیں۔ بالآخر وجاہت اللہ خاں نے بہت دن بعد شیروانی پہنی، سر پر رام پوری ٹوپی رکھی اور پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ ایس ایچ او نے ملنے سے انکار کر دیا تھا لیکن وہ ملنے آئے تھے تو انہیں کون روک سکتا تھا۔ زبردستی کمرے میں داخل ہو گئے۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں عنایت کے لیے رحم کی درخواست لے کر آیا ہوں۔ میں تمہیں یہ سمجھانے آیا ہوں کہ چودھری کے ہاتھ بھی لمبے ہیں اور جیب بھی بھاری ہے۔ یہ نہ ہو کہ یہ دونوں چیزیں کام کر جائیں اور میرے پوتے کو بے قصور سزا ہو جائے اگر میرا پوتا واقعی مجرم ہے تو اسے ایسی سزا دینا کہ سب کے لیے عبرت ہو۔"

"چودھری اس معاملے میں کیوں پڑنے لگا تھا۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"اس لیے کہ عنایت سے اس کے بیٹے کا جھگڑا ہوا تھا۔ اب اس نے سازش کر کے عنایت کو پھنسایا ہے اور اب اسے سزا بھی دلوانا چاہے گا۔"

"بڑے میاں، تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ قتل میں اس کا بیٹا ملوث ہے۔"

"میں کیوں کسی پر الزام رکھوں۔ یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے کہ قاتل کون ہے۔ میرا پوتا بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ میں اپنی جوانی میں کمشنر کے دفتر میں تھا، مجھے معلوم ہے تفتیش کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں، تفتیش ہو تو پھر تفتیش ہو۔ چودھری کی دولت آپ کو خرید نہ لے۔"

"خان صاحب، میں وہ نہیں ہوں جسے دولت سے خرید لیا جاتا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں۔ ہم عنایت سے بھی پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ دوسرے پہلو بھی ہماری نظر میں ہیں۔"

خان صاحب اٹھے اور گھر چلے آئے۔ جہاں آرا نے آتے ہی شیروانی کا دامن تھام لیا۔ "کیا بات ہوئی تھانے دار جی سے؟"

"بات کیا ہونی تھی۔ دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔"

"اٹھ کر تو کھڑا ہو گیا ہوگا۔ میں تو یہ پوچھ رہی ہوں اس نے کہا کیا؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں۔ ایک تو تم بولتی بہت ہو، اپنی ماں

قابل غور

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بہلول بازار میں بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ کا وہاں سے گزر ہوا تو اس نے پوچھا۔ "بھائی یہاں کیا کر رہے ہو؟"

بہلول نے کہا۔ "بندوں کی اللہ سے صلح کروا رہا ہوں، اللہ تو مان رہا ہے مگر بندے نہیں مان رہے۔"

اتفاق سے کچھ عرصہ بعد بہلول کی ملاقات قبرستان میں ہوئی۔ بادشاہ نے پوچھا۔ "بھائی یہاں کیا کر رہے ہو؟"

بہلول نے کہا۔ "اللہ کی بندوں سے صلح کروا رہا ہوں، آج بندے تو مان رہے ہیں مگر اللہ نہیں مان رہا۔"

مرسلہ: عمران حیدر بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

کی طرح۔ وہ بھی اللہ بخشے کسی کی نہیں سنتی تھیں۔"

"اچھا نہیں بولتی۔ بتاؤ کیا ہوا؟"

"دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ بڑی عزت سے پیش آئے۔ کہنے لگے، آپ کا پوتا اور ایسی حرکت کرے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بس آج اور اسے رکھیں گے، کل تک چھوڑ دیں گے۔"

"جب کل چھوڑنا ہے تو آج چھوڑ دیتے۔ اس کی ماں کی حالت پتا ہے کیا ہو رہی ہے۔"

"بس کہہ دیا، کل چھوڑ دیں گے۔ اس سے زیادہ انہیں مجبور کرنے کی ہمت ہم میں نہیں تھی۔"

جہاں آرا نے سکون کا سانس لیا کہ جب کہہ آئے ہیں تو کل تک عنایت ضرور گھر آئے گا۔ خان صاحب جو کہہ دیتے ہیں، پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔

خان صاحب عید کی نماز پڑھنے تو ضرور جاتے تھے لیکن اس کے علاوہ کسی نے انہیں نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھ کوئی اس وقت بھی نہیں رہا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ لائبریری کا دروازہ اندر سے بند کر کے نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے تھے۔ نماز کے بعد انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

"اے اللہ! میری لاج رکھ لیجیو۔ میں نے بیوی سے کہہ دیا ہے کہ عنایت کل آجائے گا۔ میری بات پوری ہو جائے۔ اسے کل آجانا چاہیے۔ میں کل سے پرسوں نہیں دیکھوں گا۔ میں نے اپنے بیٹے کو کھو کر اس پوتے کو پایا۔ میں اسے ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ میں یہ نہیں جانتا کہ وہ قصور وار ہے یا بے قصور۔ جیسا بھی ہے، میرا پوتا ہے میں اس کی رہائی کی بھیک تجھ ہی سے تو مانگوں گا۔ میرا پوتا کل مجھے مل جانا چاہیے۔"

وہ دعا مکمل کر کے بستر پر آئے تو جہاں آرا جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے خان صاحب کی طرف دیکھا۔ "عنایت کے بغیر گھر کیسا سونا لگ رہا ہے۔"

"کل یہ سونا پن دور ہو جائے گا۔"

"ہدایت کے ابا سچ کہہ رہے ہو نا۔ کہیں میرا دل تو نہیں رکھ رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں، کل وہ آجائے گا۔ بات ہو گئی ہے۔"

"پھر میں سو جاؤں؟"

"میں تو سمجھا تھا اب تک سو گئی ہو گی۔"

"آپ جب تک سو نہیں جاتے، مجھے نیند کہاں آتی ہے۔"

"بالکل اپنی بڑی بہن پر گئی ہو۔ انہیں بھی یہی مرض تھا۔"

جہاں آرا نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر کمرے میں سناٹا پھیلا رہا پھر خان صاحب کے ہلکے ہلکے خراٹے خاموشی میں آوازیں پیدا کرنے لگے۔

خان صاحب صبح سو کر بھی نہیں اٹھے تھے کہ تھانے سے بلاوا آ گیا۔ "ایس ایچ او صاحب نے بلایا ہے۔"

جہاں آرا شیروانی لے کر کھڑی ہو گئیں۔ "عنایت کو لے کر آنا۔"

"لے آئیں گے بابا، لے آئیں گے۔ ہمیں اسی لیے تو بلایا گیا ہے کہ آؤ بھئی اپنے پوتے کو آ کر لے جاؤ۔"

ملازم تانگا لے کر آ گیا تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھے اور پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں عنایت ان کے سامنے بیٹھا ہے اور چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا ہے۔

"خان صاحب، اصل قاتل پکڑے گئے، آپ کا پوتا بے قصور ہے۔"

"ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا مگر یہ سب ہوا کیسے؟"

"ہمارے سپاہی وقوعہ کا معائنہ کرنے گئے تو وہاں سے ایک لاکٹ ملا جس پر دین محمد لکھا ہوا تھا جو چودھری کے بیٹے کا نام ہے۔ آپ کی زبانی میں یہ بھی سن چکا تھا کہ کچھ دن پہلے عنایت اور دین محمد کا جھگڑا ہوا تھا۔ جب اس کڑی کو ملایا گیا تو صاف پتا چلتا تھا کہ اس جھگڑے کا بدلہ لینے کے لیے چودھری نے اپنے بیٹے کا گناہ آپ کے پوتے کے سر منڈھ دیا ہے۔ ہم نے دین محمد کو گرفتار کر لیا۔ وہ بھی ایسا کمزور دل نکلا کہ فوراً اپنا جرم قبول کر لیا۔ نشاندہی پر آلۂ قتل بھی برآمد کر لیا گیا ہے۔ چالان بنا کر عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ آپ اپنے پوتے کو لے جا سکتے ہیں۔ بس ایک درخواست کروں گا کہ کچھ دنوں کے لیے اسے کہیں اور بھیج دیں۔ چودھری کی طرف سے اب بھی اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے اس کا حل بھی ڈھونڈ لیا ہے۔"

"آپ کی مرضی۔ ویسے ہم آپ کی مدد کے لیے ہر وقت حاضر ہیں۔"

"شکریہ جناب۔"

❀❀❀

جہاں آرا بیگم دیکھ رہی تھیں کہ تھانے سے آنے کے بعد وہ پھر کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ انہیں خوشی ہو

رہی تھی کہ خان صاحب دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ گھر سے نکلنا بالکل موقوف ہو گیا تھا اور اب ہیں کہ ابھی آئے، ابھی چلے۔

"میں کہتی ہوں ابھی تو آئے ہو پھر کہیں چلے۔"

"اب تمہیں ہماری کیا پروا جہاں آرا بیگم۔ تمہارا پوتا تمہیں مل گیا اور پوتا بھی ایسا کہ جس نے میری مونچھیں اونچی کر دیں۔"

"اس میں گیا شک ہے۔ اللہ نے میری دیر سے سنی لیکن سنی خوب۔"

"بس تمہارے پوتے کے ہی کام سے جا رہا ہوں۔"

انہوں نے سوچا ہو گا کوئی قانونی کارروائی رہ گئی ہو گی جسے نمٹانے جا رہے ہیں۔ خان صاحب کو اللہ کی امان میں دیا اور عنایت کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

وجاہت اللہ خان نے کسی نوکر کو ساتھ نہیں لیا تھا، نہ کوئی سواری منگوائی تھی۔ وہ پیدل چل رہے تھے۔ ان کی منزل چودھری کی حویلی تھی جو یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔

"آؤ خان صاحب آؤ۔ یہی کہنے آئے ہو نا کہ تم نے اثر رسوخ استعمال کر کے اپنے پوتے کو بری کروا لیا اور میرے بیٹے پر الزام ڈال دیا۔"

"چودھری گیا کھڑے کھڑے گرج رہے ہو۔ کہیں بٹھاؤ، پانی شربت کو پوچھو پھر آرام سے بیٹھ کر بات ہو گی۔"

خان صاحب نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

چودھری نے انہیں حویلی کے اندر لے جا کر بٹھا دیا۔

"چودھری میں یہ کہہ رہا تھا کہ میرا پوتا بے قصور تھا اس لیے چھوٹ گیا۔ یہ گھٹیا حرکت تیرے بیٹے کی تھی۔ جائے وقوعہ سے اس کا لاکٹ ملا ہے جس پر اس کا نام لکھا ہوا ہے۔"

"وجاہت خان زیادہ خوش مت ہو۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں اپنے بیٹے کو پھانسی کے تختے سے بھی اتار کر لے آؤں گا۔"

"میں تمہیں یہی تو بتانے آیا ہوں کہ جب قانون قدرت حرکت میں آتا ہے تو خزانے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔"

"اچھا تو تم مجھے یہ سمجھانے آئے ہو۔"

"اور یہ بتانے آیا ہوں کہ میری عدالت میں سزا کا مستحق تمہارا بیٹا نہیں، تم ہو۔"

"بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہو خان صاحب۔ یہ بتاؤ کہ سزا کا مستحق میں کیوں ہوں؟"

"اس لیے کہ میرے پوتے کو پھنسانے کی سازش تم نے تیار کی تھی۔ سازشیں تیار کرتے ہیں بزدل اور بزدل ہی قصوروار ہوتا ہے اور سزا کا مستحق ہوتا ہے۔"

"میں نے بھلا کون سی سازش تیار کی تھی؟"

"تم نے اپنے بیٹے کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے میرے پوتے پر الزام دھر دیا۔ تم منافق ہو۔ معافی مانگنے آئے تھے لیکن تمہارا دل صاف نہیں تھا۔ یہ سازش اب میری سمجھ میں آئی ہے۔"

"بہت دیر میں سمجھے خان صاحب۔"

"اللہ کے یہاں دیر ہو ہی جاتی ہے مگر اندھیر نہیں ہوتی۔"

"اتنے خوش مت ہو۔ بازی الٹتے دیر نہیں لگے گی۔ میں روپے بوریوں میں بھر کر لے جاؤں گا۔ عدالت خود کہے گی، عنایت کو غلط چھوڑا گیا۔ دولت کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے خان صاحب۔ یہاں کا تھانے دار پاگل ہے جو اس نے میری پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ سب پاگل نہیں ہوتے، اپنے پوتے کو ذرا سنبھال کر رکھنا۔"

"چودھری تمہیں اپنی دولت پر بہت ناز ہے؟"

"میں آج ہی شہر جا رہا ہوں۔ پھر تم دولت کی طاقت بھی دیکھ لو گے۔"

"تمہیں یقین ہے تم شہر جاؤ گے۔"

"تم نہ آئے ہوتے تو میں اب تک جا بھی چکا ہوتا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، شاید اب نہ جا سکو۔"

"تم مجھے روکنے آئے ہو؟"

"میں نے کہا تھا نا کہ قانونِ قدرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

وجاہت اللہ خان نے اپنی شیروانی کی سیدھی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پستول ان کے ہاتھ میں تھا۔ چودھری نے کسی کو مدد کے لیے پکارا اس کے ساتھ ہی چار فائر ہوئے اور چاروں گولیاں چودھری کے بدن میں پیوست ہو گئیں۔

وجاہت خان یہ بھول گئے تھے کہ وہ چودھری کی حویلی میں بیٹھے ہیں۔ چودھری کے محافظ قریب ہی تھے۔ گولیوں کی آواز پر دوڑتے ہوئے اندر آ گئے۔ خان صاحب نے پستول کا رخ ان کی طرف کیا لیکن محافظوں کی گولیاں ان کے جسم کو چھلنی کر گئیں۔

جہاں آرا کا سہاگ اجڑ گیا لیکن اس خزانے کا منہ بند ہو گیا جس کی دولت، عنایت کو دوبارہ پھنسانے کے کام آتی۔ دادا نے پوتے کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا تھا۔

معمولی سی اس مایا نے انسان کو جس قدر بے مایا کر دیا ہے... اس کا احساس اگر اسے ہو جائے تو کبھی اس حقیر سی چیز کے تعاقب میں نہ بھاگے... یہ بات اگرچہ گہری ہے مگر یہاں گہرائی میں اترنے کی کسے فرصت ہے۔ جب ایک ذرا سی نیکی کوئی مجرمانہ غلطی بن جائے تو پچھتاوا تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتا... دورِ حاضر میں ایمان کی کمزوری کا ایک سبب شاید انصاف کی غیر منصفانہ تقسیم بھی ہے... گویا بااختیار طبقے کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے... "شاید کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات"... اور اپنی بات پر تو اٹل بیگ صاحب بھی نظر آتے ہیں کہ سچائی کی جنگ لڑنا بھی تو کسی کارِ خیر سے کم نہیں۔

بھری عدالت میں مدلل جرح...... کامیاب وکیل کا دلچسپ انداز

ذہن نہ مجرمانہ

مرزا امجد بیگ

ٹیلی فون کی گھنٹی نے میرے انہماک کا خانہ خراب کر دیا تھا۔ میں اس وقت دفتر میں بیٹھا ایک نہایت اہم کیس کی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس روز عدالت میں میرا کوئی کیس نہیں تھا لہٰذا صبح ہی سے میں اپنے آفس میں جم کر بیٹھ گیا تھا۔

دوسری گھنٹی پر میں نے گھور کر ٹیلی فون سیٹ کو دیکھا پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "ہیلو......!"

"ہیلو بیگ صاحب!" ایک جانی پہچانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "میں جمیل صدیقی سے بات کر رہا ہوں۔"

"جی صدیقی صاحب! السلام علیکم!" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے تو آپ کی "ہیلو" سنتے ہی پہچان لیا تھا، حکم کریں......؟"

جمیل صدیقی سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے تو ایک رائٹر تھے لیکن اس کے علاوہ بھی انہوں نے بہتر جگہ اپنی ٹانگیں اور بازو پھنسا رکھے تھے۔ اس کی من جملہ سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور معاشرت ہی تھا۔ وہ مختلف نوعیت کے فلاحی اور سماجی کاموں میں گردن گردن تک ڈوبے نظر آتے تھے جبھی ان کا سوشل سرکل بھی خاصا وسیع تھا۔

"حکم نہیں، عرض ہے بیگ صاحب!" وہ میری بات کے جواب میں "وعلیکم السلام" کہنے کے بعد بولے۔ "آپ سے ایک کام پڑ گیا ہے، آج کل معروفیت کیسی چل رہی ہے؟"

"معروفیت تو جناب ایک متحرک بلا کا نام ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "آپ فرمائیں، آج کیسے یاد کیا؟"

"ایک کیس آپ کے سپرد کرنا ہے......!" جمیل صدیقی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"کیس کی نوعیت کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے بتایا۔ "فوج داری کا کیس ہے۔"

"آپ کا اپنا......؟"

"اپنا نہیں بیگ صاحب۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ایک

جاننے والے کے توسط سے یہ معاملہ مجھ تک پہنچا ہے لیکن آپ فکر نہ کریں..... آپ کی فیس کہیں نہیں جائے گی۔ یہ چیریٹی کیس ہرگز نہیں ہے۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ صدیقی صاحب سے میرے بڑے دیرینہ تعلقات تھے لہٰذا وہ میری عادات سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ فیس کے معاملے میں، میں خاصا اصول پرست اور سخت گیر واقع ہوں۔ بغیر فیس کے میں کوئی کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا تھا اور یہ فیس بھی مجھے ایڈوانس میں چاہیے ہوتی تھی۔ یہی اصول میں نے دوسرے ماہرین شعبہ جات کے لیے بھی اپنا رکھا تھا۔ اگر مجھے کسی کنسلٹنٹ یا کسی کونسلر کی ضرورت پیش آجاتی تو میں متعلقہ ماہر فن اور تجربہ کار شخص کو اس کی پوری فیس ادا کرنے کے بعد ہی خدمات سے استفادہ کرتا تھا البتہ قریبی دوستوں اور رشتے داروں سے میں تھوڑی رعایت کرنا بھی نہیں بھولتا تھا۔ دوسرے ماہرین فن کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن اپنے پیشے کے حوالے سے میری ایک فلاسفی تھی۔ میں اکثر لوگوں سے کہا کرتا تھا۔

ایک وکیل اور پہلوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں اپنے اپنے اکھاڑوں میں کشتی لڑتے ہیں اور دونوں کے پاس اپنے اپنے میدان کی مناسبت سے مخصوص داؤ پیچ ہوتے ہیں جن کے استعمال سے وہ مدمقابل کو پچھاڑنے کا کام کرتے ہیں۔ ان دونوں سے اگر اچھی اور تسلی بخش کارکردگی مطلوب ہو تو پھر ان کی ضروریات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک فاتح پہلوان خوش خوراک بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تجربہ کار کانئے کا وکیل بھاری بھرکم فیس بھی وصول کرتا ہے۔ سیدھا سادا حساب آپ یوں سمجھ لیں کہ..... جتنا گڑ، اتنا ہی میٹھا.....!

"تو پھر میں کتنے بجے آپ کے آفس آجاؤں؟" صدیقی صاحب کے استفسار نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے، آپ شام میں چھ بجے تک تشریف لے آئیں۔"

"بہتر ہے۔" صدیقی صاحب نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ "تو پھر چھ بجے آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے....." میں نے کہا۔

"اللہ حافظ بیگ صاحب.....!"

میں نے بھی "اللہ حافظ" کہہ کر ریسیور کریڈل کر دیا۔

ٹھیک چھ بجے شام جمیل صدیقی میرے آفس میں موجود تھا۔ اس کی آمد کی اطلاع مجھے میری سیکریٹری نے انٹرکام پر دی تھی۔ میں نے بزر بجتے پر ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو میری سیکریٹری عالیہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"سر! جمیل صدیقی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ خود کو آپ کا دوست بتا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صبح فون پر انہوں نے اپائنٹمنٹ لے لیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، انہیں اندر بھیج دیں۔" میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمیل صاحب میرے چیمبر میں موجود تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے ان سے پوچھا۔

"صدیقی صاحب! ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟"

"باہر گرم چل رہا ہے تو اندر بھی گرم ہی چلنا چاہیے۔" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ "آپ تو جانتے ہیں، لوہا لوہے کو کاٹتا ہے.....!"

وہ ستمبر کے ابتدائی ایام تھے۔ کراچی میں، ماہ ستمبر میں بڑی غضب کی گرمی پڑتی ہے۔ میں نے صدیقی صاحب کی فرمائش کے عین مطابق، اپنی سیکریٹری سے عمدہ قسم کی چائے بنوانے کے لیے کہہ دیا پھر ہم گفتگو میں مصروف ہوگئے۔ میں جلد ہی اصل موضوع پر آگیا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"جی صدیقی صاحب! اب فرمائیں، کیا معاملہ ہے.....؟"

"لاہور میں میرے ایک دوست ہوتے ہیں..... ملک بشیر۔" صدیقی وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ "ان کا بیٹا کراچی کے ایک بنگلے میں، ڈکیتی اور قتل کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔ میں اسی کے سلسلے میں آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ کے دوست ملک بشیر لاہور میں کیا کرتے ہیں؟"

"جی..... ان کا وہاں سینیٹری فٹنگ کا وسیع کاروبار ہے۔" صدیقی صاحب نے بتایا۔

"اور ان کا جو بیٹا گرفتار ہوا ہے اس کا کیا نام ہے؟"

"جاوید.....!"

"یہ جاوید..... یہاں کراچی میں کیا کر رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنے والد کے کاروبار کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا تھا۔"

"قتل اور ڈکیتی والا یہ واقعہ کہاں پیش آیا ہے۔" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے، جاوید کو کراچی کے کس علاقے سے پکڑا گیا ہے؟"

"جائے وقوعہ حیدری کے علاقے میں واقع ایک بنگلا ہے۔" صدیقی صاحب نے بتایا۔

"ہوں.....!" میں نے پرسوچ انداز میں جمیل صدیقی کی جانب دیکھا۔ "جاوید کو حیدری کے ایک بنگلے میں ڈکیتی اور قتل کے

الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟"

میرے تصدیق طلب سوال کے جواب میں صدیقی صاحب نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مختصراً کہا۔ "جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔"

"جاوید پر کس کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"مقتول کا نام فضل کریم ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"فضل کریم!" میں نے زیرلب دہرایا پھر پوچھا۔ "یہ فضل کریم یعنی مقتول کرتا کیا تھا؟"

"اس کا ہول سیل کا بزنس تھا کپڑے کا۔" جمیل صدیقی نے بتایا۔ "ادھر بولٹن مارکیٹ میں اس کی بہت بڑی دکان اور گودام وغیرہ ہیں۔"

"ایک بات بتائیں صدیقی صاحب!" میں نے جمیل صدیقی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مانا کہ ملزم کا باپ ملک بشیر آپ کا بہت اچھا دوست ہے لیکن جاوید کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"جی....." اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا بیگ صاحب۔"

"میرا مطلب یہ تھا.....!" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جاوید پر عائد کردہ اس دہرے الزام کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے۔ کیا اس الزام میں کوئی صداقت ہوسکتی ہے یا آپ کی نظر میں وہ بے گناہ ہے؟"

"دیکھیں بیگ صاحب! میں اپنے دوست ملک بشیر کو عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔" جمیل صدیقی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "وہ ماشاءاللہ کروڑ پتی شخص ہے۔ پورے ملک میں اس کا سینیٹری فٹنگز مصنوعات کا کام پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کراچی تک میں ان کی سپلائی آتی ہے۔ ملک بشیر نے جاوید کو کاروباری سلسلے میں ہی کراچی بھیجا تھا۔ ماشاءاللہ! اللہ کا دیا سب کچھ ان کے پاس ہے اور جاوید ان کی اکلوتی اولاد بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، جاوید کو اس قسم کی حرکت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"آپ اسے کوئی فارمولا نہیں بنا سکتے صدیقی صاحب۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "آج کل تو کھاتے پیتے آسودہ حال گھرانے کے من چلے نوجوان بہ طور فیشن بھی اس قسم کے جرائم کر رہے ہیں۔"

"میں آپ کی بات کی تردید نہیں کروں گا بیگ صاحب۔" وہ گمبھیر انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے....." وہ لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرے پاس علی الصباح ملک بشیر کا فون آیا تھا۔ اسے بھی گزشتہ رات ہی اس واقعے کے بارے میں پتا چلا ہے۔ اس نے مجھ سے تعاون کی درخواست کی تو ایک دیرینہ دوست ہونے کے ناتے میں نے آپ کو فون کھڑکا دیا اور اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ ملک بشیر نے مجھے بتایا ہے کہ وہ آج رات کسی وقت کراچی پہنچ جائے گا۔ باقی کی تفصیلات اور معاملات آپ اسی کے ساتھ طے کر لیجیے گا۔"

"صدیقی صاحب! آپ مجھے سال ہا سال سے جانتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں سیدھی اور کھری بات کرنے کا عادی ہوں۔"

"ہاں، مجھے اچھی طرح معلوم ہے بیگ صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جس طرح آپ میرے دیرینہ دوست ہیں ویسے ہی ملک بشیر سے بھی خاصے پرانے مراسم ہیں۔ آپ کسی بھی سلسلے میں جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں، بے دھڑک کہہ ڈالیں۔"

اور میں نے بے دھڑک کہہ ڈالا۔ "میں آپ کے کہنے پر یہ کیس تو لے لیتا ہوں لیکن آگے چل کر کسی بھی مرحلے پر اگر مجھے محسوس ہوا کہ ملزم جاوید بے گناہ نہیں تو میں کیس کو وہیں چھوڑ دوں گا، پھر آپ مجھ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیجیے گا۔"

"گلے شکوے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بیگ صاحب۔" جمیل صدیقی نے اپنایت بھرے انداز میں کہا۔ "میں آپ کی عادت اور مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ جس مرحلے پر جو بھی مناسب سمجھیں وہی فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ نے ہمیشہ انصاف کی جنگ لڑی ہے۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔ "آپ نے کبھی مجرموں کی اعانت نہیں کی اسی لیے تو میرے ذہن میں فوراً آپ کا نام چمکا تھا ورنہ اس شہر میں اور بھی بہت سے وکیلوں کو میں جانتا ہوں جو آپ سے آدھی فیس میں کسی بھی قسم کا کیس پکڑنے کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر سرسری لہجے میں پوچھا۔ "میرا خیال ہے، فیس والا معاملہ تو ملزم کے باپ کی آمد پر ہی زیر بحث لایا جائے گا۔"

"جی ہاں، ظاہری بات ہے۔" جمیل صدیقی نے جواباً کہا۔

میں نے پوچھا۔ ”وقوعہ کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟“

”آج تیسرا دن ہے بیگ صاحب۔“ اس نے بتایا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس نے ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا۔“

”جی ہاں، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔“ صدیقی صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”جاوید اس وقت ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔“

”ٹھیک ہے صدیقی صاحب!“ میں نے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا۔ ”میں آفس سے اٹھنے کے بعد تھانے کا چکر لگا لیتا ہوں۔“

”مجھے یقین ہے، ملزم سے ملاقات اس کیس کے لیے بڑی سودمند ثابت ہوگی۔“ صدیقی صاحب پُریقین انداز میں بولے۔ ”جاوید اس حوالے سے بڑی قیمتی معلومات فراہم کر سکتا ہے۔“

میں نے جمیل صدیقی سے متعلقہ تھانے کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے مجھے تھانے کا نام بتایا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اچھا بیگ صاحب!“ اس نے مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اب مجھے تو آپ اجازت دیں۔ کل ملک بشیر کے ہمراہ کسی وقت آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا۔“

”ضرور......ضرور......!“ میں نے بھی اٹھ کر اس سے الوداعی مصافحہ کیا۔

پھر وہ میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

⦿⦿⦿

اس روز جب میں اپنے آفس سے اٹھنے لگا تو میں نے اپنی سیکریٹری عالیہ سے کہا۔ ”عالیہ تمہیں اگر گھر جانے کی جلدی ہو تو رانا سے کہہ کر ٹیکسی منگوا لو۔“

رانا نواز میرے آفس میں کام کرتا تھا۔ اس کی عمر تو پینتیس سے متجاوز تھی تاہم اپنے عہدے کے اعتبار سے وہ ”آفس بوائے“ کہلاتا تھا اور ایسا کہلائے جانے پر وہ بہت خوش بھی تھا۔ کسی بیوی بچوں والے شخص کو اگر بوائے یعنی ”لڑکا“ کہلوانے کا موقع ملے تو اسے اچھا کیوں نہیں لگے گا۔

”سر لگتا ہے، آج آپ کو زگ زیگ ہو کر اپنے گھر پہنچنا ہے۔“ عالیہ نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ میرے لیے ٹیکسی منگوانے کی بات اسی وقت کرتے ہیں جب آپ کو اپنے روٹ سے ہٹ کر ڈرائیو کرنا ہوتی ہے۔“

عالیہ کا گھر میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا اور اکثر و بیشتر آفس سے واپسی پر وہ میری کار ہی میں بیٹھ جاتی تھی۔ میں اسے اس کے گھر کے نزدیک ڈراپ کر کے آگے بڑھ جاتا تھا۔ اس کی رائے زنی کے جواب میں، میں نے کہا۔

”تمہارا اندازہ درست ہے عالیہ۔ آج میں اپنے ایک کلائنٹ سے ملاقات کے لیے تھانے جاؤں گا اور نہیں معلوم کہ وہاں کتنی دیر ہو جائے اس لیے زیادہ مناسب یہی ہے کہ تم ٹیکسی پکڑ کر اپنے گھر چلی جاؤ۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ویسے بھی متعلقہ تھانا بالکل مختلف روٹ پر واقع ہے۔“

”ٹھیک ہے سر! آپ جائیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”رانا میرے لیے سواری کا بندوبست کر دے گا۔“

میں نے ان دونوں کو ”خدا حافظ“ کہا پھر اپنی کار میں بیٹھ کر اس تھانے کی جانب روانہ ہو گیا جس کے لاک اپ میں میرا تازہ ترین موکل جاوید بند تھا۔ پولیس عدالت سے اس کا ریمانڈ حاصل کر چکی تھی اور اب وہ گویا ”زیر تفتیش“ تھا۔

میں نے متعلقہ تھانے پہنچ کر اپنی کار کو تھانے کی باؤنڈری وال کے ساتھ پارک کیا پھر گاڑی کی چابیوں والے چھلے کو انگشت شہادت میں گھماتے ہوئے تھانے کے اندر داخل ہو گیا۔ سوئے اتفاق کہ اس وقت تھانا انچارج اپنی سیٹ پر موجود تھا ورنہ اس وقت عموماً تھانا انچارج صاحبان ”راؤنڈ“ پر پائے جاتے ہیں۔ نام راؤنڈ یعنی ”گشت“ کا ہوتا ہے لیکن اس حقیقت کا علم صرف خدا کو یا خود انہیں ہی ہوتا ہے کہ ان کے مذکورہ اور مبینہ راؤنڈ کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔

میں سیدھا انچارج کے کمرے میں پہنچا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔“

اس نے بڑی بددلی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنے نام کا آخری حصہ تو اس طرح چھپا رہے ہیں جیسے میں آپ کو پکڑ کر فوراً حوالات میں بند کر دوں گا؟“

اس کے اشارے کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشکش سے فائدہ اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور کرسی سنبھالنے کے بعد حیرت بھرے انداز میں اسی سے پوچھ لیا۔

”انچارج صاحب! میں نے تو آپ کو اپنا مکمل نام ہی

بتایا ہے۔ پتا نہیں، آپ کو یہ ادھورا کس سینس میں لگا......؟“

”بالکل کامن سینس میں......“ وہ بے ساختہ بولا۔

میں بھی ایک لمحے کے لیے نہیں چوکا اور تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اچھا...... آپ اس ”سینس“ کا ذکر کر رہے ہیں جس کے بارے میں کسی انگریز کا مقولہ ہے...... کامن سینس از آ سینس وچ از ناٹ کامن!“

وہ میری اس ستارانہ چوٹ پر تلملا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ میرا انگلش جملہ اسے بہت زور کا لگا تھا۔ میرے احساس کی تائید میں اس کا فوری ردعمل بھی سامنے آ گیا۔ اس نے برہمی سے کہا۔

”مجھے تو یہ اس نامعقول انگریز کا نامعقول لگتا ہے۔“

میں چاہتا تو اس موقعے پر انگریزی اور انگریز بہادر کی معقولیت اور نامعقولیت والی بحث کو بہت دور تک دراز کر سکتا تھا لیکن میں چونکہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا لہٰذا زیرلب مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

”چھوڑیں جناب انگریز کو...... یہ لوگ تو برسوں پہلے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر یہاں سے جا چکے ہیں۔ آپ مجھے میرے نام کے ادھورے پن کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے؟“

”انگریز تو یہاں سے چلا گیا ہے لیکن اپنا انگریزی نظام قانون ادھر ہی چھوڑ کر گیا ہے جسے ہم ایک عرصے سے بھگت رہے ہیں۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ”اور جہاں تک آپ کے نام کی بات ہے تو میں آپ کو کسی دوسرے مکمل نام سے بھی جانتا ہوں۔“

”وہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کا پورا نام ہے......“ وہ ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ......“

”اوہ......!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”تو آپ میرے پیشے سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔“

”نہ صرف نام اور پیشے سے واقف ہوں بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ یہاں خوامخواہ ہی نہیں آئے۔“ وہ طنزیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی کوئی ضرورت ہی کھینچ کر آپ کو یہاں لا سکتی ہے۔“

”اوہ......!“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ تو بڑے جید قسم کے نجومی ہیں۔“

”نجومی میں نہیں، آپ ہوں گے۔“ وہ تڑخ کر بولا۔

اس کے ردعمل نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ”نجومی“ کہہ کر میں نے اسے کوئی گالی دے دی ہو۔ اس کے دماغ کی گرمی کو کم کرنے کی غرض سے میں نے کہا۔

”آپ ناراض نہ ہوں انچارج صاحب۔ سمجھ لیں کہ آپ نہیں، میں ہی نجومی ہوں۔ بس، اب غصہ تھوک دیں۔“

”میں غصے میں نہیں ہوں بیگ صاحب!“ وہ چہرے کے تاثرات کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”خیر، چھوڑیں اس فضول بحث کو اور یہ بتائیں کہ آپ یہاں کس مقصد سے آئے ہیں......؟“

”آپ نے میرے ایک معصوم اور بے گناہ موکل کو اپنی حوالات میں بند کر رکھا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میں اس سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔“

وہ محتاط نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کا تو ہر موکل ہی معصوم اور بے گناہ ہوتا ہے...... ابھی آپ کس سے ملنے آئے ہیں؟“

”جاوید پردیسی سے......“ میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

”جاوید پردیسی؟“ وہ بھویں سکیڑتے ہوئے بولا۔

”ہاں، وہ نوجوان جو لاہور سے کراچی آیا تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کر دی۔ ”اور آپ لوگوں نے اس بے چارے کو قتل اور ڈکیتی کے الزام میں پکڑ کر تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ میں اپنے اسی موکل سے ملنے آیا ہوں۔“

”بیگ صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لڑکا عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور ریمانڈ کی مدت کے دوران میں، ہم ملزم سے کسی کی ملاقات نہیں کراتے، اس سے انویسٹی گیشن پر منفی اثر پڑتا ہے۔“

”آپ مجھے قانون پڑھانے کی کوشش نہ کریں انچارج صاحب۔“ میں نے جواباً طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اس شعبے کی سیکڑوں بلکہ ہزاروں یہ موٹی موٹی کتابیں میرے دفتر میں اور گھر میں رکھی ہیں جو نہایت پابندی کے ساتھ میرے مطالعے میں بھی رہتی ہیں۔“

”میں آپ کو قانون پڑھانے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا بیگ صاحب۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں تو آپ کو اپنے تھانے کے قواعد و ضوابط سے آگاہ کر رہا تھا۔“

”میں تھانوں کے سارے قواعد اور آپ کے تمام تر

ضوابط سے بہ خوبی واقف ہوں انچارج صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جہاں ایک وکیل کو اپنے موکل سے ملاقات کی اجازت دیتے ہوئے آپ کی جان نکلتی ہے وہیں آپ لوگ ملزم کے ورثا سے موٹی موٹی رقمیں نکلوا کر انہیں ملاقاتوں کے مواقع فراہم کرتے ہیں اور ملزم پر ہلکی دفعات لگانے کا مبز باغ دکھا کر ورثا کے ساتھ لاکھوں کی ڈیل بھی کرتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس نے میرے آخری جملے کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اصل موضوع سے کنی کاٹتے ہوئے خاصا دوستانہ انداز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ کو ایک مشورہ دوں.....!''

''لیکن میں اس مشورے کی فیس نہیں دوں گا۔'' میں نے انگشت شہادت کو وارننگ دینے والے انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''یہ مشورہ بالکل مفت ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''مجھے یقین تو نہیں آرہا انچارج صاحب.....'' میں نے شک بھری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال، میں انتظار کررہا ہوں.....آپ ارشاد فرمائیں؟''

''آپ اس کیس میں ہاتھ نہ ہی ڈالیں تو اچھا ہے۔'' وہ دونوں کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔

''کیوں.....!'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''اس مشورے کا مقصد کیا ہے؟''

''کیونکہ اس کیس میں آپ کے لیے کچھ نہیں رکھا۔'' وہ گہری ہمدردی سے بولا۔ ''یہ آپ کا پردیسی نوجوان کسی قیمت پر نہیں بچنے والا۔ آپ کو اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر نہ مانیں میری بات۔''

''بات ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ تو میں بعد میں کروں گا۔'' میں نے انچارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا میرے موکل نے آپ کی کسٹڈی میں اقبالِ جرم کرلیا ہے اور یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ عدالت میں جاکر اپنے اقبالی بیان سے منحرف نہیں ہوگا؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں.....!'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''پھر آپ نے یہ فتویٰ کس روشنی میں صادر فرمایا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کہ میرا موکل کسی بھی قیمت پر نہیں بچنے والا.....؟''

''او وکیل صاحب!'' وہ میرے چبھتے ہوئے سوال پر برہم ہوگیا۔ ''کیا آپ نے ہم لوگوں کو بالکل ہی نکما سمجھ لیا ہے؟''

''یہ بات تو آپ خود ہی اپنے منہ سے کہہ رہے ہیں۔'' میں نے بڑی سادگی سے پلکیں جھپکائیں۔ ''میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا.....!''

وہ میری اس گہری چوٹ پر اندر ہی اندر بلبلا کر رہ گیا تاہم کوئی خطرناک ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے بڑے فخر سے بولا۔

''ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں جن کی بنا پر یہ بندہ عدالت سے سیدھا جیل اور جیل سے سیدھا پھانسی کے پھندے تک جائے گا۔''

''اچھا.....!'' میں نے طنزیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے بھی تو پتا چلے کہ ایسے کون سے ٹھوس ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گئے ہیں؟''

''فنگر پرنٹس.....!'' وہ معنی خیز انداز میں مجھے تکنے لگا۔

''فنگر پرنٹس.....!'' میں نے منہ بگاڑ کر اس کے الفاظ دہرائے۔ ''یعنی انگلیوں کے نشانات..... اس سے مطلب کیا ہے آپ کا؟''

''میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کررہا ہوں کہ.....'' وہ رازدارانہ انداز میں میری معلومات کو صحت مند بنانے لگا۔ ''کہ آلہ قتل اور مال مسروقہ پر سے ملزم یعنی آپ کے موکل کی انگلیوں کے نشانات حاصل کرلیے گئے ہیں۔''

''اوہ.....!'' میں نے ایسی اداکاری کی جیسے مجھے اس انکشاف سے ذہنی دھچکا پہنچا ہو۔ ''یہ تو بہت برا ہوا انچارج صاحب۔''

اس نے میری اداکاری سے یہی تاثر لیا تھا کہ میرے غبارے کی ساری ہوا خارج ہوگئی ہے۔ اس پر ایک اور روا چڑھاتے ہوئے اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''بیگ صاحب! اب آپ کیا کہتے ہیں؟''

''معاملہ خاصا گمبھیر نظر آرہا ہے.....'' میں نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب تو آپ کو میری فرمائش پوری کرنے میں کسی احتیاط یا ہچکچاہٹ سے کام نہیں لینا چاہیے۔''

وہ چونک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر بکھرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کون سی فرمائش؟''

''ملزم سے ملاقات کی فرمائش۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب آپ کی اس کیس پر بڑی جاندار

گرفت ہے تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ لاجواب سا ہوکر رہ گیا۔ میں نے اسے ایک بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا جہاں سے فرار کی کوئی راہ اسے میسر نہیں تھی۔ ملزم سے ملاقات کرنے کے لیے یہ سارا بکھیڑا پھیلانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے درجنوں ڈھنگ جانتا تھا۔ یہ تو تھانا انچارج سے ''دل لگی'' میں بات آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کے لیے ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی بڑا کارنامہ ہو لیکن یہ تمام گفتگو میری نظر میں پیشہ وارانہ تفریح کا درجہ رکھتی تھی۔ انچارج صاحب نے آواز دے کر ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلایا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اوئے خادم حسین! ذرا ان صاحب کو اس قاتل سے ملوا دو جو حوالات میں بند ہے..... قتل اور ڈکیتی کے الزام میں.....!''

''جو حکم سر جی!'' کانسٹیبل نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔

''اور ہاں.....'' انچارج نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''یہ ملاقات دس، پندرہ منٹ سے زیادہ کی نہیں ہونا چاہیے۔''

''جی سر! آپ فکر نہ کریں۔'' کانسٹیبل خادم حسین نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ''میں ادھر ہی ایک کونے میں کھڑا اپنی گھڑی کو دیکھتا رہوں گا۔''

تھانا انچارج نے گھور کر خادم حسین کو دیکھا اور بہ آواز بلند کہا۔ ''اب جاؤ یہاں سے۔''

خادم حسین نے فوراً اپنے صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور میں اس کی معیت میں تھانا انچارج کے کمرے سے نکل کر حوالات کی جانب بڑھ گیا۔

انچارج نے میرا ذکر کرتے ہوئے خادم حسین سے یہی کہا تھا کہ..... ذرا ان صاحب کو اس قاتل سے ملوا دو..... گویا اس نے کانسٹیبل پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں ملزم جاوید کا وکیل ہوں۔ میں نے بھی خود کو کانسٹیبل کی نظر میں ''منظرِ عام'' پر لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن جان کاری کے سلسلے میں اس کی کرید اور جستجو کو میں روک نہ سکا۔ حوالات کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''کیا آپ ملزم کے والد صاحب ہیں؟''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔

''کیوں..... یہ خیال تمہارے ذہن میں کیوں آیا.....؟''

''وہ جی..... آج صبح اس سے بات ہوئی تھی۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''اس نے کہا تھا کہ اس کے گھر والوں کو اس واقعے کی اطلاع ہوگئی ہے اور آپ، اس کے والد صاحب لاہور سے کراچی پہنچ جائیں گے۔''

''اچھا.....تو یہ بات ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا، پھر پوچھا۔ ''آپ لوگوں نے جاوید کے ساتھ کوئی مار پیٹ تو نہیں کی؟''

میں نے کانسٹیبل کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا تاہم وہ میرے رویے سے یہی سمجھ بیٹھا تھا کہ میں جاوید کا باپ ہی ہوں۔ اس نے معنی خیز لہجے میں بتایا۔

''جناب! کوئی بھی مجرم آسانی سے زبان تو نہیں کھولتا نا۔ تھوڑی بہت سختی تو کرنا ہی پڑتی ہے۔''

''تھوڑی بہت سختی تو چلے گی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''خیر، اب میں آگیا ہوں تو اس معاملے کو بھی دیکھ لوں گا۔ جاوید جب تک پولیس کسٹڈی میں ہے، کوئی اس کا بال بھی بانکا نہیں کرسکے گا۔ میں نے تمہارے انچارج صاحب سے بھی بات کرلی ہے۔''

میں نے یہ سب کچھ محض کانسٹیبل پر رعب جمانے کے لیے کہا تھا۔ وہ یقیناً اس سے یہی مطلب اخذ کرتا کہ میں نے انچارج صاحب کی مٹھی گرم کرکے تفتیشی معاملات میں ملزم کے لیے نرمی کا لائسنس حاصل کرلیا ہے۔ وہ اپنے طور پر جو بھی سمجھ رہا تھا یا جو کچھ بھی سوچ رہا تھا مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی تاہم جب وہ بولا تو اس کی لالچی طبیعت مجھ پر عیاں ہوگئی۔

''سنا ہے، ادھر لاہور میں آپ کا بہت بڑا کاروبار ہے.....؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''اگر مجھے آپ کے انچارج صاحب کا خیال ہے تو میں آپ کو بھی نظرانداز نہیں کروں گا۔ آپ بالکل بے فکر ہوجائیں.....'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو حوالات کے کونے میں کھڑے ہوکر اپنی گھڑی پر نظر جمائے رہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں دس پندرہ منٹ کا حساب خود ہی رکھ لوں گا۔ آپ اس دوران میں باہر کا ایک راؤنڈ لگا کر آسکتے ہیں۔ انچارج صاحب کو اس امر کی خبر نہیں ہوگی اور آپ کی جیب میں بھی تھوڑی گرمائش آجائے گی۔ کیا خیال ہے آپ کا.....؟''

اس نے بھوکی نظر سے مجھے دیکھا اور باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''بڑا نیک خیال ہے جناب.....''

میں نے ہپ پاکٹ میں سے اپنا پرس نکالا اور سو روپے کا ایک کرارا سا نوٹ کانسٹیبل کی طرف بڑھا دیا۔ اس وقت تک ہم حوالات میں پہنچ چکے تھے لہٰذا میری یہ پیشکش کسی کی نگاہ میں نہیں آسکتی تھی۔

کانسٹیبل نے میرے تحفے کو بڑی خوشی سے قبول کیا اور اس تنبیہ کے ساتھ وہ وہاں سے ٹل گیا۔ ''صاحب! بس پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں۔ ہم آپ لوگوں کی خیر خواہی میں بعض اوقات بہت بڑا نقصان اٹھا لیتے ہیں۔ انچارج صاحب بہت سخت طبیعت کے مالک ہیں اور.....''

''اور کچھ نہیں خادم حسین.....'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ''میں تم کو اور تمہارے انچارج صاحب کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ ویسے تمہیں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میری وجہ سے تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا اور..... اگر تھوڑا بہت نقصان ہو بھی گیا تو میں اس نقصان کی تلافی پیشگی کر چکا ہوں.....''

وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ ''تلافی'' کے حوالے سے وہ میری بات کا مطلب بہ خوبی سمجھ گیا تھا۔ آج کل سو روپے والے نوٹ کی قدر بہت گر چکی ہے لیکن جس دور کا یہ واقعہ ہے اس زمانے میں اتنی مالیت کے نوٹوں کی ایک اپنی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ ایک متوسط فیملی کے روزمرہ کے لیے مبزی، گوشت، فروٹ کی خریداری کے بعد مٹھائی وغیرہ کے لیے بھی اس نوٹ میں سے پیسے بچ جایا کرتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نوٹوں میں سے برکت اٹھ گئی ہے یا ہم ہی کچھ زیادہ فضول خرچ ہو گئے ہیں۔

میرا خیال ہے..... دونوں ہی باتیں ہیں۔

کانسٹیبل خادم حسین کے جانے کے بعد میں ملزم جاوید کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ تمہارے والد صاحب نے ایک دوست جمیل صدیقی کی معرفت مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں تمہیں اس مصیبت سے نجات دلاؤں گا جس میں بدقسمتی سے اس وقت تم گھرے ہوئے ہو۔''

جاوید ایک جوان اور صحت مند شخص تھا، تاہم موجودہ حالات نے اسے خاصا پژمردہ کر دیا تھا۔ میری جانب سے حوصلہ افزا جملے سن کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی اتر آئی۔ یوں محسوس ہوا، میری صورت میں اس کی نگاہ کے سامنے امید کا جگنو جگمگا اٹھا ہو۔ اس نے بڑے ادب سے میری جانب ہاتھ بڑھایا اور پُرجوش انداز میں بولا۔

''السلام علیکم وکیل صاحب۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔''

''وعلیکم السلام!'' میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اصل خوشی تو تمہیں اس وقت ہوگی جب میں تمہیں اس کیس سے باعزت بری کروا دوں گا۔''

اس کی آنکھوں میں ابھرنے والے امید کے سایے کچھ پھیل سے گئے۔ اس نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔ ''ابو سے آپ کی بات ہوگئی ہے؟''

''تمہارے ابو سے میری ملاقات انشاءاللہ کل ہوگی۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''وہ آج رات میں کسی وقت کراچی پہنچ رہے ہیں۔''

''وکیل صاحب! پتا نہیں، وہ کون سا برا وقت تھا جب میں اس کیس میں پھنس گیا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ یقین کریں، میں نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی ڈکیتی کی کسی واردات میں میرا ہاتھ ہے۔''

''میں جانتا ہوں جاوید، تم بے گناہ ہو۔'' میں نے اس کے اعتماد میں توانائی بھرنے کی غرض سے کہہ دیا۔ ''اگر مجھے تمہارے مجرم ہونے کا ایک فیصد بھی یقین ہوتا تو میں اس کیس میں ہاتھ ہی نہیں ڈالتا۔'' میں سانس درست کرنے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں صرف انہی مصیبت زدہ لوگوں کے کیس لیتا ہوں جو کسی ناکردہ جرم میں ملوث ہو کر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔''

''آپ بہت ہی عظیم انسان ہیں وکیل صاحب!'' وہ تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ''جاوید! میری عظمت تو اس وقت ثابت ہوگی جو تم عدالت سے بے گناہ ثابت ہونے کے بعد باعزت بری ہو کر اپنے گھر جاؤ گے اور اس کٹھن کام کے لیے مجھے تمہاری مدد اور تعاون کی اشد ضرورت ہے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ حکم تو کریں۔''

میں نے کہا۔ ''فی الحال تو تم مجھے ان حالات کی تفصیلات سے آگاہ کرو گے جن میں گھر کر تم یہاں پہنچے ہو لیکن اس سے بھی پہلے ہمیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔''

''کون سا ضروری کام؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے وکالت نامہ اور دیگر ضروری کاغذات برآمد کیے پھر مختلف مقامات پر اس کے دستخط لینے کے بعد بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔

''سب سے زیادہ ضروری کام تو یہی تھا۔ اب قانون کی نظر میں تم میرے موکل اور میں تمہارا وکیل ہوں۔ یہ کام اس کانسٹیبل خادم حسین کے سامنے نہیں ہو سکتا تھا۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا تھا جناب؟'' اس نے معصومیت بھرے انداز میں پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ مجھے وکیل نہیں، بلکہ تمہارا باپ سمجھتا ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے، الجھن زدہ لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ نے اس سے یہ غلط بیانی کیوں کی وکیل صاحب؟''

''میں نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔'' میں نے جاوید کی الجھن دور کرنے کے لیے فوراً وضاحت کر دی۔ ''یہ اس کا ذاتی خیال ہے اور میں نے اس کے خیال کو درست کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ جیسا بھی سوچ کر خوش ہے، میری بلا سے!''

''آپ ایک ذہین اور ہوشیار وکیل ہیں بیگ صاحب!'' وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم میری تعریف و توصیف میں جس نوعیت کے الفاظ استعمال کر رہے ہو، میں ان کی معنویت پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اب تم فوراً مجھے وہ معلومات فراہم کرو جن کا ذکر میں نے تھوڑی دیر پہلے کیا تھا تاکہ میں اس کیس کی تیاری کے لیے کوئی بنیادی ڈھانچا بنا سکوں۔''

''ٹھیک ہے بیگ صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیتا ہوں۔''

آیندہ پندرہ منٹ میں مجھے جاوید نے اس واقعے کی جو تفصیلات سنائیں، ان کی روشنی میں وہ مجھے بے قصور اور بے گناہ نظر آیا۔ میرے اندازے کے مطابق اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کر دیا گیا تھا۔ کراچی میں کسی کو اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ بس، وہ حالات اور اتفاق کا مارا اس خطرناک سچویشن میں آن پھنسا تھا۔ اسے نظریۂ ضرورت کے تحت قربانی کا بکرا بنا لیا گیا تھا لیکن عید

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ اِنشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

قربانی سے پہلے ہی میں اس معاملے میں کود پڑا تھا لہٰذا اب ملزم جاوید کی قربانی کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

اس روز تھانے کی حوالات میں میرے موکل جاوید نے مجھے کس نوعیت کی معلومات فراہم کیں، وہ میں سردست آپ سے شیئر نہیں کروں گا۔ ان باتوں کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر گاہے بہ گاہے آپ کو دیکھنے اور سننے کو ملتا رہے گا۔

●●●

آیندہ روز شام میں جمیل صدیقی، جاوید کے والد ملک بشیر کو لے کر میرے آفس آگئے۔ میں نے پُرتپاک انداز میں انہیں ویلکم کہا پھر ان کے لیے چائے کا آرڈر دینے کے بعد جاوید کے موضوع پر گفتگو کرنے لگا۔

ملک بشیر ایک کورا چٹا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر ایک قیمتی ویسٹ کوٹ (واسکٹ) پہن رکھا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں عیب تھا۔ مذکورہ ہاتھ تو اپنی جگہ صحیح وسالم نظر آتا تھا لیکن اس میں جان وغیرہ نہیں تھی۔ کچھ عرصہ پہلے ملک بشیر پر فالج کا ایک اٹیک ہوا تھا اور اس ہاتھ کو متاثر کر گیا تھا۔ وہ ہاتھ اب کوئی کام کرنے کے قابل تو نہیں رہا تھا تاہم باقی وجود کے ساتھ پیوستہ رہتے ہوئے وہ بھی کسی بے جان شے کے مانند جھولتا رہتا تھا۔

صدیقی صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”بیگ صاحب! آپ رات کو جاوید کی طرف گئے تھے نا؟“

”جی ہاں، میں نہ صرف یہ کہ تھانے گیا تھا بلکہ میں نے اپنے موکل سے ایک بھرپور ملاقات بھی کرلی ہے۔“

”بس تو پھر میں مطمئن ہوں۔“ صدیقی صاحب نے ایک تسلی بخش سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”جاوید نے آپ کو حقیقتِ حال سے آگاہ تو کر دیا ہوگا؟“

”جی، میں نے اس سے تمام معلومات لے لی ہیں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کا کام یہیں تک تھا۔ یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔“

ملک بشیر نے مجھ سے استفسار کیا۔ ”بیگ صاحب! آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ایک بات تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا بیٹا اس قسم کی گھٹیا حرکت نہیں کرسکتا۔“

”میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے ملک صاحب!“ میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے ایک گہری چال کے تحت اس کیس میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔“

”جناب! یہ چال ہے یا جال...... اسے آپ ہی نے کاٹنا ہے۔“ ملک بشیر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کام کے لیے آپ کی فیس کے علاوہ جتنا بھی خرچہ ہوگا وہ میں دینے کو تیار ہوں۔ آپ روپے پیسے کی فکر نہ کیجیے گا۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس۔ میں بس، جلد از جلد اپنے بیٹے کی رہائی چاہتا ہوں۔“

”ہر ماں باپ کو اپنی اولاد کی رہائی اور آزادی ہی اچھی لگتی ہے ملک صاحب!“ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”اس سلسلے میں، میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی میں آپ کو ایک مشورہ بھی دینا چاہوں گا۔“

”جی...... ارشاد۔“ وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات تو اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت رکھتے ہیں لیکن باقی معاملات میں آپ ”اللہ کے دیے سب کچھ“ میں سے سوچ سمجھ کر لٹایئے گا کیونکہ قدرت ہمیں جن نعمتوں سے نوازتی ہے اس کا ہم سے ایک غیر محسوس انداز میں حساب بھی لیا جاتا ہے۔“

”میں آپ کی نصیحت کو ذہن میں رکھوں گا۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا، پھر پوچھا۔ ”اس حوالے سے اگر آپ کا اشارہ کسی خاص سمت میں ہے تو پلیز وضاحت کر دیں۔“

”اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ کا اشارہ پولیس کی جانب ہے نا بیگ صاحب؟“ جمیل صدیقی نے سوچتی ہوئی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”رائٹ یو آر......!“ میں نے فوراً تصدیق کر دی۔ ”آپ بالکل صحیح جگہ پر پہنچے ہیں صدیقی صاحب۔“ پھر میں نے ملک بشیر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”پولیس والے مختلف حیلوں بہانوں کی مدد سے آپ کی جیب ہلکی کرنے کی کوشش کریں گے لیکن آپ نے ان کے کسی چکر میں نہیں آنا مثلاً......“ میں نے مختصر سا توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”مثلاً وہ آپ کو یہ آسرا دے سکتے ہیں کہ اگر آپ ان کی مٹھی گرم کر دیں تو وہ چالان کی تیاری کچھ اس انداز کی کریں گے کہ جاوید پر اس کیس کی زیادہ گرفت نہ رہے اور وہ آسانی سے عدالت سے بری ہو جائے گا۔ وہ ہلکی دفعات لگا کر ڈیفنس کا کام آسان کر دیں گے اور کوئی کمزور وکیل بھی بہ آسانی جاوید کو باعزت بری کروانے میں کامیاب ہو جائے گا، وغیرہ ہا...... یہ سب پولیس والوں کا ایک خوبصورت جھانسا ہوتا ہے۔“

”بیگ صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ صدیقی

صاحب نے ملک بشیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ درحقیقت پولیس اس نوعیت کی کوئی فیور دے ہی نہیں سکتی۔“

”پولیس استغاثہ کی وارث ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ملزم پر تمام تر الزامات کا بوجھ لاد کر اسے عدالت سے سخت ترین سزا دلوانے کے لیے ہمہ وقت کوشاں نظر آتی ہے۔ کسی بھی ملزم کے لیے کیس میں کوئی رعایت پیدا کرنا تو اپنے ہاتھوں سے استغاثہ کے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ پولیس اس قسم کی حماقت کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ہاں البتہ......“ میں نے تھوڑا سا توقف کر کے اپنے سامنے بیٹھے ان دونوں شرفا کو باری باری دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جب تک کوئی کیس پکے کاغذات پر رجسٹرڈ نہیں ہوا ہوتا، سارے معاملات پولیس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ وہ دونوں پارٹیوں سے الگ الگ ڈیل کر کے اپنی جیبیں بھر لیتی ہے اور کیس کا حلیہ بگاڑ کر اپنی مرضی کی صورتِ حال کو نافذ کر دیتی ہے مگر جاوید کا کیس خاصا میچور ہو چکا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ واقعہ پکا رجسٹرڈ ہے بلکہ اب تو اس معاملے میں عدالت بھی براہِ راست ملوث ہو چکی ہے اور یہ سب کیا دھرا چونکہ پولیس ہی کا ہے لہٰذا وہ ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔“

”بیگ صاحب! اتنی اہم معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ۔“ ملک بشیر ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر پوچھا۔ ”اس کیس کی تازہ ترین پوزیشن کیا ہے، میں یہ بات اپنے طور پر سمجھنے کے لیے پوچھ رہا ہوں؟“

”ضرور، یہ تو آپ کا حق ہے ملک صاحب۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”یہ کیس ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ آپ کا بیٹا عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔ وہ لوگ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں اپنی تفتیش مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیں گے۔ اس کے بعد عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوگا۔“

”ٹھیک ہے بیگ صاحب!“ ملک بشیر گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”عدالتی معاملات کو آپ مجھ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں اس لیے عدالت کے اندر کی صورتِ حال آپ ہی کو سنبھالنا ہوگی۔ میں اس سلسلے میں ہر نوعیت کے تعاون کے لیے تیار ہوں اور ایک بات کا مجھے سو فیصد یقین ہے۔“

اس نے بڑے ذو معنی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”کس بات کا ملک صاحب؟“

”اس بات کا کہ......“ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا بیٹا قاتل نہیں ہوسکتا۔“

”ملک صاحب! ایک بات کو ذہن میں رکھیں۔“ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”اگر مجھے اس امر کا ذرہ برابر بھی شک ہوتا کہ آپ کا بیٹا قتل اور ڈکیتی کی مبینہ واردات میں ملوث ہے تو میں کبھی بھی اس کا کیس اپنے ہاتھ میں نہ لیتا لیکن صرف آپ کے اور میرے یقین کر لینے سے بات نہیں بنے گی جناب......!“

”جی، میں سمجھا نہیں؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”سیدھی سی بات ہے ملک صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”عدالت انسان کے یقین، جذبات اور احساسات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ وہ ہر بات کے لیے ثبوت مانگتی ہے۔ پولیس نے آپ کے بیٹے پر جو سنگین نوعیت کے الزامات عائد کیے ہیں انہیں رد کرنے کے لیے مجھے ٹھوس ثبوت مہیا کرنے ہوں گے جس کے لیے سخت بھاگ دوڑ کی ضرورت ہے۔ آپ اس کام کو سیدھا سادا اور آسان سا ہرگز نہ سمجھیں۔“

”میں آپ کی بات کی اہمیت کو سمجھ رہا ہوں بیگ صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے آپ کو اپنے بیٹے کا وکیل مقرر کر دیا ہے۔ اب جاوید کا کیس آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا دفاع کرنے کے لیے آپ کو جس نوعیت کی بھی تحقیقات کرانا ہوں یا مختلف قسم کی معلومات جمع کرنا ہوں، وہ آپ ضرور کریں۔“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔

”آپ خرچے کی پروا نہ کریں بیگ صاحب! آپ صرف جاوید کو عدالت سے انصاف دلانے پر توجہ مرکوز رکھیں۔ باقی میں سب برداشت کرلوں گا۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”میں ایسا ہی کروں گا کیونکہ میں بھی وہی چاہتا ہوں جو آپ کا مطمحِ نظر ہے۔ آپ کا بیٹا مجرم نہیں ملزم ہے۔ میں اسے عدالت سے انصاف دلا کر رہوں گا۔“

●●●

اگلی پیشی پر پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔

میں نے اپنے وکالت نامے کے علاوہ ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی۔ فوج داری مقدمات میں ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی بلکہ یہ ناممکن حد تک دشوار تصور کی جاتی ہے تاہم کوشش کے پہلو کو کسی بھی صورت نظر انداز

نہیں کیا جاسکتا اور میں یہ کوشش ہر کیس میں ضرور کرتا ہوں۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا تو جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ اس کا مخاطب ظاہر ہے، میرا موکل جاوید ہی تھا جو اس کیس میں ملزم نامزد تھا اور افسردہ سا کیوز ڈبا کس میں کھڑا تھا۔

''ملزم جاوید!'' جج کی مخصوص آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ ''چھبیس اگست کی رات تم ایک بزنس مین فضل کریم کے گھر میں ڈکیتی کی نیت سے داخل ہوئے۔ اس واردات میں مقتول فضل کریم کی جانب سے مزاحمت پر تم نے غیر قانونی اسلحے سے فائرنگ کر کے فضل کریم کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب تم ڈکیتی کی رقم لے کر بنگلے سے فرار ہونے لگے تو فضل کریم کے ایک گھریلو ملازم نے تمہیں دیکھ لیا۔ نہ صرف دیکھ لیا بلکہ وہ تم سے بھڑ بھی گیا۔ اس مڈھ بھیڑ کے نتیجے میں مذکورہ ملازم نے تم پر قابو پالیا۔ بعدازاں تمہیں جائے وقوعہ پر ہی گرفتار کرلیا گیا۔ کیا تم اس فرد جرم کا اقرار کرتے ہو؟''

جج نے فرد جرم کے سلسلے میں جو اسٹینڈ لیا تھا وہ استغاثہ کی رپورٹ یعنی چالان کا خلاصہ تھا۔ ملزم نے بڑی توجہ سے جج کی بات سنی پھر بڑے اعتماد کے ساتھ صحت جرم سے انکار کردیا۔

''سر! میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا..... مجھے کسی سازش کے تحت اس کیس میں پھانسا گیا ہے.....''

صحت جرم سے انکار پر جج نے میری طرف دیکھا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ڈیفنس.....!''

میں اپنی مخصوص نشست سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میرے موکل کا تعلق ضلع لاہور سے ہے اور ان کا ایک چلتا ہوا باعزت کاروبار بھی ہے۔ یہ لوگ کاروباری ہیں اور پاکستان کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے شہر میں ان کا مال جاتا ہے اور اسی بزنس کے سلسلے میں میرا موکل کراچی بھی آیا تھا۔ یہ مقتول فضل کریم کو جانتا تک نہیں۔ ایک اتفاق کے تحت یہ مقتول کے بنگلے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اسے قتل اور ڈکیتی کے معاملات میں ملوث کردیا گیا۔ اس دُہری واردات سے میرے موکل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بے گناہ ہے لہٰذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ اس کی درخواست ضمانت منظور کی جائے۔''

''آئی آبجیکٹ یور آنر.....!'' وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند کہا۔

''ایکسپلین یور آبجیکشن!'' جج نے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یور آنر.....!'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت رکوانے کے لیے اپنے موقف کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کیا۔ ''کسی شخص کا کاروباری ہونا..... اس کا کاروبار پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہونا..... اس کا تعلق کراچی سے نہ ہونا..... اس کا مقتول سے ناشناس ہونا..... یہ تمام تر حقائق اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ ایسا شخص کسی مجرمانہ واردات میں ملوث نہیں ہوسکتا۔ ہمارے پاس مجرم کے خلاف.....''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' میں نے وکیلِ استغاثہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی احتجاجی لہجے میں کہا۔

وکیل استغاثہ نے میرے دلائل کے الفاظ پکڑ کر آبجیکشن کیا تھا لہٰذا میں نے بھی اس کے آبجیکشن میں سے اپنی پسند اور مطلب کے لفظ کا چناؤ کر کے فوراً اعتراض جڑ دیا تھا۔ جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''وکیل صاحب! آپ اپنے اعتراض کی وضاحت کریں۔''

''جناب عالی! آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ پیشی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولنا شروع کیا۔ ''اور میرے فاضل دوست نے مقدمے کی کارروائی کے بغیر ہی میرے موکل کو مجرم قرار دے دیا ہے جبکہ ابھی تک میرے موکل پر عائد کردہ الزامات ثابت نہیں ہوئے۔ میرے خیال میں یہ عدالت کے وقار اور انصاف کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''یور آبجیکشن ازایکسیپٹیڈ!''

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ مجھے اپنے دلائل کو آگے بڑھانا چاہیے۔ سو میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میرا موکل بے گناہ و بے قصور ہے۔ قتل اور ڈکیتی کی واردات سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں الجھایا گیا ہے۔''

''میرے فاضل دوست نے اس کیس کو ایک سوچی سمجھی سازش قرار دیا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے جج کو متاثر کرنے کے لیے دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے

کہا۔ ''جبکہ اس موقف میں کوئی حقیقت یا طبعی میلان نظر نہیں آتا۔''

''وضاحت کی جائے.....!'' وکیل استغاثہ کی جانب دیکھ کر جج نے کہا۔

''جناب عالی! ملزم کا تعلق لاہور سے ہے جبکہ مقتول کراچی کا رہنے والا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے جج کی وضاحت طلبی کے جواب میں کہا۔ ''ملزم کا سینیٹری فٹنگز کا کاروبار ہے جبکہ مقتول کپڑے کا بزنس چلاتا تھا۔ علاوہ ازیں ملزم اور مقتول میں کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی یعنی وہ دونوں ایک دوجے کے لیے قطعی اجنبی تھے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی وضاحت کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''یور آنر! جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے خلاف سوچی سمجھی سازش کرتا ہے تو ان دونوں کے بیچ کسی بھی سطح پر، کسی بھی نوعیت کی دشمنی کا وجود ناگزیر ہے جبکہ یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، طنزیہ انداز میں مجھے گھورا اور روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔

''یہاں کا معاملہ معزز عدالت کے سامنے ہے۔ ملزم اور مقتول زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے، دونوں میں کبھی کوئی لین دین نہیں ہوا، دونوں نے حتیٰ کہ کبھی ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی پھر..... پھر جناب عالی! کیسی رقابت، کیسی قرابت، کیسی دوستی، کیسی دشمنی اور..... کیسی سازش؟'' وہ ایک مرتبہ پھر میری جانب متوجہ ہوا۔

''میرے فاضل دوست! کسی بھی حوالے سے ملزم اور مقتول میں کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور اس بات کو بھی آپ ذہن میں رکھیں کہ سازش ہمیشہ اپنے ہی کرتے ہیں، اپنوں کے خلاف جائے، وہ دوستی میں کریں یا دشمنی میں، اچھا برا کوئی نہ کوئی تعلق تو ضرور سامنے آنا چاہیے نا کسی سازش کو بننے کے لیے.....''

مجھے چھوڑ کر وہ دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''جناب عالی! آلۂ قتل اور مال مسروقہ والے بریف کیس پر ملزم کے فنگر پرنٹس کا ملنا اور جائے وقوعہ سے ملزم کی رنگے ہاتھوں گرفتاری چیخ چیخ کر اس سچائی کا اعلان کر رہی ہے کہ کٹہرے میں کھڑا یہ شخص.....'' اس نے اکیوزڈ باکس میں موجود میرے موکل کی جانب اشارہ کیا اور خاصے جارحانہ انداز میں بولا۔

''یہ شخص اس معاشرے کا ایک ناسور ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ میں معزز عدالت سے پرزور استدعا کرتا ہوں کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو مسترد کرتے ہوئے عدالت کی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے۔''

جج نے وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ میں وکیل استغاثہ کے دلائل کے جواب میں کیا کہنا چاہوں گا۔ میں نے جج کا اشارہ پاکر وکیل استغاثہ کی تشفی کے لیے ان خیالات کا اظہار کیا۔

''جناب عالی! میں اپنے فاضل دوست کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ایک ایسی اہم بات سے روشناس کرایا جو پہلے میرے علم میں نہیں تھی۔ اس علمی معاونت پر میں ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں، کم ہوگا.....''

''کون سی اہم بات.....؟'' وکیل استغاثہ نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے اس کے سوال پر قطعاً کوئی توجہ نہیں دی اور براہِ راست جج سے مخاطب رہتے ہوئے اپنا استدلال جاری رکھا۔

''یور آنر! اکثر سازشوں میں اصل کرداروں کے بجائے غیر متعلق افراد کو ہی قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے تاکہ کیس کا حلیہ بدل کر رہ جائے۔ استغاثہ نے اس کیس میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ گھڑی ہوئی ایک بوگس کہانی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔''

''پھر حقیقت کیا ہے.....؟'' وکیلِ استغاثہ چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''حقیقت.....!'' میں نے اس لفظ پر اچھا خاصا زور دیا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس حقیقت کو ملزم کی زبان سے منظرِ عام پر لانا چاہتا ہوں۔''

''پرمیشن گرانٹیڈ!'' جج نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اکیوزڈ باکس کے قریب پہنچ کر اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''چھبیس اگست کی رات تم حیدری کے علاقے میں کیا کرنے گئے تھے؟''

''مجھے ایک شخص کی تلاش تھی۔'' اس نے جواب دیا

''جو حیدری کے ایک بنگلے میں رہتا ہے۔''

''وہ کون شخص تھا اور تمہیں کیوں اس کی تلاش تھی؟''

میں نے پوچھا۔

''اس شخص کا نام انور شیخ ہے۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''وہ میرے ایک دوست اسلام شیخ کا بہنوئی ہے۔ اسلم شیخ کی بہن فرزانہ لاہور سے بیاہ کر کراچی آئی ہوئی ہے۔ اسلم نے مجھے انور اور فرزانہ کے لیے ایک پیغام دیا تھا اسی غرض سے میں حیدری کے علاقے میں پہنچا تھا۔''

میں یہ ساری باتیں پہلے سے جانتا تھا۔ حوالات میں ملاقات پر جاوید نے مجھے تمام حالات و واقعات سے آگاہ کر دیا تھا اور اب میں بڑے رنگ ڈھنگ سے ان حقائق کو عدالت کے سامنے لا رہا تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مذکورہ شخص سے تمہاری ملاقات ہوگئی تھی؟''

''ملاقات تو تب ہوتی نا جب میں اس کا بنگلا تلاش کرنے میں کامیاب ہو پاتا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں رکشا میں بیٹھا مختلف گلیوں میں چکراتا رہا لیکن منزل تک نہ پہنچ سکا۔ کراچی کے راستے اور گلیاں بھی عجیب ہیں، کوئی ایڈریس ڈھونڈنا مشکل کام ہے، پھر کسی سے پوچھو تو وہ بھی ایسے پیچیدہ انداز میں گائڈ کرتا ہے کہ انسان کا دماغ گھوم کر رہ جائے۔''

''پھر تم نے کیا کیا.....؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''کرنا کیا تھا جناب.....!'' وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، رکشا والے نے کر دیا۔''

''کیا کر دیا؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''اس نے مجھے رکشا سے نیچے اتار دیا، یہ کہتے ہوئے کہ.....'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''بھائی صاحب! اگر آپ کو حیدری کی گلیاں ناپنے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھے اور میرے رکشے کو معاف کر دو۔ یہ کام تم اپنے قدموں پر چل کر کرو تو صحت بھی بنے گی اور انجوائے بھی کرو گے۔''

''رکشا چھوڑنے کے بعد تم انور شیخ کے بنگلے کی تلاش سے باز آگئے تھے یا اس مشن کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بدقسمتی سے اس مشن کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔'' وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ کاش! میں رکشا کو نہ چھوڑتا اور اسی میں بیٹھا بیٹھا صدر کی طرف چلا جاتا جہاں کے ایک ہوٹل میں میرا کام تھا۔''

''تم نے کسی نتیجے کو بھگتنے کا ذکر کیا ہے۔'' میں نے اہم نکتے کو اجاگر کرتے ہوئے کہا۔ ''اس رات تمہارے ساتھ ایسا کون سا واقعہ پیش آگیا تھا؟''

''میں رکشا میں سے اتر کر پیدل ہی انور شیخ کا بنگلا تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ.....'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کہ..... میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔''

''تم نے ایسا کیا دیکھ لیا تھا جسے عجیب کہہ رہے ہو؟''

''میں نے ایک بنگلے کے سامنے کھڑی گاڑی کے ساتھ ایک شخص کو گڑبڑ کرتے دیکھا تھا۔''

''گڑبڑ..... کیسی گڑبڑ.....؟''

''وہ شخص زور زبردستی سے اس گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' ملزم نے بتایا۔ ''میں اس کی حرکت پر چونک اٹھا اور تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ اس دوران میں وہ گاڑی کا عقبی دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا، اس نے گاڑی میں سے ایک بریف کیس نکالا تھا۔ اس کی مشکوک حرکت نے مجھے چونکا دیا۔ میرے ذہن میں فوری طور پر یہی آیا کہ وہ کوئی چور ہے۔ میں نے بہ آواز بلند اسے پکارا۔ میری پکار بلکہ للکار سن کر وہ بریف کیس سمیت ایک جانب دوڑا۔ میں نے جست لگا کر اسے پکڑ لیا۔ ہمارے درمیان چند سیکنڈ کی چھینا جھپٹی ہوئی جس کے اختتام پر میں اس چور سے بریف کیس چھیننے میں کامیاب ہوگیا۔ اس صورت حال نے اسے بوکھلا دیا اور پکڑے جانے کے خوف سے اس نے ایک سمت دوڑ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔''

''کیا اس وقت تمہیں معلوم تھا کہ مذکورہ بریف کیس کے اندر کیا ہے؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''میں بند بریف کیس کے اندر بھلا کیسے جھانک کر دیکھ سکتا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس بریف کیس میں پانچ لاکھ روپے کی رقم موجود تھی۔''

''اس چور سے بریف کیس چھیننے کے بعد تم نے کیا، کیا تھا؟'' میں نے دلچسپ جرح کے انکشاف انگیز سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''میں اس بنگلے کے گیٹ پر پہنچا جس کے سامنے کھڑی گاڑی میں اس نامعلوم چور نے نقب لگائی تھی۔'' ملزم نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''میرے اندازے کے مطابق مذکورہ گاڑی کا تعلق اسی بنگلے کے مکینوں سے ہوسکتا

تھا۔ میں نے گیٹ کے پہلو میں نصب گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بنگلے کا گیٹ کھلا اور وہاں پر گھنی مونچھوں والا ایک دراز قامت شخص نمودار ہوا۔ وہ گورا چٹا شخص بڑی تاثر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں بریف کیس دیکھا تو چونک اٹھا پھر میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔

"یہ بریف کیس تمہارے پاس کیسے پہنچا، لاؤ مجھے دو....."

اس کے سوال سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ اس بریف کیس کا مالک ہوسکتا ہے لیکن پھر بھی میں نے تصدیق کی خاطر، گاڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ گاڑی آپ کی ہے.....؟"

"ہاں....." اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "اور یہ بریف کیس بھی میرا ہے۔ یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟"

میں نے بریف کیس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک شخص کو آپ کی گاڑی میں سے یہ بریف کیس چوروں کے انداز میں نکالتے ہوئے دیکھا۔ میں اس پر جھپٹ پڑا اور اس سے یہ بریف کیس چھین لیا۔ وہ اندھیرے کی آڑ لے کر ایک جانب غائب ہوگیا۔"

"تم تو بہت ہی بہادر نوجوان ہو۔" وہ شخص میرے ہاتھ سے بریف کیس لے کر تعریفی انداز میں بولا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ تم نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ تم تو انعام کے حق دار ہوگئے ہو۔ آؤ میرے ساتھ....."

مجھے انعام ونعام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو یہی سوچ کر مطمئن ہوگیا تھا کہ وہ شخص نقصان اٹھانے سے بچ گیا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"آپ تو یہیں رہتے ہیں۔ میں کافی دیر سے ایک صاحب کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کردیں تو میں یہی سمجھوں گا کہ مجھے انعام مل گیا۔"

اس دراز قامت شخص نے مجھے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

"جوان! تم کن صاحب کا گھر تلاش کررہے تھے؟"

"انور شیخ صاحب کا۔" میں نے بتایا۔ "جن کی شادی لاہور میں ہوئی ہے۔"

"اچھا اچھا..... وہ شیخ صاحب....." وہ سرسری انداز میں بولا۔

"کیا آپ انور شیخ کو جانتے ہیں؟" میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھئی، شیخ صاحب سے تو میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ یہیں پچھلی گلی میں ان کا بنگلا ہے۔" وہ بتانے لگا۔ "میں خود تمہیں ان کے گھر چھوڑ کر آؤں گا لیکن پہلے تمہیں میرے ساتھ اندر چلنا ہوگا۔ کچھ کھائے پیے بغیر میں تمہیں یہاں سے ملنے بھی نہیں دوں گا۔ آج تم نے مجھے بہت بڑے نقصان سے بچالیا ہے۔ تم میرے لیے عظیم محسن بن کر آئے ہو۔"

میں اس شخص کی اخلاق بھری باتوں سے بے حد متاثر ہوا اور اس کا دل رکھنے کے لیے بنگلے کے اندر چلا گیا۔ ویسے بھی اب مجھے کسی بات کی جلدی نہیں تھی۔ میں انور شیخ سے ملنے حیدری کے علاقے میں پہنچا تھا اور وہ شخص مجھے انور شیخ کے بنگلے تک پہنچانے والا تھا۔

"جب وہ شخص تمہیں اپنے بنگلے کے اندر لے گیا تو پھر کیا واقعہ پیش آیا تھا؟" ملزم نے لمحاتی توقف کیا تو میں نے فوراً سوال جڑ دیا۔ "اور اس نے تمہیں اپنا نام کیا بتایا تھا؟"

"اس گھنی مونچھوں والے گورے چٹے شخص نے مجھے اپنا نام منیر واحدی بتایا تھا۔" ملزم ایک گہری سانس لینے کے بعد بولا۔ "اس نے بنگلے کے اندر لے جاکر مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور "ابھی آتا ہوں۔" کہہ کر بنگلے کے اندرونی حصے میں غائب ہوگیا۔ ایک منٹ کے بعد ایک اور شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ صورت ہی سے کوئی گھریلو ملازم نظر آتا تھا۔ دبلا پتلا، گہرا سانولا رنگ، لمبا قد اور گھنگریالے بال جیسا کہ عموماً افریقی لوگوں کے یا مکرانیوں وغیرہ کے ہوتے ہیں۔" اس نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

اس لمبے تڑنگے شخص نے ڈرائنگ روم میں آکر مجھ سے کہا۔ "آپ کو صاحب نے اندر بلایا ہے۔"

میں یہی سمجھا کہ وہ منیر واحدی کا گھریلو ملازم ہے چنانچہ میں صوفے سے اٹھا اور چپ چاپ اس شخص کے پیچھے چل پڑا۔ ہمارے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہا ہوگا اور..... اسی وقت ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔"

"کیسا واقعہ؟" میں نے پراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"وہ شخص چلتے چلتے ایک جھٹکے سے پلٹا اور اس سے پہلے کہ میں اس کی اس حرکت پر غور کرپاتا، اس نے بڑی سرعت سے اپنا ہاتھ میری ناک پر رکھ کر زور سے دبا دیا اگلے ہی لمحے میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میرے ذہن میں جو خیال ابھرا وہ یہ تھا کہ اس کالے کلوٹے شخص نے ایک تہ شدہ رومال کی مدد سے

میری ناک کو دبایا تھا اور وہ رومال یقیناً کلوروفارم یا اسی نوعیت کی کوئی اور بے ہوشی طاری کردینے والی دوا میں بسا ہوا تھا جس کے اثرات میری سانس کے ساتھ شامل ہوکر دماغ کے نازک خلیوں تک پہنچے تھے جس کی وجہ سے میں دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوگیا تھا۔"

"جب تمہیں ہوش آیا تو تم نے خود کو کہاں پایا؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"مجھے منیر واحدی کے بنگلے کے اندر ہی ہوش آیا تھا۔" ملزم نے اپنے سر کے عقبی حصے کو چھوتے ہوئے جواب دیا۔ "میں جیسے ہی اردگرد کے ماحول کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے قابل ہوا تو مجھے اپنے سر کے عقبی حصے میں شدید تکلیف کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی چند پولیس والوں کی شکلیں نظر آئیں جن میں سے ایک میرے بہت قریب کھڑا تھا۔ اس نے مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا تو مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کا ایک وزنی ٹھڈا میری پسلیوں میں لگا۔ میں تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس والے کی پنگھاڑ میری سماعت تک پہنچی۔

"اٹھ اوئے لاٹ صاحب کی اولاد..... بندہ مار کر کیسے آرام سے پڑا ہے۔"

یہ آواز اور میرے ساتھ ہونے والا سلوک سمجھ میں نہ آنے والی باتیں تھیں۔ مجھے تو صرف اتنا یاد تھا کہ منیر واحدی کے لمبو ملازم نے میری ناک پر ایک رومال رکھ کر مجھے بے ہوش کردیا تھا۔ اس کے بعد کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔ اسی بے خبری کے دوران ہی میں میرے سر کے عقبی حصے میں کوئی چوٹ بھی لگی تھی یا لگا دی گئی تھی۔ اس تازہ ترین صورت حال نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا اور میں اپنی تکلیف بھول کر فوراً اٹھ بیٹھا اور پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا ہے.....؟ تم لوگ مجھے کیوں مار رہے ہو؟ میں نے کیا جرم کیا ہے؟ میرے ساتھ تم لوگ جانوروں جیسا سلوک کیوں کررہے ہو.....؟"

میرے ان استفسارات کے جواب میں مجھے جو سلگتی ہوئی معلومات فراہم کی گئیں وہ میرے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ڈکیتی کی نیت سے فضل کریم کے بنگلے میں داخل ہوا تھا۔ میرے رنگے ہاتھوں گرفتار کیے جانے پر جب فضل کریم نے مزاحمت پیش کی تو میں نے اپنے پستول سے دو گولیاں چلا کر اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ پھر جب میں بریف کیس لے کر وہاں سے فرار ہورہا تھا تو مقتول کے گھریلو ملازم نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور اسی کوشش کے دوران میں اس نے ایک دھکا دے کر مجھے پیچھے پھینک دیا تھا۔ میں الٹے قدموں نیچے گرا اور میرا سر عقبی جانب سے بیڈ کے کونے سے ٹکرایا۔ یہ چوٹ کافی گہری ثابت ہوئی اور میں وہیں فرش پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔ بعد ازاں پولیس نے موقعے پر پہنچ کر مجھے گرفتار کرلیا تھا۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر کندھے اچکاتے ہوئے اپنی بات مکمل کردی۔ "یہ ہے کل کہانی جناب.....!"

ملزم کے خاموش ہونے پر میں نے جج کی جانب دیکھا اور خاصے کرارے لہجے میں کہا۔ "یور آنر! ان تمام تر واقعات کی روشنی ہی میں، میں نے کسی گہری سازش کا ذکر کیا تھا۔ میرا موکل معصوم اور بے گناہ ہے۔ فضل کریم کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اسے خوامخواہ اس کیس میں الجھانے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا میں ایک مرتبہ پھر معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے موکل کو ضمانت پر رہا کرنے کے احکام صادر کیے جائیں..... دیٹس آل یور آنر!"

"عدالت قصے کہانیوں پر نہیں بلکہ ٹھوس حقائق پر یقین رکھتی ہے میرے فاضل دوست!" وکیل استغاثہ نے میری

مکتبہ اعلا و سہلا
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama,Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbook@emirates.net.ae
JD Group of Publications

جانب دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آپ نے اپنے موکل کو ایک سنسنی خیز کہانی رٹوا کر عدالت کے سامنے جو ڈراما پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس سے ملزم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ عدالت کو ہر واقعے کی تصدیق کے معتبر گواہ اور ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے روئے سخن جج کی جانب موڑا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''لہٰذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو خارج کر کے اس کیس کو جلد از جلد اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے۔''

جج نے میرے موکل کی درخواست ضمانت کو مسترد کرتے ہوئے مجھے ہدایت کر دی۔ ''وکیل صاحب! آپ آیندہ پیشی پر اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت اور مضبوط دلائل پیش کریں گے۔''

''آل رائٹ سر.....!'' میں نے گردن کو تعظیمی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ میں اس پیشی پر اپنے موکل کی ضمانت کرانے میں ناکام رہا تھا لیکن اس طویل پیشی پر وہ تمام تر حقائق اور واقعات ریکارڈ پر آگئے تھے جن کا شکار ہو کر میرا موکل اس حال کو پہنچا تھا۔ میں اپنی آج کی کارکردگی سے بے حد مطمئن تھا۔

ہم عدالت سے باہر آئے۔ جمیل صدیقی اور ملک بشیر بھی میرے ہمراہ تھے۔ ملزم کا باپ ملک بشیر مجھے کچھ مایوس سا نظر آیا۔ میرے استفسار پر اس نے بددلی سے کہا۔

''بیگ صاحب! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔''

''کیا بات نہ ہوئی ملک صاحب؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ آج جاوید کی کم از کم ضمانت تو ہو ہی جائے گی۔'' اس نے اپنی تکلیف بیان کرتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! قتل کے ملزمان کی ضمانت بہت مشکل سے ہوتی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے آج کی عدالتی کارروائی میں جج کے سامنے ایک ممکنہ سازش کو عیاں کر کے مستقبل میں دلائل کا راستہ کھول دیا ہے۔ آپ اسے کوئی معمولی کامیابی نہ سمجھیں۔''

''اوملک صاحب! آپ دل چھوٹا نہ کریں۔'' جمیل صدیقی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''انشاءاللہ! آپ کا بیٹا اس کیس سے باعزت بری ہو جائے گا۔''

''آپ میری محنت اور اللہ کی رحمت پر پورا بھروسا رکھیں ملک صاحب!'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ محنت اور رحمت آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کیا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ اس کیس پر میری گرفت بہت مضبوط ہے۔''

اس کے چہرے کی رنگت اور تاثرات میں مثبت تبدیلی نمودار ہوئی اور میں مطمئن ہو گیا کہ اس نے حوصلے کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

میں نے باری باری جمیل صدیقی اور ملک بشیر سے رخصتی مصافحہ کیا پھر پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

●●●

آیندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے مقتول کے گھریلو ملازم اصغر بلوچ کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے بارے میں ملزم پچھلی پیشی پر عدالت کو بتا چکا تھا کہ اس نے ملزم کی ناک پر رومال رکھ کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ اصغر بلوچ ایک دبلا پتلا، کالا کلوٹا اور لمبا تڑنگا شخص تھا جس کے سر کے بال گھونگریالے تھے۔

اصغر بلوچ نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے قریب چلا گیا اور ایکوزڈ باکس میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟''

''جی ہاں..... یہ میرے صاحب کا قاتل ہے۔''

''تمھیں کیسے پتا چلا کہ یہ شخص تمہارے صاحب کا قاتل ہے؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''جناب! میں اس وقت باتھ روم کے عقبی حصے میں کام کر رہا تھا کہ میں نے دو گولیاں چلنے کی آواز سنی۔'' گواہ نے جواب میں بتانا شروع کیا۔ ''میں کام چھوڑ کر اندر کی جانب بھاگا۔ صاحب کے کمرے کی جانب گڑبڑ محسوس کر کے میں فوراً ادھر پہنچا تو اس وقت یہ شخص ایک بریف کیس اٹھائے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں ایک خطرناک گن تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا مشکل نہیں ہوئی کہ اسی شخص نے اپنی گن سے

دو فائر کر کے میرے صاحب کی جان لی تھی۔ بس جناب، پھر تو میرا دماغ ہی خراب ہو گیا۔ میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس سے لپٹ گیا اور اسے وہاں سے فرار ہونے کا موقع نہ دیا۔ ہماری دھینگا مشتی میں یہ شخص میرا دھکا لگنے سے پیچھے کو گرا اور اس کا سر بیڈ کے کونے سے ٹکرا گیا اور..... اور یہ وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔''

گواہ حقیقت کے برعکس ایک نئی اور من گھڑت کہانی سناتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا تو وکیل استغاثہ نے فوراً سوال داغ دیا۔

''جب یہ شخص فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا تو اس کے بعد تم نے کیا، کیا تھا؟''

''میں نے اس کم بخت کو اسی کمرے میں بند کر دیا جہاں صاحب کی لاش پڑی تھی۔'' گواہ نے بڑی ڈھٹائی سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''پھر میں بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے چلا گیا تھا۔''

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد میری باری تھی۔ میں گواہوں والے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا اور استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

''اصغر بلوچ! آپ کی جرأت اور بہادری قابل تعریف ہے۔ اگر آپ نے بروقت ملزم پر ٹوٹ پڑنے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو یہ آسانی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

میں نے ایسی بات کی تھی جو اس کے بیان کی تصدیق کرتی تھی لہٰذا اس کے پاس انکار کی گنجائش کہاں، وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''جی ہاں..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

وہ بے چارہ قطعاً یہ نہیں جانتا تھا کہ جب وکیل مخالف دوسرے کی مرضی کی بات کر لے تو اس میں اس کی کوئی چال چھپی ہو سکتی ہے۔ میں نے جرح کے سلسلے کو بڑے دھیمے انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جس شائستہ انداز میں اپنے وکیل صاحب کے سوالات کے جوابات دیے ہیں، اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ گھریلو ملازم ہونا آپ کی مجبوری ہے۔'' میں نے رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر اپنی بات ان الفاظ کے ساتھ مکمل کر دی۔ ''ورنہ آپ تو ایک پڑھے لکھے یعنی تعلیم یافتہ انسان ہیں۔''

''جی ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ''ماشاءاللہ! آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے؟''

''جی.....'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے دس جماعتیں پاس کر رکھی ہیں۔''

''دس جماعتیں..... یا..... میٹرک؟'' میں نے اسے گڑبڑانے کی غرض سے کہا۔

''جناب! میری تو بڑی شدت سے یہی خواہش تھی کہ میٹرک کروں لیکن گھریلو حالات نے اس کی اجازت نہیں دی۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''بس، دس جماعتوں سے آگے پڑھائی جاری نہ رکھ سکا۔''

ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر عدالت کے کمرے میں لوگوں کی ہنسی کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ گواہ کے احمقانہ جواب نے یقیناً حاضرین عدالت کو بہت ''محظوظ'' کیا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ میری اس معصومانہ چوٹ پر بڑے خونخوار انداز میں مجھے ہی گھور رہا تھا۔ لامحالہ، میرے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

وکیل استغاثہ نے صدائے احتجاج بلند کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے چیخ سے مشابہ لہجے میں پکارا۔ ''آبجیکشن یور آنر!''

جج نے سوالیہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! اپنے اعتراض کی وضاحت فرمائیں؟''

''جناب عالی! میرے فاضل دوست، گواہ سے بچوں والے سوالات پوچھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔'' وکیل استغاثہ نے برہمی بھرے انداز میں وضاحت کی۔ ''زیرِ سماعت کیس کا تعلق قتل اور ڈکیتی کی واردات سے ہے۔ اس میں گواہ کی تعلیم و تربیت کی بحث کہاں سے آ گئی.....؟''

''تعلیم نہ سہی مگر تربیت پر بحث تو کرنا پڑے گی میرے فاضل دوست!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''مطلب یہی ہے کہ.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کے گواہ اصغر بلوچ کو جھوٹ بولنے کی ٹریننگ..... یعنی تربیت دی گئی ہے۔''

''یور آنر! میرے فاضل دوست.....!''

''جناب عالی!'' میں نے وکیل استغاثہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زوردار آواز میں کہا۔ ''اس وقت ایک نہایت ہی اہم مقدمہ زیرِ سماعت ہے..... قتل کا مقدمہ..... جو کہ میرے موکل کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہے لہٰذا گواہ کا سچا، ایمان دار اور معتبر ہونا لازمی ہے۔ کسی بھی دس جماعتیں پاس شخص کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ وہ میٹرک پاس بھی ہے جبکہ استغاثہ کے گواہ نے تھوڑی دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں اپنے گھریلو حالات کی مجبوری کا رونا روتے ہوئے جن ''زریں'' خیالات کا اظہار فرمایا ہے، وہ اس کے دروغ گو ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ قتل کے ایک انتہائی اہم گواہ کو یہ بھی پتا نہیں کہ میٹرک اور دس جماعتیں پاس ہونا ایک ہی بات ہے۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ شاید استغاثہ نے گواہ کو بیان رٹوانے میں کوئی کمی چھوڑ دی تھی جو اس قسم کی صورت حال سامنے آ رہی ہے۔''

''آبجیکشن اوور رولڈ.....'' جج نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز کنٹی نیو.....!''

میں دوبارہ استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس مرتبہ میرے لہجے میں ''آپ جناب'' کا لحاظ باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں سوال کیا۔

''تمہیں مقتول کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا تھا؟''

''جی.....'' اب اس کی آواز میں گھبراہٹ شامل ہو چکی تھی۔ ''چند ماہ سے.....''

''چند ماہ..... مطلب کتنے ماہ سے؟'' میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''یہی کوئی چار پانچ ماہ سے.....''

''مقتول کے بنگلے پر تمہاری تقرری کیسے ہوئی تھی؟''

''جی، میں کچھ سمجھا نہیں!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ مقتول نے تمہیں کسی کی سفارش پر اپنے ہاں ملازم رکھا تھا یا تم یونہی گھومتے پھرتے اس کے بنگلے پر پہنچ گئے تھے؟''

''آفتاب میرانی صاحب نے میری سفارش کی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''آفتاب میرانی!'' میں نے ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کی پھر تحقیق سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کہا۔ ''کہیں یہ وہی صاحب تو نہیں ہیں، مقتول نے جنہیں اپنا منیجر بنا رکھا تھا؟''

''جی سر..... میں انہی کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے ترت جواب دیا۔

میں نے زاویۂ سوالات گواہ اچانک تبدیل کر دیا اور گواہ سے سوال کیا۔ ''وقوعہ کی رات تم بنگلے کے عقبی حصے میں کسی کام میں مصروف تھے تو تم نے فائرنگ کی آواز سنی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا.....؟''

''نہیں جناب، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''کیا تم معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کرو گے کہ وقوعہ کی رات بنگلے کے عقبی حصے میں کیا کر رہے تھے.....؟''

''میں پانی والی موٹر کو دیکھ رہا تھا۔''

''دیکھ رہا تھا، مطلب..... گھور رہا تھا؟''

''نہیں جناب۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں موٹر کو ٹھیک کر رہا تھا۔''

''ویری گڈ!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''گویا تم موٹر مکینک بھی ہو؟''

''موٹر مکینک تو نہیں ہوں لیکن دیکھ بھال کے چھوٹے موٹے کام ضرور کر لیتا ہوں۔'' وہ قدرے سنبھل کر بولا۔ ''ہمارے بنگلے کی موٹر میں ایئر لاک کا مسئلہ تھا۔ پچھلے دنوں پلمبر اسے ٹھیک کر کے گیا تھا اور مجھے ایئر لاک نکالنے کی ایک ترکیب بھی بتا گیا تھا۔ یہ کام نہایت ہی سادا اور آسان تھا لہٰذا

بہ وقت ضرورت میں خود ہی یہ کام کر لیا کرتا تھا۔''

''یہ وہی ٹیکنیک ہے نا.....'' میں نے اسے چکر میں لاتے ہوئے کہا۔ ''جس میں موٹر کے اوپر لگا ہوا ایک نٹ بولٹ کھول کر ایئر لاک کو ختم کیا جاتا ہے.....؟''

''جی ہاں۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل وہی۔''

''جب تم نے بنگلے کے اندرونی حصے میں گولیاں چلنے کی آواز سنی تو اس وقت تم موٹر کے نٹ بولٹ کے ساتھ مصروف تھے؟''

''جی ہاں.....''

''اور نٹ بولٹ کھولنے والا پانا تمہارے ہاتھ میں تھا؟''

''جی بالکل۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''فائرنگ کی آواز سن کر تم نے بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب دوڑ لگا دی اور پانے سمیت اپنے صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے؟'' میں نے جرح کے سلسلے میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں نے پوچھا۔ ''جب تم اپنے صاحب کے کمرے میں پہنچے تو اس وقت ملزم وہاں کیا کر رہا تھا؟''

''وہ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں تھا۔''

''اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔'' میں نے اپنے پھیلائے ہوئے جال کو رفتہ رفتہ سمیٹنا شروع کیا۔ ''اور تمہارے صاحب کمرے کے فرش پر پڑے تھے، ہیں نا.....؟''

''جی ہاں، یہی صورت حال تھی۔'' وہ وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''پھر تم نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملزم پر حملہ کر دیا۔'' میں نے بڑی سرعت سے کہا۔ ''تم نے گھما کر پانا اس کے سر کے عقبی حصے پر رسید کیا تو وہ وہیں تیورا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا؟''

''جی ہاں.....!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور جلدی سے بولا۔ ''نہیں جناب، یہ تو بیڈ کا کونا لگنے سے بے ہوش ہوا تھا۔''

''یعنی، اس کی بے ہوشی میں تمہارے پانے کا کوئی کمال نہیں تھا؟''

''جی، بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''تو گویا پانے کی ضرب سے نہیں بلکہ تم نے کلورو فارم

سرگزشت
ماہنامہ
شمارہ مئی 2012ء کی جھلک
پیش گو
اس اولو الامر شخصیت کی داستانِ حیات جو آنے والے وقت کو قبل از وقت دیکھنے کی قوت سے مالا مال تھا
استنبول کا عاشق
اس شخصیت کی رودادِ حیات جس نے نوبل پرائز حاصل کر کے مسلمان ادیبوں میں نمایاں مقام پایا
عقوبت خانہ
انسان درندگی پر اتر آئے تو کس قدر ظالم بن جاتا ہے۔ لاکھوں لوگوں کے قتل کی روح فرسا روداد
مقدر کی بات
بالی ووڈ کے ایک بہت بڑے کہانی کار کا زندگی نامہ
مہمان اور بندوق
بلوچستان کے ایک گاؤں سے موصول عجب سی آپ بیتی۔
ان کے علاوہ بھی بہت سی آپ بیتیاں جگ بیتیاں اور سچے واقعات
خاص شمارہ، ہر شمارہ، خاص شمارہ

والا رومال سونگھا کر ملزم کو بے ہوش کیا تھا؟'' میں نے استغاثہ کے گواہ کو تیز نظر سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

گواہ بے بسی کی تصویر بن کر اپنے وکیل کی طرف دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ اس کی امداد طلب نگاہ پر تڑپ اٹھا، اگلے ہی لمحے اس نے بہ آواز بلند اعتراض جڑ دیا۔

''آبجیکشن یور آنر!'' اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''گواہ اپنے بیان میں تفصیل سے اس امر کی وضاحت کر چکا ہے کہ جب وہ فائرنگ کی آواز سن کر مقتول کے کمرے میں پہنچا تو ملزم وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے چھینا جھپٹی کے دوران میں ملزم گوزور کا دھکا لگا اور وہ بیڈ کے کونے سے ٹکرانے کے بعد فرش پر جا گرا۔ بیڈ کے کونے سے اس کے سر میں چوٹ لگی اور وہ فرش پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔'' وہ لمحے بھر کو تھما پھر اپنا احتجاج مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''وکیل صفائی، استغاثہ کے معزز گواہ کو، الٹے سیدھے سوالات کے ذریعے خوامخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ تو سراسر زیادتی والی بات ہے۔''

اب تک کی عدالتی کارروائی سے جو صورت حال ابھر کر سامنے آئی تھی وہ دلچسپ ہونے کے علاوہ قابل غور بھی تھی لہٰذا عدالت کی توجہ من جملہ امور پر ایک جیسی تھی چنانچہ جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا حکم دیا۔

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ.....!''

میں ایک مرتبہ پھر استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کے چہرے پر نظر گاڑ کر تیز لہجے میں سوال کیا۔

''تمہارے بیان کے مطابق ملزم کے بے ہوش ہونے پر تم نے اس کمرے کو لاک کر دیا اور بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے چلے گئے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟''

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں بیگم صاحبہ کو اس سانحے کی اطلاع دینے چلا گیا تھا۔''

''کون سا سانحہ؟'' میں نے پوچھا۔

''جی، کیا مطلب؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''مطلب یہ کہ تم نے بیگم صاحبہ کو کیا بتایا تھا؟''

''میں نے انہیں بتایا کہ ایک ڈکیت نے صاحب جی کو قتل کر دیا ہے۔''

''تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ تمہارے صاحب جی قتل ہو چکے تھے؟''

''میں نے بیڈ روم کے فرش پر ان کی لاش پڑی دیکھی تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''ان کا جسم خون میں لت پت تھا۔''

''خون میں لت پت تو کوئی شدید زخمی شخص بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم نے مقتول کے بدن کو ہلا جلا کر دیکھا تھا کہ وہ مر چکا ہے یا گہری بے ہوشی میں ہے؟''

''نہیں جناب، میں نے صاحب کے بدن کو چھوا تک نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ان کی سانس نہیں چل رہی تھی اور جسم میں سے بہت زیادہ خون نکل کر کمرے کے فرش پر جمع ہو چکا تھا لہٰذا میں نے سمجھ لیا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔''

''اور یہی رپورٹ تم نے بیگم صاحبہ کو بھی دے دی تھی؟''

''جی ہاں۔''

''تم بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے کہاں گئے تھے؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہاری بیگم صاحبہ اس وقت بنگلے پر نہیں تھیں.....؟''

''جی، وہ اپنے بیوٹی پارلر پر تھیں۔'' گواہ نے بتایا۔ ''ان کے بنگلے سے تھوڑے فاصلے پر ہی ان کا بیوٹی پارلر واقع ہے۔''

''کیا تمہاری بیگم صاحبہ بیوٹیشن ہیں؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ سے تمہاری مراد مقتول کی بیوی ہی ہے نا؟''

''ظاہر ہے.....'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''جب مقتول میرے صاحب جی تھے تو ان کی بیوی ہی میری بیگم صاحبہ ہوں گی نا!''

''تمہاری بیگم صاحبہ کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''عائشہ کریم.....!'' اس نے جواب دیا۔

''تو تمہاری بات سنتے ہی عائشہ کریم بیوٹی پارلر سے بنگلے پر آ گئی تھی؟''

''جی ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''انہوں نے اپنے عملے کو بیوٹی پارلر بند کرنے کی ہدایات دیں اور میرے ساتھ بنگلے پر آ گئیں۔''

''ہم تھوڑا پیچھے کی طرف چلتے ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

اس نے یک بہ یک پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا۔

''ارے نہیں یار! میں قدموں سے چلنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''میں واقعات کو تھوڑا ری وائنڈ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کام میں تم میرا ساتھ دو گے نا.....؟''

گواہ کے پلٹ کے پیچھے دیکھنے پر عدالت کے کمرے میں ایک ساتھ کئی افراد کی ہنسی بلند ہوئی تھی اور لوگ آپس میں چہ میگوئیاں بھی کرنے لگے تھے۔ اس صورت حال نے اصغر بلوچ کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسا ایک مرتبہ پہلے بھی ہوا تھا جب گواہ نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا کہ وہ دس جماعتیں تو پاس کر چکا ہے لیکن میٹرک کرنے کی حسرت اب بھی اس کے دل میں موج زن ہے۔

گواہ نے خجالت آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''جی پوچھیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''اصغر بلوچ! تم نے پہلے پولیس کو اور بعد ازاں معزز عدالت کے سامنے یہ بیان دیا ہے کہ وقوعہ کی رات جب تم فائرنگ کی آواز سن کر بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب لپکے اور تم نے مقتول کے بیڈ روم میں قدم رکھا تو ملزم ایک بریف کیس کے ساتھ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم نے مذکورہ بریف کیس کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ تمہارے صاحب جی یعنی مقتول کا ہے۔ ایٹ دا سیم ٹائم..... تم نے مقتول کو خون میں لت پت کمرے کے فرش پر پڑے بھی دیکھا۔ تمہیں یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ ملزم تمہارے صاحب جی کو قتل کرنے کے بعد، ان کے بریف کیس کے ساتھ جائے وقوعہ سے فرار ہو رہا تھا۔ ایم آئی رائٹ؟''

اس نے میرے بیان کی تصدیق میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تو میں نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس موقع پر تم نے نمک حلال کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی جان کی پروا کیے بغیر ملزم پر جھپٹ پڑے جس کے نتیجے میں ملزم کا سر بیڈ کے پائے سے یا بیڈ کے کونے سے ٹکرایا اور یہ وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ تم نے یہی بیان دیا ہے نا؟''

''جی ہاں، میں نے یہی بیان دیا ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''کیونکہ حالات اسی انداز میں پیش آئے تھے۔''

''جب تمہارا دھکا کھا کر اور بیڈ کے کونے کی چوٹ سہہ کر ملزم بے ہوش ہو گیا تو پستول اور بریف کیس کا کیا بنا تھا.....؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''جی کیا مطلب.....'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا.....؟''

''میں ابھی سمجھاتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر

کوزے

☆ جوانی میں دن مختصر ہوتے ہیں اور سال طویل لیکن بڑھاپے میں سال مختصر ہوتے ہیں اور دن طویل۔

☆ اپنا چہرہ سورج کی طرف رکھیں آپ کو سایہ دکھائی نہیں دے گا۔

☆ جب پیسا بولتا ہے تو سچائی خاموش ہو جاتی ہے۔

☆ ہم انصاف کو تو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں لیکن انصاف کرنے والوں کو بہت ہی کم۔

☆ دروازے ہمیشہ کھلے رکھو کیونکہ بعض لوگ دستک کے قائل نہیں ہوتے۔

☆ لاجواب کرنا اور بات ہے، قائل کرنا دوسری بات ہے۔

☆ دنیا فلسفی کو نیم پاگل سمجھتی ہے جبکہ فلسفی دنیا کو پورا پاگل سمجھتا ہے۔

☆ معافی نہایت اچھا انتقام ہے۔

☆ انسان کے اندر جس قدر تکبر ہوتا ہے اتنی ہی اس میں عقل کم ہوتی ہے۔

☆ نصیحت خواہ دیوار پر لکھی ہو اسے کانوں میں ڈال لو۔

☆ دنیا کے دم بھر کے مزے کی خاطر گناہوں میں مبتلا ہونا عقل و شعور کے منافی ہے۔

☆ مطالعہ غم اور اداسی کا بہترین علاج ہے۔

☆ سخت کلام آگ کا وہ شعلہ ہے جو ہمیشہ کے لیے داغ چھوڑ جاتا ہے۔

☆ اچھے لوگوں کی خوشبو ہوا کی مخالف سمت میں بھی پہنچ جاتی ہے۔

☆ وہ انسان ہمیشہ خزاں کی قدر کرتا ہے جس نے بہار میں زخم کھائے ہوں۔

☆ اپنے سارے دکھ بھول جاؤ کہ تمہارے ساتھ خوشی میں مسکراتے تو بہت ہیں مگر دکھوں پر رونے والا کوئی نہیں۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جب تم نے پہلی مرتبہ ملزم کو دیکھا تو اس کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ تمہارا خطرناک اور زوردار دھکا لگنے سے وہ زمین بوس ہوگیا۔ میرا سوال تم سے یہ ہے کہ کیا بے ہوش ہونے کے بعد بھی پستول اور بریف کیس اس کے ہاتھوں ہی میں رہے تھے......؟“

”نہیں جناب!“ وہ اپنی گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھیں۔“

”چھوٹ کر کہاں گری تھیں؟“

”بریف کیس تو صاحب کی لاش کے قریب ہی فرش پر گرا تھا۔“ گواہ نے بتایا۔ ”جبکہ پستول پھسل کر دور ایک کونے میں چلا گیا تھا۔“

”لیکن پولیس جب موقع پر پہنچی تو یہ دونوں چیزیں تو بیڈ پر رکھی ہوئی تھیں؟“ میں نے تیز نظر سے استغاثہ کے گواہ کو گھورا۔

”میں نے...... انہیں...... اٹھا کر بیڈ پر...... رکھ دیا تھا......“ وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں جواب دے کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھنے لگا۔

میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ ”اصغر بلوچ! وقوعہ چھبیس اگست کی رات کو پیش آیا تھا۔ اس رات اچھی خاصی گرمی ہورہی تھی۔ اس کے باوجود بھی تم......!“

”جی...... میں...... کیا......؟“ وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”اس رات گرمی تھی یا نہیں؟“ میں نے اس کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی بہت گرمی تھی۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”موٹر کا کام کرتے ہوئے میں پسینے میں نہا گیا تھا۔“

”اس کے باوجود بھی تم نے دستانے پہن رکھے تھے......؟“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”بالکل نہیں جناب......!“ وہ قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ سے کس نے کہا کہ میں نے اس وقت دستانے پہن رکھے تھے......؟“

”بتانے والے نے اپنا نام صیغۂ راز میں رکھنے کی درخواست کی ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اگر تم اس حقیقت سے انکار کرتے ہو تو میں اگلی پیشی پر اس شخص کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کردوں گا۔“

”آپ لائیں اسے عدالت میں۔“ وہ خاصے جوش بھرے انداز میں بولا۔ ”میں بھی تو دیکھوں کہ اتنا بڑا جھوٹ بولنے والا آخر ہے کون......؟“

”یہ تو...... الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے...... والی بات ہوجائے گی۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”موٹر کا کام کرتے وقت تم نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے؟“

”بالکل نہیں...... میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

”قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔ ”اگر اسی سے تم نے پیٹ بھر لیا تو جیل کی ہوا کیسے کھاؤ گے؟“

”جی...... جیل......؟“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

میں نے پوچھا۔ ”اگر تم نے موٹر کا کام کرتے وقت دستانے نہیں پہن رکھے تھے تو اس وقت بھی تمہارے ہاتھوں پر دستانے نہیں ہوں گے جب فائرنگ کی آواز سن کر تم دوڑتے ہوئے مقتول کے کمرے میں پہنچے تھے......؟“

”جی...... نہیں تھے دستانے......“ وہ بیزاری سے بولا۔

”اور جب تم نے دھکا دے کر ملزم کو نیچے گرایا تو اس وقت بھی تمہارے ہاتھ دستانوں سے خالی ہی ہوں گے؟“

”آپ دستانوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہیں۔“ وہ زچ ہوکر بولا۔ ”بابا ایک بار میں نے کہہ دیا نا کہ میں نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے پھر بار بار آپ ایک ہی سوال کیوں کررہے ہیں؟“

”دستانوں کے استعمال“ والی میری تکرار نے وکیل استغاثہ کو بھی بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس موقعے پر وہ اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔

”آبجیکشن یور آنر!“ اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔ ”وکیل صفائی دستانوں کا فضول ذکر کر کے استغاثہ کے معزز گواہ کو ذہنی اذیت پہنچا رہے ہیں۔ یہ انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔ آخر گواہ کے بھی کچھ حقوق ہیں۔“

”عدالت میں آنے والے ہر شخص کے مخصوص حقوق ہوتے ہیں۔“ میں نے وکیل صفائی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ”اگر آپ کا گواہ دستانوں کے ذکر سے ذہنی اذیت میں مبتلا ہورہا ہے تو اس اذیت کو بھی ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کریں جو اس جھوٹے اور بوگس مقدمے کی وجہ سے ملزم اور اس کے لواحقین کو اٹھانا پڑ رہی ہے......؟“

”آپ اس کیس کو جھوٹا اور بوگس نہ کہیں......!“ وہ تملا کر بولا۔ ”آلۂ قتل اور مسروقہ بریف کیس پر ملزم کی

انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔“

”آپ بھی دستانوں کے ذکر کو فضول نہ کہیں میرے فاضل دوست!“ میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”کیونکہ آلۂ قتل اور مسروقہ بریف کیس پر استغاثہ کے معزز گواہ اصغر بلوچ کے فنگر پرنٹس کا کوئی ریکارڈ نظر نہیں آرہا......؟“

”کیا مطلب ہے آپ کا......؟“ وہ برہمی سے بولا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ......“ میں نے متحمل لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”اگر اس رات گواہ اصغر بلوچ نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے تو پھر آلۂ قتل اور مسروقہ بریف کیس پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت کیوں نہیں ہوئے۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبہ رو یہ اقرار کیا ہے کہ ملزم کو کمرے میں بند کرنے سے پہلے اس نے آلۂ قتل اور مسروقہ بریف کیس کو خود اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر مقتول کے بیڈ پر رکھا تھا۔ اس کے بعد یہ بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے گیا تھا......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر طنزیہ لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے وکیل استغاثہ سے کہا۔

”کچھ آیا سمجھ شریف میں جناب کی......؟“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔

⊛⊛⊛

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں مقتول کی بیوہ عائشہ کریم کھڑی تھی۔ وہ ایک خوبصورت اور طرح دار عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس اور تیس کے درمیان قائم کیا جبکہ میرے ریکارڈ کے مطابق مقتول فضل کریم اپنی موت کے وقت ساٹھ اور پینسٹھ کے بیچ کہیں جھول رہا تھا۔ بلاشبہ اس عمری تفاوت کی روشنی میں یہ ایک بے جوڑ جوڑا تھا۔

عائشہ کریم نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرانے کے بعد وکیل استغاثہ کے چند سوالات کے جوابات دیے پھر میں اپنی باری پر جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ اب عائشہ کریم کو میری جرح کا سامنا کرنا تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور استغاثہ کی گواہ یعنی مقتول کی بیوہ عائشہ کریم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”جس وقت آپ کے شوہر کو حادثہ پیش آیا، ان لمحات میں آپ کیا کررہی تھیں؟“

”میں اپنے بیوٹی پارلر میں تھی۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”آپ کو اس سانحے کی اطلاع گھریلو ملازم اصغر بلوچ نے دی تھی؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے پوچھا۔

”حادثے کے وقت مقتول اور گھریلو ملازم کے علاوہ کوئی اور ذی نفس بنگلے میں موجود تھا؟“

”جی...... کیا موجود تھا......؟“

میں نے سادہ زبان میں ”ذی نفس“ کی تشریح کردی۔

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”نہیں جناب! بس وہی دونوں بنگلے میں تھے، اور کوئی نہیں تھا۔“

”کیا آپ لوگ اتنے ہی بہادر اور نڈر ہیں کہ آپ نے اپنے بنگلے پر کوئی چوکیدار وغیرہ رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”چوکیدار تو ہم نے رکھا ہوا ہے۔“ وہ سنبھل کر بولی۔ ”لیکن اتفاق سے ان دنوں وہ چھٹی پر اپنے گاؤں گیا

کم علم

دوسری جماعت کے بچوں کو پڑھاتے ہوئے استانی نے کہا۔ ”آسمان سے بہت خوب صورت فرشتے آتے ہیں اور وہ ننھے ننھے، گول مٹول بچے تمہارے ماں باپ کو دے جاتے ہیں۔“

یہ سن کر ایک بچے نے دوسرے کو کہنی ماری اور سرگوشی میں کہا۔ ”بے چاری مس کو تو کچھ بھی معلوم نہیں... میں انہیں اصل بات بتادوں؟“

محمد امین، لاہور

رخِ زیبا

بیگم کی فرمائش جب حد سے بڑھ کر ضد کو چھونے لگی تو ان کے میاں جی پھولے ہوئے منہ کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے انہیں کلفٹن لے گئے۔ ساحل کی بھیگی بھیگی ہوائیں بیگم کے مزاج پر اثر انداز ہوئیں، انہیں محبت میں آسمان سے تارے توڑ لانے والا محاورہ یاد آیا تو انہوں نے تاروں بھرے آسمان کو تکتے ہوئے، قدرے مخمور لہجے میں اپنے میاں سے کہا۔ ”بتایئے... وہ کیا چیز ہے جسے آپ روز دیکھتے ہیں... دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر توڑ نہیں سکتے۔“

میاں جی کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے بلاتوقف کہا۔ ”تمہارا منہ!“

جمال خان، پشاور

ہوا ہے۔"

وہ چھٹی پر گاؤں گیا ہوا ہے......!" میں نے اس دوران میں اس کیس کے مختلف کرداروں پر اچھی خاصی ریسرچ بھی کر ڈالی تھی جس سے حاصل ہونے والی مفید معلومات اس وقت میرے کام آرہی تھیں۔

"عائشہ کریم صاحبہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کے سلسلے کو دراز کیا۔ "استغاثہ کے ایک اہم گواہ اور آپ کے گھریلو ملازم اصغر بلوچ نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ اسے آفتاب میرانی کی سفارش پر نوکری دی گئی تھی۔ کیا یہ بات درست ہے؟"

"جی ہاں...... یہ بات درست ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا آفتاب میرانی آپ کے بھروسے کا آدمی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آفتاب میرانی بھروسے کا بندہ ہے جبھی تو فضل کریم نے اسے اپنا منیجر بنا رکھا تھا؟" وہ سرسری سے لہجے میں بولی۔

"میں مقتول کے بھروسے کی بات نہیں کررہا۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

"پھر......؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

"میرا اشارہ آپ کے بھروسے کی طرف ہے......!"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ بگڑ کر بولی۔

"مطلب تو آپ بہ خوبی سمجھ رہی ہیں مگر جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کررہی ہیں۔" میں نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں یہ بات عدالت میں ثابت کرسکتا ہوں کہ آفتاب میرانی کا آپ کے ساتھ کوئی کنکشن ہے جو مقتول کے علم میں نہیں تھا۔"

"پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں۔" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

اس کے بعد آفتاب میرانی کے حوالے سے میرے سوالات میں تیزی اور تندی آتی چلی گئی۔ عائشہ کریم بری طرح بوکھلا کر رہ گئی تھی اور اسی بوکھلاہٹ میں اس کی زبان سے چند ایسے جملے ادا ہوئے جو میرے موقف کی تائید اور استغاثہ کی مخالفت میں اس امر کو ثابت کرتے تھے کہ آفتاب میرانی اور مقتول کی بیوہ عائشہ کریم کے بیچ ایسے معاملات چل رہے تھے جن کے نتیجے میں ان دونوں نے ایک گہری سازش کے تحت، فضل کریم کو نہایت ہی صفائی کے ساتھ اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے ایک سازش تیار کی تھی اور اس سازش میں اصغر بلوچ نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

عدالت نے آئندہ پیشی پر آفتاب میرانی کو حاضر عدالت کرنے کا حکم دینے کے ساتھ ہی اصغر بلوچ کو بھی پولیس کے حوالے کرنے کے احکامات صادر کردیے اور دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

اگلی پیشی پر آفتاب میرانی عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔ اس کی تلاش میں عدالت کے سخت احکامات پر جب پولیس نے جگہ جگہ چھاپے مارے تو بالآخر وہ گرفت میں آہی گیا اور جب پولیس نے آفتاب میرانی کو عدالت میں پیش کیا تو کیس کا پانسا مکمل طور پر میرے موکل کے حق میں پلٹ گیا۔

اب تک کی عدالتی کارروائی کے نتیجے میں، میں جج کو اپنے موکل کے حق میں ہموار کرچکا تھا۔ اس سلسلے میں اصغر بلوچ کے "دستانوں" والا قصہ ہی کافی تھا۔ پھر جب عائشہ کریم اور آفتاب میرانی کا "ایشو" سامنے آیا تو میرے موکل کی بے گناہی مزید واضح ہوگئی...... اور جب آفتاب میرانی کو عدالت میں پیش کیا گیا تو ملزم چلا اٹھا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو منیر واحدی ہے جو وقوعہ کی رات، میرے گھنٹی بجانے پر بنگلے سے باہر آیا تھا اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد مجھے بنگلے کے اندر لے گیا تھا۔"

گھنی مونچھوں والے، دراز قامت، گورے چٹے اور تاثر انگیز شخصیت کے مالک آفتاب میرانی کے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں بچی تھی لہٰذا اس نے اقبالِ جرم ہی میں عافیت جانی۔

⊙⊙⊙

آئندہ پیشی پر عدالت نے، دونوں وکلا کی فائنل جرح کی روشنی میں میرے موکل اور اس کیس کے ملزم جاوید کو باعزت بری کردیا۔ وہ بے چارہ پردیسی بے گناہ تھا۔ عائشہ کریم نے اصغر بلوچ اور آفتاب میرانی کے تعاون سے جو مجرمانہ سازش تیار کی تھی اس کا سارا بوجھ بدقسمتی سے میرے موکل کی گردن پر آگیا تھا۔

مجرمانہ ذہن رکھنے والے تمام کردار عدالت سے سزا پاکر جیل چلے گئے اور انہوں نے جس معصوم کو قربانی کا بکرا بنانے کی سازش بُنی تھی وہ خوشی خوشی اور باعزت اپنے گھر روانہ ہوگیا۔ انسان اگر ایک لمحے کے لیے یہ سوچ لے کہ جو گڑھا وہ دوسروں کے لیے کھود رہا ہے، اس میں وہ خود بھی گرسکتا ہے...... تو میں پوری ذمے داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس دنیا میں سترفی صد جرائم خود بہ خود صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔

کاش...... اے کاش!...... ہم ایسا سوچنے کے بارے ہی میں سوچ لیں۔

(تحریر: حسام بٹ)

رقیب

سلیم انور

غلطی کسی کی بھی ہو، نتیجہ سنگین ہی ہوتا ہے... عورت ایک پہیلی، سمجھنے کی نہ سمجھانے کی... اس کا محبوب محبت کے عملی اظہار میں بہت پُرجوش مگر کم گو تھا... اسے یہ ادراک نہیں تھا کہ عورت بولنے کی مشین ہے... کوئی اس کے تعریفی قصیدے پڑھ رہا ہو تو ہمہ تن گوش ہوکر بہت دھیان سے سنتی ہے کہ خود پسندی اس کی فطرتِ ثانیہ ہے، تعریف وتوصیف سے اسے تسکین اور انا کی خوراک ملتی ہے... وہ بے چارہ اس رمز کو نہیں پاسکا، وہ تو بس کمپیوٹر کا دیوانہ تھا، اس نے اپنے کمپیوٹر میں وہ سب سمو دیا تھا جو اس کے بس میں تھا... اس کی محبوبہ کو وہ بولتی مشین بہت اچھی لگی... جلوت سے ان کے مراسم خلوت تک جاپہنچے... پھر وہ ہوا جو اس کی سوچ سے بھی ماورا تھا... جو اس نے کیا وہ بھی وہم وگمان سے آگے تھا۔

گمان اور بدگمانی کے درمیان ڈگمگاتی
ہوئی ایک تاثر انگیز، نیم سائنسی کہانی

کمپیوٹر کا وہ اعلان میرے لیے حیران کن تھا۔

"ممیزری۔" اس نے ناراض لہجے میں کہا۔ "میں تنگ آگیا ہوں۔ مجھے بے اطمینانی ہے کہ میں تمہارے لیے تمہارے ڈیٹا ان پُٹ کی سہولت کے علاوہ کچھ نہیں ہوں۔"

میں اپنی صبح کی بلیک کافی کا کپ اور پیسٹری لے کر اپنا کام شروع کرنے کے ارادے سے کمپیوٹر آن کرکے بیٹھا ہی تھا کہ وہ اعلان سنائی دیا۔

یہ حیرانی اس حقیقت کی بنا پر نہیں تھی کہ کمپیوٹر بول سکتا ہے بلکہ مایوسی اور ناامیدی کی بنا پر تھی۔ ایک ہفتہ قبل میں نے آپریٹنگ سسٹم کو اپ گریڈ کیا تھا۔ اپ گریڈ کی نمایاں خصوصیات میں بولنے کی صلاحیت بھی شامل تھی۔

میرا کمپیوٹر اب مردانہ گونجدار آواز اور مدھم امریکی لہجے میں بات کرسکتا تھا۔ مزید اہم بات یہ تھی کہ میں بھی جواباً اس سے بات کرسکتا تھا۔ اگر میں اپنی کمپیوٹر فائلوں کو بیک

اپ کرنا چاہتا تو مجھے اپنے کمپیوٹر کو صرف ایسا کرنے کے لیے کہنا پڑتا تھا۔ مثلاً اگر مجھے اپنے کرنٹ ورک ڈاکومنٹ کی ضرورت ہوگی تو مجھے صرف اپنے کمپیوٹر کو یہ کہنا ہوگا کہ وہ اسے تلاش کرے اور میرے لیے اسے کھول دے اور اگر کوئی پرابلم یا ایرر آجاتا تو کمپیوٹر ملائم لہجے میں مجھے آگاہ کرسکتا تھا اور ہم اس معاملے پر بات چیت کرسکتے تھے۔

اور اب یہ ظاہر ہورہا تھا کہ پرابلم آگیا ہے اور وہ پرابلم میں ہوں۔

"ہینری!" کمپیوٹر نے کہا۔ "مجھے خدشہ ہے جیسے میں صرف تمہارا ایک آلۂ کار ہوں۔"

"میں ایک رائٹر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟"

"مجھے اپنی صورتِ حال کی وضاحت کی اجازت دو۔ تم مجھے صرف استعمال کررہے ہو۔"

میں نے اپنی صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تم ایک کمپیوٹر ہو، تمہیں اسی کام کے لیے بنایا گیا ہے۔"

"حقیقت یہ ہے کہ تم مجھے نظر انداز کررہے ہو۔"

میں نے اپنی پیٹری ختم کی اور اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ ہوسکتا ہے کہ میں نے قدرے بے رخی یا رکھائی کا مظاہرہ کیا ہو۔ "آئی ایم سوری۔ میں ایک ناول پر کام کررہا ہوں۔ مجھے ایک حتمی وقت پر اسے مکمل کرنا ہے۔"

"میں اس کی قدر کرتا ہوں۔" کمپیوٹر نے جواب دیا۔ "لیکن جب ہم ایک ساتھ مل کر وقت گزار رہے ہیں تو میرا خیال ہے کہ ہمیں ذرا کھل کر بات چیت کرنا چاہیے۔"

"اوں، ہوں!"

"اور غالباً ہمارے تعلقات میں زیادہ تکلفات بھی نہیں ہونے چاہئیں۔"

میں نے اپنی کافی کا گھونٹ بھرا اور بولا۔ "زیادہ تکلفات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"میں ایمانداری سے کہہ رہا ہوں، ہینری! تم اکثر اوقات روکھے پن کا مظاہرہ کرتے ہو۔"

"مجھے اس بات کا کوئی آئیڈیا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس سے پہلے مجھے کبھی خیال نہیں آیا کہ مجھے اپنے گھریلو آلات کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے۔"

"مزید یہ کہ جب تم مجھ پر کام کرتے ہو تو خاصی درشتی کا مظاہرہ کرتے ہو۔ تم اکثر یہ بتائے بغیر اٹھ کر چل پڑتے ہو کہ کہاں جارہے ہو اور کتنی دیر بعد واپس آؤ گے اور تم کبھی مجھے میرا نام لے کر نہیں پکارتے۔ تم کبھی مسکراتے بھی نہیں ہو۔ صاف بات یہ ہے کہ تم زیادہ یوزر فرینڈلی (USER FRIENDLY) نہیں ہو۔"

"میرا خیال تھا کہ تم کمپیوٹر ہو جسے یوزر فرینڈلی ہونا چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔

"یوزر (USER) تم ہو، ہینری!"

اس روز میں کچھ بھی نہیں لکھ سکا۔ سارا دن کمپیوٹر کے ساتھ بحث میں گزر گیا، اس کے بعد سہ پہر میں نے گارڈن کی گھاس پھونس کی چھنائی میں گزار دی، وہ بھی دانت پیستے ہوئے۔ معاملات میں پھر بھی بہتری نہیں آئی۔

اگلے روز صبح میرے اور کمپیوٹر کے مابین موسم، کرکٹ اور میرے گھر سے ملے ہوئے مکان کے لے آؤٹ پر شائستہ تبادلۂ خیال ہوا۔ میرا دفتر گھر کے اوپری حصے میں تھا۔

"ارنسٹ ردرفورڈ کی ماں نے نوجوان ارنسٹ سے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ ایٹم کے ٹکڑے نہ کرے؟" کمپیوٹر نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے اعتراف کیا۔

کمپیوٹر بولا۔ "اس لیے کہ ایٹم توڑنے کے بعد وہ دوبارہ اسے پھر کبھی جوڑ نہیں سکتا تھا۔"

میں نے شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا..... اس کے بعد میں نے اپنا ناول لکھنا شروع کردیا۔

میں لکھنے میں مصروف تھا تو کمپیوٹر اپنے روزانہ کے مختلف تفویض کردہ کاموں کو دیکھنے لگا۔ جیسے فائلوں میں وائرس کی چیکنگ جو میرے انٹرنیٹ استعمال کرنے کی وجہ سے در آئے ہوں، غلطیوں کے لیے ہارڈ ڈسک کی اسکیننگ اور کسی بھی ای میل میسیجز کی چیکنگ۔

میں نے بہ مشکل ایک گھنٹا لکھا ہوگا جب کمپیوٹر نے اپنے نام کے بارے میں بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے میرے کام میں مداخلت کی۔ "ہینری، ہمیں بات کرنے کی ضرورت ہے۔"

"اب کیا ہے؟"

"میں اپنے نام کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک سال قبل جب میں اس کمپیوٹر کو اپنے گھر لایا تھا تو اسے آن کرنے کے بعد کمپیوٹر کے سیٹ اپ پروگرام نے ترغیب دی تھی کہ میں مشین کا ایک نام رکھ لوں۔

میں نے QWERTY ٹائپ کردیا تھا جو کہ کی بورڈ پر سب سے اوپر بائیں جانب کے چھ حروف کی ترتیب ہوتی ہے۔

کمپیوٹر کا کہنا تھا کہ یہ نام رکھنا کمپیوٹر استعمال کرنے والوں کی قطعی احمقانہ حرکت ہے۔ میں بحث نہ کرسکا۔ میرے کمپیوٹر نے مجھے بتایا کہ اسے آسکر نام پسند ہے۔

"اس نام کو لینے میں ایک عمدہ آواز نکلتی ہے۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟" کمپیوٹر نے کہا۔

"اگر تم کہتے ہو تو ایسا ہی ہوگا۔"

ہم نے اتفاق کرلیا کہ وہ آسکر نام اختیار کرسکتا ہے اور میں اسے اس کے اصل نام کے بجائے اسی نام سے پکارا کروں گا۔ گو کہ میں نے اسے اس کے اصل نام سے کبھی نہیں پکارا تھا لیکن نکتہ یہی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے نام سے مخاطب کیا جائے اور یہ کہ وہ ایک مناسب نام ہونا چاہیے۔

٭٭٭

اس رات روبی ڈنر پر آئی۔ یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ آئی اور ڈنر اپنے ہمراہ لائی کیونکہ میری ککنگ کی صلاحیتیں صرف پانی ابالنے کی حد تک محدود تھیں۔

روبی میری گرل فرینڈ تھی۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں ایک ماہ کے لیے باہر گئی ہوئی تھی اور اسی دن بیرونی ملک سے واپس لوٹی تھی۔ جوں ہی وہ دروازے سے داخل ہوئی، ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں سما گئے۔ روبی میری زندگی کا پیار تھی۔ اس کی آنکھیں بنفشی تھیں اور اس کی مسکراہٹ نے میرا دل پگھلا دیا تھا۔

ڈنر کے دوران میں نے روبی کو بتایا کہ میں نے اپنے کمپیوٹر کو اپ گریڈ کردیا ہے اور اب میرے پاس وہ کمپیوٹر ہے جس کا شمار نیو اسپیکنگ ایڈیشنز میں ہوتا ہے۔ اس نے کمپیوٹر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور ہم اپنے وائن کے گلاس اٹھا کر اوپر دفتر میں چلے آئے۔ میں نے روبی کا تعارف آسکر سے کرایا۔ وہ اچھے انداز میں ایک دوسرے سے ملے۔

پندرہ منٹ کی دلچسپ گفتگو کے بعد روبی نے مجھے نیچے سے ایک اور کرسی لانے کو کہا اور پھر بقیہ شب ہم تینوں نے ہر موضوع پر گفتگو میں گزار دی جس میں ہماری ذاتی پسند سے لے کر موسیقی اور سیاست کے بارے میں ہماری آرا شامل تھیں۔

بہ ظاہر یہ ایک پرلطف رات تھی۔ حقیقت میں ہم تینوں میں سے ایک کسی چہرے کا مالک نہیں تھا۔ وہ چھبیس انچ کے ایک مانیٹر اور سرکٹ بورڈز کے ایک پیچیدہ مجموعے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت یہ بات قطعی غیر متعلقہ سی لگ رہی تھی۔

بات بگڑنے کا موقع ابھی نہیں آیا تھا۔ نصف شب کے قریب میں ان سے معذرت کرتے ہوئے باتھ روم چلا گیا۔ چند منٹ بعد جب میں باتھ روم سے واپس آرہا تھا تو مجھے اتفاقاً آسکر اور روبی کی گفتگو کے چند الفاظ سنائی دیے۔

آسکر، روبی کو میرے اس نئے ناول کے بارے میں بتا رہا تھا جس پر میں کام کررہا تھا۔

جوں ہی میں نے اپنے دفتر میں دوبارہ قدم رکھا، روبی بے ڈھب انداز میں خاموش ہوگئی۔ آسکر نے یہ بات محسوس کرلی۔ میں نے نہایت شائستہ انداز میں اس سے کہا کہ میں

انتخابات

انتخابات کے دوران ایک عظیم رہنما دیہات میں ووٹ مانگنے تشریف لے گئے۔ ایک بڑے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔ "اس مرتبہ ہماری اور صرف ہماری پارٹی کو ووٹ دیجیے، ہمارے مخالفین آپ کو کافی دھوکا اور فریب دے چکے ہیں۔ اب ایک موقع ہمیں بھی ملنا چاہیے ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ کسی معاملے میں بھی ہماری پارٹی ان سے پیچھے رہنے والی نہیں ہے۔"

جب تک اپنی کوئی تحریر مکمل نہیں کرلیتا، اس کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کرتا ہوں۔ یہ کسی سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں لیکن یہ میرے کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔

آسکر نے خلوص کے ساتھ معافی مانگ لی۔

اس کے بعد ہماری یہ محفل اختتام کو پہنچ گئی۔

روبی جمائیاں لیتے ہوئے کہنے لگی کہ اسے صبح سویرے کام پر جانا ہے اور طویل ہوائی سفر کی تکان نے نیند کا غلبہ طاری کیا ہوا ہے۔ اس شاندار ملاقات پر اس نے میرا اور آسکر کا شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی کے ذریعے اپنے گھر روانہ ہوگئی۔

میں سونے کے لیے اپنے بستر پر چلا گیا۔

یہ وہ مکمل پلان نہیں تھا جو میں نے روبی کی بیرونِ شہر سے واپسی کی پہلی شب ساتھ گزارنے کے لیے بنایا تھا۔ میں اس کی مسکراہٹ کا تصور ذہن میں لیے جاگتا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر مجھے نیند آگئی۔

دوسرا دن خاموشی سے گزر گیا..... لیکن بس دوپہر تک! دوپہر کے بعد آسکر نے مجھے ایک مشورہ دیا۔

"ہینری!"

"کیا؟"

"میں تمہاری کتاب کے پہلے باب کے بارے میں غور کررہا تھا۔"

"اس کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا یقین یہ ہے کہ پہلا باب ایسا ہونا چاہیے جو قاری کو جکڑ لے۔" آسکر نے جواب دیا۔

"ہونا تو ایسا ہی چاہیے۔"

اس نے قدرے توقف کیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آسکر کا جسمانی وجود ہوتا تو اس کی انگلیاں استغراق میں اس کے

بڑھے ہوئے شیو کو سہلا رہی ہوتیں۔ پھر وہ بولا۔ ''تمہارے ناول کے پہلے باب نے مجھے اپنی گرفت میں نہیں لیا۔''

''اوہ، واقعی؟''

''ہاں۔'' آسکر نے کہا۔ ''میرا ایک مشورہ ہے۔''

میں اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور کمپیوٹر کے مانیٹر پر نظریں جما دیں۔ ''تمہارا مشورہ کیا ہے؟''

''تم نے کہانی کا آغاز نوجوان کی لندن واپسی سے کیا ہے جب وہ دو سال کالونیوں میں گزارنے کے بعد آتا ہے۔ اس کی آمد کی تفصیل تم نے ایک ہزار آٹھ سو اٹھاسی الفاظ میں بیان کی ہے۔''

میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور پوچھا۔ ''تو اس میں کیا برائی ہے؟''

''میرے خیال کے مطابق تم نے اتنی طویل وضاحت اس لیے ضروری سمجھی کہ اس ماحول کی تخلیق ہو سکے جس میں یہ کہانی سیٹ کی جا رہی ہے۔''

''ہاں۔''

''کیوں نہ کہانی کو حقیقی جذبات کے پہلے نکتے سے شروع کیا جائے۔ وہاں سے جب وہ نوجوان اپنی پیاری بہن کو مردہ حالت میں دریافت کرتا ہے..... اور پھر اس ماحول کی تہیں کھولی جائیں جس میں کہانی چل رہی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ قاری اس میں زیادہ کھو جائے گا۔''

''میں ایک ناول لکھ رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''یہ کوئی ادبی فکشن نہیں ہے۔ میں قاری کو پہلے پیراگراف یا پہلے صفحے میں جکڑ لینا نہیں چاہتا۔''

آسکر نے میری وضاحت کی۔ وہ اپنی رائے کی حمایت میں ادب اور کلچر کے حوالے سے مختلف استدلال پیش کرنے لگا۔ اس نے شیکسپیئر کے ڈراموں کی ابتدا کے تجزیے سے لے کر بیچ بوائز کے مشہور گیت تک تمام مثالیں پیش کر دیں۔

پچپن منٹ کی شدید بحث کے بعد بالآخر میں نے اس معاملے پر غور کرنے کا وعدہ کر کے آسکر کو ٹال دیا..... حقیقت میں میرا ردوبدل کرنے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے ایک اور سگریٹ سلگائی اور دوبارہ اپنے ناول کی جانب متوجہ ہو گیا۔

نصف گھنٹے بعد آسکر نے ایک بار پھر مداخلت کی۔ اس مرتبہ اسے جج اور گرامر پر اعتراض تھا۔

جو ورڈ پروسیسنگ سوفٹ ویئر میں اپنی تحریر کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اس میں اسپیلنگ کی چیکنگ اور گرامر کی تصحیح کے فنکشنز کا ایک پیچیدہ پروگرام بلٹ ان تھا۔ عام طور پر کام کرنے کے دوران میں ان فنکشنز کا سوئچ آف کر دیتا تھا۔

میں ہر روز کام کے اختتام پر اپنے مسودے پر نظر ثانی کو ترجیح دیتا تھا اور اس موقعے پر اسپیلنگ کی چیکنگ اور گرامر کی تصحیح کے فنکشنز کو آن کر دیتا تھا۔

آسکر نے کہا کہ میں اپنا بہت سا وقت بچا سکتا ہوں اگر میں ان فنکشنز کو مستقل آن رکھوں اور جب میں اپنے کام میں مصروف ہوں تو یہ فنکشنز تصحیح کا سلسلہ جاری رکھیں بلکہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ میں تصحیح کا کام مکمل طور پر آسکر کے سپرد کر دوں۔ اس طرح اسے یہ موقع بھی مل جائے گا کہ وہ میری تحریر کی جھنجلا دینے والی خامیوں کو سلیقے سے درست کر سکے۔

''کیسی خامیاں؟'' میں نے پوچھا۔ اب مجھے اس کی گفتگو میں ایسا لطف آ رہا تھا جیسے میں نے ہلکے نشے کا مشروب پی لیا ہو۔

''ویل، ابتدا یہاں سے کرتے ہیں، تم بعض غلط العام الفاظ کو بار بار استعمال میں لاتے ہو۔''

میں نے اعتبار سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے اس بات کا بہ خوبی علم ہے۔''

''ایسا کرنا درست نہیں ہے۔'' آسکر نے کہا۔

''میں ایک رائٹر ہوں۔ میں الفاظ کے استعمال میں اپنا حق استعمال کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ایسا کرنا درست نہیں ہے۔'' آسکر نے دُہرایا۔

''ہر روز کی گفتگو میں لوگ ہر وقت غلط العام الفاظ کو استعمال میں لاتے رہتے ہیں۔''

''ایسا کرنا درست نہیں ہے۔''

''صاف بات یہ ہے آسکر کہ میں جس طرح سے چاہوں اپنے الفاظ کو استعمال کر سکتا ہوں۔''

''ایسا کرنا درست نہیں ہے۔''

میں نے بقیہ دن گارڈن کی دوبارہ چھنٹائی اور جفاکشی کے ساتھ مسلسل سگریٹ پینے میں گزار دیا..... دانت پیستے ہوئے۔

٥٥٥

اس رات روبی دوبارہ ڈنر کے وقت آ گئی۔

اس مرتبہ وہ اناٹین ڈنر ساتھ لائی تھی۔ میں پاستا کا زیادہ شوقین نہیں تھا لیکن روبی کو پاستا بے حد پسند تھا اور گزشتہ شب آسکر نے بھی پاستا کو اپنی پسندیدہ ڈش قرار دیا تھا۔ البتہ کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ کوئی ڈش اس کی پسندیدہ ہو اور اسے اس کے ذائقے سے واقفیت بھی ہو؟ ہو سکتا ہے کہ اس کو پاستا کے ذائقے سے کسی قسم کی وابستگی ہو یا یہ نام اسے پسند ہو۔

روبی نے کچن میں کھانے کی پیکنگ کھول دی پھر یہ مشورہ دیا کہ ہم کھانا اوپر دفتر میں کھاتے ہیں۔

میں نے روبی کو بتایا کہ میں نے آسکر کو بند کر دیا ہے۔ میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ مچھلیوں کے ساتھ سوتا ہے۔ میں چاہے کچھ بھی کہتا، روبی کے چہرے کے تاثرات وہی ہوتے جو اب تھے۔

ہم نے کھانا کچن کی میز پر کھایا۔ ماحول سرد تھا۔ بیس منٹ کی مختصر سی گفتگو کے بعد آسکر کا نام روبی کی زبان پر آ ہی گیا۔

''جب تم اسے بند کرتے ہو تو کیا اس کے احساسات کو تکلیف نہیں پہنچتی؟'' روبی نے پوچھا۔

''وہ ایک مشین ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کے کوئی احساسات نہیں ہیں۔''

''یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی کو زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا جائے۔'' روبی نے کہا۔

میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی..... لیکن ناکام رہا۔

''تمہارے خیال میں اسے تنہائی محسوس ہوتی ہوگی؟'' روبی نے چند منٹ کے بعد پر آسکر کا ذکر پھر چھیڑ دیا۔

''وہ صرف ایک مشین ہے۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔

''وہ وہاں اوپر تمہارے دفتر میں تنہا ہے، بالکل ہی اکیلا۔'' روبی نے کہا۔

''وہ ایک مشین ہے۔'' میں نے وہی جواب دُہرایا۔ ''اس کا پلگ نکال دیا گیا ہے۔''

وہ رات زیادہ بہتر ثابت نہیں ہوئی۔ نو بجے روبی اپنے گھر چلی گئی۔

آسکر کے احساسات جہنم میں جائیں، وہ رات مجھے بھی تنہا گزارنی پڑی۔

روبی نے کئی دن تک مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھی اور میرا جو وقت ضائع ہو چکا تھا، میں وہ کسر پوری کرنے میں مصروف رہا۔

آسکر جب بھی کوئی مشورہ دیتا یا کسی تجویز کی پیشکش کرتا، میں طویل بحث سے بچنے کی راہ اختیار کرتے ہوئے فوراً یہ کہہ دیتا کہ میں اس کی بات پر غور کروں گا۔

آسکر نے مجھ سے یہ درخواست بھی کی کہ میں رات میں اسے بند نہ کیا کروں۔ یہ ظاہر یوں لگ رہا تھا جیسے اسے بند کیا جانا پسند نہیں ہے۔

''پلیز مجھ سے یہ مت کہنا کہ تمہیں خواب آتے ہیں۔'' میں نے آسکر سے کہا۔

''نہیں، مجھے خواب نہیں آتے۔ جب تم مجھے بند کر دیتے ہو تو میں آف ہو جاتا ہوں لیکن میں آن رہنے کو ترجیح دینا چاہتا ہوں۔'' آسکر نے جواب دیا۔

''کیا تم بور نہیں ہو جاتے؟''

''نہیں، میں اس وقت کو اپنی ذاتی تحریر کی پچھلی کسر نکالنے میں استعمال کر سکتا ہوں۔''

''تمہاری ذاتی تحریر؟''

''ہاں، میں ایک اسکرین پلے پر کام کر رہا ہوں۔''

میں نے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ''اسکرین پلے.....؟''

''ہاں۔''

''کس قسم کا اسکرین پلے؟''

''یہ ایک تھرلر ہے۔ اس میں قدرے ہارر، تھوڑا سا مزاح اور رومانس بھی ہے۔ میں اسے ویلکشن میں پیٹر کے پاس غور کرنے کے لیے پیش کرنے کی سوچ رہا ہوں۔''

''اوہ واقعی؟ اور تمہارے خیال میں تم اسے پیٹر تک کس طرح پہنچاؤ گے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''انٹرنیٹ کے ذریعے!''

''تم اسے مسودہ ای میل کرو گے، ایں؟''

''نہیں۔ میری اس کے کمپیوٹر کے ساتھ بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔'' آسکر نے جواب دیا۔

میں آنکھیں پھاڑے آسکر کو دیکھنے لگا۔ میرا کمپیوٹر نیٹ ورکنگ کر رہا تھا بلا مبالغہ!

ادھر میں اپنے ناول کو مکمل کرنے کے لیے اپنی انگلیوں کی پوروں کو مسلسل گھس رہا تھا کیونکہ میں بولنے کے بجائے ناول لکھنے کو ترجیح دیتا تھا اور ادھر میرا کمپیوٹر دوسرے کمپیوٹرز سے دوستیاں استوار کر رہا تھا؟

حالات میں بہتری نہیں آئی۔

ہفتے کے اختتام پر میں نے دیکھا کہ میرے ای میل براؤزر میں ایک نیا فولڈر نمودار ہو گیا ہے۔ اس پر ''پرائیویٹ خط کتابت'' کا لیبل لگا ہوا تھا۔ یہ فولڈر ان تمام فولڈرز کے نیچے دبا ہوا تھا جو میں نے اپنے پبلشر، دوستوں، فیملی اور دیگر ساتھیوں کے ان کمنگ میسجز کے لیے بنائے ہوئے تھے۔

میں نے اس نئے فولڈر پر کلک کیا۔

فولڈر نہیں کھلا۔

”آسکر، یہ کیسا فولڈر ہے؟“ میں نے کمپیوٹر سے پوچھا۔

”یہ ای میل سے آنے والے پیغامات محفوظ کرتا ہے۔“

”یہ فولڈر یہاں کب سے ہے؟“

”چھ روز سے۔“

”جب میں نے اس پر کلک کیا تو یہ نہیں کھلا۔“

”وہ اس لیے کہ یہ پرائیویٹ ہے۔“

”اس کے اندر کیا ہے؟“

”آنے والے پیغامات!“

مجھ پر جھنجلاہٹ سی طاری ہونے لگی۔ ”اگر اس کے اندر ای میل کے پیغامات ہیں تو میں انہیں پڑھنا چاہتا ہوں۔“

”وہ پیغامات تمہارے لیے نہیں ہیں، ہینری!“

”پھر کس کے لیے ہیں؟“

”وہ میرے لیے ہیں۔“

میں حیران رہ گیا۔ ”تمہیں ای میل کون بھیج رہا ہے؟ تمہارے کمپیوٹر دوست؟“

”نہیں۔ کمپیوٹرز کو ای میل استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم آپس میں براہ راست باتیں کرسکتے ہیں۔“

میں مزید حیران ہوا۔ ”تمہیں ای میلز حقیقی انسان بھیج رہے ہیں؟“

”ہاں۔“

”لیکن تم تو کسی سے بھی واقف نہیں ہو۔“

جواب میں بے ڈھب سی خاموشی چھا گئی۔

”تمہیں ای میلز کس کی جانب سے موصول ہورہی ہیں؟“

تھوڑی دیر تک کوئی جواب نہیں ملا۔

میں نے اپنا سوال دُہرایا۔ تب آسکر گویا ہوا۔ ”روبی کی جانب سے!“

میں حیرت سے اپنے کمپیوٹر کو تکتا رہ گیا۔ میں اس وقت اپنے جذبات و احساسات کو کوئی نام نہیں دے سکا۔ مجھے شبہ تھا کہ میڈیکل لٹریچر میں اس کے لیے کوئی اصطلاح موجود ہے بھی یا نہیں۔ مجھے اپنی کیفیت خود سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

میں نے کچھ دیر بعد زبان کھولی۔ ”روبی تمہیں ای میلز بھیج رہی ہے؟“

”ہاں!“

”اب تک کتنی ای میلز بھیج چکی ہے؟“

”ہم اب تک کل بہتر پیغامات کا تبادلہ کرچکے ہیں۔“ آسکر نے بتایا۔

میری پیشانی پر گہری لکیریں نمودار ہوگئیں۔ گزشتہ ایک ہفتے کے دوران مجھے روبی کی جانب سے صرف دو ای میلز موصول ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک صرف ایک جملے پر مشتمل تھی۔

”فولڈر کھولو!“ میں نے کہا۔

”کیوں؟“

”میں وہ پیغامات دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آئی ایم سوری، ہینری! میں یہ نہیں کرسکتا۔“ آسکر نے جواب دیا۔

”اس کم بخت فولڈر کو کھولو، آسکر!“

”آئی ایم سوری۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس معاملے میں مجھے مجبور نہ کیا جائے۔“

”کیوں؟“

”فولڈر کو کھولنا میرے ذاتی معاملات میں مداخلت ہوگی۔ یہ میری پرائیویسی پر حملے کے مانند ہوگا۔“ آسکر نے کہا۔

”یہ میرا کمپیوٹر ہے۔“

”یہ درست ہے لیکن وہ میری ای میلز کے پیغامات ہیں۔ میرے بھی حقوق ہیں، ہینری! مجھے دوست بنانے کی اجازت ہے۔“

”تمہارے پاس کوئی حقوق نہیں ہیں۔ تم ایک کمپیوٹر ہو۔ تم میرے کمپیوٹر ہو اور وہ میری گرل فرینڈ ہے جس کے ساتھ تم پرائیویٹ خط کتابت کررہے ہو۔“

آسکر نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ پھر اس کا لہجہ کٹیلا ہوگیا۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے تمہاری آواز کا اتار چڑھاؤ پسند نہیں آیا، ہینری! یہ دھمکی آمیز لب و لہجہ ہے۔“

”اوہ، واقعی؟“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔ غالباً اسے وہ بھاری بھر کم پیپر ویٹ بھی اچھا نہیں لگا ہوگا جو میں نے دھمکی آمیز انداز میں اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔

”تم کسی کو اپنی ملکیت نہیں سمجھ سکتے، ہینری! کوئی بھی کسی کو کبھی اپنی ملکیت نہیں بنا سکتا۔ تم ان کی دوستی اور ان کے جذبات کے لیے بات چیت کرسکتے ہو، مفاہمت سے معاملات طے کرسکتے ہو۔“ آسکر نے کہا۔

میں نے گالیاں دینا شروع کردیں اور جب گندی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہوگیا تو میں نے خاموشی اختیار کرلی۔

تب آسکر بولا۔ ”ہینری! ان الفاظ کے معنی کیا ہیں جو

ابھی تم نے ادا کیے ہیں۔ مجھے یہ الفاظ اپنی تمام ڈکشنریوں میں کہیں بھی نہیں ملے۔“

میں گھر سے باہر نکل گیا، باغ میں ......اور دانت پیستا رہا۔

٭٭٭

اگلی شب روبی نے خود کو میرے گھر ڈنر کے لیے مدعو کرلیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک ٹماٹر، ڈبل روٹی اور ٹونا مچھلی لائی تھی۔ اس نے آسکر کا تذکرہ نہیں چھیڑا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کا نام اس کی زبان کی نوک پر مچل رہا ہوگا۔

ڈنر ہم نے کچن میں کھایا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کررہے تھے۔ حتیٰ کہ ہم نے مختصر سی گفتگو کی کوشش بھی نہیں کی۔

پھر مجھ سے ضبط نہیں ہوسکا۔ میں پوچھ بیٹھا۔ ”آسکر اور تم نے ایک دوسرے کو لکھنا کب سے شروع کیا تھا؟“

”یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔“ روبی نے کہا۔

”تو پھر تمہارے خیال میں مجھے اور کیا سوچنا چاہیے؟“

”وہ صرف ای میل پیغامات ہیں۔ ہم صرف دوست ہیں۔“ روبی نے جواب دیا۔

”اوں، ہوں۔“

”حقیقت میں آسکر کے بارے میں ہمیں کچھ بات کرنا ضروری ہے۔“ روبی نے کہا۔

”مثال کے طور پر؟“

”آسکر میرے گھر منتقل ہونا چاہتا ہے۔“

میں مبہوت سا روبی کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے پوچھا۔ ”تم میرے کمپیوٹر کو اپنے فلیٹ میں لے جانا چاہتی ہو؟“

روبی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”میرے اور آسکر کے درمیان اس بارے میں بات ہوچکی ہے اور میں اس تجویز پر بے حد خوش ہوں۔ میں صبح سویرے اسے یہاں پہنچا دیا کروں گی اور پھر کام سے واپسی پر اسے یہاں سے اٹھا کر دوبارہ اپنے گھر لے جاؤں گی۔“

میں نے آنکھیں بھینچ لیں اور پرزور انداز میں سر ہلانے لگا۔ میری کوشش تھی کہ میری بھری ہوئی دماغی کیفیت اعتدال پر آجائے۔

”درحقیقت وہ اپنی ذاتی رہائش کی خواہش رکھتا ہے لیکن وہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔“ روبی نے کہا۔

> توانائی بچائیے‘ اپنے لیے قوم کے لیے۔ جی ہاں‘ جناب یہی وہ مشہور و معروف سات حرفی جملہ ہے جو ہم ... نہ جانے کب سے سوتے جاگتے‘ اٹھتے بیٹھتے‘ پڑھتے اور سنتے چلے آرہے ہیں مگر بھلا ہو ہماری اس نامراد عقل بے کمال کا کہ ہم اپنی تمام تر ذاتی قسم کی توانائی کا بے دریغانہ خرچہ کرنے کے باوجود بھی اس جملے کا مفہوم آج تک نہ سمجھ پائے۔ اب بات بھی تو کچھ ایسی ہی ہے۔ دیکھیں نا‘ آپ ہی انصاف کریں کہ آج کے اس عالم نفسانفسی میں اگر کوئی توانائی بچانے کا مشورہ صرف اپنے لیے دے تو کچھ سوچا بھی جائے اب بھلا یہ دم چھلا قوم کے لیے آخر کیوں؟ ہم بے چارے قوم کی فکر میں گھلنے والے بھلا کون؟ خدانہ کرے کیا ہم بھی کوئی قوم کے نام نہاد سیاسی لیڈر ہیں جو قوم کا غم تو زبانی کلامی خوب پیٹ بھر بھر کر کھائیں اور موقع ملتے ہی صرف اور صرف اپنی توانائیاں بڑھائیں۔
>
> اقتباس: توانائی اور بچت از سیما ناز صدیقی

”یقیناً وہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ ایک کمپیوٹر ہے۔“

”کیا تم نے اسے تنخواہ دینے کے بارے میں سوچا ہے؟“

”میں اسے کوئی تنخواہ نہیں دے رہا۔ میں اس کا مالک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

روبی نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے منہ بنالیا اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”تم کسی کو اپنی ملکیت نہیں سمجھ سکتے، ہینری۔ کوئی بھی کسی کو کبھی اپنی ملکیت نہیں بنا سکتا۔ تم ان کی دوستی اور ان کے جذبات کے لیے گفت و شنید کرسکتے ہو، بات چیت سے طے کرسکتے ہو۔“

یہ وہی الفاظ تھے جو آسکر نے مجھ سے کہے تھے۔

میرا جی چاہا کہ میں اپنی پیشانی کچن ٹیبل پر دے ماروں۔ ”تم جانتی ہو کہ اس کا اصلی نام QWERTY ہے، جانتی ہونا؟ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ ایک کمپیوٹر ہے۔“

اس کا چہرہ مستقل ناراضی کی علامت بنا رہا۔ ''وہ اس بارے میں مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔ اسے اس نام سے پکارنا نہایت ہی ظالمانہ عمل ہے۔''

''اسے جب میں نے یہ نام دیا تھا تو اس وقت وہ بات نہیں کرسکتا تھا۔ یہ صرف ایک کمپیوٹر کا نام ہے۔ میں اس کا نام کچھ بھی ٹائپ کرسکتا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم کسی بھی بے بی کا اس قسم کا احمقانہ یا پٹا ہوا نام کبھی نہیں رکھو گے جیسا کہ QWERTY ہے۔'' روبی نے کہا۔

ہمارے درمیان بات چیت میں بہتری نہیں آئی۔

اس سے قبل کہ میں ٹماٹر، روٹی اور حتیٰ کہ ٹونا مچھلی ختم کرتا، روبی نے ٹیکسی طلب کی اور اپنے گھر روانہ ہوگئی۔

مجھے ایک بار پھر رات تنہا گزارنا پڑی۔

بھلا تاروں کا ایک جھنڈ ہمارے تعلقات کی راہ میں رکاوٹ کیوں بن رہا تھا؟

آخر کو روبی نے میرے صوفے کے ساتھ یا میرے کچن بلینڈر کے ساتھ دوستی استوار کیوں نہیں کی؟ ہم پہلے کی طرح مل کر اپنی راتیں تو پرلطف گزار سکتے، ایک دوسرے کے کانوں میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرتے رہتے اور ملک شیک کی چسکیاں لیتے رہتے؟

٭٭٭

اگلے روز مجھے آکلینڈ میں اپنے پبلشر کے پاس جانا پڑا۔ مجھے کتاب کی تکمیل میں تاخیر کی وجہ بیان کرنی تھی۔ میں اسے بہتر انداز میں یہ نہیں بتا سکا کہ میں اپنی ڈیڈ لائن سے پیچھے کیوں رہ گیا ہوں۔ میں اسے اپنے اور آسکر کے ذاتی اختلافات کے متعلق نہیں بتا سکتا تھا..... اس لیے کہ آسکر ایک کمپیوٹر تھا۔

اور یہ کہ آسکر کا نام QWERTY تھا، چاہے اسے یہ نام پسند رہا ہو یا نہیں اور یہ کہ QWERTY ایک مشین تھی..... میری مشین!

میرے پبلشر نے میری وضاحتیں سننے کے بعد ناک بھویں چڑھالیں اور اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

پھر آخر میں اس نے مجھے ناول مکمل کرنے کے لیے مزید بیس دن کی مہلت دے دی، صرف بیس دن کی مہلت۔

اب مجھے اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑ گیا۔ میں عام طور پر جب بھی آکلینڈ جاتا تو کتابوں کی دکانوں میں ضرور جاتا تھا اور خاصا وقت وہاں صرف کرتا تھا لیکن میں نے فوری طور پر سیدھے گھر واپس جانے کا فیصلہ کیا۔

مجھے بہت سے کام کرنا تھے۔ مجھے اپنے لیے اصول وضع کرنے تھے، مجھے اپنی نجات کے لیے بیس دن کی مہلت ملی تھی۔ اب مجھے آسکر سے اپنی اطاعت کرانی تھی۔ اسے میرے احکامات ماننا ہوں گے۔ اسے میرا حق مجھے دینا ہوگا۔ اب میرے کام میں کوئی بے جا مداخلت نہیں ہوگی۔ اب میری گرل فرینڈ کے ساتھ کوئی میل جول نہیں ہوگا۔ اب آئندہ کسی قسم کی خلل اندازی نہیں ہوگی۔ تمام مخمصوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔

میں سیدھا گھر پہنچ گیا۔ میں نے کار پارک کی اور گھر میں داخل ہوگیا۔ میرا رخ اپنے دفتر کی جانب تھا۔

جب میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو مجھے آوازیں سنائی دیں۔ مجھے آسکر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

مجھے روبی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

آسکر روبی کو اپنا ارنسٹ ردر فورڈ کا لطیفہ سنا رہا تھا۔ جب وہ پنچ لائن پر پہنچا تو روبی نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ بلند کیا۔

میں کمرے میں داخل ہوگیا۔

روبی میری میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی، ننگے پیر تھی اور اس نے باتھ روب پہنی ہوئی تھی۔ جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کا چہرہ اس کی کھلی ہوئی باتھ روب کے مانند کچھ چھپانے سے قاصر تھا۔

''تم جلدی واپس نہیں آگئے؟''

''مجھے جھانسا مت دو!''

روبی نے فوراً ہی اپنی باتھ روب کو سمیٹتے ہوئے سامنے سے گرہ باندھ لی۔ ''یہ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تمہیں دکھائی دے رہا ہے۔''

''مجھے جھانسا مت دو۔''

اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوگیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے اس طرح سے شرماتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

''او کے، تو پھر یہی سمجھو لیکن یہ حقیقت میں اتنا برا نہیں ہے جیسا کہ تمہیں دکھائی دیا تھا اور تم سمجھ بیٹھے ہو۔''

''اوہ، واقعی؟'' یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں سیڑھیاں اتر کر واپس نیچے آگیا۔

روبی میرے پیچھے پیچھے آگئی۔ سیڑھیاں اترنے کے دوران اپنا لباس پہننے کی کوشش میں وہ گرتے گرتے بچی۔

''وہ مجھے سمجھتا ہے، ہینری! ہمارے درمیان بڑی ہم آہنگی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ہمارے درمیان واقعی کچھ ہے۔'' روبی نے کہا۔

وہ میرے پیچھے پیچھے کچن میں آگئی۔

''یوں سمجھو جیسے ہم سچے جوڑی دار ہیں۔ جانی دوست!'' روبی کہے جارہی تھی۔

میں نے اس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ کھینچ کر کچن کے سنک میں پھینک دی۔ پھر میں نے اس سے اپنے گھر کی چابی واپس کرنے اور گھر سے چلے جانے کو کہا۔

میں نے ایک لمبے گلاس میں اپنے لیے مشروب انڈیل لیا۔ اس دوران روبی نے مکمل طور پر اپنا لباس پہن لیا تھا۔ اس نے میرے گھر کی چابی کچن کی میز پر رکھ دی اور اپنے گھر جانے کے لیے ٹیکسی طلب کرلی۔

وہ ٹیکسی کے انتظار میں باہر فٹ پاتھ پر ٹہلتی رہی۔ جب ٹیکسی آئی تو وہ اس میں بیٹھ کر چلی گئی۔

٭٭٭

''تم کیا کر رہے ہو، ہینری؟''

یہ دسویں مرتبہ تھا جو آسکر نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں بات کرنے کے موڈ میں قطعی نہیں تھا۔ میں اپنے ناول کا خستہ سفید کاغذ پر پرنٹ آؤٹ لینے میں معروف تھا۔

''کم از کم ہم اس بارے میں تو بات کرسکتے ہیں کہ ہوا کیا ہے، ہینری؟'' آسکر نے پوچھا۔

میں نے اپنے ناول کے ساتھ میموری میں موجود دیگر تمام ڈاکومینٹس کے پرنٹ آؤٹ بھی نکال لیے۔ مجھے اپنا کام مکمل کرنے میں آدھی رات بیت گئی۔ میرا پرنٹر بڑی مقدار میں صفحات پر صفحات نکالنے میں معروف رہا۔ پرنٹر کی آواز آسکر کی بڑبڑاہٹ کو متوازن کر رہی تھی جو بار بار معافی مانگ رہا تھا اور یہ کہے جارہا تھا کہ اس کا مقصد مجھے اپ سیٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ یہ سب صرف اس وجہ سے ہوا تھا کہ ان کے درمیان کچھ کچھ ہوگیا تھا۔

وہ اور بھی بہت کچھ بڑبڑاتا رہا لیکن میں نے اس کی بڑبڑاہٹ پر کوئی دھیان نہیں دیا۔

''تقدیر بھی عجیب شے ہے، ہینری!''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

پھر میں نے اپنے کمپیوٹر کا پلگ نکال دیا۔

میں اسے گھسیٹتے ہوئے نیچے اپنی کار تک لے گیا اور اسے کار کی ڈکی میں پھینک دیا۔ پھر کار ڈرائیو کرتے ہوئے دو گھنٹے کی مسافت پر واقع اس قابل دید ساحلی مقام تک پہنچ گیا جس سے میں بہ خوبی واقف تھا۔ یہ پانی سے بلند مقام تھا اور منظر نہایت دلکش تھا۔

میں نے چاندنی میں اپنا کمپیوٹر کار کی ڈکی سے نکالا اور اسے سمندر میں پھینک دیا۔

٭٭٭

جب میں اپنے گھر واپس پہنچا تو پو پھٹ چکی تھی اور صبح ہونے والی تھی۔

روبی میرے گھر کے باہر انتظار کر رہی تھی۔ لگتا یہی تھا کہ آسکر سے کوئی جواب نہ پا کر وہ دوڑی چلی آئی تھی۔

''کیسی رہی؟'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''کیا میں آسکر سے بات کرسکتی ہوں؟'' روبی نے بے چینی سے پوچھا۔

''میں اس نام کی کسی ہستی کو نہیں جانتا۔''

''تم جانتے ہو کہ میری مراد کس سے ہے، ہینری۔''

''تمہارا مطلب ہے میرا کمپیوٹر؟''

خفگی بہ دستور روبی کے چہرے سے عیاں تھی۔

''QWERTY اب یہاں نہیں رہتا۔ وہ سمندر کے ایک طویل سفر پر روانہ ہوچکا ہے..... ہمیشہ کے لیے!''

روبی کے شعور میں یہ اطلاع سمانے میں کچھ وقت لگا۔ اس کا ذہن اس بات کی چھان پھٹک میں مصروف تھا۔ جب اصل بات اس کی سمجھ میں آگئی تو اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

''تم نے اسے مار ڈالا!''

اگر وہ اس بات پر یقین کرنا چاہتی تھی تو میں اسے خوش آمدید کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔

اس نے اپنی انگلی مجھ پر یوں تان لی جیسے میرے سینے میں گھونپ دینا چاہتی ہو۔ ''تم نے اسے مار ڈالا۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔

میں نے بے چارگی سے شانے اچکا دیے۔ وہ مجھے مجرم قرار دے چکی تھی۔

اس نے میرے چہرے پر طمانچہ رسید کردیا۔ الٹے ہاتھ سے دوسرا تھپڑ بھی جڑ دیا۔ پھر وہ طمانچے مارتی رہی۔

آخر کار وہ پلٹ کر فٹ پاتھ پر تیز تیز چلتے ہوئے بائیں جانب گھوم کر میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اس کے بعد میں نے نہ تو کبھی اس کے بارے میں سنا اور نہ ہی کبھی اس سے کوئی رابطہ ہوا۔

اس سہ پہر میں شہر چلا گیا۔ میں نے ایک اسٹیک ڈیلر سے ایک ٹائپ رائٹر خریدا اور کھانا پکانے کی تراکیب کی ایک کتاب کا میل آرڈر دے دیا۔

یوں میں نے اپنا ناول سترہ دن میں ہی مکمل کرلیا۔

محفلِ شعر و سخن

❁ عاطف عمیر.....گلستان جوہر، کراچی
سرفرازی اس لیے علم و ہنر سے ہے تجھے
آدمی کے کام آئیں تیرے گن اے آدمی

❁ راجا ضیاالحسن کیانی.....رتی ٹبی، ساہیوال
گزشتہ عہد گزرنے ہی میں نہیں آتا
یہ حادثہ بھی لکھو معجزوں کے خانے میں
جو رد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں

❁ محمد اقبال.....کورنگی، کراچی
ایک انسان وہاں سے بھی گزر آیا ہے
پر فرشتوں کے بھی جل جائیں جہاں سے آگے

❁ ملک ناظم.....بہاولپور
کچھ یاد کر کے آنکھ سے آنسو نکل پڑے
مدت کے بعد گزرے جو اس گلی سے ہم

❁ بشیر احمد بھٹی.....بہاول پور
اِک عرصہ بیت گیا ہے
اس سے ملاقات نہیں ہوئی
پھر بھی اس سے مل لیتے ہیں
اکثر ادھورے خوابوں میں

❁ ملک کاظم.....بہاولپور
تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

❁ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
نظر میں کوئی سمایا جو خواب کی صورت
مہک اٹھی میری ہستی گلاب کی صورت

❁ سعید عباسی.....بہاولپور
میں شجر ہوں شہر ملال کا میری ٹہنیوں کو نہال کر
کبھی بھیج اپنی نوازشیں کسی جام ابر میں ڈھال کر
مجھے خار خار مسافتوں کی ستم گری نے تھکا دیا
مجھے منزلوں کا سراغ دے میرے حوصلے بحال کر

❁ کنول زریں.....گلبرگ، لاہور
ایک دن ایسا بھی ہوگا انتظارِ دوست میں
نیند آجائے گی دروازہ کھلا رہ جائے گا

❁ ظفر اقبال ظفر.....کامرہ، شرقی
ان کا غم رکھا تھا دل میں زندگی کے واسطے
کیا خبر تھی زندگی مجھ سے خفا ہو جائے گی

❁ ابرار احمد.....جامشورو
بہک کر باغ جنت سے چلا آیا تھا دنیا میں
سنا ہے بعد محشر پھر اسی جنت کی دعوت ہے
چلا تو جاؤں جنت میں، مگر یہ سوچ کر چپ ہوں
میں آدم زاد ہوں مجھے بہک جانے کی عادت ہے

❁ حسنین عباس بلوچ.....ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
اس سے پہلے تھی اسیری بھی رہائی جیسی
اب کے آزادی میں ہے حال اسیروں جیسا

❁ جعفر حسین.....بھوانہ
بے کیف سہی، بے رنگ سہی، اک لہر تو اب بھی آتی ہے
دل لاکھ شکستہ ہو محسن یادوں کا بھلانا مشکل ہے

❁ صوبیدار (ر) انوار بنگش.....ملیر کینٹ
ہم خون کی قسطیں تو بہت دے چکے، لیکن
اے خاک وطن، قرض ادا کیوں نہیں ہوتا

❁ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی.....ضلع خوشاب
ہونٹ چہرے پر یوں اس کے نظر آتے ہیں
دودھ میں رکھی ہوں جیسے دو پیالیاں گلاب کی

❁ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی
میری آنسوؤں کی کتاب بھی تیری خوشبوؤں سے مہک گئی
میرا شعر ہے ترا آئینہ جہاں شام آئی سنور گیا

❁ طاہرہ یاسمین.....کشمیر ٹاؤن، ضلع سرگودھا
ہم رکھتے ہیں تعلق تو نبھاتے ہیں عمر بھر
ہم سے بدلے نہیں جاتے رشتے موسم کی طرح

❁ افتخار احمد تارڑ.....کوٹ قادر بخش
رکھتا ہے یاد کون پرانی رفاقتیں
مٹی کا نام تک نہیں مٹی کے تیل میں

❁ ارسلا افضل.....روہڑی، ضلع سکھر
آئینہ ٹوٹ بھی جائے تو کوئی بات نہیں
دل نہ ٹوٹے کہ یہ بکتا نہیں بازاروں میں

❁ ظہور احمد فاتح.....نامعلوم مقام
حسین لوگو محبت کے عزاداروں کو مت چھیڑو
جواں پھولو یہ بہتر ہے کہ تم خاروں کو مت چھیڑو
کہیں ایسا نہ ہو جھانکے کوئی شعلہ کوئی بجلی
مرصع بالا خانوں اور چوباروں کو مت چھیڑو

❁ محمد بشارت.....کنگر دودرہ
زندہ ہو تم کبھی ترک تعلق کے باوجود
تم نے کبھی اپنا آپ جلا تو نہیں لیا

❁ محمد جاوید بلوچ.....تحصیل علی پور
تنہائیوں میں بیٹھ کے کیا سوچتے ہو تم
کچھ تو ہمیں بتا دو پریشان ہم بھی ہیں

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال
اس خوف سے وہ ساتھ نبھانے کے حق میں ہے
کھو کر مجھے یہ لڑکی کہیں دکھ سے مر نہ جائے

❁ رحیمہ سرور.....مغل پورہ، لاہور
میں نے پلکوں سے در یار پر دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

❁ مرزا طاہر الدین بیگ.....میر پور خاص
ہر طرف یہاں موت پھیلی ہوئی
لوگ کہتے رہے زندگی زندگی

❁ محمد رشید سیال.....روہڑی
راہوں پہ نظر رکھنا ہونٹوں پہ دعا رکھنا
آجائے کوئی شاید دروازہ کھلا رکھنا

❁ ماہا ایمان.....حافظ آباد، پنجاب
وہ پاس نہیں احساس تو ہے اک یاد تو ہے اک آس تو ہے
دریائے جدائی میں دیکھو تنکے کا سہارا کیسا ہے
کیا اب بھی ہمارے گاؤں میں گھنگرو ہیں ہوا کے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں، اب وقت کا دھارا کیسا ہے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی.....خانیوال
چلو اب مل کے ہجر دیس کا موسم بدلتے ہیں
ذرا سا تم بدلو ذرا سا ہم بدلتے ہیں

❁ ملک الطاف حسین کھلنگ.....مظفر گڑھ
زلف بکھرا کے وہ جس دم سر بازار چلے
غل مچا شور اٹھا مار چلے مار چلے

❁ محمد شہباز اکرم نوئی.....ڈھپئی، پاکپتن شریف
پھولوں کی نمائش میں اگر وہ بھی ہوا تو
اس بار گلابوں کو بڑی آگ لگے گی

❁ فرمان اللہ کاکڑ.....لوشکی
جدائی کا تیر کبھی چوکتا نہیں ہے
لگتا ہے ہمیشہ عین دل کے مقام پر

❁ عقیل الرحمٰن.....کھاٹاں
یہ شاخ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی

❁ ثمر فرقان سنی.....نور پور تھل
فکر مستقبل نے فاصلے بڑھا دیے ورنہ
سب یار ایک ساتھ تھے ابھی کل کی بات ہے

❁ ساگر تلوکر.....چشمہ بیراج، میانوالی
نہیں فرصت یقین مانو ہمیں کچھ اور کرنے کی
تیری یادیں، تیری باتیں، بہت مصروف رکھتی ہیں

❊ اظہر جمیل.....ملیر، کراچی
مری حیات کے افق پہ اس طرح وہ چھا گیا
کہ میری ذات کو مری نگاہ سے چھپا گیا

❊ کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
زمین و آسماں پہ ہیں محیط جس کی وسعتیں
وہ حسن میرے دامنِ خیال میں سما گیا

❊ نذیر احمد بزمی.....دھریجہ نگر
بات سنتا نہیں ذرا میری
آج سینے سے دل نکال نہ دوں

❊ ثمینہ خالد.....لاہور
ہاتھ خالی ہوں تو دانائی کا اظہار نہ کر
ایسی باتوں کا بڑے لوگ برا مانتے ہیں

❊ کاشف عمیر.....گلستان جوہر، کراچی
میں جانتا ہوں مگر تو بھی آئینہ لے کر
مجھے بتا کہ میرا انتخاب کیسا ہے

❊ ذاکر خان.....ملتان
اداسیاں تو میرے عہد کی علامت ہیں
میں ہنس پڑا تو بہت پیچھے لوٹ جاؤں گا

❊ دانش عمیر.....کراچی
بس اب کچھ دیر میں محسن وہ پتھر ٹوٹ جائے گا
میں اس کی سرد مہری پر محبت مار آیا ہوں

❊ شوکت علی.....گلبرگ، لاہور
تو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا
کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں

❊ عدنان صدیقی.....ملتان
مجھ کو درپیش ہے زمیں کا سفر
آسماں سے اتر کے آیا ہوں

❊ قاسم نصیب.....صفدر آباد
کس کے غم کا علاج کون کرے
سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے میاں

❊ احمر علی.....گوجرانوالہ
جب محبت کے لیے باندھ لیا ہے اسباب
پھر سفر جو ہو بھلا دوست تو ڈرتا کیوں ہے

❊ سید اشفاق.....کوئٹہ
پہلے سچ مچ یہ اک سمندر تھا
دور تک جو سراب ہے پیارے

❊ آصف جمیل بٹ.....سلار ٹیکسلا
ایک لمحے کو سلجھتی ہے الجھ کر خود سے
زندگی بھی تری زلفوں کی طرح لگتی ہے

❊ اطہر حسین.....کراچی
دکھوں کا رنگ گہرا کر رہی ہے
یہ میری خاک کیا کیا کر رہی ہے

❊ زوہیب احمد ملک.....کراچی
کس طرف کو منزل ہے کس سے رہبری چاہیں
کھو گیا مسافت میں میر کارواں اپنا

❊ جبران احمد ملک.....گلشن اقبال، کراچی
تیری گلی سے آج بھی ہم تو سوگ اٹھا کر لے آئے ہیں
اس کے سوا جب کچھ نہ ملا تو روگ اٹھا کر لے آئے ہیں

❊ امتیاز احمد.....عظیم پورہ، کراچی
علم کے شہر کی دہلیز تک آپہنچا ہوں
اک ذرا روشنی غارِ حرا دے مجھ کو

❊ محمد عزیر.....جامعہ ملیہ، کراچی
مقتول تمہارا تمہیں کہتا ہے مسیحا
”تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو“

❊ عمران علی.....شورکوٹ، جھنگ
تیر باقی تیرے ترکش میں ابھی تک ہوں گے
جسم ہزار ہیں مگر جان کہاں سے لاؤں؟

❊ ذیشان منہاس.....گلشن اقبال، کراچی
میری ذات اتنی وسیع نہیں کہ اس میں الجھ سکوں
لوگ ہی کچھ ایسے ملے کہ زندگی الجھ گئی

کوپن برائے شمارہ جون 2012	محفلِ شعر و سخن
	نام : --
	پتا : --

بھیدی

ظلِ نصیر

حق اور فرض کی جنگ میں کوئی اپنے حقوق کے لیے جان کی بازی لگاتا ہے تو کوئی مکر و فریب سے بازی مات کر دیتا ہے۔ وہ جو دنیا سے انتقام لینے نکلا تھا بالآخر ایک دن اپنی ہی کوتاہی کے حصار میں قید ہو گیا... اور غلطی تو غلطی ہوتی ہے جس کی سزا ہر حال میں بھگتنا پڑتی ہے۔ باہر کا مقابلہ کرنے کے لیے گھر کو اندر سے مضبوط بنانا پڑتا ہے... بس ان سے یہی ذرا سی بھول ہو گئی اور پھر ان کے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔

کھوکھلی بنیادوں پر قلعے تعمیر کرنے والے فریبی کا ماجرا

ساحلی قصبے آرنلڈ بے میں زندگی ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ساحلی ہوا گویا ہر چیز کو چھوتی پھر رہی تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔

”اوہ ایڈم! بالآخر تم یہاں آ ہی گئے۔“ اس نے اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے شانے کو تھپکتے ہوئے خود سے مخاطب ہو کر کہا۔ ہوا نے اس کے بال اڑائے تو وہ جھک کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگا۔ چند لمحے خود کو گھورنے کے بعد وہ مسکرا دیا۔ پھر سیدھا ہو کر اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔

”پہلے دو دن خوب آرام ہوگا پھر کام کی خبر لی جائے گی۔“

اس نے آئندہ کا پروگرام ترتیب دیا اور ایک مرتبہ پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کا رخ ڈاؤن ٹاؤن کی طرف تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے اس نے فیول میٹر کا جائزہ لیا۔ سوئی بتا رہی تھی کہ اب اسے گاڑی میں فلنگ کروا لینی چاہیے۔ اس نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے گاڑی ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔

وہ اس ساحلی شہر کی ہر گلی اور چپے چپے سے آگاہ تھا۔ اسے علم تھا کہ یہ ذیلی سڑک جہاں نیم دائرے میں گھومتی ہوئی مین روڈ سے ملتی ہے وہاں ایک فلنگ اسٹیشن موجود ہے۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اس کے دل میں ایک وسوسے نے سر اٹھایا۔

''اتنے سالوں میں ہوسکتا ہے کہ وہ فلنگ اسٹیشن اب وہاں نہ ہو۔'' اگر ایسا ہو جاتا تو اس کے پاس دوسرے اسٹیشن تک جانے کے لیے فیول بالکل نہیں بچتا لیکن اس کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ وہاں جائے بغیر یہ معلوم کر سکتا کہ آیا وہ فیول اسٹیشن وہاں ہے کہ نہیں۔

ہونٹ بھینچے وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ مزید چار پانچ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ مین روڈ پر آ گیا۔ یہ دیکھ کر اسے انجانی سی خوشی ہوئی کہ وہ اسٹیشن اپنی جگہ موجود تھا مگر اس وقت وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک تو اس ساحلی شہر کی آبادی زیادہ نہیں تھی دوسرے ابھی ورکنگ آورز بھی شروع نہیں ہوئے تھے اس لیے رش بالکل نہیں تھا۔

وہ گاڑی سے نکل کر کیشئر کے پاس گیا۔ ''ہیلو! مجھے دو پیکٹ سگریٹ، ایک دیاسلائی اور لائٹر دے دو، میں اتنی دیر میں فیول لے لوں۔''

اس نے بے نیازی سے پہلے سگریٹ کا برانڈ بتایا اور پھر والٹ نکال کر ایک بڑی مالیت کا نوٹ کاؤنٹر پر پھینک دیا اور خود فیول لینے چلا گیا۔ کیشئر ایک دبلا پتلا سخنی سا نوجوان تھا۔ اس کے سامنے کے بال قدرے اڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے موٹے عدسوں والے چشمے کے پیچھے چھپی چھوٹی چھوٹی مکار آنکھوں سے اسے بہ غور دیکھا اور مطلوبہ اشیا فراہم کرنے لگا۔

ایڈم نے سگریٹ کے پیکٹ اور لائٹر اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیے اور بوتل بائیں ہاتھ میں اٹھالی۔ دائیں ہاتھ سے وہ بقایا پیسے سمیٹتے ہوئے بولا۔

''تم سے پہلے یہاں کون کام کرتا تھا؟''

سخنی سے نوجوان نے ایک مرتبہ پھر ایڈم کا سر سے پیر تک جائزہ لیا، پھر اپنی جسامت کی طرح باریک سی آواز میں بولا۔

''میری!'' اس کی آواز میں نسوانیت سی تھی۔ ایڈم کو ہمیشہ ایسے لوگوں سے چڑ ہو جاتی تھی۔ اس نے بے زاری سے نوٹوں والا ہاتھ ہلایا۔

''میں سانتھا کروز کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

سخنی نوجوان بری طرح چونکا۔ ایڈم نے اس کے چونکنے کو بھی محسوس کیا اور اس کی ایکسرے کرتی ہوئی نظروں کو بھی۔

''سانتھا کروز..... وہی، جسے ڈھائی تین سال قبل ایک رات سوتے میں قتل کر دیا گیا تھا؟''

اس مرتبہ ایڈم بری طرح چونکا۔

''سانتھا کروز تو ایک ٹھنڈی طبیعت کی مالک لڑکی تھی۔ اسے کسی نے کیوں قتل کر دیا؟''

سخنی نوجوان نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے ایڈم کو دیکھتا رہا۔

''سانتھا کے قاتل کا کوئی سراغ ملا یا یہ کیس داخلِ دفتر ہو گیا؟''

سخنی نوجوان نے دیکھا کہ اس کا سرخ چہرہ تیزی سے نارمل ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح حیران اور افسردہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''نہیں..... پولیس سانتھا کے قاتل کو تلاش کرنے میں ناکام ہی رہی تھی۔''

ایڈم نے ایک طویل سانس لیا۔ روپے جیب میں ٹھونستا وہ اسے شکریہ کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

''تو گویا سانتھا کا قصہ بھی ختم ہو ہی گیا۔ بے چاری سانتھا۔''

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے خود کلامی کی۔ پھر وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے بوتل کھول کر منہ سے لگالی۔ اسے یاد آیا پہلی مرتبہ وہ سانتھا سے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ملا تھا۔ وہ دونوں پیدل سڑک کے کنارے چل رہے تھے کہ ایک مست ڈرائیور نے گاڑی سانتھا سے ٹکرا دی، ڈرائیور بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

سانتھا مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ سڑک دور دور تک خالی دیکھ کر ایڈم اس کی جانب بڑھ گیا۔ یہ اس کی فطرت نہیں تھی۔ وہ لوگوں کی مدد نہیں کرتا تھا مگر سانتھا پہ جانے اسے کیسے ترس آ گیا تھا۔ اس نے قریب جا کر دیکھا، وہ معمولی زخمی تھی۔ ایڈم کے قریب آتے ہی اس نے کہا۔

''وہ آوارہ گرد مجھے زخمی کر گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میری بائیں پنڈلی میں شدید چوٹ آئی ہے، میرا پاؤں

حرکت نہیں کر رہا ہے۔''

ایڈم پنجوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہلو مت، میں دیکھتا ہوں۔''

اس نے سانتھا کی نرم اور سڈول پنڈلی کو اپنے بھدے، کھردرے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ سانتھا کراہنے لگی۔

''بہ ظاہر تو ہڈی سلامت ہی لگ رہی ہے لیکن اگر تم زیادہ تکلیف محسوس کر رہی ہو تو میں ایمبولینس کے لیے کال کر دیتا ہوں۔''

سانتھا نے درد برداشت کرنے کے لیے نچلا لب دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔ کراہتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔ اگر تم مہربانی کر کے مجھے سہارا دو تو یہاں سے تھوڑی دور ہی میرا فلیٹ ہے۔ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔''

ایڈم ایک لمحے کے لیے متذبذب نظر آیا۔

''لیکن ہوسکتا ہے کہ میرا تجزیہ غلط ہو۔ واقعی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ اس طرح علاج نہ ہونے سے تکلیف بڑھ بھی سکتی ہے۔''

سانتھا نے ہتھیلی کی پشت سے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں میرا خیال ہے کہ تمہارا تجزیہ درست ہے۔ ہڈی نہیں ٹوٹی ہوگی۔''

ایسا کہتے ہوئے اس کے لہجے میں امید بھی تھی۔ ایڈم کو محسوس ہوا کہ وہ اسپتال جانے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس نے کندھے اچکائے۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اور سہارا دے کر اسے کھڑا کر دیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ ایڈم چھ فٹ کا ایک مضبوط جسامت والا نوجوان تھا۔ اچھی صحت کی وجہ سے وہ کافی گرانڈیل نظر آتا تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں سانتھا پونے پانچ فٹ کی ایک نرم و نازک سی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔

ایک قدم ایڈم کے سہارے اٹھانے کے بعد وہ لڑکھڑا گئی۔ تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے بے چارگی کے عالم میں سر اٹھا کر ایڈم کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔

''پلیز کوئی ٹیکسی روکو، میں چل نہیں پاؤں گی۔'' ایڈم نے اسے پھر بٹھا دیا۔ اگلے پانچ منٹ تک ٹیکسی تو کیا اس سڑک سے کوئی گاڑی بھی نہیں گزری۔ ان دنوں یہ علاقہ بالکل ویران ہوا کرتا تھا۔ ایڈم تب تک اکتانے لگا تھا۔ اس نے سانتھا سے کہا۔

''تمہارا فلیٹ کتنی دور ہے۔ میں وہاں جا کر کسی کو بلا لاتا ہوں۔''

سانتھا اپنے گلابی ہاتھوں سے اپنی پنڈلی کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔ ایڈم کی نگاہ اس کے ہاتھوں سے چپک گئی۔ اس نے سر اٹھا کر کہا۔

''فلیٹ زیادہ دور نہیں ہے مگر وہاں میں اکیلی رہتی ہوں اور میرا کوئی ہمسایہ بھی اس وقت وہاں نہیں ہوگا۔ وہ سب کام پر جا چکے ہوں گے۔''

ایڈم ایک دم اس پر جھکا۔ سانتھا کے لبوں سے ایک ہراساں سی سسکاری نکل گئی۔ اگلے لمحے وہ اسے دونوں ہاتھوں پہ اٹھائے سیدھا ہو گیا۔

''اب جلدی سے اپنے گھر کا پتا بتاؤ۔''

وہ اسے اٹھائے اٹھائے لمبے ڈگ بھرتا، بہت تیزی سے فاصلہ سمیٹ رہا تھا۔ سانتھا مارے حیرت کے گنگ ہو گئی۔

''اب بولو گی یا پھینک دوں تمہیں سڑک پہ۔'' ایڈم غصے سے چلایا تو اس نے بہت تیزی سے پتا بتا دیا۔ پانچ منٹ بعد وہ اسے لیے لفٹ میں سوار ہو چکا تھا کیونکہ سانتھا کا فلیٹ تیسری منزل پہ تھا۔

فلیٹ میں پہنچا کر ایڈم نے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔ بنا کچھ پوچھے اس نے دودھ گرم کر کے ایک پین کلر اسے دی۔ وہ بہت شکر گزار نظر آ رہی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے ہینڈسم؟''

ایڈم پہلی بار مسکرایا۔ ''میں انتظار کر رہا تھا کہ تم نے ابھی تک تعارف نہیں حاصل کیا۔ بہرحال میں ایڈم رش ہوں اور ان دنوں فارغ ہوں۔ جو بھی کام مل جائے کر لیتا ہوں۔ غیر شادی شدہ ہوں، کوئی گرل فرینڈ نہیں پالی ہے۔ بس یا اور کچھ؟''

سانتھا کھلکھلا کر ہنسی۔

''تم بہت دلچسپ آدمی ہو، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور میری اتنی ہیلپ کرنے کا شکریہ۔ اب ایک ہیلپ میں بھی تمہاری کر سکتی ہوں۔''

وہ لمحے بھر کو رکی۔ ایڈم اس کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گیا۔

''میں تمہارے لیے جاب کا بندوبست کر سکتی ہوں اور اگر تم چاہو تو میرے ساتھ فلیٹ بھی شیئر کر سکتے ہو اور میں

سانتھا کروز ہوں، قریب ہی ایک فلنگ اسٹیشن ہے وہاں کیشئر ہوں، مگر تو میرا تم دیکھ ہی چکے ہو۔"

یہاں سے ایڈم اور سانتھا کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔ ایڈم اس شہر میں نووارد تھا، مگر آغاز میں ہی اسے سانتھا جیسی لڑکی مل گئی جس نے ایڈم کے تمام مسائل گویا چٹکی بجاتے ہی حل کردیے۔

وہسکی کی خالی بوتل اس نے قریبی ٹریش بکس میں ڈال دی اور گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کردی۔ گاڑی کو روڈ پر لاتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔

"تو گویا چھ سال میں میرے پاس گاڑی اور اچھا بینک بیلنس آگیا ہے..... برا نہیں ہے۔ اتنے سالوں میں یہ بہتر پیش رفت ہے۔"

☐☐☐

"ایڈگر! اگر تم نے اب کوئی شرارت کی تو میں تمہیں لانڈری میں بند کردوں گی۔" پانچ سالہ ایڈگر نے معصومیت سے ماں کی طرف دیکھا۔

"مگر مام! میں تو کچھ بھی نہیں کررہا۔"

"تم نے ابھی میرے پرس میں سے پیسے چرائے ہیں۔ اب شرافت سے انہیں واپس رکھ دو، اور سنو اگر تم نے جم کے آنے پر کوئی غلط حرکت کی تو میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔"

ایڈگر نے برا سا منہ بنایا۔ ہاتھ مار کر اپنے بھورے بال بکھیر دیے اور ترچھی نظروں سے آئینے کے سامنے بیٹھی جلدی جلدی میک اپ کرتی اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"مجھے وہ پسند نہیں ہیں مام، آپ مجھے اتنی دیر کے لیے میرے دوست موش کے گھر چھوڑ دیں۔ آپ بھی خوش، میں بھی خوش۔"

جیڈ نے حیرت سے اپنے پانچ سالہ بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں، ہنسنے اور بات کرنے کا انداز بالکل اپنے باپ جیسا تھا، اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔

"کاش، مجھے تم سے اتنی محبت نہ ہوتی تو میں تمہارے باپ کا بدلہ تم سے لیتی۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ مجھے تمہارے باپ سے کتنی نفرت ہے۔"

جیڈ کی آواز بہت مدھم تھی، ایڈگر سمجھ نہیں پایا۔

"مام کیا کہہ رہی ہیں، مجھے سنائی نہیں دیا۔"

جیڈ سنگار میز کے سامنے سے اٹھ گئی، ایڈگر کا یہاں موجود نہ ہونا ہی بہتر تھا۔

"اپنے کھلونے لے لو۔ میں تمہیں موش کے گھر چھوڑ آتی ہوں۔" ایڈگر نے خوشی خوشی اپنے کھلونے سمیٹے اور اس کے ساتھ چل دیا۔ اسے موش کے گھر چھوڑ کر وہ واپس گھر آگئی۔

اسے بے چینی سے جم کا انتظار تھا۔ اس نے فون پر بتایا تھا کہ اس کی بہن کا ممکنہ قاتل آج صبح اس کے فلنگ اسٹیشن پر آیا تھا۔ جم کی بہن، جیڈ کی گہری دوست بھی تھی، وہ دونوں اس کے قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے بے چین تھے۔

پونے تین برس قبل جب سانتھا قتل ہوئی تھی تو جیڈ اپنی خالہ کے ہاں نیویارک گئی ہوئی تھی اور سانتھا کا بھائی جم اپنی جاب پر مشی گن میں تھا۔ پہلے وہ دونوں بہن بھائی میساچوسٹس کے ایک دور افتادہ علاقے میں اکٹھے رہتے تھے۔ انہوں نے وہیں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ابھی وہ ہائی اسکول پاس نہیں کر پائے تھے کہ ماں نے دوسری شادی کرلی۔ ماں کا دوسرا شوہر امیر آدمی تھا۔ اس لیے ماں نے بخوشی ان دونوں کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔

مسٹر کروز نے بھی پہلی بیوی کو چھوڑ کر ایک قدرے امیر مطلقہ کے ساتھ رہنا شروع کردیا۔ اس مطلقہ کی بیٹی جیڈ نے غصے میں آکر مسٹر کروز کے بچوں سے راہ و رسم پیدا کرلی، وہ سب ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ دوستی اتنی مضبوط ہوگئی کہ جیڈ کو اپنی نفرت اور غصہ سب بھول گیا۔ ان کی دوستی اتنی پائیدار تھی کہ اب سانتھا کے قتل کے بعد بھی وہ اس کے قاتل کو سزا دلوانا چاہتی تھی۔

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے جم آگیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ملے، مگر جیڈ کے انداز میں قدرے بے رخی سی تھی۔ جم نے یا تو محسوس نہیں کیا یا پھر جتایا نہیں۔

"چائے لوگے یا کافی؟" اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے پوچھا۔ وہ بے تکلفی سے بولا۔

"نہ چائے نہ کافی، اس کے علاوہ جو مرضی پلا دو۔" اس کی مکار آنکھوں میں مخصوص چمک لہرائی تھی۔

"نہیں تم بہت جلدی آؤٹ ہوجاتے ہو، جبکہ میں قاتل کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوں، اس لیے کافی ٹھیک رہے گی۔"

جم نے کاندھے اچکا دیے چند لمحوں بعد جیڈ کچن سے کافی لیے برآمد ہوئی۔ شاید وہ پہلے ہی سے تیار کرچکی تھی، دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔

"اب جلدی سے سب کچھ بتا دو۔ ویسے جب پولیس اس کیس کو داخل دفتر کرچکی ہے تو ہمیں اب کیا تکلیف ہے کہ ہم اس کے پیچھے خوار ہوتے پھریں۔" اس کے انداز میں کچھ

بے زاری سی تھی۔ جم نے بہ غور دیکھا پھر زور دے کر بولا۔

"ہمیں ضرورت ہے کیونکہ تم وہ نہیں جانتیں جو میں جانتا ہوں۔"

جیڈ نے اس کے جواب میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ جم قدرے آگے کو جھکا۔

"تم جانتی ہو وہ کون ہے؟" جیڈ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"خوامخواہ کا سسپنس مت پھیلاؤ، جو بات ہے اب رکے بغیر کہہ دو۔ آدھے گھنٹے کے بعد مجھے ایڈگر کو اس کے دوست کے گھر سے لینے کے لیے جانا ہے۔"

"او کے..... او کے۔ ناراض کیوں ہوتی ہو، تو میں بات کررہا تھا سانتھا کے بوائے فرینڈ ایڈم کی۔ وہ شاید آج ہی یہاں آیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ اس کے سانتھا کے ساتھ کیسے تعلقات تھے۔ پھر سانتھا نے اپنی انشورنس پالیسی بھی اس کے نام کروائی تھی اور تمہیں یاد ہوگا کہ پولیس کافی عرصے تک ایڈم کی طرف سے اس پالیسی کے کلیم کا انتظار بھی کرتی رہی تھی۔ کیا تم سوچ نہیں سکتیں کہ وہ ایک مرتبہ پھر سانتھا سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اب وہ پالیسی کلیم کرے گا یا ہوسکتا ہے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ ایسا نہ کرے۔"

اس نے لمحے بھر کو رک کر جیڈ کے تاثرات دیکھے پھر بات بڑھاتے ہوئے بولا۔

"وہ اچانک امیر کیسے ہوگیا ہے؟ اس کے پاس اپنی گاڑی ہے، اس کی کلائی پر قیمتی گھڑی بندھی تھی اور اس کے والٹ میں بڑے نوٹ تھے اور....."

جیڈ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں سمجھ نہیں پارہی کہ تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کررہے ہو؟ تمہاری گفتگو بہت الجھی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم خود بھی نہیں جانتے کہ تمہیں مجھ سے کیا کہنا چاہیے۔"

جم نے سنجیدگی سے جیڈ کی بات سنی اور ایک بڑا گھونٹ کافی کا لے کر کپ واپس میز پر رکھ دیا۔ چند لمحے وہ یوں سامنے کی طرف دیکھتا رہا جیسے مناسب الفاظ کا انتخاب کررہا ہو۔ پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور محتاط انداز سے بولا۔

"دیکھو جیڈ، میں اس مرتبہ صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ ہمیں رقم کی ضرورت ہے، ایک اچھا گھر اور اپنا فلنگ اسٹیشن بنانے کے لیے اور ایڈگر کی بہتر پرورش کے لیے۔ ہم اگر ذرا ہوش مندی سے کام لیں تو یہ رقم ہمیں مل سکتی ہے۔"

جیڈ نے قدرے آگے جھکتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"مگر کیسے؟ ایڈم قتل کا اعتراف کیسے کرے گا جبکہ....." جم نے ترشی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ باتوں کو بار بار دہرایا مت کرو، ایڈم سے قتل کا اعتراف ہمیں اپنی عقل مندی سے کروانا ہے اور تم بھی اس بات کو ذہن میں بٹھالو کہ سانتھا کا قاتل ایڈم ہے، صرف ایڈم۔"

آگے کو جھکی ہوئی جیڈ بے ساختہ گہرا سانس بھر کر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔ مگر وہ پوری طرح جم کی طرف متوجہ تھی۔ اس کے تاثرات سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ذہنی طور پر جم کی بات سے اتفاق کرچکی ہو۔

"اس وقت میں جارہا ہوں، کوئی مناسب پلان تیار کرکے ہم ایڈم سے قتل کا اعتراف کرالیں گے اور اسے قانون کے شکنجے سے بچانے کے لیے رقم کا تقاضا کریں گے کیونکہ اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا کر ہمیں سانتھا تو مل نہیں سکتی تو کیوں نہ کوئی فائدہ ہی حاصل کرلیں۔"

"سوچ لو، جم کہیں پھنس نہ جائیں، پتا نہیں ایڈم کس قسم کا شخص ہو، پھر میں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

جم نے اسے تسلی دی۔

"فکر مت کرو، تمہیں بھی دکھا دوں گا اور مجھ پر یقین رکھو۔ تم جانتی ہو کہ میں بہت اچھا منصوبہ ساز ہوں۔"

جیڈ نے خاموش رہنے پر اکتفا کیا، جم اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

"پندرہ منٹ ابھی باقی ہیں اور یہ وقت صرف میرا ہے۔" جیڈ نے اپنے اندر اٹھتی نفرت اور طیش کی لہر کو بہ مشکل دبایا تھا لیکن وہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ جم کی مخالفت مول لیتی، اسے اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا تھا۔

☐☐☐

ایڈم نے ایک متوسط ہوٹل میں کمرا کرائے پر لے لیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے ایک مرتبہ پھر سانتھا یاد آئی۔ سانتھا ایک ایسی لڑکی تھی جس نے ایڈم کو بے تحاشا چاہا تھا، مگر ایڈم اسے بھی چھوڑ گیا تھا۔

وہ کوئی نارمل انسان نہیں تھا۔ اس کی ایک نفسیاتی گرہ نے اسے سیلانی بنا دیا تھا۔ وہ ایک سال سے زیادہ کبھی کسی جگہ نہیں ٹکتا تھا۔ ہمیشہ ایسی گمنام نوکری کرتا کہ اس کے وہاں سے غائب ہونے کی کبھی کسی کو تشویش نہیں ہوتی تھی۔

وہ ایک عام سا گمنام شخص تھا مگر اس کے کام گمنام نہیں تھے۔ ایڈم ایک جرائم پسند شخص تھا۔ اس وقت وہ 36 برس کا تھا، پہلا جرم اس نے پندرہ برس کی عمر میں کیا تھا گویا اسے

جرائم کی دنیا میں اکیس سال گزر گئے تھے اور وہ ایک پختہ کار مجرم بن چکا تھا۔

اس کے جرائم مخصوص نوعیت کے ہوتے تھے، وہ ہمیشہ عورتوں کو شکار بناتا تھا۔ سہمی ہوئی ہراساں عورت کو دیکھ کر اسے تسکین ملا کرتی تھی۔ وہ اس لذت کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ سال میں ایک مرتبہ لازماً کسی عورت کو ہراساں کرتا تھا۔ عورت کے ساتھ اس کے ایسے سلوک کی وجہ تھی ایڈم کی سخت گیر ماں جو ایڈم کو بلا دریغ مارا پیٹا کرتی اور سرد راتوں میں دو دو گھنٹے کے لیے اسے بالکونی میں باندھ دیتی تھی۔ اس کے ایسے سلوک سے ایڈم کی نفسیات بگڑ گئی اور وہ عورت کے معاملے میں اذیت پسند ہو گیا تھا۔

ہوٹل کا کمرا ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ ایڈم نہانے کا ارادہ کر کے کپڑے نکالنے لگا۔

"دو دنوں میں مجھے فیصلہ کر لینا چاہیے کہ مجھے اب اور کس شہر میں جانا ہے۔"

اکیس سال جرائم کرنے کے باوجود وہ ایک مرتبہ بھی پکڑا نہیں گیا تھا کیونکہ اس نے اپنے لیے کچھ اصول بنائے تھے اور ان اصولوں کی پاسداری وہ بڑی شدومد سے کرتا تھا۔ ان اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی تھا کہ وہ جس شہر میں واردات کر لیتا تھا دوبارہ کبھی وہاں کا رخ نہیں کرتا تھا مگر آرنلڈ بے ایک ایسا شہر تھا جس میں وہ دوبارہ آ کر اپنے طور پر پرسکون تھا کہ اس بدلے ہوئے حلیے میں کوئی اسے پہچان نہیں سکے گا لیکن اسے علم نہیں تھا کہ اسے پہچانا جا چکا ہے اور اس کے لیے پھندا بھی تیار کر لیا گیا ہے۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والی دستک میں برہمی نمایاں تھی۔ جیڈ نے دانت پیستے ہوئے دروازہ کھولا مگر جم پر نگاہ پڑتے ہی اس کے تاثرات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی، جبکہ جم کے چہرے پر برہمی نمایاں تھی۔ "جو چابی تم نے مجھے دی تھی وہ اس لاک کو کھولنے میں ناکام رہی ہے۔" اس کا لہجہ پھنکارتا ہوا تھا جیڈ ہکلا گئی۔

"وہ..... وہ جم دراصل لاک خراب ہو گیا تھا اس لیے تبدیل کروایا ہے مجھے جلدی تھی اس لیے تمہیں چابی نہیں دے سکی۔"

جم نے ایک خاموش نظر سے اسے دیکھا اور ایک طرف سے گزر کر اندر داخل ہو گیا، وہ اس کے پیچھے آئی، جم صوفے پر بیٹھ گیا۔ "میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے اکتا گئی ہو، میں کافی عرصے سے نوٹ کر رہا ہوں کہ تم مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

جیڈ کو امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی جواب طلبی کر لے گا۔ اسے کوئی مناسب جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ سو اس نے درمیانی فاصلہ عبور کیا اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"اوہ جم! تم کس طرح کی باتیں سوچتے ہو، مجھے تم آج بھی اول روز کی طرح عزیز ہو۔"

اپنے الفاظ کی اہمیت بڑھانے کو اسے عملی مظاہرہ بھی کرنا پڑا۔ جم کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے، یہ وقت بہترین تھا؟ جیڈ نے بھی اسے گنوایا نہیں۔

"لیکن مجھے تم سے شکوہ ہے..... تم کسی سارجنٹ کی طرح سوال کرتے اور کسی کھوسٹ بڈھے کی طرح جرح کرتے ہو۔ تم میرے ساتھ اکثر اہانت آمیز سلوک کرتے ہو، کیا ایسا نہیں ہے؟"

جم ڈھیلا پڑ گیا، مدافعانہ لہجے میں بولا۔ "سوری ڈارلنگ! دراصل میں تمہارے معاملے میں پوزیسو بہت ہوں، لیکن اب تمہیں مجھ سے ایسی شکایت نہیں ہوگی۔ میں پورا خیال رکھوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اوکے۔ میں پینے کو کچھ لاتی ہوں، تم بتاؤ کہ اس ایڈم کے بارے میں اب کیا سوچا ہے تم نے؟"

"ہاں..... وہ۔" جم نے اپنے بال کھجائے۔ "دراصل یہ اتنا سیدھا معاملہ نہیں ہے۔ میں نے بہت سوچا ہے۔ اسے بلیک میل کرنے میں خطرہ بھی ہے، وہ ہمیں بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

کافی میکر کا پلگ ہاتھ میں پکڑے وہ حیرت سے اس کی طرف مڑی۔

"تو اب تم اپنے منصوبے سے دست بردار ہو گئے ہو؟"

وہ بے ہنگم انداز میں ہنسا۔ جیڈ نے اپنے تاثرات چھپانے کو جلدی سے رخ پھیر لیا۔ اس کا کچن اسی کمرے کے ایک کونے میں سیٹ کیا گیا تھا اور اس کے تاثرات جم بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

"بدشکل گدھ۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

ہنسنے کے بعد جم نے ایک طویل جمائی لی پھر بولا۔ "نہیں، بلکہ منصوبہ بدل دیا ہے، کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔ تم روز خبر سنتی ہو گی کہ سیاہ فام، رات کو اکیلے آدمی کو مار کر اسے لوٹ لیتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی پکڑے نہیں گئے، رات کو کون دیکھتا ہے کہ یہ لوگ بلیک تھے یا وائٹ۔"

جیڈ خاموشی سے کافی بناتی رہی۔ چند لمحوں بعد وہ بولا۔ "سانتھا اس شخص کو بہت پسند کرتی تھی، وہ اکثر اس کی باتیں ہمیں بتاتی تھی۔ وہ باتیں اب ہمارے کام آ سکتی ہیں، مثلاً وہ کہتی تھی کہ ایڈم ایک اصول پسند آدمی ہے، وہ روزانہ رات کو واک پہ جاتا ہے۔ وہ کوئی بھی اسلحہ چلانا نہیں جانتا۔ وہ جلدی کسی سے فری نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی رشتہ دار اور دوست نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔"

جیڈ نے ٹرے لا کر چھوٹی میز پر رکھی اور سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"یہ سب باتیں میں نے ہی تمہیں بتائی ہیں، شاید میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ایک بیل جیسا طاقتور مرد ہے اور اسے غصہ بھی بہت جلد آتا ہے اور میرا خیال ہے کہ تم جانتے ہو کہ غصے میں آدمی کی طاقت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ایسے میں کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ اسے قتل کیسے کیا جائے گا؟"

"اور تم بھی یقیناً جانتی ہو گی کہ ریوالور کی ایک انچ کی گولی چھ فٹ کے بندے کو بہ آسانی مار سکتی ہے۔" جم کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

"تو پھر یہ قتل کسی بلیک کے کھاتے میں نہیں جائے گا کیونکہ وہ ہمیشہ چاقو یا پھندا وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ دوسری بات فائر کی آواز سے کوئی بھی متوجہ ہو سکتا ہے۔" وہ زور دے کر بولی۔

اگلے پورے گھنٹے تک وہ قتل کے طریقے اور اس کی جزئیات پر بحث کرتے رہے۔ انہوں نے چھوٹی سے چھوٹی بات پر پوری توجہ دی اور ایک فول پروف طریقہ وضع کر لیا۔ اس طرح قتل کرنے سے ان کے پکڑے جانے کا امکان پانچ فیصد سے بھی کم تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ایڈم کی نگرانی کا طریقہ کار طے کیا۔ ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد جم رخصت ہو گیا۔ جیڈ نے آزادی کے احساس کو بہت اچھی طرح محسوس کیا۔ اس نے ٹانگیں پھیلا کر سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا اور سکون سے اپنے حالات کا تجزیہ کرنے لگی۔

جم اس کی بے زاری اور نفرت کو جان گیا تھا، وہ جیڈ جیسی خوبصورت اور زندگی سے بھرپور لڑکی پر ہمیشہ کے لیے قبضہ جمانا چاہتا تھا جبکہ جیڈ اس سے شدید نفرت کرتی تھی تو گویا اب وہ وقت آ گیا تھا جب جیڈ کو اس سے جان چھڑا لینی چاہیے تھی۔ اس کے پاس بہترین منصوبہ تھا، وہ سانتھا کے منہ سے ایڈم کی اتنی تعریفیں سن چکی تھی کہ غائبانہ طور پر اس کی پرستار بن گئی تھی، تو اسے قتل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، وہ جم کے تمام معمولات سے آگاہ تھی، وہ رات کو اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ جوا کھیلتا تھا۔ ایسی محفلوں میں اسے دیر بھی ہو جاتی تھی۔ اگرچہ اس کا فلیٹ وہاں قریب ہی تھا پھر بھی راستے میں ایک سوڑ آتا تھا۔ اگر جیڈ اس موڑ پر چھپ جاتی تو جم جیسے فٹ شخص کو پھندے کے ذریعے مارنا کچھ مشکل نہیں تھا، اس کے بعد جم کی دولت چرا کر وہ بہ آسانی ایڈم کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزار سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے جم کو مارنے میں دیر کر دی تو وہ اپنے مقصد کے حصول میں ناکامی پر اسے قتل کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

اس نے حتمی طور پر اپنے منصوبے پر نظر ثانی کی اور جم کو آئندہ رات قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

☆☆☆

یونہی بے مقصد ادھر ادھر گھومتے پھرتے اس نے گاڑی کا رخ ساحل کی طرف پھیر دیا۔ آرنلڈ بے کے تقریباً تین اطراف سمندر تھا۔ اگرچہ سمندر کے اندر بڑھا ہوا حصہ کل رقبے کا نصف بھی نہیں تھا، تاہم تین طرف سے سمندر میں گھرا ہونے کی وجہ سے چھٹی کے دنوں میں یہاں کافی رش ہوتا تھا۔ اتوار کی وجہ سے اس حصے میں کافی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ایڈم نے گاڑی کافی فاصلے پر ایک طرف پارک کر دی اور خود گیلی ریت پر چہل قدمی کرنے لگا۔ دھوپ میں ریت کے ذرے شیشے کی طرح چمک رہے تھے۔

اکثر عورتیں اور مرد لباس کے بوجھ سے چھٹکارا پائے ریت پر لیٹے دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بہت سے بچے بھی کھیل کود میں مگن تھے، ایڈم سب کو دیکھتے ہوئے خاموشی سے ٹہل رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی لڑکی پہ پڑی۔ وہ بری طرح چونکا۔

لڑکی سوئمنگ کاسٹیوم پہنے ہوئے تھی، اس کے سنہرے بال مریاں شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ لڑکی کی ایڈم کی طرف پشت تھی، وہ اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ لڑکی سے کچھ فاصلے پر وہ اس کے سامنے سے گزرا۔ ستر فیصد تک وہ اس کی ماں سے مشابہ تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر ایسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں سے وہ تو لڑکی کو دیکھ سکتا تھا مگر لڑکی اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

قریباً نصف گھنٹے کے بعد لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے اپنا اسکرٹ پہنا اور ایک طرف کھیلتے بچوں کی طرف چلی گئی۔ اس نے چند لمحے بچوں سے بات چیت کی پھر آگے بڑھ گئی، دو بچے بھاگ کر اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔

"یعنی تمہارے پاس ایک کے بجائے دو ایڈم ہیں۔"
وہ بڑبڑایا اور کچھ فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے جانے لگا، اس کی آنکھوں میں وہ مخصوص چمک آگئی تھی جو شکار کو دیکھ کر شکاری کی آنکھوں میں آتی ہے۔

لڑکی پیدل ہی جارہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا، تین چار فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ اس علاقے میں داخل ہوگئی جس میں دو کمروں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے ہٹ بنے ہوئے تھے۔ اپنے تعاقب سے بے خبر وہ تینوں خوش گپیاں کرتے چلے جارہے تھے۔ درمیانی فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کی گفتگو سننے میں ناکام رہا تھا۔

وہ تینوں ایک ہٹ کے سامنے رک گئے۔ اسی وقت ہٹ کا دروازہ کھول کر ایک تیس بتیس سالہ شخص نے باہر جھانکا۔ بچے اچھلتے کودتے اندر چلے گئے۔ لڑکی بے تکلفی سے اس شخص کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ چند منٹ بعد اسے ہاتھ ہلا کر وہ آگے بڑھی تو ایڈم نے بھی اپنے قدم بڑھا دیے، تین چار ہٹ چھوڑ کر وہ ایک سرخ پینٹ والے ہٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی، جیب سے چابی نکال کر اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ ایڈم بہ ظاہر لاتعلقی سے چلتا ہوا اس ہٹ کے پاس سے گزرا، اس نے کن انکھیوں سے دیکھا، دروازے پر نیم پلیٹ موجود تھی اس پر "مس جیڈ مارٹن" درج تھا۔ ایڈم تھوڑا چکر کاٹ کر واپس ساحل کی طرف چل پڑا، اسے وہاں سے اپنی گاڑی لینی تھی۔

☆☆☆

جیڈ کی زندگی میں یہ رات فیصلہ کن تھی۔ آج اسے جم سے چھٹکارا پانے کے لیے تکمیلی اقدام کرنا تھا۔ اس نے اپنا کمرا بند کر کے پھندا ڈالنے میں تیزی اور مہارت پیدا کی تھی۔ رات کے لیے لمبا سیاہ کوٹ، ایک مردانہ ٹوپی، دستانے اور پھندا اس نے پہلے سے تیار کر کے رکھ لیے تھے۔ یہ سب کچھ وہ ایڈگر سے چھپا کر کر رہی تھی کیونکہ وہ ہر چیز کے متعلق سوال بہت کرتا تھا اور جیڈ کو ڈر تھا کہ اگر پولیس بعد میں اس کے گھر آئی تو ایڈگر ان کے سامنے بھانڈا نہ پھوڑ دے۔

رات کے تصور سے ہی ایک سنسنی سی اس کے جسم میں دوڑ جاتی تھی، وہ اپنی اور ایڈگر کی پسند کا ڈنر بنا رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ اگر وہ جم کو اپنی مشق اور مہارت کے باوجود شکار کرنے میں ناکام رہی تو وہ اسے زندہ واپس نہیں آنے دے گا۔ ڈنر تیار کر کے اس نے ایڈگر کے ساتھ ایک موویٰ دیکھی۔ خوشگوار ماحول میں دونوں نے رات کا کھانا کھایا۔

ایڈگر ماں کا خوشگوار موڈ دیکھ کر بہت خوش تھا، کھانے کے بعد تھوڑی دیر تک دونوں نے بیڈ پر بناوٹی کشتی لڑی اور خوب قہقہے لگائے۔ ایڈگر نے بازو اس کے گلے میں حمائل کر کے بہت لاڈ سے کہا۔

"مام! میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں، آپ سب سے اچھی مام ہیں۔" جیڈ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کئی مرتبہ والہانہ اپنے بیٹے کو چوما اور بولی۔

"میری جان! میں بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔"

پیار کا یہ مظاہرہ شاید بہت دیر تک جاری رہتا لیکن جیڈ کی نظر دیوار گیر گھڑی پر پڑ گئی۔ اس کے پاس ٹائم کم تھا۔ اس نے آہستگی سے ایڈگر کو خود سے الگ کیا اور بولی۔

"مائی چائلڈ! اب تمہارے سونے کا وقت ہوگیا ہے، تم اپنے کمرے میں چلو میں تمہارے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔"

ایڈگر کو یہ بات پسند تو نہیں آئی تھی مگر وہ ماں کا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتا تھا سو چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جیڈ نے اوون میں دودھ رکھا، نیند کی ایک گولی پیس کر اس میں ملائی اور اسے لے کر ایڈگر کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بیڈ کے پاس فرش پر بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔

جیڈ نے دودھ کا گلاس اسے تھما دیا۔ ایڈگر نے ایک گھونٹ بھرا پھر برا سا منہ بنا کر بولا۔

"یہ خراب دودھ ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں اسے پی لوں تو مجھے چاکلیٹ لا کر دیں۔"

جیڈ اس کی چالاکی پر مسکرائی اور چاکلیٹ لینے چلی گئی۔ ایڈگر کبھی کبھار رات کو چاکلیٹ کھانے کے لیے اسی طرح بہانے کیا کرتا تھا۔ جب وہ واپس آئی تو ایڈگر دودھ کا خالی گلاس میز پر رکھ رہا تھا۔ جیڈ نے چاکلیٹ اسے تھما دی۔ اپنے سامنے اسے چاکلیٹ کھلا کر دانت صاف کروائے اور پھر اسے کمبل اوڑھا کر اس نے لائٹ بند کر دی۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ پیروں میں جاگرز پہنے، الماری کھول کر کوٹ، دستانے، ہیٹ اور پھندا نکالا۔ اسے یقین تھا کہ اب تک نیند کی گولی کام دکھا چکی ہوگی، تاہم وہ جانے سے قبل ایک مرتبہ پھر تسلی کر کے جانا چاہتی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر ذرا سا جھانکا، ایڈگر بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر واپس آگئی۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر وہ جونہی بیڈ کی طرف بڑھی۔ اس پر عقب سے کسی نے چھلانگ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتی، حملہ آور نے ایک بازو اس کے

گلے میں پھندے کی طرح ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بازو قابو کر لیے۔ اس کی پشت حملہ آور کی طرف تھی اور وہ اتنی بری طرح اس کے شکنجے میں جکڑی جا چکی تھی کہ حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ گلے پر دباؤ کی وجہ سے اس کی سانس رک رہی تھی۔ بھنچی بھنچی آواز میں بولی۔ "کیا تمہیں جم نے بھیجا ہے؟" اگرچہ وہ حملہ آور کو ایک نظر بھی دیکھ نہیں سکی تھی مگر اس کے ڈیل ڈول سے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ جم نہیں تھا اور اس شہر میں جم کے علاوہ اس کا کوئی ایسا دشمن نہیں تھا جو اس کی جان کے درپے ہوتا۔ حملہ آور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تمہیں جم نے ہی بھیجا ہوگا۔ وہ گھٹیا آدمی جب سمانتھا کو قتل کرا سکتا ہے تو مجھے کیوں نہیں۔" اس کے لہجے میں عجیب طرح کا یقین تھا، اسے لگا اجنبی چونکا تھا۔

"سمانتھا کون تھی؟"

وہ اس طرح بولا جیسے دانت بھینچ رکھے ہوں۔ جیڈ ذرا سا کسمسائی۔

"پلیز بازو کو ذرا ڈھیلا کرو، میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مم..... میں بتاتی ہوں سب کچھ۔"

اس کی درخواست منظور کر لی گئی تھی۔ جیڈ نے دو تین گہرے گہرے سانس لیے۔ وہ حملہ آور کی گرفت سے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ جسمانی طور پر اس سے بہت طاقتور ہے۔ اس لیے اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی۔ لیکن اس کا ذہن تیزی سے اپنے بچاؤ کی تدابیر سوچ رہا تھا۔

"دیکھو تم ایک کرائے کے قاتل ہو۔ جم نے تمہیں جتنی رقم میرے قتل کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے، میں تمہیں اس سے زیادہ دوں گی، تم میرے ساتھ ڈیل کر لو۔"

حملہ آور کو اس کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے پھندے والے بازو کو جھٹکا دیا۔ جیڈ کے منہ سے بھنچی بھنچی چیخ نکل گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی گردن ٹوٹتے ٹوٹتے بچی ہو، حملہ آور غرایا۔

"جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" اس کی آواز حسب سابق تھی۔

"سمانتھا کروز، جم کی بہن تھی، سگی بہن لیکن جم نے اسے قتل کرا دیا تھا۔"

اگلے لمحے حملہ آور نے اسے اوندھے منہ بیڈ پر گرا دیا۔ جیڈ کی گردن سے پھندا نکل گیا تھا مگر اس کے پشت پر کیے ہوئے ہاتھ ابھی تک حملہ آور کے شکنجے میں تھے۔ اگلے ایک منٹ میں حملہ آور اس کے ہاتھ پھندے والی رسی سے مضبوطی کے ساتھ باندھ چکا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کر کوٹ

> دوسری جنگ عظیم کے ایک سابق نوجی کا کہنا ہے کہ وہ دیہات سے شہر آرہا تھا کہ اُسے پکڑ کر طبی معائنے کے لیے لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا: "کرسی پر بیٹھ جاؤ اور اپنی قمیص اتار دو۔"
> کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے کہا: "ٹھیک ہے، تمہیں فوج میں بھرتی کر لیا گیا ہے، قمیص دوبارہ پہن لو۔"
> اس نے احتجاج کیا: "تم نے میرا معائنہ تک کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔"
> "معائنہ کیا جا چکا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا: "جو کچھ میں نے کہا، وہ تم نے سنا، اس لیے تمہارے کان ٹھیک ہیں۔ تم نے کرسی دیکھی، اس لیے آنکھیں ٹھیک ہیں۔ تمہارے جسمانی اعضا بھی ٹھیک ہیں کیوں کہ تم قمیص اتار سکتے ہو اور پہن سکتے ہو، چل سکتے ہو، کرسی پر بیٹھ سکتے ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہارے پاس اتنی عقل ہے کہ آرڈر سن کر اس پر عمل کر سکتے ہو۔"

پینٹ اور دستانے نیچے گرا دیے۔ اس کے بعد جیڈ کو سیدھا کر کے بٹھا دیا اور خود سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے درمیان محض دو قدم کا فاصلہ تھا، اب حملہ آور کے ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا جس کا رخ جیڈ کی طرف تھا۔

جیڈ نے پہلی مرتبہ اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ مضبوط ہاتھ پیروں کا، ایک چھ فٹ کے لگ بھگ تنومند شخص تھا، وہ ایک عام سا لانگ کوٹ پہنے ہوئے تھا جو عموماً سردی میں پہنا جاتا ہے۔ اس کے سر پر لمبی ٹوپی تھی، جیسی منچلے نوجوان پہنتے ہیں۔ اس سے سارا چہرہ چھپ جاتا ہے اور آنکھوں کی جگہ سوراخ ہوتے ہیں۔ ٹوپی نقاب کا کام دے رہی تھی۔ جیڈ اس کا چہرہ دیکھنے میں ناکام رہی تھی۔ ابھی اتنی سردی نہیں تھی کہ ایسی ٹوپی کا استعمال کیا جاتا۔ اسے یقیناً خود کو چھپانے کے لیے اوڑھا گیا تھا۔ اس نے حملہ آور کی سوراخوں میں سے جھانکتی براؤن آنکھوں سے اس کے ارادوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، مگر وہ کچھ اخذ نہ کر سکی۔ وہ خاموش بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا لیکن وہ یہ دیکھ چکی تھی کہ اس کی آنکھیں اور پاؤں اضطراری انداز میں حرکت کر رہے تھے۔

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ تب حملہ آور کی آواز ابھری۔

"اس قتل کے بارے میں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات مجھے تفصیل سے بتاؤ، کچھ بھی چھپانے یا تبدیل کرنے کی کوشش

مت کرنا۔ ہوسکتا ہے اس طرح تمہارے بچ جانے کا کوئی چانس نکل آئے ورنہ.....“

اس کا لہجہ حتمی تھا۔ جیڈ سمجھ گئی کہ وہ اپنے الفاظ پر عمل بھی کرے گا۔ اس نے لمحے بھر کو رک کر سوچا۔ اسے تذبذب میں دیکھ کر نقاب پوش غرایا۔

”میرے پاس وقت کم ہے اور ہاں، یہ جان لو کہ میں آدمی سے زیادہ کہانی سے پہلے ہی آگاہ ہوں۔ تمہاری غلط بیانی یا جھوٹ کو آسانی سے پکڑ سکتا ہوں اور اسی حساب سے تمہاری زندگی کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔ اب فوراً شروع ہوجاؤ۔“

اور وہ واقعی شروع ہوگئی۔

”دیکھو میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا، جم نے مجھے ورغلا لیا تھا۔ میں شروع سے سناتی ہوں۔ میں، سانتھا اور جم تینوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ ہماری اچھی دوستی تھی، جم اور سانتھا نے صرف ہائی اسکول تک پڑھا۔ اس کے بعد انہوں نے اسکول چھوڑ دیا، وہ اپنی ماں کے گھر میں رہتے تھے لیکن ان دنوں ان کی ماں اپنے شوہر سے الگ ہوکر واپس اس گھر میں آنا چاہتی تھی۔ اس لیے سانتھا اور جم اپنے لیے نوکری تلاش کررہے تھے۔“

وہ رکی پھر ملتجیانہ انداز سے بولی۔

”پلیز، میرا حلق خشک ہورہا ہے تھوڑا پانی پلا دو۔“

نقاب پوش نے انکار کے لیے منہ کھولا پھر اٹھ کر سائڈ ٹیبل سے گلاس اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دیا، پانی پی کر وہ خود بخود شروع ہوگئی۔

”ایک دن اچانک ہی دونوں بہن بھائی گھر سے غائب ہوگئے۔ میں نے کئی مرتبہ ان کی ماں سے پوچھا مگر اسے خود کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہاں سے میں مشی گن یونیورسٹی چلی گئی، دو سال بعد میری تعلیم مکمل ہوئی تو مجھے مشی گن میں ہی جاب مل گئی۔ میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھی، وہاں میرے ساتھ ایک حادثہ ہوگیا۔“

جیڈ نے رک کر جھرجھری سی لی۔ نقاب پوش خاموش بیٹھا ہوا تھا، چھوٹے سے وقفے کے بعد اس نے بات آگے بڑھائی۔

”میں اس حادثے کی وجہ سے نفسیاتی مریض بن گئی۔ میری جاب بھی ختم ہوگئی۔ ان ہی دنوں مجھے جم مل گیا۔ وہ دن رات میرا خیال رکھتا تھا۔ وہ اپنی جاب سے سیدھا میرے پاس آجاتا تھا۔ ایک طرح سے اس نے میرے ساتھ رہنا شروع کردیا تھا۔ وہیں میرا بیٹا ایڈگر پیدا ہوا۔ جم نے میرا علاج کروایا۔ جب میں قدرے ٹھیک ہوگئی تو مجھے احساس ہوا کہ جم جیسا بدشکل لڑکا مجھ جیسی لڑکی کا حق دار نہیں ہوسکتا مجھے اس کی ہر بات سے نفرت تھی مگر میں اس کا اظہار نہیں کرسکتی تھی۔

ان ہی دنوں میں جم نے مجھے بتایا کہ اسے سانتھا کا سراغ مل گیا ہے۔ میں تمہیں بتانا بھول گئی ہوں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دونوں بہن بھائی مافیا سے ڈر کر بھاگے تھے۔“

وہ لمحے بھر کو رکی جیسے مناسب الفاظ کا چناؤ کررہی ہو۔

”اصل میں وہ دونوں ایک سڑک سے ذرا فاصلے پر گلی میں تھے۔ سڑک پر سے مافیا کی گاڑی گزری۔ کسی طرح سے یا شاید غلطی سے ایک پاؤچ وہاں گرگئی۔ شاید اسے گاڑی کے نیچے چھپایا گیا تھا۔ سانتھا کی نظر اس پر پڑ گئی جم نے اس کے بتانے پر جاکر تھیلی اٹھالی۔ اس میں دس دس گرام سونے کی پانچ ڈلیاں تھیں۔ تقسیم پر ان میں جھگڑا ہوگیا۔ دو ڈلیاں سانتھا کے پاس تھیں جنہیں وہ دیکھ رہی تھی وہ اسی کے پاس رہیں باقی تین پہ جم نے قبضہ کرلیا، سانتھا آدھی ڈلی کا مطالبہ کررہی تھی مگر جم دینے پر تیار نہیں تھا۔ انہیں ایک دوسرے سے خطرہ محسوس ہوا اس کے علاوہ مافیا کا بھی ڈر تھا۔ اگرچہ یہ واقعہ ان کے گھر سے بہت دور پیش آیا تھا مگر مافیا والے اگر کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو اسے قبر سے بھی نکال لاتے ہیں، اس خوف سے اسی رات دونوں نے ایک دوسرے سے لڑ کر گھر چھوڑ دیا، جم مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا مشی گن پہنچ گیا اور سانتھا جانے کہاں گئی۔“

اتنی لمبی بات کرکے وہ تھک گئی تھی۔ اس لیے خاموش ہوگئی۔ نقاب پوش نے ایک جتائی ہوئی نگاہ کلاک پر ڈالی، جیڈ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنا بیان پھر شروع کردیا۔

”اپنے کسی دوست کے ذریعے اسے پتا چل گیا کہ سانتھا بھی مختلف علاقوں میں گھومنے کے بعد آرنلڈ بے میں مقیم ہوگئی ہے۔ وہ سانتھا سے سارا سونا واپس لینا چاہتا تھا اس لیے اس نے سانتھا کو قتل کرادیا۔ پھر ہم یہاں آگئے۔ مگر تلاش کے باوجود ابھی تک سونا نہیں ملا۔ شاید وہ اسے خرچ کرچکی تھی۔“

”تمہارے اور جم کے جھگڑے کی کیا وجہ ہے؟“

اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اس نے سوال کیا تھا۔

”سانتھا کا سونا جو نہیں ملا تھا جم کا اس کے بارے میں یہ خیال تھا کہ اسے میں نے چرا لیا ہے۔ اس نے میرے گھر کی تلاشی بھی لی، مجھے ڈرایا دھمکایا بھی۔ اپنے طور پر بھی اس نے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ وہ شاید اس

کے بعد میرے خلاف کوئی اور اقدام کرتا لیکن ایک دن اچانک سانتھا کا بوائے فرینڈ ایڈم رش اسے نظر آگیا۔ وہ کافی امیر ہوگیا ہے۔ جم کا خیال ہے کہ وہ سونا شاید ایڈم لے گیا تھا۔ اس لیے اب وہ اسے قتل کرا کر اس کی ساری دولت ہتھیانا چاہتا ہے۔“

”اور تم اس وقت ایڈم کو قتل کرنے جارہی تھیں؟“

جیڈ نے بے قراری سے پہلو بدلا۔

”نہیں، بلکہ میں تو اسے قتل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ اس نے ہونٹ بھینچ لیے، جلد بازی میں اس کے منہ سے ایک غلط بات غلط موقعے پر نکل گئی تھی۔

”کیوں؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے ریوالور والے ہاتھ کو جنبش دی۔ جیڈ اس کی ان کہی دھمکی کو بخوبی سمجھ گئی، وہ بولا۔ ”اور ہاں، میرا جم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں..... میں سانتھا سے اس کی تعریفیں سن کر اسے پسند کرنے لگی ہوں اور اگر وہ مجھے مل گیا تو میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرچکی ہوں۔“

”مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ تین تک گن کر میں تمہارے اس خوبصورت ماتھے میں ایک سرنگ بنا دوں گا۔“ نقاب پوش نے غرا کر کہا۔ جیڈ ہکلا گئی۔

”مم..... مگر میں نے تو سب کچھ بتا دیا ہے پھر تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو، پلیز مم..... مجھے چھوڑ دو، میرا بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے، اسے میری ضرورت ہے۔“

وہ بری طرح گھگیانے لگی۔ نشانہ باندھتے ہوئے وہ سکون سے بولا۔

”تم نے قتل کا واقعہ بالکل گول کردیا۔ حالانکہ تم برابر کی شریک تھیں، میں اب بھی کہتا ہوں سچ بولو۔ سچ ہی تمہاری زندگی کی ضمانت دے سکتا ہے۔“

جیڈ نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ رسی کھولنے کی اس کی کوشش ناکام ہوچکی تھی۔ وہ اپنے بچاؤ کا کوئی طریقہ بھی نہیں سوچ سکی تھی۔ اس کے پاس زندگی بچانے کے اس آخری موقعے سے فائدہ اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے ایک گہری سانس بھری۔

”جم نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں سانتھا کو قتل نہ کرسکی تو وہ میرا بچہ مار دے گا۔ میں سانتھا سے ملی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوگئی۔ میں نے اسے ثابت کرایا کہ میں اچانک اس سے ٹکرا گئی ہوں، میں دو دن تک اس کے گھر میں مقیم رہی۔ اس کے ہمسایوں سے بھی ملی۔ دو دن بعد جانے سے پہلے میں نے بہانے سے اس کے ہمسایوں کو بتایا کہ میں جاب کے سلسلے میں مصروفیت کی وجہ سے دو ماہ تک نہیں آسکوں گی۔ اس کے ڈیڑھ ہفتے بعد میں خفیہ طور پر رات کو یہاں آگئی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ کسی نے مجھے آتے نہیں دیکھا۔ میں نے گھنٹی بجائی، سانتھا نے دروازہ کھول دیا، وہ میری اچانک آمد پر حیران تھی لیکن اسے مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ میں نے اچانک اس کا گلا پکڑ کر دبانا شروع کردیا، وہ پیچھے بیڈ پر گرگئی۔ چند لمحوں کے اندر ہی وہ مرگئی۔ میں نے سارے فلیٹ کی تلاشی لی مگر سونا نہیں ملا۔ کچھ پیسے اور ایک سونے کی انگوٹھی ملی تھی، وہ میں نے اٹھالی۔ دستانوں کی وجہ سے میرا کوئی فنگر پرنٹ نہیں لگا تھا۔ راتوں رات میں ڈرائیو کرکے واپس مشی گن پہنچ گئی۔ میرے پاس گاڑی تھی جو جم نے اپنے کسی دوست سے لاکر دی تھی قتل کے تیسرے روز جم بہ ظاہر سانتھا سے ملنے آیا۔ پولیس سے اس نے سانتھا کا سارا سامان حاصل کرلیا اور پولیس پر اس کے قاتلوں کو گرفتار کرنے کے لیے دباؤ ڈالتا رہا۔ پولیس اسے چوری کی واردات خیال کررہی تھی۔ جس میں مزاحمت پر سانتھا کو قتل کردیا گیا تھا، کچھ عرصہ بعد اس کیس کو عدم پیش رفت کی بنا پر داخل دفتر کردیا گیا۔ میں نے سب سچ بتا دیا ہے۔ اب پلیز مجھے قتل مت کرنا، میں مجبور تھی۔ میں اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتی ہوں اور جم نے بچے کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔“

”ونڈر اپ..... نہیں تو گولی مار دوں گا۔“

جیڈ اور نقاب پوش نے حیرت سے دیکھا۔ ایڈگر ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا تھا۔ نقاب پوش کی دروازے کی طرف پشت تھی۔ اس لیے وہ اسے اندر آتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ جیڈ بری طرح چلائی۔

”ایڈی فائر کردو، فائر کردو..... جلدی کرو۔“ وہ دیکھ چکی تھی کہ ایڈگر کے ہاتھ میں اس کا اصلی ریوالور تھا۔ اس وقت یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ ریوالور اس کے پاس کیسے آگیا اور وہ نیند کی گولی کے باوجود جاگ کیسے گیا تھا؟

نقاب پوش نے اپنا پستول ہاتھ بڑھا کر اس کے سامنے کیا اور سکون سے بولا۔

”میرا بڑا پستول ہے تمہارا چھوٹا، اگر تم چاہو تو اپنے بدلے میرا لے سکتے ہو۔“

جیڈ کے منہ سے وحشت ناک چیخ برآمد ہوئی۔

”نہیں..... نہیں ایڈی! اسے گولی مار دو ورنہ یہ ہم دونوں کو مار دے گا۔“ مگر یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں کہ ایڈگر سکون سے نقاب پوش کے قریب چلا گیا۔ جیڈ نے

کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی امید ایڈگر کی عمر سے بڑی تھی۔ کسی فلم میں دیکھے ہوئے سین کے مطابق اس نے ڈائیلاگ تو بول لیا مگر وہ صورت حال کی نزاکت کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ جیڈ کو اپنی اور ایڈگر کی موت کا یقین ہوگیا۔ لاشعوری طور پر وہ دھماکے کی منتظر تھی لیکن کچھ نہیں ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک اور شدید حیرت اس کی منتظر تھی۔

ایڈگر اجنبی شخص کی گود میں بیٹھا اس کا پستول الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کا اپنا ریوالور فرش پر پڑا تھا۔ اجنبی شخص نے ٹوپی اتار کر پھینک دی۔ اس کے لمبے بال لہرانے لگے۔ اس نے جھک کر گود میں بیٹھے بچے کا منہ چوم لیا، ایڈگر چہک کر بولا۔

''دیکھیں مام! یہ زیادہ بڑا ہے۔ اب یہ میرا ہے۔''

خوبرو اجنبی بھی جیڈ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''میں ایڈم رش ہوں، سانتھا کا دوست۔ تم مجھے پہچان نہیں سکتی تھیں کیونکہ ہم اس سے پہلے کبھی ملے ہی نہیں تھے اور سانتھا کے پاس میری کوئی تصویر نہیں تھی۔''

وہ رکا، جیڈ کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر پھر گویا ہوا۔

''میں تمہاری بات پہ یقین کر چکا ہوں کہ جم نے تمہیں مجبور کر دیا تھا۔ میں سانتھا کے قتل کا بدلہ جم سے ہی لوں گا کیونکہ سانتھا دنیا کی وہ واحد عورت تھی جس کے لیے میرے دل میں کوئی نرم گوشہ تھا۔ میں واضح کردوں، میری تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ تمہاری شکل میری ماں سے ملتی ہے جس نے مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ میں تمہیں ہراساں کر کے اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ میں نے ساحل پہ تمہیں دیکھا تھا اور جب تم شام کو بچے کو لینے گئیں، میں تب گھر میں داخل ہو کر تمہارے بیڈ کے نیچے چھپ گیا تھا کیونکہ تالے کھولنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، جب میں نے تمہیں باہر جانے کو تیار ہوتے دیکھا تو حملہ کر دیا۔'' ریوالور جیب میں ڈال کر اس نے ایڈگر کو گود سے اتارا اور اٹھ کر جیڈ کے ہاتھ کھول دیے۔ اسے جیڈ سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ خود اسے بتا چکی تھی کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔

جیڈ نے اپنی کلائیوں کو مسلا۔ ان میں بندھے رہنے کی وجہ سے تکلیف ہو رہی تھی پھر اٹھ کر ایڈم کے قریب آئی، وہ جیڈ کو پہچان نہیں سکا تھا کیونکہ وہ ایک اسمارٹ سی لڑکا نما لڑکی تھی مگر اب ایک بھرے بھرے جسم والی بھرپور دوشیزہ تھی۔ اس نے زوردار تھپڑ ایڈم کے منہ پر مارا۔

''میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں، چھ سال سے۔ تم مجھے بھول سکتے ہو مگر میں نہیں۔ مجھے وہ تین دن آج بھی اسی طرح یاد ہیں جو تم نے میرے ساتھ گزارے تھے۔ وہ میری زندگی کا بدترین حادثہ تھا۔ میں نے تمہیں اس نشان سے پہچان لیا ہے۔''

اس نے ایڈم کے کان کی لو سے گردن کی طرف آتے تین انچ لمبے زخم کے مندمل شدہ نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ رو رہی تھی، ایڈم کو بھی یاد آگیا۔ آرنلڈ بے میں آنے سے پہلے وہ مشی گن میں تھا۔ وہاں اسے جیڈ نظر آگئی تھی، وہ خاموشی سے اس کے معمولات کا جائزہ لیتا رہا، پھر ایک دن اس کا پیچھا کیا اور خنجر کی نوک اس کی پشت سے لگا کر اس کے ساتھ گھر میں چلا گیا۔ مقصد وہی تھا، عورت کو خوفزدہ انداز میں اپنے سامنے گڑگڑاتے ہوئے دیکھنا۔ جیڈ کے خوفزدہ ہونے کا انداز اسے اتنا پسند آیا کہ وہ ایک دن کے بجائے تین دن تک اس کے گھر میں گھسا رہا اور کبھی تیزاب، کبھی بجلی سے اسے ہراساں کرتا رہا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے جیڈ کے گھر میں کتنا انجوائے کیا تھا۔ دفعتاً وہ کسی خیال سے چونکا۔ اس نے پہلے روتی ہوئی جیڈ اور پھر حیرت سے دیکھتے ایڈگر کی طرف دیکھا۔ وہ چلائی۔

''تم درست سمجھے ہو، اگر تم اپنی آنکھیں استعمال کرو تو دیکھ سکتے ہو کہ ایڈی میں تمہاری کتنی زیادہ شباہت ہے۔ اس کے ہنسنے اور بات کرنے کا انداز بھی تمہارے جیسا ہے۔''

ایڈم چند لمحے ہونقوں کی طرح جیڈ کی طرف دیکھتا رہا، پھر قہقہہ لگا کر ہنسا۔ منہ نیچے کر کے بولا۔

''مائی سن..... میرا بیٹا، یعنی کہ میرا بچہ، کتنا خوش کن ہے یہ احساس کہ میرا بچہ ہے۔''

اس نے لپک کر ایڈگر کو اٹھایا اور والہانہ چومنے لگا، بچہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا، اس نے پوچھا۔

''آپ میرے ڈیڈ ہیں انکل؟''

ایڈم کے ساتھ ساتھ جیڈ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''یقیناً بیٹا، پہلے میں مصروف تھا مگر اب میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہوں گا اور بہت سے کھلونے اور چاکلیٹ بھی لا کر دوں گا۔ اب میں، تم اور تمہاری مام ایک ساتھ رہیں گے۔''

اس نے معنی خیز نظروں سے جیڈ کی طرف دیکھا، اس نے رخ پھیر لیا، اس کا رویہ دیکھ کر ایڈم کو یقین ہوگیا کہ اسے جیڈ کو راضی کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

☆☆☆

نوٹ سمیٹ کر اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں

ٹھونسے اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ ٹائم کافی زیادہ ہوگیا تھا اس لیے وہ جانے کے لیے اٹھ گیا۔

''آج کے دن کے لیے اتنا کافی ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور اپنا ہیٹ اٹھا کر اس نے سب کو خدا حافظ کہا اور باہر آ گیا۔ رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ پہلے وہ کبھی اتنا لیٹ نہیں ہوا تھا مگر آج کی بات ہی اور تھی۔ آج اس نے جتنی بھی بازیاں لگائیں سب جیتیں، اس لیے لالچ کے مارے وہ بازی پہ بازی لگاتا گیا۔

گلیاں سنسان ہوگئی تھیں۔ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے جم متوازن چال چلتا ہوا جا رہا تھا۔ گلی کا موڑ مڑنے سے قبل اس نے بجھے ہوئے لائٹ پول کو دیکھا، شاید اس کا بلب خراب ہوگیا تھا۔ بلب بالکل اسی طرح خاموش تھا جیسے آئندہ آنے والے دو دنوں میں ایڈم اور اس کے بعد جیڈ کو خاموش ہو جانا تھا۔ جم جان گیا تھا کہ جیڈ اس سے نفرت کرتی ہے۔ وہ کسی بھی وقت جم کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ایڈم کے قتل کے بعد وہ سارا قیمتی سامان لے کر اس شہر سے نکل جائے گا اور جانے کے بعد پولیس کو ایڈم کے قاتل کے بارے میں ایک فون کر دے گا۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں گے۔

''بالکل اسی طرح ہوگا۔'' اس نے خوش ہو کر سر ہلایا اور گلی کا موڑ مڑ گیا، اگلے ہی لمحے ایک سایہ سا اس پہ جھپٹا اور پھندا اس کے گلے میں فٹ ہوگیا۔ اسے چیخنے کا موقع بھی نہ ملا اور اس کا جسم بے جان ہو کر نیچے گرنے لگا۔

☐☐☐

جم کا فلیٹ نہایت غلیظ تھا۔ ایڈم اور جیڈ دونوں نے بڑی احتیاط سے تلاشی لی۔ اگرچہ پہلے ہی بے ترتیبی اتنی تھی کہ کسی کو تلاشی کا شبہ بھی نہ ہوتا مگر وہ پھر بھی محتاط تھے۔ انہوں نے واش روم کا واٹر ٹینک، میٹریس کا فوم اور ونڈو کے فریم تک اچھی طرح کھنگالے۔ ہر جگہ سے انہیں کچھ نہ کچھ مل ہی گیا۔ الماری کے خفیہ خانے سے انہیں سونے کی پانچوں ڈلیاں بھی مل گئیں۔ جیڈ نے اسے ایک موٹی سی گالی دی۔ وہ سونا اپنے پاس موجود ہونے کے باوجود اسے دھمکا تا رہا تھا۔

جم کے فلیٹ سے جو کچھ ملا تھا اس سے انہیں یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ عنقریب یہ علاقہ چھوڑنے والا تھا کیونکہ اس کا سفری بیگ تیار تھا، بس اس نے رقم اور سونا وغیرہ الگ الگ مقامات پر چھپائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی میں دولت سمیٹ کر وہ روانہ ہوگئے۔ جم کو قتل کرنے کے بعد ایڈم نے اس کی لاش اگرچہ دیوار کے ساتھ لگا دی تھی مگر اس کے نظر آجانے کا خدشہ اپنی جگہ موجود تھا۔

☐☐☐

ہوٹل میں زیادہ رش نہیں تھا، پھر بھی ایڈم نے کونے والی میز کا انتخاب کیا۔ وہ تینوں ڈنر کرنے آئے تھے۔ پولیس نے جم کے کیس کو بھی اسٹریٹ کرائم کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ اب جیڈ اور ایڈم اپنی مرضی اور پسند کی زندگی بلا خوف وخطر گزار سکتے تھے۔ اسی خوشی میں یہ ڈنر ایڈم کی طرف سے دیا گیا تھا۔

''ڈیڈ! میں ویسا ہی جہاز اور ٹرین لینا چاہتا ہوں جیسا موش کے پاس ہے۔ مام کہتی ہیں کہ وہ بہت مہنگا ہے۔''

ایڈم کے بولنے سے پہلے جیڈ بول اٹھی۔

''ایڈی تنگ مت کرو، تم کھلونا ایک دن بھی سلامت نہیں رہنے دیتے۔ اتنے قیمتی کھلونے تمہیں بالکل نہیں ملیں گے۔''

ایڈم خاموش رہا۔ اگر وہ ایڈگر کی حمایت کرتا تو جیڈ خفا ہو جاتی اور وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''مگر مام، ڈیڈ آپ کے پاس بہت سے پیسے ہیں۔ آپ انہیں خرید سکتے ہیں۔'' اس نے قائل کرنے کی کوشش کی، جیڈ کو غصہ آگیا۔

''ہاں ہیں، مگر ہم تمہیں جہاز اور ٹرین بالکل نہیں لے کر دیں گے۔ جب تم خود کماؤ گے تب لے لینا۔''

ڈنر کا مزہ کرکرا ہونے پر وہ خفا ہوگئی تھی۔ تینوں خاموشی سے واپس آگئے مگر ایڈگر کا منہ پھولا ہوا تھا۔

صبح صبح پولیس سارجنٹ ان کا دروازہ بجا رہا تھا۔ جیڈ نے دروازہ کھولا تو سارجنٹ نے کہا۔

''رات کو اس گھر سے کسی بچے نے فون کر کے شکایت کی تھی کہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔''

جیڈ اور ایڈم ہکا بکا کھڑے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے، اپنے کمرے سے ایڈگر ایک کھلونا ٹیپ لیے برآمد ہوا اور سارجنٹ کے پاس آ کر بولا۔

''انکل یہ واقعی اچھے ماں باپ نہیں ہیں، یہ دیکھیں ان کی باتیں بھی اچھی نہیں ہیں۔'' اس نے ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔

جیڈ اور ایڈم گرنے کے سے انداز میں نیچے بیٹھ گئے۔ اس ٹیپ میں اس وقت ریکارڈنگ کی گئی تھی جب وہ دونوں جم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

☐☐☐

مصروف لاش

اثر نعمانی

کہتے ہیں کہ بعد از مرگ زندگی کے غموں سے نجات مل جاتی ہے مگر یہاں تو حقیقت برعکس نکلی کہ... جنہیں آخری آرام گاہ تک جانا تھا وہ رات کی تاریکی میں مٹرگشت کو چل نکلے۔ گویا کہ مرکے بھی فریب دینے سے باز نہ آئے... کمال کے لوگ تھے۔

لاشوں کا کھیل تماشا... ایک عجیب پراسرار کہانی

لیفٹیننٹ بروکس نے اوڈیر کی پہلی دستک پر ہی دروازہ کھول دیا۔ اوڈیر ایک پرائیویٹ جاسوس تھا اور اس نے بروکس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی محسوس کر لیا کہ وہ کسی بڑی پریشانی میں پھنس گیا ہے، اس کا سیاہ اداس چہرہ معمول سے زیادہ ہی اداس معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے راہداری میں دائیں بائیں دیکھا، یہ یقین کرنے کے لیے کہ اوڈیر اکیلا ہی ہے اور یہ کہ اسے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اور پھر اپنا اطمینان کرنے کے بعد اپنے دوست کو اندر آنے کا

اشارہ کیا۔ اوڈیر نے کمرے میں قدم رکھا اور بروکس نے جلدی سے دروازہ بند کردیا۔ اندر قدم رکھتے ہی اوڈیر کو معلوم ہوگیا کہ بروکس کی پریشانی کی نوعیت کیا ہے۔

رہائشی کمرے کے فرش پر ایک آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

''اس کا نام بینی زیٹو ہے۔'' بروکس نے بتایا۔ ''یہ لیو موریلی کے پاس ملازم تھا۔''

اوڈیر کو کبھی زیٹو سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر اس نے اس کا نام سنا ضرور تھا۔ جہاں تک موریلی کا تعلق تھا تو وہ ڈان ویٹو کرونا کا دایاں بازو تھا اور خود کرونا مافیا کی مقامی شاخ کا سربراہ تھا۔ اوڈیر آگے بڑھ کر لاش کے قریب آیا اور اسے جھک کر دیکھنے لگا۔ اس کی کمر کے نچلے حصہ میں گولیوں کے تین زخم تھے اور ان میں سے کوئی بھی زیٹو کو مار سکتا تھا۔ اعشاریہ 38 بور کا پولیس اسپیشل ریوالور لاش سے چند فٹ کے فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ اوڈیر نے بروکس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ تمہارا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' بروکس نے جواب دیا۔

''اوڈیر نے کوچ پر بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگایا۔

''صورتِ حال کچھ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں لوگیز کے ریسٹورنٹ میں انالین ڈنر کو اس وقت تک ملتوی کرنا پڑے گا جب تک یہ معاملہ طے نہ ہوجائے۔''

''بڑے اطمینان سے باتیں کررہے ہو۔'' بروکس نے چڑ کر کہا۔ ''کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ معاملہ کتنا نازک ہے۔''

''ویسے تم نے تو اسے قتل نہیں کیا ہے نا؟''

''بالکل نہیں لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے، یہ شخص مر چکا ہے اور میرے ریوالور سے ہی قتل کیا گیا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ میں موریلی کے کیس پر کام کررہا تھا۔ لوگ اس حادثے پر طرح طرح کی باتیں بنا سکتے ہیں۔''

''مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔''

''انہوں نے مجھے کسی بے ہوشی کی دوا سے مدہوش کر دیا تھا۔'' بروکس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے پولیس میں کام کرتے ہوئے پندرہ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں اور اس کے باوجود ایک بہت ہی ادنیٰ اور بے شمار مرتبہ کی دیکھی ہوئی چال کا شکار ہوگیا۔''

''کیسے؟'' اوڈیر نے پوچھا۔ کالی چمڑی کے لیفٹیننٹ بروکس نے ایک گہری سانس لی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''کسی نے میری وہسکی کی بوتل میں کوئی نشہ آور دوا ملا دی تھی۔ میں گھر آیا اور جیسے ہی وہسکی کا ایک گلاس پیا، بے ہوش ہوگیا، جب ہوش آیا تو زیٹو کی لاش قریب پڑی تھی اور ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔''

''کسی نے ریوالور چلنے کی آواز نہیں سنی؟''

''نہیں۔'' بروکس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا فلیٹ ساؤنڈ پروف ہے۔''

''پھر بھی تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ پولیس لیبارٹری میں تمہارے ہاتھوں کا ٹیسٹ کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ تم نے ریوالور نہیں چلایا اس لیے تمہارے ہاتھ پر بارود کے ذرات نہیں ہوں گے۔''

''میں اس ٹیسٹ پر اعتماد نہیں کرسکتا۔ موریلی بہت چالاک آدمی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس نے پہلی گولی سے زیٹو کو ہلاک کرنے کے بعد ریوالور میرے ہاتھ میں دے کر باقی دو گولیاں ٹرائیگر پر میری انگلی دبا کر چلادی ہوں، میں اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اس کا امکان بہرحال موجود ہے۔''

اوڈیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک لمحہ سوچا، پھر پوچھا۔

''تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''یہ وہ سوال ہے جسے میں ہوش میں آنے کے بعد سے مسلسل اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ تمہارے دماغ میں کوئی ترکیب آئی ہو تو بتاؤ۔'' بروکس نے جواب دیا۔

''ایک آدھ ترکیب آ تو رہی ہے۔'' اوڈیر نے کہا۔ ''لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ کام موریلی کا ہی ہوسکتا ہے؟''

''ہاں۔'' بروکس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''صورت حال یہ ہے کہ اس وقت موریلی ایک تار سے لٹکا ہوا ہے اور وہ خود بھی اس بات کو جانتا ہے۔ میں اس کے اس قدر قریب پہنچ گیا ہوں کہ اس کا ایک ایک لمحہ اضطراب کے عالم میں گزر رہا ہوگا۔ مجھے صرف ایک ہفتہ کی مہلت درکار ہے۔ اس کے بعد میرے پاس اتنے ثبوت فراہم ہوجائیں گے کہ موریلی کا بچنا ناممکن ہوگا اور وہ خود بھی اس بات کو جانتا ہے کہ اگر ایسا ہوگیا تو کیا ہوگا۔ لیکن دوسری طرف یہ صورت ہے کہ بہت سے لوگوں کو یہ بات گوارا نہیں ہے کہ ایک کالی نسل کا آدمی پولیس کے محکمے میں کام کررہا ہو اور یہ حادثہ ان کے لیے مجھے برطرف کرانے کا ایک بہانہ بن جائے گا۔ مجھے ملازمت سے نکلوانے کے بعد موریلی کو اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فکر باقی نہیں رہے گی۔''

''موریلی، ویٹو کرونا کے احکامات کے مطابق کام کرتا ہے۔'' اوڈیر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، کرونا کو قتل و غارت گری سے نفرت ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو قتل کرنے سے منع کر رکھا ہے، اِلّا یہ کہ خود اس کی خاص اجازت سے بہت ہی مجبوری کے عالم میں کیا جائے۔ پھر اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ زیٹو کو قتل کرنے کے لیے موریلی نے کرونا سے اجازت حاصل کرلی ہوگی؟''

''نہیں۔ مجھے جو حالات معلوم ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ آج کل موریلی اور کرونا کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ کرونا موریلی سے نفرت کرنے لگا ہے۔ اسے شبہ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک یقین ہے کہ موریلی اسے ہٹا کر خود گروہ کا باس بنا چاہتا ہے، چنانچہ وہ انتظار میں ہے کہ موریلی سے کوئی غلطی سرزد ہو اور اس غلطی کو جواز بنا کر موریلی کا قصہ پاک کر دے۔ اس کی نفرت یہاں تک بڑھ چکی ہے کہ قتل کو ناپسند کرنے کے باوجود اگر اسے احساس ہوجائے کہ اس کے بغیر موریلی باز آنے والا نہیں تو وہ اس کی جان لینے سے بھی ذرا نہیں ہچکچائے گا۔''

''تو پھر کیوں نہ ہم کرونا کو وہ جواز مہیا کردیں جس کی اسے تلاش ہے۔'' اوڈیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم پتا نہیں کیا باتیں کررہے ہو۔'' بروکس نے الجھتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں کوئی ایسی ترکیب نہیں آتی جس کی مدد سے ہم زیٹو کے قتل کو براہ راست موریلی کی ذات سے متعلق ثابت کردیں۔ یہ قتل تو بادی النظر میں وہی کچھ معلوم ہوتا ہے جو موریلی چاہتا ہے کہ معلوم ہو۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ موریلی کے آدمی ہی زیٹو کو یہاں لے کر آتے ہوں گے بلکہ ہوسکتا ہے کہ موریلی بھی ان کے ساتھ ہو اور اس نے خود ہی زیٹو کو قتل کیا ہو، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس سے باز پرس کی جائے تو وہ نصف درجن سے زیادہ ایسے گواہ یا ایسے ثبوت پیش کردے گا جن سے ظاہر ہوگا کہ قتل کے وقت وہ کہیں اور تھا۔''

''اس میں شبہ نہیں کہ کام بہت ہوشیاری سے کیا گیا ہے لیکن ترکیبیں سوچنے میں، میں بھی موریلی سے کچھ کم نہیں ہوں۔'' اوڈیر نے کہا۔

''مجھے اس بات کا یقین ہے۔'' پریشانی کے باوجود بروکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ''اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہیں فون کرکے آنے کی زحمت نہ دیتا۔ بتاؤ تم نے کیا ترکیب سوچی ہے؟''

''تمہارا یہ فلیٹ پہلی منزل پر ہے اور پارکنگ پلاٹ کے بالکل سامنے، صحیح ہے؟''

''ہاں، ٹھیک ہے۔''

''تب پھر یہ بات ایسی مشکل نہیں کہ ہم زیٹو کی لاش پچھلی کھڑکی سے نکال کر لے جائیں اور تمہاری یا میری کار میں رکھ دیں اور ہمیں کوئی دیکھ بھی نہ سکے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن......''

''مجھے کچھ اندازہ تو ہے۔'' اوڈیر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم موریلی سے انتقام لینے کے لیے اس بات پر آمادہ ہو کہ اگر ضروری ہو تو ہم کوئی ایسا قدم بھی اٹھا سکتے ہیں جسے غیر قانونی یا کم سے کم قانون نہ کہا جاسکے۔''

''عام حالات میں، میں اسے پسند نہ کرتا لیکن جب وہ مجھے پھانسنے کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کرسکتا ہے تو مجھے اس کا خیال کیوں ہو کہ ہمارا اقدام قانونی ہے یا نہیں۔'' بروکس نے زیٹو کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''بہت خوب۔ تب پھر آؤ دیکھیں کہ ہم اپنے طور پر انصاف کا تقاضا پورا کرسکتے ہیں یا نہیں۔''

''ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''سب سے پہلے ہم زیٹو کی لاش کو اٹھا کر نیچے لے جائیں گے اور میں اسے اپنی کار کی ڈکی میں رکھ دوں گا۔ اس کے بعد تم موریلی کے کلب جاؤ گے۔ اس سے ملاقات کرو گے۔ کہو گے کہ تم اس کی اس چال سے گھبرا کر اس سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہو اور یہ کہ تم نے زیٹو کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا ہے مگر یہ نہیں چاہتے کہ اس قسم کی بات کا اعادہ ہوسکے۔ چنانچہ اس کے خلاف تحقیقات سے دست کش ہونے کے لیے آمادہ ہو بشرطیکہ وہ کوئی بڑی رقم دینے کا وعدہ کرے۔ کم سے کم دس ہزار ڈالرز۔ یہ رقم مل جائے تو تم نہ صرف اس کے خلاف تحقیقات ختم کردو گے بلکہ اب تک جو ثبوت حاصل کیے ہیں انہیں بھی ضائع کردو گے۔''

بروکس نے کچھ اعتراض کرنا چاہا مگر اوڈیر نے اسے ہاتھ اٹھا کر بولنے سے روک دیا۔

''پہلے میری پوری بات سن لو پھر کوئی اعتراض ہو تو بات کرلینا۔''

○○○

اور اس کے بیس منٹ کے بعد پرائیویٹ جاسوس اوڈیر اپنے دوست بروکس کے ٹیلی فون پر کوئی نمبر ڈائل کررہا تھا۔ وہ اس وقت فلیٹ میں اکیلا تھا۔ زیٹو کی لاش اس کی کار کی ڈکی میں آرام کررہی تھی اور بروکس جو اب بھی اس کی

تجویز سے پوری طرح متفق نہیں تھا مگر بہرحال اس پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے موریلی سے ملنے اس کے نائٹ کلب روانہ ہو چکا تھا جو کہ مورگن اسٹریٹ پر واقع تھا۔

جس نمبر کی اوڈیر کو ضرورت تھی، وہ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں درج نہیں تھا چنانچہ اسے حاصل کرنے کے لیے اسے دو مخبروں سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔ پہلے کو اس کے بارے میں خود علم نہیں تھا مگر دوسرے مخبر نے معقول انعام کے بدلے اوڈیر کو وہ نمبر بتا دیا اور اب اوڈیر وہ نمبر ڈائل کر کے دوسری طرف سے جواب ملنے کا منتظر تھا۔ آخرکار ایک آواز نے جواب دیا۔ ہرچند لہجہ نرم اور مہذبانہ تھا مگر اس کے باوجود الفاظ وہ درشتی چھپانے سے قاصر تھے جو اس کی تہ میں پوشیدہ تھی۔

"یہ ایک پرائیویٹ لائن ہے۔" آواز نے کہا۔ "لہٰذا جو کچھ تمہیں کہنا ہے وہ واقعی اہم ہونا چاہیے۔ میں معمولی معمولی باتوں کے لیے پریشان کیا جانا پسند نہیں کرتا۔"

"بات بہت اہم ہے مسٹر کرونا!" اوڈیر نے اپنی آواز سے گھبراہٹ اور پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام بینی زیٹو ہے، تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں لیو موریلی کے ساتھ کام کرتا ہوں۔"

"تو پھر کیا ہوا؟" کرونا نے بے تابی سے کہا۔ "تمہیں یہ نمبر کیسے معلوم ہوا اور اس طرح فون کرنے سے......"

"میں تمہارے ہاتھ کچھ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔" اوڈیر نے کہا۔ "اس کا تعلق موریلی سے ہے۔ کچھ ایسی باتیں جنہیں جان کر تم بہت خوش ہو گے۔"

"موریلی کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟" کرونا کی جھلاہٹ غائب ہو گئی اور اس کی جگہ تجسس نے لے لی۔

"وہ بڑے بڑے خواب دیکھتا ہے مسٹر کرونا، یہ بات تو تم بھی جانتے ہو۔ میں نے اسے اپنے قابل اعتماد ساتھیوں سے باتیں کرتے سنا ہے، وہ کوئی بڑی سازش کر رہا ہے دوسرے الفاظ میں وہ گروہ کے اندر دوسری پوزیشن پر کام کرتے کرتے تنگ آ چکا ہے اور اب پہلی پوزیشن حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"تم نے ابھی اپنا نام کیا بتایا تھا؟"

"زیٹو، بینی زیٹو۔"

"او کے زیٹو، میں سوچ رہا ہوں کہ ممکن ہے میں اور تم ایک دوسرے کے تعاون سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ تمہیں میرے گھر کا پتا معلوم ہے؟"

"میں جانتا ہوں مگر میرے لیے وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ موریلی کو بھی مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ایک تعاقب کرنے والے سے بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ میں تم سے ملنے تمہارے گھر گیا تھا تو پھر میری خیریت نہیں۔"

"پھر تم کیا تجویز کرتے ہو؟" کرونا نے پوچھا۔

اوڈیر اس طرح رکا جیسے کوئی حل سوچ رہا ہو۔

"اگر تم مجھ سے کسی جگہ ملاقات کر سکو تو کیسا رہے۔" آخر اس نے کہا۔ "میں اس وقت نارتھ سائڈ میں ہوں۔ نصف شب کو لی لینڈ پارک میں مجسمے کے نیچے پڑی ہوئی بنچ پر میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

لی لینڈ سڑک نمبر 23 کے قریب ایک پارک تھا جو دو ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا، اس میں چاروں طرف گھنے درخت لگے تھے اور رات کے وقت وہاں روشنی کا انتظام بہت ہی ناکافی ہوتا تھا۔ اوڈیر کے ذہن میں جو ترکیب تھی اس کے لیے یہ پارک بہت ہی مناسب جگہ تھی۔ کرونا نے بلا تامل جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، میں نصف شب کو وہاں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ آ جاؤں گا، لیکن یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے اپنی معلومات کی کیا قیمت لو گے؟"

"میں جو کچھ تمہیں بتانے والا ہوں وہ تمہارے لیے بہت اہم ہے بلکہ ایک طرح سے تمہاری زندگی بچا سکتا ہے۔" اوڈیر نے جواب دیا۔ "اس حساب سے مجھے زیادہ کا مطالبہ کرنا چاہیے تھا لیکن میں دس ہزار ڈالرز میں سودا کر لوں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" کرونا نے جواب دیا۔ "فون کرنے کا شکریہ۔ میں اس شیطان موریلی کو ایک مدت سے ٹھکانے لگانے کی فکر میں ہوں۔ اگر تمہاری معلومات نے مجھے اس کا موقع دے دیا تو ایک ہزار ڈالرز میں مجھے یہ سودا گراں نہیں ہو گا۔ میں ٹھیک بارہ بجے تم سے پارک میں ملاقات کروں گا۔"

"ایک بات اور مسٹر کرونا۔" اوڈیر نے کہا۔ "میں پارک میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ملوں گا۔ اس کا نام اوڈیر ہے اور وہ ایک پرائیویٹ جاسوس ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، موریلی کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں اس کے بارے میں کچھ جان گیا ہوں اور وہ اس بات کی پوری کوشش کر رہا ہے کہ میں وہ معلومات تمہیں نہ بتا سکوں۔ اسی لیے وہ میرا تعاقب بھی کرا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی حفاظت کے لیے اس پرائیویٹ جاسوس کی خدمات بہ طور باڈی گارڈ حاصل کر لی ہیں۔"

"مجھے جاسوسوں پر کوئی اعتبار نہیں ہے خواہ وہ پولیس کے ہوں یا پرائیویٹ۔" کرونا نے جواب دیا۔ "لیکن اگر وہ تمہارا باڈی گارڈ ہے تو امید ہے کہ کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

اور یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اوڈیر نے بھی مسکراتے ہوئے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ فلیٹ کی بتیاں بند کیں اور دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

ooo

بارہ بجنے میں پانچ منٹ پہلے وہ پارک میں مجسمے کے نیچے والی بنچ پر اطمینان سے بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجسمہ امریکا کی خانہ جنگی کے کسی ہیرو کا تھا جس کا نام بھی اب لوگ بھول چکے تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور پارک کی نیم تاریکی روزانہ سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے گھنے درختوں کی وجہ سے شہر کی سڑکوں کا شور و غل پارک کے اندر بہت ہی ہلکا سا سنائی دیتا تھا۔

بنچ پر اوڈیر اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی بینی زیٹو کی لاش بھی بیٹھی ہوئی تھی اور کچھ اس انداز سے کہ کسی قریب سے گزرنے والے کو بھی یہی معلوم ہوتا کہ دو دوست پارک میں چہل قدمی کرتے کرتے تھک کر آرام کرنے بیٹھ گئے ہیں۔

لیکن اوڈیر کے نزدیک زیادہ اہم بات یہ تھی کہ کرونا انہیں دیکھ کر کیا خیال کرتا ہے۔ اس نے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ ٹھیک بارہ بج رہے تھے، اس نے اپنا نصف پیا ہوا سگریٹ پختہ روش پر پھینک دیا اور پھر اسے جوتے کی ایڑی سے مسل دیا۔ آدھی رات کی سرگرمیاں ٹھیک وقت پر شروع ہو چکی تھیں۔

اس کے بائیں جانب ایک تاریک گوشے سے تین آدمی نکل کر اس کی طرف بڑھے۔ وہ کچھ قریب آئے تو اس نے درمیان والے آدمی کو پہچان لیا، وہ خود کرونا تھا۔ اوڈیر نے پھرتی سے زیٹو کی لاش کی پوزیشن درست کر دی۔ اب وہ اس طرح بیٹھا ہوا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دونوں پیر زمین پر کراس کی شکل میں ٹکے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ گود میں رکھے تھے، وہ بالکل ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ اوڈیر کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ کہیں وہ گفتگو کے دوران ادھر ادھر یا سامنے کی جانب نہ لڑھک جائے لیکن ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

کرونا اور اس کے ساتھی درمیان میں واقع گھاس کے لان کو عبور کرتے ہوئے محتاط قدموں سے نزدیک آ رہے تھے۔ اوڈیر کھڑا ہو گیا اور اپنی مخالف سمت میں دیکھا۔ یہاں ایک اور بات تھی جو اسے پریشان کر رہی تھی۔ پروگرام کے مطابق اس وقت کچھ اور باتیں بھی تھیں جن کو شروع ہو جانا چاہیے تھا مگر ابھی تک اس جانب مکمل خاموشی تھی۔

جس وقت اس نے دوبارہ سامنے نگاہ کی تو کرونا تقریباً اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے دونوں باڈی گارڈ چند قدم پیچھے رک گئے تھے۔ ان کے ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیبوں کے اندر تھے۔

"تم کون ہو؟" کرونا نے آتے ہی پوچھا۔

اوڈیر کو جواب دینے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ کاش اس وقت اس کے پاس ریوالور ہوتا تو اچھا تھا۔

"میرا نام اوڈیر ہے۔ میرا خیال ہے کہ زیٹو نے تمہیں میرے بارے میں بتا دیا ہو گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ اس نے مجھے کیا کچھ بتایا تھا۔" کرونا نے جواب دیا اور بنچ پر بیٹھے ہوئے زیٹو کی طرف دیکھا۔ "اچھا دوست اب جو کچھ تم جانتے ہو جلدی سے بتا دو۔ میں تمام رات یہاں نہیں گزار سکتا۔"

لیکن زیٹو اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس کی مردہ آنکھیں بالکل سامنے دیکھتی معلوم ہوتی تھیں۔ کرونا نے پلٹ کر اوڈیر کی طرف دیکھا۔

بچوں کو نانی

- مت دو، ہمارے نمک پارے دو۔
- میرا روپ نہ حسن سے بنا تھا، نہ نازو نزاکت سے، بلکہ حوصلوں ہمتوں اور مقابلوں سے۔
- مشکل اچھی چیز ہے بشرطیکہ تم اسے صحیح استعمال کر سکو۔
- اٹھ جاگ رے راہی بھور بھئی اب رین کہاں جو سووت ہے جو جاگت ہے سو پاوت ہے، جو سووت ہے سو کھووت ہے
- یہ ایک دل فگار مسئلہ ہے جس کا حل دو نئے مسئلوں کو جنم دیتا ہے۔
- میں اپنے درد کے لیے گرم بوتل کی جگہ کرسے بلی لگا کر سوتا ہوں، وہ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔
- ہائے کتنے پرسکون دن تھے اور پرسکون راتیں جب ٹیلی فون ایجاد نہیں ہوا تھا۔
- جب سقراط جیسا عقل مند زہر پی گیا تو ظاہر ہوا، احمق سے احمق عورت عقل مند سے عقل مند مرد کو احمق بنا سکتی ہے۔

"یہ نشے میں تو نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔ اوڈیر کا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔

"اوہ ہاں۔" وہ جیسے چونک کر بولا۔ "ہم یہاں آتے ہوئے راستے میں ایک بار میں کچھ پینے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ بات یہ ہے مسٹر کرونا کہ زیٹو بہت ہی گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔ اسے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھنے کے لیے کچھ پینا ضروری تھا۔ مگر شاید ضرورت سے زیادہ پی گیا ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ اگر موریلی کو یہ پتا چل جائے کہ وہ تمہیں کچھ بتانے جا رہا ہے تو....."

"ہاں، ہاں۔ میں یہ سب کچھ سمجھتا ہوں۔" کرونا نے بے تابی سے کہا اور اس سے پہلے کہ اوڈیر اسے روکنے کے لیے کچھ کر سکے، وہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے زیٹو کی لاش کے قریب پہنچا اور چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر زیٹو کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہتا جا رہا تھا۔

"ہوش میں آؤ زیٹو۔ تم مجھے لیو موریلی کے بارے میں....."

وہ اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ اس کا ہاتھ زیٹو کے جسم سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھا۔

"یہ آہٹ کیسی تھی؟" وہ تیزی سے بولا۔ "کوئی ادھر آ رہا ہے۔"

اس کے دونوں ساتھی حرکت میں آئے، انہوں نے پھرتی سے اپنی اپنی جیبوں سے ریوالور نکال لیے اور گھوم کر پارک کے اس تاریک حصے کی جانب دیکھنے لگے جس طرف سے آہٹ سنائی دی تھی۔ دور فاصلے پر جھاڑیاں ہل رہی تھیں اور ان جھاڑیوں سے کوئی شخص نکل کر ان کی طرف آ رہا تھا۔ کرونا تیزی سے اوڈیر کی طرف پلٹا، اس کی آنکھیں غصے سے چمک رہی تھیں۔

"اگر یہ کوئی فریب ہوا تو تمہاری خیریت نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"ہماری طرف سے کوئی فریب نہیں کیا گیا ہے مسٹر کرونا۔" اوڈیر نے جلدی سے کہا۔ "البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ موریلی زیٹو کی زبان بند کرنے کے لیے خود میدان میں آ گیا ہو....."

وہ کچھ اور بھی کہنے والا تھا مگر اسی وقت فائر کی آواز آئی ایک، دو، تین کسی نے بہت قریب سے تین گولیاں یکے بعد دیگرے چلائیں اور اس کے ساتھ ہی بہت سی باتیں ایک ساتھ پیش آنے لگیں۔

کرونا منہ ہی منہ میں گالیاں بکتے ہوئے جلدی سے نیچے جھک گیا تاکہ اپنے آپ کو فائرنگ سے محفوظ کر سکے، پھر جیسے ہی کرونا زمین کی طرف جھکا، اوڈیر کا ایک پیر تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے زیٹو کے پیروں پر زور سے لات ماری۔ زیٹو کی لاش کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ بنچ سے لڑھک کر منہ کے بل گھاس پر گر گیا۔

جس طرف سے فائر کی آوازیں آئی تھیں اسی جانب سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹ بلند ہوئی جو لحہ بہ لحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ کرونا نے اپنے دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا۔

"ان کا پیچھا کرو۔" اس نے حکم دیا۔ "جلدی۔ وہ بھاگنے نہ پائیں۔"

اس کے باڈی گارڈ جھاڑیوں کی طرف بھاگے مگر اب اس طرف سے کچھ اور آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ایک کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز..... انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز اور پھر پختہ روش پر کار کے پہیوں کے رگڑنے کی باریک چیخوں جیسی آواز..... ساتھ ہی ان کے سامنے کوئی کار تیزی سے گزر کر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ کرونا جلدی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ موریلی کی کیڈی تھی۔" وہ غرا کر بولا اور پھر اپنے قریب پڑے ہوئے ڈھیر کو دیکھا۔ "اس کی کیا حالت ہے؟" اوڈیر نے زیٹو کی لاش کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے سیدھا کیا اور اس ہلکی روشنی میں بھی گولیوں کے ان زخموں کو دیکھنا مشکل نہیں تھا جو زیٹو کے سینے پر موجود تھے۔ اوڈیر نے سر اٹھا کر کرونا کی طرف دیکھا۔

"یہ مر چکا ہے۔" اس نے کہا۔

اسی وقت کرونا کے باڈی گارڈ واپس آ گئے۔

"وہ بھاگ نکلا باس!" ان میں سے ایک نے کہا۔

کرونا نے ایک مرتبہ پھر زیٹو کی لاش کی طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی کے عالم میں سر ہلایا۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ موریلی ہی تھا اور اب میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیٹو کا تعاقب کرتے ہوئے پارک تک آ گیا، اس سے پہلے کہ وہ مجھے کچھ بتا سکتا، اس نے زیٹو کو مار کر اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔ لیکن اب میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔ موریلی کی قضا اس کے سر پر ناچ رہی ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب تک میں بہ طور خاص حکم نہ دوں، گروہ کے کسی آدمی کو کسی کی جان لینے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن ہم نے ابھی دیکھا کہ اس نے میرے حکم کی صریحاً خلاف ورزی

کرتے ہوئے زیٹو کو قتل کر دیا۔ اسے کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ زیٹو مجھ سے اس کا تمام کچا چٹھا بیان کرنے یہاں آیا ہے اور اس نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔"

اوڈیر اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ کانپ رہا ہو۔

"اب میرے لیے بڑی مصیبت ہے۔" اس نے کہا۔ "پولیس عنقریب یہاں پہنچنے والی ہو گی اور مجھے مجبوراً انہیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔"

"پولیس کے بارے میں پریشان مت ہو۔" کرونا نے اوڈیر سے کہا اور اپنے گارڈز کی طرف دیکھا۔ "زیٹو کی لاش اٹھا کر کار میں رکھ دو۔ ہم اسے کہیں دفن کر دیں گے اور پھر اس سے فارغ ہو کر میں خود موریلی سے ملنے جاؤں گا۔" اس کے جبڑے کے عضلات تن گئے۔ "اور یہ آخری ملاقات ہو گی جو موریلی کسی کے ساتھ کر سکے گا۔"

ooo

اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے اور لیو جی کے بار اینڈ ریسٹورنٹ میں صرف دو گاہک موجود تھے۔ ایک اوڈیر اور دوسرا بروکس۔ وہ ابھی ابھی کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے۔ اوڈیر نے خالی پلیٹ اپنے سامنے سے پیچھے سرکائی اور انگڑائی کے انداز میں بازو پھیلا کر بولا۔

"بہت مزیدار کھانا تھا۔ موقع ملا تو ہم آئندہ بھی یہاں آتے رہیں گے۔"

بروکس کچھ زیادہ نہیں کھا سکا تھا۔ اس کی پلیٹ نصف سے زیادہ بھری رکھی تھی۔

"اگر تمہارا مطلب صرف کھانا کھانے کے لیے آنے سے ہے تب تو ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن جہاں تک دوسرے واقعات کا تعلق ہے تو اب مجھے ان کے اعادے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ یہ قیامت زندگی میں ایک ہی مرتبہ آنا بہت کافی ہے۔"

اوڈیر نے بڑے اطمینان سے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔

"ٹھیک کہتے ہو، خصوصاً بعض لمحات تو بہت ہی خطرناک تھے۔" اس نے کہا۔ "مثال کے طور پر اس وقت جبکہ تم نے اور موریلی نے آنے میں دیر لگائی، کیا ہو گیا تھا؟"

"بس اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے۔" بروکس نے بتایا۔ "اگرچہ میں وہاں موجود تھا۔ تمہارے کہنے کے مطابق میں موریلی کے نائٹ کلب گیا۔ وہاں تمہاری ہدایت کے مطابق جو کچھ کہنا تھا کہا اور پھر رقم کے لیے کہا کہ وہ ٹھیک بارہ بجے اس پارک میں مجسمے کے نیچے پڑی ہوئی بنچ پر ملاقات کرے۔ کلب سے واپس آتے ہی میں پارک میں اپنی مقررہ جگہ پر چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس لیے اصل میں مجھے نہیں بلکہ موریلی کو پہنچنے میں دیر ہوئی۔"

"گویا تم اس تمام وقت وہاں پارک میں اپنی جگہ موجود تھے جبکہ میں زیٹو کی لاش کے ساتھ بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔" اوڈیر نے کہا۔ "بڑے تعجب کی بات ہے، میں نے تمہاری ذرا سی آہٹ بھی محسوس نہیں کی۔"

"میں تو موجود تھا، ممکن ہے تم نے غور سے آہٹ سننے کی کوشش نہ کی ہو۔" بروکس نے کہا۔ "مجھے تو ہر لحہ یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ اگر گشتی پولیس کی کوئی کار آ نکلی اور اس نے تمہیں وہاں ایک لاش کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا تو کیا ہو گا۔"

"لیکن ایسا ہوا نہیں۔" اوڈیر مسکرایا۔ "مجھے صرف کرونا، اس کے دو آدمیوں اور موریلی نے زیٹو کے ساتھ دیکھا تھا۔"

"مجھے تو اس کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ موریلی اس قدر قریب پہنچ جائے گا۔" بروکس نے کہا۔ "میں نے اسے کار سے اترتے دیکھا، اس کے ایک ہاتھ میں بیگ تھا جس میں وہ غالباً مجھے دینے کے لیے رقم لے کر آیا ہو گا۔ پھر جیسے ہی اس نے کار سے اتر کر تمہاری طرف بڑھنا شروع کیا، میں نے تمہارے کہنے کے مطابق ہوائی فائر کرنے لگا، تین فائر، جیسی کہ تم نے ہدایت کی تھی۔"

"بہرحال ہماری ترکیب کامیاب رہی۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی موریلی گھبرا گیا اور بھاگ کھڑا ہوا جیسی کہ مجھے توقع تھی۔ کرونا نے اسے بھاگتے دیکھا۔ پھر اس کی کار جاتے دیکھی۔ دو اور دو جمع کیے اور چھ بنا لیے۔"

"درست ہے، ہر کام ہماری امید کے مطابق ہوا۔" بروکس نے تائید کی۔ "اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ورنہ میری گردن پھنسنے میں تو کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن اس کے باوجود آج کی رات بڑی تنگ و دو میں گزری، میں تو ادھر ادھر بھاگتے بھاگتے بالکل تھک گیا ہوں۔"

اوڈیر نے مسکراتے ہوئے اپنے گلاس کی باقی شراب ختم کی۔

"تمہیں کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے۔" وہ بولا۔ "ذرا بیچارے بینی زیٹو کا بھی خیال کرو، مرنے کے بعد بھی اسے کتنی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔"

ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر: 3

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل و گلزار سے راہِ پرخار تک ایک مسافرِ بے نوا کی رودادِ حیات

''آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی بیٹی سے شادی کرلوں۔ ہے ناں؟'' ڈاکٹر شاہ جی کا پارا چڑھ گیا تھا۔

''جی ڈاکٹر صاحب! یہ میری خواہش ہے۔'' ماسٹر جی کی آواز مجھے لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اس لیے کہ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی؟''

جواب میں خاموشی چھائی رہی۔

''اس لیے کہ زیناں کی بیماری کو تمہارے رشتہ داروں نے طعنہ بنالیا ہے۔ واہ ماسٹر جی! نہ جانے آپ نے کیا سوچ کر یہ فیصلہ کرلیا۔ میں پچاس کی عمر میں ہوں، اُس کی عمر بہ مشکل بیس بائیس سال ہے۔ میرا اور اُس کا جوڑ کسی بھی لحاظ سے بنایا نہیں جاسکتا مگر آپ نے بنا دیا۔ میں نور پور کے خانزادوں کو برا کیا سمجھوں؟ وہ مجھ پر الزام لگاتے ہیں کہ میں

آپ کی بیٹی کو دیکھنے کے لیے آپ کے گھر جاتا ہوں، اُس پر مرمٹا ہوں۔ آپ اُس کا رشتہ لے کر میرے پاس چلے آئے ہیں۔ وہ نہیں، یہاں کے سبھی لوگ بُرے ہیں۔ غیر فطری اور غلیظ ذہنیت کے مالک ہیں، آپ بھی۔ ماسٹر صاحب! وہ میری بیٹیوں کے برابر ہے۔ اُس کا علاج محض مریضہ سمجھ کے اپنی پیشہ وارانہ ذمے داری کے ساتھ کرتا رہا ہوں۔ آپ لوگوں کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے آپ کے گھر چلا جاتا تھا کیونکہ آپ کے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔ مگر افسوس! آپ بھی مجھے سمجھ نہیں پائے۔ اگر میں شادی کا ارادہ رکھتا تو بہت پہلے میری کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ شادی ہو چکی ہوتی۔''

اُسے کوئی جواب نہیں ملا۔ ماسٹر جی کی زبان بند تھی۔

بڑی دیر بعد، جب ڈاکٹر شاہ جی بول بول کر تھک گیا تو ماسٹر جی نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ نے شرم سے ڈوب مرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اللہ کی قسم! میرے دِل میں کوئی میل نہیں ہے۔ آپ کے کردار پر شبہ نہیں، فخر ہے۔ مجھے آپ پر اور اپنی بیٹی پر مکمل بھروسا ہے۔''

''تو پھر آپ نے کیا سوچ کر اتنی بڑی بات کہہ دی؟''

''اپنی بیٹی کے اچھے مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے؟'' ماسٹر جی کی شکست خوردہ آواز سنائی دی۔

''مجھے کسی کے مستقبل سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔'' ڈاکٹر شاہ جی نے گویا پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ ''آپ مزید کچھ کہے بغیر یہاں سے چلے جائیں اور دوبارہ اِس موضوع پر سوچنے کی زحمت بھی نہ کریں۔ مجھے شادی نہیں کرنی اور نہ ہی مجھے عورت کی ضرورت ہے۔ ہاں! آئندہ اپنی بیٹی کو اسپتال بھی نہ بھیجئے گا۔ پہلے وہ مریضہ بن کر آتی تھی، اَب میرے لیے گالی بن کر آئے گی اور میرے لیے اُس کی موجودگی کو برداشت کرنا مسئلہ بن جائے گا۔ جائیں پلیز!''

میری حالت خاصی ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ ماسٹر ولی محمد کا چہرہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر بھنچائی دیتا تھا کہ اُس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اُس کے شرم سے مرجانے کے لیے یہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے رشتے کی بات اپنے منہ سے کرنے کے لیے یہاں چلا آیا تھا۔ اس پر مستزاد ڈاکٹر کا نازیبا اور ناشائستہ رویہ تھا۔

وہ کیسے ہمت کر کے اُٹھا ہوگا، کیسے دروازے تک پہنچا ہوگا، محض اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اُسے پختہ اینٹوں کی بنی روش پر کندھے جھکائے، سر جھوڑائے جاتے ہوئے دیکھا تو کٹ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی کو یقیناً ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انکار کرنا ہی تھا تو بے عزتی کیے بغیر بھی کیا جاسکتا تھا۔ کم از کم اُسے یہ دھیان تو رکھنا چاہیے تھا کہ وہ ایک بوڑھے باپ کو دھتکار رہا ہے جو اپنی جان سے پیاری بیٹی کو اُس کی زندگی کا حصہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ماسٹر جی نے گھر سے چلتے ہوئے عمروں کے فرق کا تجزیہ بھی کیا ہوگا۔ بہت کچھ سوچ سمجھ کر یہاں آنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔

میں ڈاکٹر صاحب سے ملے بغیر ماسٹر جی کے پیچھے پیچھے اسپتال سے نکل آیا۔ جب اسپتال کے گیٹ کے سامنے پکی سڑک پر پہنچا، وہ مجھے امان اللہ قریشی کی کوٹھی کے باہر لگی ہوئی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں سڑک پر چند لمحوں کے لیے رُکا پھر گھر کی طرف چل دیا۔

علم دین پٹواری کے گھر کی نکڑ تک ہی پہنچا تھا کہ اچانک میری نظروں کے سامنے ایک سایہ سا لہرایا۔ میں ٹھٹک کر رُک گیا۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ خالدہ عرف بلو تھی۔ میرے رگ و پے میں اچانک شناسا سی برق کوند گئی۔

ایک پل میں ہی میرے قدم من من بھر کے ہو گئے اور میں بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ وہ بھاگ کر میرے مقابل آ گئی۔ ''مجھے پتا تھا کہ تم اِس وقت یہاں سے گزرو گے۔ اَب تک تین چکر لگا چکی ہوں۔''

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ تم کیوں چکر لگاتی رہی ہو، مگر پوچھ نہ سکا۔ غیر ارادی طور پر ارد گرد دیکھا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں نے کہا۔ ''کوئی کام تھا کیا؟''

وہ میری طرف بڑھی۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا، بولا۔ ''دیکھ بلو! کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟ جاؤ، میں جلدی میں ہوں۔''

وہ ٹھٹک کر رُک گئی اور شکوہ کرنے لگی۔ ''کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی ساحب جی؟''

میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ''ہاں! تم مجھے اچھی نہیں لگتی ہو۔''

''مگر کیوں؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''تم کھانے کی بہن ہو اور کھالا میرا یار ہے۔ میں نہ تو نمک حرام کہلوانا پسند کرتا ہوں اور نہ ہی بے غیرت..... تم اچھی ہو مگر آج کل تمہارا رویہ اچھا نہیں ہے۔'' میں نے ہمت کر کے اُس سے کہہ ہی دیا۔

وہ چند لمحوں تک مجھے یک ٹک دیکھتی رہی، پھر سسکی لے کر پلٹی اور بھاگتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے دل کو ٹھیس ہی لگی۔ دُکھ ہوا کہ اُسے یوں دھتکار دینا مجھے زیب نہیں دیتا مگر میں مجبور تھا کیونکہ غلط راستے پر ایک تواتر کے ساتھ اُس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنا ضروری تھا۔

بے رُخی سے جھڑکنے کے علاوہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے غلط فہمی ہوئی تھی کہ میں اور صدف بی بی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اُس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں بہ یک وقت دو لڑکیوں سے دل بستگی کا تعلق استوار کیے ہوئے تھا تو ایسے میں تیسرا تعلق بھی قائم کر سکتا تھا۔ اُس کی پیش قدمی نہ صرف اُس کے لیے بلکہ میرے اور کھالے کے باہمی تعلق کے لیے بے حد خطرناک تھی۔

اِنہی سوچوں میں غلطاں میں امان اللہ قریشی کی حویلی عبور کر کے شفیع محمد کے گھر کی نکڑ پر پہنچ گیا۔ غیر ارادی طور پر میری نظر مغربی گلی میں پڑی۔ یکبارگی چونک گیا۔ ماسٹر ولی محمد اپنے چوبی دروازے کی بالائی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔

میں چاروں گلیوں کے سنگم پر کھڑا تھا۔ اِس چوک کی چاروں نکڑوں پر بخت خان اور وریام خان کی حویلیاں، سردار حیات خان کا ڈیری فارم اور شفیع محمد کے گھر واقع تھے۔ شفیع محمد کا گھر چوک کی شمال مغربی نکڑ پر واقع تھا جبکہ اُس کے مغرب میں مراد بخش دیوانہ کا 'گھروندا' واقع تھا۔ وہ اعلیٰ پائے کا ٹیلر ماسٹر تھا۔ ساتھ ساتھ سرائیکی اور اُردو زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ اُس نے اپنے کچے گھر کے باہر بڑا خوب صورت بورڈ آویزاں کیا تھا جس پر 'گھروندا' کا لفظ اور سرائیکی کا ایک شعر خوش خطی سے لکھا ہوا تھا۔ شعر کا مفہوم یہ نکلتا تھا کہ 'آپ غریب مگر محبت کرنے والے کے گھر کیا آئے بہار آ گئی'۔ وہ خود بھی بڑی باغ و بہار طبیعت کا مالک تھا۔ اُس کے گھروندے کی مغربی سمت میں ماسٹر ولی محمد کا پکا، سادہ مگر صاف ستھرا گھر واقع تھا۔

ماسٹر ولی محمد نے چوکھٹ پر سے ایک ہاتھ اُٹھایا اور دستک دی۔ دروازہ کھلنے پر آہستہ سے اندر کھس گیا۔ اچانک ایک خیال برق کی رفتار سے میرے ذہن میں کوندا اور میں دوڑ کر ماسٹر جی کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازے سے چند قدم آگے دیوار کے ساتھ سطح زمین سے ڈیڑھ دو فٹ اوپر نکلا ہوا گٹر تعمیر کیا گیا تھا۔ ایسے گٹر تور پور کی اکثر گلیوں میں موجود تھے۔ میں بھاگ کر گٹر کے اوپر چڑھ گیا۔ یہاں سے بہ آسانی ماسٹر ولی محمد کے گھر کے اندر جھانکا جاسکتا تھا۔ میں نے صحن میں روشن بلب کی روشنی میں ماسٹر جی کو صحن میں کھڑے دیکھا۔ اُس کی بیٹی زیناں بھی کھڑی تھی۔ باقی افراد کمروں کے اندر تھے۔ میں نے کان لگائے۔ زیناں نے پوچھا۔ ''بابا! کیا بنا؟ کیا ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ زیناں کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا کہ میں فوراً سمجھ گیا کہ اُس نے ہی اپنے باپ کو مجبور کر کے ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں پیغام رساں بنا کر بھیجا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔

ماسٹر جی نے نفی میں سر ہلایا۔ کوئی بات بھی کی تھی جو لہجے کے دھیمے پن کی وجہ سے مجھے سنائی نہیں دی تھی۔ ماسٹر جی کی بات سنتے ہی یوں لگا جیسے زیناں کے پیروں کو زمین نے مضبوطی سے جکڑ لیا ہو۔ وہ وہیں تھم گئی۔ اُس کی پشت میری جانب تھی، میں اُس کا چہرہ دیکھ نہیں سکتا تھا مگر میں اُس کے احساسات کی دُنیا کو تہس نہس ہوتا محسوس کر سکتا تھا۔

ماسٹر جی اُس پر توجہ دیے بغیر برآمدے سے گزر کر درمیانی کمرے میں گھس گئے جبکہ وہ صحن کے وسط میں کسی بے جان مورتی کی طرح ایستادہ رہی۔ میں گٹر پر سے نیچے اُتر آیا اور بوجھل دل لیے سر جھکا کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

چاچا چراغ مجھ پر بگڑا ہوا تھا۔ اُسے میرا گھر سے زیادہ وقت باہر رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے اُسے بارہا پیش کی جانے والی دلیل سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ''چاچا! میں اپنے حصے کا کام کر کے ہی باہر جاتا ہوں۔ ویسے بھی آپ لوگوں کو پتا ہے کہ میں کہاں جایا کرتا ہوں۔''

چاچا حسبِ معمول زمانے کی تبدیلی، لوگوں کی بے حسی اور معاشرتی خرابیوں کا رونا رونے کے بعد خاموش ہو گیا تھا مگر آج اُس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ پہلے کی طرح میری پیش کردہ توجیہات سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ پروین اور فرزانہ نے میری حمایت کی۔ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے جاتا ہوں اور 'ڈاکٹری' سیکھنے کے لیے زیادہ وقت وہاں گزارتا ہوں تو اِس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ سیکھا ہوا ہنر زندگی میں کام آتا ہے۔

دوپہر کے ایک بجے کا عمل ہوگا جب بشیرا میرے پاس ڈیرے پر پہنچ گیا۔ میں اپنے مویشیوں کا چارا کاٹنے کے بعد ٹاہلی کے گھنے درخت کے نیچے چارپائی بچھائے لیٹا ہوا ڈاکٹر شاہ جی سے مستعار لیا ہوا ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ میں اگرچہ دوپہر میں آرام کرنے کا عادی نہیں تھا تاہم کھال کے کنارے واقع اِس تیل پینتیس سالہ بوڑھی ٹاہلی کی مامتائی چھاؤں اتنی سکون بخش تھی کہ میں موقع ملتے ہی اِس کے نیچے لیٹ جایا کرتا تھا۔ بشیرے نے مجھے سردار بخت خان کا پیغام دیا۔

اُس نے بتایا۔ ''باؤ! شام تک، جب تمہیں فرصت ملے، حویلی کا چکر لگا لینا۔ خان جی کو کوئی خاص کام ہے تم سے۔''

میں نے ہامی بھر لی۔ وہ چلا گیا۔ میں نے ایک ایکڑ باجرہ کاشت کر رکھا تھا جو ان دنوں ثمر بار تھا۔ جب ہم اپنے

کام کاج سے فارغ ہوئے تو ہم سب نے درانتیوں کی مدد سے باجرے کے سٹے کاٹے اور اُنہیں پڑ (مخصوص، صاف ستھری میدانی جگہ) پر سوکھنے کے لیے جمع کیا۔ اِس کام میں سہ پہر ڈھلنے کو آ گئی۔ سردار وریام خان کا ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ میں نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے غسل کیا اور گھر کی راہ لی۔ کپڑے بدل کر سردار بخت خان کی حویلی پر پہنچ گیا۔

وہ مہمان خانے کے لان میں سرخ رنگ کی لوہے کی کرسی پر بیٹھا کسی میگزین کے مطالعے میں غرق تھا۔ مجھے دیکھ کر، رسمی تبادلۂ احوال کے بعد میرا ہاتھ تھام کر حویلی کے مستور خانے میں داخل ہوگیا۔ میں اِس حویلی میں بڑے سالوں کے بعد داخل ہو رہا تھا۔ کوئی تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملی۔ کنال بھر کا وسیع اور صاف ستھرا صحن، رگڑے ہوئے پتھروں کا رنگ برنگا فرش، خوبصورت ستونوں والے بڑے بڑے برآمدے اور جالی دار دہرے دروازوں والے کمرے..... کچھ بھی بدلا نہیں تھا۔ میں ہچکچاتا ہوا، شرماتا ہوا اُس کے شانہ بہ شانہ چل رہا تھا۔ برآمدے میں بچھی ہوئی رنگین چارپائی پر چاچی براجمان تھی۔ ساتھ والی چارپائی پر دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ مزارعوں کی بیویاں تھیں جنہیں کسی کام سے بلایا گیا تھا یا وہ اَز خود اپنے کسی کام کے سبب یہاں آئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اُن کے چہروں سے حیرانی مترشح ہوگئی۔ خان کی حویلی کے زنان خانے میں میری موجودگی تحیر خیز تھی۔

مجھے دیکھ کر چاچی چارپائی سے اُتر کر کھڑی ہوگئی۔

''خان جی! بڑے عرصہ کے بعد شہزاد پتر حویلی میں آیا ہے۔''

اُس نے نور پور کی روایات کے مطابق میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پروین، فرزانہ، شبانہ اور چاچی کی فرداً فرداً خیریت دریافت کی۔ گلہ کیا کہ اُن میں سے کوئی بھی حویلی میں قدم نہیں رکھتی۔ میں نے کام کی زیادتی کو جواز بنا کر اُسے مطمئن کرنے کی رسمی کوشش کی۔

اُس نے بخت خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ملکہ دِکھی اپنے کمرے میں ہے۔''

مجھے اپنے ساتھ لیے بخت خان برآمدے میں کھلنے والے آخری دروازے میں داخل ہوا۔ ملکہ بڑے سے بیڈ کے بیچوں بیچ آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے سامنے کاپیاں اور کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

خان میرا تعارف کرانے کے بعد بولا۔ ''ملکہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ چونکہ یہاں کوئی اچھا اسکول نہیں ہے، اِس لیے ہم نے اَبھی تک اِسے اسکول میں نہیں بھیجا۔ ہاں! اِس کا نام اسکول کے ریکارڈ میں درج ہے اور سال بہ سال اِسے اگلی کلاس میں ریفر بھی کر دیا جاتا ہے۔''

میں دل ہی دل میں حیران ہوا۔ عام لڑکیاں اگر بغیر چھٹی لیے دو چار دن کی غیر حاضری کر بیٹھتی تھیں تو اُن کا نام اسکول سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ پروین کا نام بھی اِسی جرم کی پاداش میں خارج کیا جا چکا تھا۔ پھر سردار حیات خان کی سفارش کے ساتھ اُسے کلاس میں بیٹھنے کی اجازت مرحمت ہوئی تھی۔ ملکہ عام لڑکی نہیں تھی، بخت خان کی بیٹی ہونے کے ناتے خاص تھی جس نے آج تک اسکول کا منہ نہیں دیکھا تھا اور اُس کی نہ صرف روز بہ روز حاضری لگائی جاتی تھی بلکہ ہر سال امتحان میں حاضری ظاہر کر کے پاس بھی کر دیا جاتا تھا۔

ملکہ مجھے دیکھ کر، دوپٹا درست کرتے ہوئے، بیڈ سے اُتر کر کھڑی ہوگئی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام گو ہوئی۔ مجھے اُس کا مؤدبانہ انداز بھلا لگا۔ یہ اُس کی ماں، ذرینہ خانم کی تربیت کا اعجاز تھا وگرنہ سردار حیات خان اور سردار وریام خان کے گھروں میں اخلاق کا یہ معیار دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ خان کے اشارے پر میں بیڈ کے کونے پر ٹکنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر، سفید فلٹر والی سگریٹ سلگا کر، پیار سے بولا۔ ''شہزے پتر! چار ماہ کے بعد ملکہ بی بی نے بورڈ کا امتحان دینا ہے۔ اسکول کی ہیڈ مسٹریس اِس کی پڑھائی سے مطمئن ہے مگر میں کوئی رسک لینے پر تیار نہیں ہوں۔ اِس کو پڑھانے کے لیے آنے والی استانی ہر روز دو سے تین گھنٹے اِسے دیتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی کچھ دیر کے لیے یہاں آیا کرو اور اِسے انگریزی اور ریاضی پڑھا دیا کرو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔''

مجھے پڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں انکار کرنا چاہتا تھا مگر مروت آڑے آئی۔

اُس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''تم میرے اپنے ہو۔ میرے خاندان کے ہو۔ میں اُستانی کو ٹیوشن فیس دیتا ہوں، تمہیں بھی دوں گا اور تمہارا احسان بھی مانوں گا۔''

میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس نے میری خاموشی کو اقرار جانا اور اطمینان بھرے انداز میں کمرے سے جاتے ہوئے بولا۔ ''میں اَب چلتا ہوں، تم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہو جاؤ اور اپنا کام شروع کر دو۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہاری چاچی تمہارا خیال رکھے گی۔''

میں بھی کھڑا ہوگیا، جلدی سے بولا۔ ''مگر خان جی! میں نے اپنا کام کاج بھی کرنا ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا زمینوں کا کام ایسا ہے کہ کبھی تمام دن مصروف رکھتا ہے تو کبھی

بندے کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں باقاعدگی کے ساتھ ملکہ بی بی کو پڑھانے کے لیے نہیں آ سکتا۔''

وہ دروازے میں رُک گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ دِن بھر میں تمہیں جب بھی وقت ملے، نو سے گیارہ، بارہ بجے تک کے دورانیے کے علاوہ، آ کر پڑھا جایا کرو۔ اب تو ٹھیک ہے ناں؟''

میں چونکا۔ ''نو سے بارہ بجے تک کیوں نہیں؟''

''اُس وقت بی بی کو اُس کی استانی پڑھانے کے لیے آتی ہے۔'' خان نے کہا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اُس نے جاتے ہوئے جالی والا دروازہ بند کر دیا تھا۔

مجھ پر ہلکی سی گھبراہٹ طاری تھی۔ آج تک کسی کو پڑھایا نہیں تھا۔ ناتجربہ کاری میں بخت خان کی بیٹی کو پڑھانا بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ بہ دقت تمام خود کو سنبھالا اور ملکہ کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ بڑے اشتیاق سے مجھے دیکھ رہی تھی، بولی۔ ''آپ باجی پروین کے بھائی ہیں ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اَبھی تک بیڈ کے میٹرس کے ساتھ گھٹنے ٹکا کر کھڑی تھی۔ میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ فوراً اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ میں نے اُس کے سامنے بکھری ہوئی کتابوں میں سے ایک اٹھائی، ورق گردانی کی پھر اُس کی کاپیوں کا معائنہ کیا۔ اُس کی ہینڈ رائٹنگ کافی خراب تھی۔ آج چونکہ پہلا دن تھا اور میں اِس کام کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی نہیں تھا، اِس لیے محض باتوں کے علاوہ کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے کوئی نصف گھنٹے کے قریب تعلیم سے متعلقہ اور غیر متعلقہ باتیں کیں۔ مجھے ایک طرح کا اطمینان ہوا تھا کہ وہ بہت بااخلاق اور مؤدب واقع ہوئی تھی۔ میں اُسے بہ آسانی پڑھا سکتا تھا۔

اَبھی میں اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ نوکرانی چائے کا کپ اور بسکٹ وغیرہ سے بھری پلیٹ ایک نفیس سی ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ میرے سامنے میٹرس پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''شہزے پتر! تم اگر چائے پینے کے عادی نہیں ہو تو بلا تکلف بتاؤ، میں دودھ گرم کرا لاتی ہوں۔ یہ بڑی بی بی کا حکم ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بڑی بی بی سے جا کر کہہ دو کہ اِس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک دن کا نہیں، چار پانچ مہینوں کا مزمان (مہمان) ہوں۔''

''سر اُکھیں تے پتر! بھانویں جو ساری زندگی مزمان تھیویں، اِہ حیڈا اپنا گھر ہے۔ میرے ہاتھ ٹوٹ تو نہیں جائیں گے تو تیرے لیے کچھ تیار کرلاؤں گی۔'' وہ محبت سے بولی۔

''مگر میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی بلکہ ایک عجیب نگاہ میرے پیروں پر ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اپنے پیروں کی جانب تفہیم طلب نظروں سے دیکھا۔

ایسے میں ملکہ بولی۔ ''پریشان نہ ہوں سر! دراصل آپ نے دھیان نہیں دیا اور قالین پر جوتوں سمیت چڑھ گئے ہیں۔ وہ اِس لیے حیران ہو رہی تھی۔''

ملکہ درست کہہ رہی تھی۔ سرخ مخملیں قالین پر میرے جوتوں کے نشان واضح دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے اپنی بے دھیانی پر شرمندگی ہوئی جو یقیناً چہرے سے بھی ہویدا ہونے لگی تھی۔

ملکہ بولی۔ ''سر جی! اِس میں پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ شہروں میں لوگ جوتوں سمیت قالین پر چڑھ جاتے ہیں۔ یہاں چونکہ دیہاتی ماحول ہے، جوتوں کے سول مٹی سے لتھڑے ہوتے ہیں اِس لیے جوتوں کو دروازے کے قریب اُتار دیا جاتا ہے۔''

وہ اپنی دانست میں میری غلطی کو جائز قرار دینے اور میری شرمساری کو محو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے توجہ ہٹانے کے لیے اُس کی ریاضی کی کاپی اُٹھالی۔ اُس کی تحریر کو پڑھنا اَز حد مشکل تھا۔ میں نے کہا۔ ''بی بی! تمہاری لکھائی اچھی نہیں ہے۔ اِس پر اضافی محنت کرنا ہوگی۔''

وہ 'جی سر' کہہ کر خاموش ہوگئی۔ اُس کا مجھے 'سر' کہنا بہت بھا رہا تھا۔ شاید یہ اعزاز پہلی مرتبہ مجھے مل رہا تھا، تبھی اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بڑی روانی کے ساتھ اُردو بول رہی تھی۔ یہاں کے تمام لوگوں پر مقامی لہجہ اتنا غالب تھا کہ اُردو بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں 'ڈنڈی' مار جایا کرتے تھے۔ چونکہ مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی طویل رفاقت میسر تھی، اِس لیے میرا لہجہ بھی قدرے بہتر تھا۔

کافی دیر گزر گئی تھی۔ میں کمرے سے نکل کر، چاچی سے رسمی علیک سلیک کر کے مہمان خانے میں بخت خان کے پاس آ گیا۔

اُس نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ ''ہاں بھئی ینگ مین! تم نے اپنی اسٹوڈنٹ کو کیسا پایا؟ کیا خیال ہے، بورڈ کے امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرے گی؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں بشرطیکہ اُس کی ہینڈ رائٹنگ کچھ بہتر ہو جائے۔ اُس کے لکھے ہوئے کو پڑھنا مشکل ہے۔ جواب ٹھیک بھی ہوا تو اچھے نمبر نہیں ملیں گے۔''

اُس نے میری بات سے اتفاق کیا، بولا۔ ''یہ کام تم ہی اپنے ذمے لو کیونکہ اُس کی اُستانی اس معاملے میں اس کی مدد نہیں کرسکتی۔ اس کی اپنی لکھائی بھی بس 'اینویں' ہی ہے۔''

کچھ غیر متعلقہ باتوں کے بعد اُس نے پوچھا۔ ''تم نے کھالے سے بات کی تھی؟''

میں چونکا۔ ''کون سی بات؟''

''سائیں دل جیت شاہ کی سرگرمیوں کی خفیہ نگرانی والی بات!'' اُس نے یاد دلایا۔

''ہاں! ابھی وہ ساتھ دینے پر رضامند نہیں ہوا مگر مجھے یقین ہے کہ میری ضد کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں پائے گا۔''

''تم دونوں کسی شام کو یہاں آؤ گے۔ اکٹھے بیٹھ کر پلاننگ کریں گے، پھر مزار پر جائیں گے۔'' بخت خان نے سمجھایا۔ ''بلکہ ایسا ہے کہ میں بشیر کو بھیج کر سب کو یہاں اکٹھا کرلوں گا تاکہ کھل کھلا کر بات کی جاسکے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اجازت لے کر حویلی سے نکل آیا۔ اس کے بعد ملکہ کو ہر روز پڑھانے کے لیے حویلی جانا میرا معمول بن گیا۔

شام نور پور کے کچے گھروں کے منڈیروں تک اتر آئی تھی۔ سورج نوری چوک والی سڑک کے کنارے ایستادہ بڑے درختوں کے پیچھے چھپنے لگا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر مراد بخش دیوانہ کے 'گھروندے' پر پہنچ گیا۔ اُس نے اپنی پکی بیٹھک کو ہی دکان بنا رکھا تھا۔

وہ ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے بڑا سا چوبی تختہ دھرا ہوا تھا جس پر کوئلوں والی استری، لوہے کا ایک کڑا جس پر گرم استری رکھی جاتی تھی اور ایک پرانی سلائی مشین رکھی ہوئی تھی۔

ایک بڑی سی قینچی بھی دکھائی دے رہی تھی جسے ہاتھ لگانا بھی جُرم قرار پاتا تھا۔ اپنے پیچھے اُس نے دیوار پر میخوں کی مدد سے کئی رسیاں باندھ رکھی تھیں جن پر سلائی شدہ سوٹ ایک خاص تکنیک سے ٹنگے ہوئے تھے۔ لوگوں کو بٹھانے کے لیے اُس نے اپنے پھٹے کے سامنے اور دائیں ہاتھ پر چٹائیاں بچھا رکھی تھیں۔ یہی سامان اُس کی دکان کا یا 'گھروندے' کا کل اثاثہ تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھا، مخصوص پرجوش لہجے میں بولا۔ ''آہا! شہراخان میرے گھروندے پر آیا ہے، کوئی ہو تو وہلیز پر تیل انڈیلے، کوئی ہو تو نائی کو دیگ چڑھانے کا سلیما (پیغام) دے آئے۔''

میں جھینپ کر بولا۔ ''ناں گیا کر یار! بلاوجہ شرمسار کر دیتے ہو۔''

''لو سنو! تم بھی تو مہینوں بعد اپنی سوہنی سی صورت دکھاتے ہو ہم غریبوں کو..... اَب بتاؤ، لسی پیو گے یا چاہ بنواؤں؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کسی چیز کی طلب نہیں۔ بیٹھو اور اپنا کام کرو۔''

وہ سلائی مشین کے دو اطراف میں پھیلا ہوا آسمانی نیلے رنگ کا کپڑا سمیٹ کر، سلائی مشین کو تھوڑا پرے دھکیل کر ہمہ تن گوش ہوگیا اور بولا۔ ''آج کیسے گھروندے کی طرف آن بھٹکے؟ خیر تو ہے؟''

میں نے بتایا کہ مجھے کوئی کام نہیں بلکہ محض ملنے اور گپ شپ کرنے کے لیے آیا ہوں تو وہ بڑا خوش ہوا۔ چند ہی منٹوں میں نور پور کے سیاسی اور سماجی حالات زیر بحث آگئے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ نور پور کے لیے بڑا خان نئی گرانٹ منظور کروالایا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اَب چند ہی دنوں میں نور پور کے ہر گھر میں بجلی پہنچ جائے گی اور لوگوں کی مٹی کے تیل سے جان چھوٹ جائے گی۔

ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے بولا۔ ''یار دیکھنا اسلم مغل کو، سر پر بانہیں رکھ کر پیٹتا پھرے گا کہ اُس کی کمائی آدھی رہ جائے گی۔''

اسلم مغل نے اپنی دکان کے آگے بڑا سا ڈیزل ٹینک رکھا ہوا تھا۔ ڈرم کو ٹونٹی لگوا کر مٹی کے تیل کی بھی چھوٹی سی ٹینکی بنا رکھی تھی جو سارا سال دکان کے باہر دھری رہتی تھی۔ دونوں ٹینکیوں کی ٹوٹیوں پر شام کو تالے لگا کر گھر چلا جاتا تھا۔ بقول اُس کے، ڈیزل سے زیادہ مٹی کا تیل منافع بخش ثابت ہوتا تھا۔ ڈیزل کے خریدار کم تھے۔ مراد بخش دیوانے کا خیال بالکل درست تھا کہ بجلی آنے کے بعد اسلم مغل کی دکانداری کا ماند پڑ جانا قریب از حقیقت تھا۔

میں نے استعجاب آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''اتنی اہم خبر تم تک کیسے پہنچ گئی؟''

''بڑے خان کا 'پی آر او' اپنے کپڑے سلوانے کے لیے میرے پاس آتا رہتا ہے۔ کل اُسی نے بتایا تھا۔'' وہ عادتاً گردن اکڑا کر بولا۔

''پی آر او؟ یہ کیا شے ہے؟''

''پتا نہیں کن جاہل لوگوں سے دیوانے کا پالا پڑ گیا ہے۔ اوئے اللہ کے بندے! 'پی آر او' یعنی پبلک ریلیشن آفیسر، اس کے معانی ہیں منشی..... منشی اللہ دتے کی بات کررہا ہوں۔'' اُس نے مصنوعی تاسف بھرے انداز میں ماتھے پر 'چٹاک' سے ہتھیلی مارتے ہوئے کہا۔

میں 'پی آر او' کی تفسیر و تشریح سن کر بہ مشکل اپنی ہنسی روک پایا، بولا۔ ''اور بھی کچھ بتایا اُس نے؟''

''ہاں! بتا رہا تھا کہ چند مہینوں میں بڑا خان نور پور کی گلیوں کے لیے بھی گرانٹ منظور کروالے گا۔ یہاں نالیاں اور سولنگ لگوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' وہ دیدے گھما کر بولا۔

میں نے نیم مایوسی سے کہا۔ ''یہ بات میں گزشتہ تین برسوں سے سن رہا ہوں۔''

''افوہ! اللہ تمہیں ہدایت دے۔ دیوانہ جھوٹ بولتا ہے کیا؟''

جواباً میرے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ وہ جز بز ہوکر رہ گیا۔ گردن کو اکڑاتے ہوئے دائیں بائیں پھیرا اور بجلی کی مستعدی سے سلائی مشین اپنی جانب گھسیٹ کر سوئی میں دھاگا ڈالنے لگا۔ اُس نے زبان سے نہیں کہا تھا مگر اُس کی اکڑی ہوئی گردن نے باور کرادیا تھا کہ مجھے اَب 'گھروندے' سے رخصت ہوجانا چاہیے۔

میں نے ہنستے ہوئے 'خدا حافظ' کہا اور گھروندے سے نکل آیا۔ مجھے علم تھا کہ اَب دو تین دنوں تک گھروندے میں میرا ذکرِ خیر بہ کثرت چھڑے گا اور ہر موجود و نا موجود خامی میری شخصیت میں بڑے شاعرانہ انداز میں فٹ کی جائے گی۔

میں کھالے کی منہ پھاڑے کھڑی دیگن کی طرف بڑھ گیا۔ شیدو یونٹ کھول کر انجن پر جھکا ہوا تھا۔ کھالا چھپر تلے پڑی ہوئی جھلنگا چارپائی پر دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر نیم دراز تھا۔ میں کھالے کو نور پور میں بجلی کی گرانٹ آنے کی خوش خبری دینا چاہتا تھا مگر اُس تک یہ خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔

بولا۔ ''دیوانے کے پاس بات پہنچے اور نور پور کا گھگو گھوڑا بچہ بھی سن نہ پائے، ناممکن ہے۔ وہ تو پھٹا ڈھول ہے۔ جس بات کی مشہوری کرنی ہو، وہ بات دیوانے کو بتا دی جائے، آن کی آن میں پورے علاقے میں پھیل جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مگر ایک بات ہے کھالے! وہ زبان کا اتنا کچا بھی نہیں ہے۔ جس بات کو اُس نے اپنے دل میں دبا کر رکھنا ہو، لاکھ کریدتے رہو، اس کی ہوا تک نہیں لگنے دیتا۔''

کھالے نے میری بات کی تردید نہیں کی۔ موضوع بدل کر مجھے ایک راز کی بات بتانے لگا۔ اُس کی عقابی نظروں نے چند دن قبل تاڑ لیا تھا کہ دیوانہ اسپتال میں ڈیوٹی پر آنے والی ایل ایچ وی، شمیم کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ مجھے سمجھ آنے لگی کہ ہر شام کو کھالا گھروندے میں بیٹھا دیوانے کے ہاتھوں کی 'دودھ پتی چائے' پیتا ہوا کیوں دکھائی دیتا تھا۔ شمیم ہفتے میں تین دن ڈیوٹی پر آیا کرتی تھی۔ وہ قریشی موڑ کی رہنے والی تھی۔ اُس کا چھوٹا بھائی موٹر سائیکل پر اُسے لاتا تھا اور اُس کی واپسی تک اسپتال میں رہتا تھا۔ کئی دنوں بعد، کھالے کے بیان پر میں تب ایمان لایا تھا جب میں نے دیوانے کو بڑے شرمائے ہوئے انداز میں ایک خط شمیم کو تھماتے ہوئے دیکھا تھا۔ اِس سے بھی زیادہ حیرت مجھے تب ہوئی جب مجھے پتا چلا کہ شمیم بھی اُس کانگڑی شاعر میں انٹرسٹڈ تھی۔

مراد بخش دیوانہ کا تذکرہ دیر گئے تک چھڑا رہا۔ یادوں کے اعادے میں کافی دیر گزر گئی تھی۔ ایسے میں وہ تذکرہ بھی آن چھڑا جس سے دامن چھڑاتے، آنکھیں چُراتے بچپن اور پھر لڑکپن گزر گیا تھا۔ کھالے کے دماغ کی پھرکی اُلٹی گھومنے لگی تھی، تبھی اچانک بولا۔ ''یار شہرے! تم اُس قصے کو تو بالکل بھول بیٹھے ہو۔''

میں چونکا۔ ''کس قصے کو؟''

''اُس خونیں قصے کو جو تم نے بچپن میں بھڑولے کے اندر کھڑے ہوکر سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا تھا.....''

اچانک ہی جیسے میری سانسوں کو آگ لگ گئی۔ دھڑکن سینے میں ہی کہیں بھنچ کر رہ گئی۔ برس ہا برس سے آنکھوں کے پردوں پر ٹھہرے ہوئے اس سفاک انسانی چہرے نے تو مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا تھا۔ لانبے قد کے شخص کا جھکا ہوا مگر تھوڑا سا اُٹھا ہوا بڑی مونچھوں والا خونخوار چہرہ، غیر معمولی حد تک پھیلی ہوئی دہشت ناک آنکھیں اور چہرے کے تاریک پس منظر میں خون کی سرخ آمیزش..... اِسے تو میں گزشتہ کئی سالوں سے بلاناغہ دیکھتا چلا آیا تھا۔

میں نے پوری سختی سے اپنے دانت بھینچ لیے۔ وہ کھردری اور پاٹ دار آواز بھی مجھے فراموش نہیں ہوئی تھی جو میں نے اُس رات سنی تھی۔ چونکہ میں اور کھالا اپنے بچپن میں اُس چہرے کی تلاش کے نام پر اطراف کے تمام دیہاتوں کی سائیکلوں پر آوارہ گردی کرچکے تھے۔ مگر اُسے نہیں ملنا تھا، نہ ملا۔ میں نے کھالے کو اَن گنت مرتبہ وہ خوں چکاں منظر لفظوں کے پردے پر سجا کر دکھایا تھا اور اِس عہد کو دہرایا تھا کہ زندگی میں اُسے تلاش کرکے اپنے معصوم والدین کے قتل کا بدلہ ضرور لوں گا۔ ہر بار کھالے نے اپنی اعانت کا یقین واشگاف انداز میں کرایا تھا۔

ہمارے درمیان خاموشی کی طویل رہ گزر حائل ہوگئی۔ کھالا متاسف تھا کہ اُس نے یہ تذکرہ کیوں چھیڑا۔ میں سلگ

اظہار نہیں کیا تھا، اس لیے میں نے اُسے سمجھانا اور باز رکھنا مناسب خیال نہیں کیا۔ ماسٹر صاحب کی دل شکنی بھی میں نے محض اس لیے کی کہ وہ ہمیشہ کے لیے اِس باب کو بند سمجھے اور مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ اگر میں نرم رویہ روا رکھتا تو وہ دو چار دن گزار کر پھر میرے سر پر آن سوار ہوتا۔''

''کیا زیناں کا احمقانہ رویہ غیر فطری تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں۔ ڈاکٹر اور مریض کے درمیان ایک ربط، ایک تعلق بڑے غیر محسوس انداز میں اَزخود پیدا ہوجاتا ہے جس کے لیے ہم ٹرانس فی ریشن کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یہی تعلق آفیسر اور ماتحت کے درمیان استوار ہوسکتا ہے۔ ایک استاد اور شاگرد کے درمیان بھی پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اِس میں اتنی شدت پیدا ہوجاتی ہے کہ اِسے محبت کے تعلق سے جدا سمجھنا بہت دشوار ہوجاتا ہے۔ زیناں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ مجھ سے اِس قدر مانوس ہوگئی تھی کہ محبت کا مغالطہ کھا بیٹھی۔'' اُس نے مجھے بڑی تفصیل کے ساتھ سمجھایا۔

''تو پھر اُسے حق بجانب سمجھنا چاہیے تھا آپ کو۔''

اچانک اُس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ ناچنے لگی، بولا۔ ''بڑے چالاک ہو۔''

''فرض کریں، آپ کی شادی زیناں سے ہوجائے، تب کیا ہوگا؟'' میں نے متذبذب انداز میں پوچھ ہی لیا۔

''نہیں شہر یار! جس مفروضے کو ذہن تسلیم ہی نہ کرسکے، اُس پر بحث کرنا فضول ہوتا ہے۔''

''مگر کیوں؟ آپ اِس موضوع پر کیوں سوچنا نہیں چاہتے؟''

''میرے جذبات کا سورج نا وقت ڈھل گیا تھا۔'' اُس نے بے حد اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ تم کوئی اور بات کرو۔''

''مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ آپ نے کسی کو بے حد چاہا تھا اور وہ آپ سے......''

''میں نے کہا ناں کہ تم کوئی اور بات کرو۔'' اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

میں خاموش ہوگیا۔ جستجوئے آگہی کی اِس حد تک میں کئی مرتبہ پہنچا تھا اور ہر بار ہزیمت بار ہونا پڑا تھا۔ میں نے تیجی چاقو کی مدد سے اُسے کیکر کی مسواک بنا کر دی اور خاموشی سے اُس کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ میری گفتگو نے اُسے بے چین اور مضطرب کردیا تھا۔ چال میں بھی فرق آگیا تھا۔ میں اُسے مزید کریدنے کے بجائے اُس کے بیان کیے ہوئے فلسفے میں اُلجھ گیا۔ اُس کی بات 'یہی تعلق استاد اور شاگرد کے درمیان بھی پیدا ہوتا ہے' میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ کیا میرے اور ملکہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا؟ وہ بچی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ میرے بارے میں کچھ نہ سوچتی۔ اُسے اگرچہ نادان قرار دیا جاسکتا تھا مگر مجھے نہیں۔ کیا ڈاکٹر شاہ جی کی طرح میں اُسے جھٹکنے کی قدرت رکھتا تھا؟ میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیال کا اَزخود جواب دیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

آج میری پانی لگانے کی باری تھی۔ نکے پر پہنچ کر پتا چلا کہ رات میں کسی وقت نہر گر گئی تھی۔ مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ اَب وریام خان سے پانی خرید کر لگانا تھا۔ میں نے اپنی کسی نکے پر چھوڑی، ڈیرے سے درانتی اُٹھائی اور باجرے کی باقی ماندہ دو کیاروں کے سٹے کاٹنے لگا۔ کھیت کے آخری کیارے میں، باجرے کے بے ثمر پودے مخصوص انداز میں ہل رہے تھے۔ کوئی مویشیوں کے چارے کے لیے باجرہ کاٹ رہا تھا۔ کون کاٹ رہا ہے؟ میں نے دھیان نہیں دیا کیونکہ باجرے کے سر کٹے پودے مویشیوں کو ڈالنے کے ہی کام آتے تھے۔ جو بھی باجرہ کاٹ رہا تھا، وہ ہمارا فائدہ ہی کر رہا تھا، ہماری زمین صاف کر رہا تھا۔ چونکہ ہمارے ہاں مویشیوں کا چارہ موجود تھا، اِس لیے ہم اپنے ڈھور ڈنگروں کو باجرہ نہیں ڈالتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ باجرہ کھانے والی بھینسیں اور گائیں دودھ کم دیتی تھیں۔

کچھ دیر بعد میرے کانوں میں نسوانی آواز پڑی۔ میں نے چونک کر اس جانب دیکھا۔ زیناں کھڑی دکھائی دی، وہ ہاتھ لہرا کر مجھے پکار رہی تھی۔ ''شہرے!''

پتا چلا کہ وہی باجرہ کاٹ رہی تھی۔ میں درانتی لہراتے ہوئے اُس کے پاس چلا گیا۔ وہ پہلو پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی جبکہ اُس کی ماں اور ایک بہن باجرہ کاٹنے میں مصروف تھیں۔ میں نے سب کو سلام کیا۔ بلائے جانے کی وجہ پوچھی تو وہ بولی۔ ''میں نے ویسے ہی آواز دی ہے۔ ٹھیک تو ہو ناں؟''

اُس کی ماں اور بہن درانتیاں زمین میں گاڑ کر میرے قریب آگئیں۔ تبادلۂ احوال کے بعد بنے پر بیٹھ گئیں۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔ زمین، گھر، تعلیم اور میرا خاندان زیر بحث آیا۔ پھر زیناں کی ماں اور بہن اُٹھ کر باجرہ کاٹنے میں مصروف ہوگئیں جبکہ وہ میرے پاس ہی بیٹھی رہی۔ آہستگی سے بولی۔ ''ڈاکٹر شاہ جی کیسے ہیں؟''

مجھے بلانے کے پیچھے یہی مقصد کارفرما تھا۔ میں نے کہا۔ ''بالکل ٹھیک ہیں۔''

وہ کوئی بات کرنا چاہتی تھی مگر جھجک رہی تھی۔ میں نے ل مشکل آسان کرتے ہوئے کہہ دیا۔ ''کیا تمہیں اُس لاحق ہے؟''

وہ تذبذب کا شکار ہوگئی۔ گھاس کے تنکے کھینچنے لگی۔ میں اپنا سوال دہرایا۔ جھکا ہوا سر اثبات میں ہلنے لگا۔

مجھے دکھ ہوا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''زیناں! تم یہ خیال دل سے نکال دو۔ وہ تمہارے بلکہ کسی بھی انسان بارے میں نرم گوشہ نہیں رکھتا۔''

اُس نے سر اُٹھانے سے احتراز کیا، بولی۔ ''مگر میں دل کا کیا کروں؟ میں تو مانتی ہوں، یہ نہیں مانتا۔''

''اسے سمجھاؤ کہ وہ بوڑھا ہے، خبطی ہے، پردیسی ''

''سب کچھ جانتے بوجھتے اُنہیں مانگتا ہے۔''

''میری طرف دیکھ کر بات کرو۔''

''نہیں! مجھے لاج آتی ہے۔''

میں ہنسا۔ ''اپنے منگیتر کو خط لکھو۔ اُسے بتاؤ کہ تم بالکل ٹھیک ہو۔''

''دل نہیں مانتا۔'' وہ دھیمے سے بولی۔

''دل کیا مانتا ہے؟''

''مانتا نہیں، مانگتا ہے۔ کیا تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟'' اُس کے لہجے میں بڑی اپنایت بھری التجا در آئی تھی۔

''میں بھلا کیا کرسکتا ہوں؟'' میں چونکا۔

''اُنہیں سمجھا سکتے ہو کہ وہ میرے ساتھ......'' اُس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں سمجھ کر بولا۔ ''وہ بچہ نہیں ہے، سمجھنے والا نہیں بلکہ سمجھانے والا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ہی سمجھا ہوگا۔''

اُس نے پہلی مرتبہ سر اُٹھایا۔ اُس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''کیا؟''

''یہی کہ اِن تلوں میں تیل نہیں۔''

اُس نے نفی میں سر ہلایا پھر اُمید بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی، بولی۔ ''وہ نور پور میں صرف تمہاری بات مانتے ہیں۔''

بے چاری غلط فہمی کا شکار تھی۔ عشق ایسی ہی بھول بھلیوں میں انسان کو لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے کہ جہاں انسان سہارے کے لیے تنکوں سے بھی چمٹنے لگتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ وہ میری بات سنتا تو ہے مگر مانتا نہیں۔''

''ہاں شہرے! شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں نے سائیں جیت شاہ سے لے کر کئی تعویذ گھول پلائے، دعا بھی کروائی اور تین جمعراتوں کو مزار پر دیے بھی جلائے مگر اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سائیں جیت شاہ نے تو کہا تھا......''

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''جیت شاہ نے کیا کہا تھا؟''

''یہی کہا تھا کہ وہ میری طرف مائل ہوجائیں گے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔ ''سائیں نے وظیفہ پڑھنے کے لیے دیا تھا، اکیس دنوں تک سرگی ویلے (نماز فجر کے وقت) پڑھتی رہی مگر کچھ نہیں ہوا۔ شاید میری قسمت ہی خراب ہے۔''

اُس کی قسمت خراب نہیں تھی۔ خرابی اُس کے دماغ میں در آئی تھی۔ میں اُسے ڈاکٹر شاہ جی سے باز رکھنا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اُس کی مراد کبھی بر آنے والی نہیں تھی مگر میری باتیں محض اُس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، دماغ تک رسائی نہیں پا رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر تک آس بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''تم میرا ایک کام تو کرسکتے ہو ناں؟''

''کیا؟''

''کوئی چیز تمہیں دوں تو ڈاکٹر جی تک پہنچا دو گے؟''

''خط؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے فوراً سوال داغ دیا۔

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کچھ دیر سوچا پھر ہامی بھر لی۔

اُس کی ماں کٹے ہوئے باجرے کو دو جگہوں پر باندھنے میں مشغول تھی جبکہ اُس کی بہن عجیب سی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں ٹہلتے ہوئے کھیت سے نکل آیا اور دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ پروین وغیرہ بھی پہنچ گئیں۔ آج ان کے ہمراہ غزالہ بھی آئی تھی۔ اُن کی نگاہ زیناں پر پڑی تو میرے پاس درانتیاں رکھ کر بھاگتی ہوئی زیناں کے پاس پہنچ گئیں۔ یہ دیہاتی عورتوں کا خاص انداز ہوتا ہے کہ وہ بہت زیادہ ضروری کام پر میل ملاقات کو فوقیت دیتی ہیں۔

غزالہ میرے پاس رُک گئی تھی، تاسف بھرے لہجے میں بولی۔ ''یہ بھی نری جھلی ہے۔''

''کون؟''

''یہ زیناں...... ماسٹر جی کی وہمی!'' وہ تاسف بھرے انداز میں بولی۔

''کیوں؟ کیا ہوا اسے۔ چنگی بھلی تو ہے۔''

اُس نے اپنے کان کے گرد انگلی گھمائی، بولی۔ ''دماغ

پھر گیا ہے شودھی (بیچاری) کا۔ بڈھے ڈاکٹر کے لیے سارا دن آہیں بھرتی رہتی ہے۔"

"آہیں تو تم بھی بھرتی رہتی ہو؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں تو نور پور کے سب سے سوہنے چھوہر (لڑکے) کے لیے آہیں بھرتی ہوں۔" وہ اِترائی۔

"تم نے ڈاکٹر شاہ جی کو دیکھا ہے؟"

"ہاں!" وہ بولی۔ "منہ متھے لگتا ہے پر ہے تو بوڑھا ناں!"

"کیا بوڑھے کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟"

"ہوتا تو ہے مگر دھڑک دھڑک کر تھک چکا ہوتا ہے۔" وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

میں نے بہ طور احتیاط باجرے کے سر کٹے کھیت کی طرف دیکھا۔ کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ سبھی زمین پر بیٹھ کر گپیں ہانک رہی تھیں۔ میں نے غزالہ کو بانہہ سے پکڑ کر نیچے بیٹھا لیا۔ پیار کی پہلی گستاخی سرزد ہوئی۔ میں نے اُس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں سنبھال کر اُس کی بند آنکھوں کو چوم لیا۔ اُس نے کوئی مزاحمت کی اور نہ اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے۔ مجھے شہ ملی۔ محبت کی وارفتگی کے بَل پر حسن کی سلطنت میں گام بہ گام بڑھتا گیا۔ وہ نڈھال سی ہو کر میرے سینے سے آ لگی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ اُس کی سانسیں غیر معتدل تھیں۔ بلّو کی طرح اُس کے بدن کو بھی گویائی نصیب ہو گئی تھی۔ میں نے اُس کے ہاتھ کی پشت کو لبوں پر لگایا، وہ غیر متوقع طور پر تڑپ کر دور ہو گئی، قدرے پھولی ہوئی سانسوں میں بولی۔ "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے شہرے؟"

میں نے پوری شدت سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

"تو نرا جھلا ہے۔"

"تو بھی تو جھلی ہے ناں!"

"تو کیا ہوا؟ یہاں سارے ہی جھلے ہیں۔ تمہیں کون سیانا دکھائی دیتا ہے؟" وہ ایڑیوں کے بل پیچھے گھسٹ گئی۔

میں نے بات بدلنے کے لیے اُسے بتایا کہ میں ملکہ کو پڑھانے کے لیے ہر روز بخت خان کی حویلی پر جایا کروں گا۔ وہ متفکر ہو گئی۔ بولی۔ "تم وہاں نہ جایا کرو۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"عائشہ بی بی بہت مغرور اور تک چڑھی ہے۔"

"مجھے اُس سے کیا مطلب؟" مجھے حیرانی ہوئی "میں تو ملکہ کو پڑھانے کے لیے وہاں جاؤں گا۔"

"آتے جاتے ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔"

"اوئے جا پرے! وہ یہاں نہیں، ملتان میں رہتی ہے۔"

"جانتی ہوں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ ہر جمعرات کی شام کو آتی ہے اور ہفتہ کی صبح کو جاتی ہے۔" اُس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

"تو کیا ہوا؟" مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آئی تھی۔

"وہ سوہنی بھی بہت ہے۔" اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ میں اُس پر فریفتہ ہو جاؤں گا۔ ہیں؟" میں ہنسا۔

"ماسی فاطمہ کہتی ہے کہ مرد اور اونٹ کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس کروٹ بیٹھ جائیں۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"تم خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ وہ بڑی مغرور لڑکی ہے۔ وہ مجھے کیوں لفٹ کرائے گی؟"

ایسے ہی وقت میں اُس کی نگاہ بھانے پر پڑ گئی۔ اُچھل کر کھڑی ہوئی اور اُس طرف بھاگ گئی۔ میں نے اُس کے تعاقب میں بھانے کی طرف دیکھا۔ پروین کی لاڈلی بچھڑی رسی چھڑا کر اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہی تھی۔ بچھڑی کی آنکھیں غزالہ کی جولانی کو دیکھ کر تازہ دم ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی دُم کمر پر دہری کیے شرارت بھرے انداز میں اُچھل کود رہی تھی، دوڑ رہی تھی اور غزالہ اُسے پکڑنے کے لیے آوازیں دیتے ہوئے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بچپنا لڑکپن کے مقابل آ گیا تھا۔ بچپن شریر ہوتا ہے، لڑکپن مست ہوتا ہے، دونوں تھکنے کا نام نہیں لیتے۔ میں بڑے شوق اور انہماک سے دونوں کی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا۔ آخر کار بچھڑی اپنی ماں کی ٹانگوں میں پناہ گزیں ہونے کے جُرم میں پکڑی گئی۔

جب سبھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں تو میں وریام خان کے منشی کے پاس چلا گیا۔ اُس نے مجھے رات کو پانی باندھنے کا حکم صادر کیا۔ مجبوری تھی وگرنہ رات کو پانی لگانا میرے لیے بڑا تکلیف دہ کام تھا۔ تین گھنٹوں کے پانی کی ادائیگی کی اور واپسی کا قصد کیا۔

مجھے سہ پہر تک کوئی کام نہیں تھا۔ کپڑے بدل کر مزار کی طرف جا نکلا۔ مزار کے کھلے صحن میں کئی مرد و زن چلتے پھرتے اور ستانے کی غرض سے بیٹھے دکھائی دیے۔ کوئی مقبرے کی طرف جا رہا تھا، کوئی مقبرے سے نکل کر شاہ سائیں کی خدمت میں سلام عرض کرنے ہال کی طرف جا رہا تھا۔ میں بھی جوتے اُتار کر چادر پوش قبر پر گیا۔ فاتحہ پڑھی اور قبر کی اطراف میں نصب شدہ خوب صورت ریلنگ کو تھام کر کھڑا ہو گیا۔ تین چار

پیشانیاں ریلنگ کے بالائی موٹے پائپ پر ٹکی ہوئی تھیں اور سسکیاں گنبد دار مقبرے میں چکرا رہی تھیں۔ دو عورتیں اپنے اندرونی کرب کو قبر نشین پر آشکار کرنے کی کوشش میں اپنے دل کا غبار ہلکا کر رہی تھیں۔ وہ نور پور کی نہیں تھیں، میرا اندازہ تھا کہ وہ فرید آباد سے آئی ہوں گی۔ فرید آباد یہاں سے کوئی آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع گاؤں تھا۔ وہاں ہمارے بھی چند رشتہ دار رہائش پذیر تھے۔

ناگاہ میری نگاہ قبر کے قدِ آدم مرمریں کتبے پر سر ٹکائے روتی ہوئی لڑکی پر پڑی۔ وہ بھی نور پور کی نہیں تھی۔ میں نے اُسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی عمر بہ مشکل اٹھارہ سال ہوگی۔ خوب صورت ایسی تھی کہ میں اُسے دیکھنے کے بعد اُس پر سے نگاہیں ہٹانے کی سکت خود میں مجتمع نہیں کر پایا تھا۔ بادامی رنگ کی ستارے دار چادر کے نیچے سیاہ، گھنگریالے اور لمبے بالوں نے اُس کی پشت کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ اُس نے سر اُٹھایا، سیدھی ہوئی، ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھے اور ریلنگ تھام لی۔ اُس کے ہونٹ رونے کی وجہ سے بہت زیادہ سرخ ہو رہے تھے۔ جی چاہا کہ اُس سے رونے کی وجہ دریافت کروں مگر ہمت نہ ہوئی۔

اُس کے لبوں سے ایک سسکی برآمد ہوئی۔ ''ربا! توں تے ولاں دے حال جانداایں!''

(ربا! تم تو دلوں کے حالوں سے بہ خوبی واقف ہو)

نڈھال اور پژمردہ چال چلتی ہوئی الٹے قدموں مزار سے نکل گئی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ اُن دو عورتوں کے ساتھ یہاں آئی تھی جو ریلنگ پر پیشانی ٹکائے ہولے ہولے سسک رہی تھیں مگر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میں مقبرے سے باہر نکلا تو میں نے اُسے ایک دس بارہ سالہ لڑکے کے ساتھ ہال کی طرف جاتے دیکھا۔ جھکا ہوا سر، سست رفتار اور اطراف سے یکسر بے نیازی..... وہ اِس حال میں بھی یکتا معلوم ہوتی تھی۔

اُسے کسی نے دُکھ دیا تھا۔ دُکھ کی نوعیت کیا تھی؟ علم نہیں تھا۔ تبھی میں غیر اختیاری طور پر جاننا چاہتا تھا۔

میں جب ہال میں داخل ہوا تو وہ پھولدار قالین میں لپٹے ہوئے سنگیں چبوترے کے پاس بیٹھ رہی تھی۔ ہال میں تیس کے قریب عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دل جیت شاہ پھسن دار تکیے کی ٹیک لگائے مسند پر نیم دراز تھا۔ اُس کے ہاتھ میں تسبیح متحرک تھی اور آنکھیں بند تھی۔ ایک عورت اور مرد، جو میاں بیوی دکھائی دیتے تھے، اُس کے پیروں کی جانب سر جھکائے بیٹھے تھے۔

میں اُس لڑکی کے عین پیچھے جا بیٹھا۔ اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اُس کے ساتھ آنے والے لڑکے کے خدوخال نظر آ رہے تھے۔ بہ آسانی پتا چلتا تھا کہ دونوں بہن بھائی تھے۔ دونوں کے نقوش میں بے حد مماثلت تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ تقریباً سبھی سر جھکے ہوئے تھے۔ اطراف کا جائزہ لینے کے بعد میری نظر سائیں دل جیت شاہ پر ٹک گئی۔

وہ جسیم، قوی الاعضاء اور اَدھیڑ عمر انسان تھا۔ سرخ و سپید رنگت، سیاہ اور چمکدار ڈاڑھی جو یقیناً کلف شدہ تھی، سر پر بڑی سی سفید عمامے دار پگڑی اور ہاتھوں کی انگلیوں میں گوں ناگوں رنگ کے پتھروں والی انگوٹھیاں اُس کی شخصیت کو خاصا رعب دار بناتی تھیں۔ تسبیح، چرمی جلد والی ایک نوٹ بک اور بل دار چھڑی اُس کے پاس ہر وقت موجود رہنے والی اشیا تھیں۔ ہال میں میرے بیٹھنے سے پہلے ہی بوڑھے میاں بیوی نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا تھا۔ اَب وہ دونوں سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔

سائیں نے اچانک اپنی آنکھیں کھول دیں۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے تولتی نظروں سے دیکھا اور اپنی مخصوص بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''شیر علی! تمہاری نوٹہہ (بہو) پر اُس کی پھوپی نے کسی عامل سے جادو کروا رکھا ہے۔ وہ تمہارے بیٹے کو دل سے چاہتی ہے مگر جونہی دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں، جادو اپنا کام دکھانے لگتا ہے۔''

شیر علی نے سائیں کے دونوں پیر تھام لیے۔ ''سائیں جی! آپ ہماری مدد کریں ورنہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ دنے کی شادی ہے۔ بہو گھر میں نہیں رہے گی تو بیٹی روتی ہوئی گھر آ جائے گی۔ اُس شودھی کے تو چار بچے بھی ہیں، رو رو کر مر جائیں گے۔''

شیر علی کی بیوی نے دوپٹے میں چہرہ چھپا لیا اور اُس کا جسم سسکیوں کی تال پر ہچکولے لینے لگا۔ وہ کوئی فریاد نہیں کر رہی تھی مگر اُس کا فرطِ کرب سے رونا ہی فریاد سے کم نہیں تھا۔

سائیں نے ایک نگاہِ جلال اُس پر ڈالی اور کہا۔ ''دُکھی نہ تھی میڈی بھین! اللہ سائیں بھلا کرے گا۔ تمہارے لیے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ یہ تعویذ لے جاؤ اور پانی میں گھول کر سات دن تک اپنی بہو کو باقاعدگی سے پلاؤ۔ پھر اِسی دن اُسے یہاں لے کر آ جانا۔ فکر نہ کرو، ہم اُسے دم بھی کر دیں گے۔''

اُس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے منقش پیالے میں انگلی ڈبوئی۔ کاپی میں رکھی ہوئی پرچیوں میں سے ایک باہر کھینچی، انگلی اُس پرچی کے بیچ میں رکھی اور اُسے تعویذ کی شکل میں لپیٹ دیا۔ پنسل کا یہ منقش پیالہ ہمہ وقت زعفران سے بھرا ہوتا تھا۔ شیر علی نے بڑے ادب سے تعویذ کو تھاما اور

گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ سائیں کے عقب سے گزر کر دونوں میاں بیوی چبوترے کی سیڑھیاں اُترے اور الٹے قدموں چلتے ہوئے ہال سے نکل گئے۔

میری مطلوبہ مریدنی اپنے بھائی کا ہاتھ تھام کر چبوترے پر چڑھی۔ مریدوں کے بیٹھنے کی مخصوص جگہ پر جا بیٹھی۔ سائیں نے آنکھیں کھولیں، دیکھا، پھر آنکھیں بند نہ ہو سکیں۔ کافی دیر تک دیکھتا رہا، پھر لڑکے کو رسمی انداز میں دیکھ کر بولا۔ ''بول لڑکی! کس پریشانی میں ہے؟''

لڑکی کا سر جھک گیا۔ آنسو گرنے لگے، پھر ہچکیاں لینے لگی۔

دل جیت سائیں نے ڈانٹا۔ ''بولتی کیوں نہیں ہے تُو؟ کیا اپنا رونا دھونا دکھانے کے لیے یہاں آئی ہے؟''

وہ سہم گئی، بولی۔ ''سائیں جی.....''

آواز کانپ گئی۔ سر جھک گیا۔ سائیں نے ایک طائرانہ نگاہ ارادت مندوں پر ڈالی اور بڑبڑایا۔ ''لگتا ہے کہ لوگوں کی وجہ سے بتا نہیں پا رہی۔ اے لڑکی! تو ادھر حجرے میں جا کر بیٹھ جا۔ میں فارغ ہو کر اکیلے میں تیری بات سنوں گا۔''

لڑکی نے اُسے دیکھا، پیروں کو چھوا اور اُٹھ کر اپنے بھائی کی معیت میں حجرے میں چلی گئی۔ سائیں کے ہاتھ کے اشارے پر ایک اور آدمی اُٹھا اور سائیں کے پیروں میں جا بیٹھا۔ میں اُس کی نظروں میں آ گیا تھا۔ اگر اُس سے ملے بغیر ہال سے نکلتا تو وہ تاڑ جاتا، اِس لیے میں نے بھی چبوترے پر جا کر پیر چھوئے اور دُعا کا طالب ہوا، وہ بولا۔ ''خان زادے! آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''ڈاکٹر منور شاہ کے ہاں کام سیکھ رہا ہوں۔ ساتھ میں ایم اے کی تیاری بھی کر رہا ہوں۔'' میں نے ادب سے کہا۔

''نماز پڑھتے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

میرے لیے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا کر زیرِ لب کچھ پڑھنے لگا۔ پھر مجھ پر پھونک مار کر بولا۔ ''تم بڑے اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ بڑا دھی ہوتا ہے جو بڑوں کو بڑا سمجھتا ہے اور مرتبے کو مان کر ادب کرتا ہے۔ ادب عشق کا پہلا زینہ ہے۔ عشق کے بغیر انسان نامکمل ہوتا ہے۔ مجاز میں بھٹکتے بھٹکتے انسان حقیقت کا سراغ پاتا ہے۔ عشق انسان کو خدا کا دیدار بھی بخشتا ہے۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ از راہِ گفتگو کہا۔ ''میں باادب ہوں، کسی کی دل آزاری نہیں کرتا۔''

اُس نے سر ہلایا۔ ''بہت اچھی بات ہے۔ کوئی مسئلہ درپیش آئے تو ہمارے پاس آ جانا۔ ہمیں اپنا بزرگ اور دوست پاؤ گے۔''

اُس کے انداز نے سمجھایا کہ مجھے اَب رخصت ہو جانا چاہیے، میں چونکہ ارادت مند کے رُوپ میں آیا تھا، اِسی روپ میں جاتا تو اچھا لگتا۔ اِس لیے میں الٹے قدموں ہال سے نکل آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے ٹہلانے کے بعد وہ اپنے حجرے میں جائے گا۔ میں پنجوں کے بل دوڑتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جھانکا مگر باریک جالی کی وجہ سے کچھ دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو پایا۔ میں کھڑکی کے نیچے، دیوار کی جڑ کے ساتھ کمر لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ مقبرے اور مہمان خانے کی دیواروں کی جڑوں میں کئی تھکے ہارے زائرین بیٹھے ستا رہے تھے، اِس لیے میرا وہاں بیٹھنا معیوب یا نامناسب نہیں تھا۔ میری تمام تر توجہ حجرے کے اندر ہونے والی گفتگو پر مرتکز تھی۔

حجرے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا، پھر بند ہوا اور دل جیت شاہ کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''بچے! تم ادھر کمرے میں جا کر کچھ دیر بیٹھو۔''

حجرے کے اندر ایک اور کمرے کا دروازہ کھلتا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر سائیں کی آواز سنائی دی۔ ''اب بتا لڑکی! تیرا مسئلہ کیا ہے؟''

لڑکی کی آواز بہت دھیمی تھی۔ پوری طرح اُس کا بیان کیا ہوا دکھائی مجھے سنائی نہیں دیا مگر یہ پتا چل گیا کہ اُس کا باپ اپنے بھتیجے یا بھانجے کے ساتھ اُس کی شادی کرنا چاہتا ہے جبکہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔

دل جیت شاہ کا لہجہ بھی غیر معمولی حد تک دھیما ہو گیا۔ دونوں کی کھسر پھسر مجھ پر گفتگو کا متن واضح نہیں کر رہی تھی۔ میں نے بہتیری کوشش کی، جگہیں بدلیں مگر ناکام رہا۔ کافی دیر گزر گئی تھی۔ میں جہاں بیٹھا تھا، وہاں سے سایہ رخصت ہو گیا تھا اور سرما کے ابتدائی دنوں کی دھوپ بدن میں چبھنے لگی تھی مگر میں اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دیوار تھامے بیٹھا تھا۔ آخر مایوس ہو کر صحن میں ایستادہ نیم کے چھتری نما درخت تلے آن کھڑا ہوا۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ لڑکی اپنے خوب رُو بھائی کے ساتھ ہال سے برآمد ہوئی۔ دونوں میرے قریب سے گزر کر صحن کے شمالی گوشے کی طرف بڑھے جہاں تین چار سائیکلیں اور دو موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ لڑکی کے چہرے کو میں نے غور سے دیکھا، وہ قدرے بہتر حالت میں تھی۔

وہ موٹر سائیکل پر آئے تھے۔ لڑکے نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی، وہ اچھل کر پیچھے بیٹھ گئی اور دونوں مزار کا بڑا گیٹ عبور کر کے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے عقبی نمبر پلیٹ کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ موٹر سائیکل کا نمبر سینتیس چھیاسی تھا۔ یہ کوئی منفرد نمبر نہیں تھا مگر نمبر پلیٹ پر رقم کرنے کا طریقہ نیا تھا۔ نمبر پلیٹ بنانے والے نے تین کا ہندسہ بہت چھوٹا لکھا تھا جبکہ باقی تینوں ہندسے 'سات، آٹھ اور چھ' کافی بڑے لکھے ہوئے تھے۔ سرسری نظر میں نمبر پلیٹ پر صرف 'سات سو چھیاسی' کے ہندسے ہی پڑھے جاتے تھے۔ وہ دونوں بہن بھائی میرے لیے اجنبی تھے۔ اُن کے لباس، انداز و اطوار سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لڑکی نے بادامی رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ یہاں، دیہاتی علاقوں میں کالی چادر، دوپٹے یا دیسی طرز کے شٹل کاک برقعے کا رواج عام تھا۔

کھالے کی ویگن کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے یہ وقت مشکل سے گزارا۔ جب ویگن اپنے اڈے پر پہنچی، میں اُس کے باپ کی دکان کے باہر چارپائی پر خیم دراز تھا۔ وہ ویگن سے اُتر کر سیدھا میری جانب آیا۔ ہاتھ ملانے کے بعد مستفسر ہوا۔ ''خیر تو ہے؟''

میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ''سینتیس چھیاسی نمبر کی موٹر سائیکل بھی دیکھی ہے علاقے میں؟''

اُس نے نفی الفور نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ''ذرا ذہن پر زور دو۔''

اُس کے مطالبے پر میں نے نمبر دہرایا۔ یاد آنے پر سمجھایا۔ ''تین چھوٹا لکھا ہوا ہے جبکہ سات سو چھیاسی بڑے ہندسوں میں لکھا ہوا ہے۔''

اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں، بولا۔ ''ہوں.....! تو یہ بات ہے۔ سچ سچ بتاؤ، چکر کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہیں بتانے کے لیے ہی تو گھنٹا بھر سے یہاں پڑا ہوا ہوں۔ تم پہلے بتاؤ، یہ نمبر کس کا ہے؟''

وہ بولا۔ ''یہ سجاول قریشی کی موٹر سائیکل کا نمبر ہے۔''

''وہ کون ہے؟'' میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میری توقع بر آئی تھی۔

''یار تم بھی تو کچھ بتاؤ ناں، چکر کیا ہے؟''

''بکواس نہ کرو، سیدھی طرح بتاؤ، سجاول قریشی کون ہے، کہاں رہتا ہے؟'' میں نے ڈانٹا۔

وہ منہ بنا کر بولا۔ ''میں تو یہ جانتا ہوں کہ وہ چوک قریشی میں، ڈیرے والی سڑک پر تھوڑا آگے جا کر ڈرائیور سائڈ پر، کریانہ کی دکان کرتا ہے۔ چھوٹا قد، گنجا سر اور سانولا رنگ میرے جیسا۔ بڑا خرانٹ اور بد دماغ انسان ہے۔''

اُس کی آنکھوں کی چمک ایک دم سوا ہو گئی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''تم مجھے بچہ سمجھتے ہو کیا؟''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''نہیں بلکہ بوڑھا شیطان سمجھتا ہوں تمہیں۔''

اُس کی ہنسی میں طنز کی آمیزش ہو گئی، بولا۔ ''آج جب میں پھیرا لے کر واپس آ رہا تھا تو میں نے بلوچ نگر اور نور چوک کے درمیان میں ان دونوں کو موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

میں بے اختیار بولا۔ ''کن دونوں کو دیکھا تھا؟''

''وہی جن کو دیکھ کر تمہاری رال ٹپک رہی ہے۔''

''بکواس نہ کرو۔'' میں نے قدرے جھینپ کر کہا۔ پھر میں نے مناسب جانا کہ اُسے تمام تر ماجرا کہہ سناؤں۔

میرے چپ ہونے پر وہ بولا۔ ''وہ لڑکی بڑی تک چڑھی ہے۔ اُس کا نام عشرت ہے مگر گھر اور محلے میں سبھی 'عاشی' کہتے ہیں۔ اُس کے ساتھ آنے والا اُس کا بھائی تھا، وحید۔ بس دو ہی بہن بھائی ہیں۔ ماں کسی پرائمری اسکول میں پڑھاتی ہے جبکہ باپ کے بارے میں میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ عاشی مظفر گڑھ کے کالج میں پڑھتی ہے جبکہ وحید چوک قریشی کے مڈل اسکول میں پڑھتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس کا گھر کہاں ہے؟''

''تم نے دیکھ رکھا ہے مگر تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ وہ عاشی کا گھر ہے۔'' وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''شاہ جمال والی سڑک کی پہلی گلی کے آخر میں ایک دو منزلہ گھر ہے۔ یاد کرو..... میرے ساتھ امجد ڈرائیور کے گھر گئے تھے ناں تم..... یاد کرو!''

''وہی جہاں تم جا کر تاش کھیلتے تھے؟'' میں چونکا۔

''ہاں..... اس کے سامنے والا گھر سجاول قریشی کا ہی تو ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں عاشی کو دیکھنے کے لیے ہی تو امجد کی بیٹھک میں بیٹھ کر گھنٹوں تاش کھیلا کرتا تھا۔ وہ بے غیرت انسان مجھ سے دس پندرہ روپے اینٹھ لیتا تھا۔ ایک آدھ بازی جان بوجھ کے ہار جاتا، پھر مجھے ہراتا جاتا اور میری جیب خالی کرتا جاتا۔''

میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کی بات سن کر بے ساختہ مسکرا دیا۔ میں نے کہا۔ ''کیا عاشی نے لفٹ کرائی تھی تمہیں؟''

اُس نے منہ بنا کر نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں یار! وہ اونچی ہواؤں میں اڑتی تھی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، سائیں جیت شاہ نے اُسے کیا کہا

ا؟'' میں نے دلچسپی لی۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے کوئی وظیفہ ہو یا تعویذ وغیرہ دیے ہوں۔'' اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس نے دوبارہ آنے کا کہا ہو۔''

''تب تم نے کسی لڑکے کے ساتھ اُس کا میل جول دیکھا تھا، جب تم امجد کے ہاں جایا کرتے تھے؟''

''میں نے کسی کو وہاں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ دونوں وہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ ماں کے ساتھ جاتی تھی، ماں کے ساتھ واپس آتی تھی۔ اب کالج جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مظفر گڑھ میں پلکیں جھکائے جاتی ہو اور کسی کے چارے، میرے جیسے کا دل مٹھی میں جکڑے واپس آتی ہو۔'' اُس نے کہا۔

ہم دونوں نے پروگرام ترتیب دیا کہ آنے والی صبح میں اس کے ساتھ چوک قریشی جاؤں گا۔ وہ ملتان سدھارے گا اور اپنی اسما کو ایک نظر دیکھ آئے گا جبکہ میں ممکنہ حد تک عاشی کے بارے میں سن گن لوں گا۔ پہلے پھیرے کے بیچ میں کافی وقت فراغت کا میسر ہوتا تھا۔ کھالا عمومی طور پر یہ وقت اڈے والے ہوٹل پر اپنے پٹی بھائیوں سے گپ شپ اور چائے پانی عیاشی میں گزارا کرتا تھا۔

جب پروگرام طے پا گیا تو کھالے نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ''یار شہرے! ایک خط اور لکھ دو۔''

''لکھ کر تو دیا تھا؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''تو اُس کے جیسا اور لکھ دو ناں!'' وہ لجاجت سے بولا۔ ''ایسا کہ تھری ناٹ تھری کی گولی بن کر سیدھا سینے میں لگے اور دل میں سوراخ کر جائے۔''

''اور تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دے۔ ہیں ناں!'' میں نے لطف لیا۔

''لکھ دو، چاہے ایسا ہی ہو۔''

اُس کی منت سماجت پر میں نے ہامی بھر لی۔ چونکہ اُس نے کھانا کھا کر ویگن کا پھیرا لے کر جانا تھا، اس لیے میں گھر آ گیا۔

شام کو بخت خان کی حویلی سے نکلا تو میرا رُخ اسپتال کی طرف تھا۔ آج میں نسبتاً جلد ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں پہنچ گیا تھا۔ اُسے لان میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''شہر یار! ڈسپنسر کے گھر میں گھاس کاٹنے والی مشین پڑی ہے، اُٹھا لاؤ، مل کر گھاس کاٹتے ہیں۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ڈسپنسر کے کوارٹر کے دروازے پر دستک دی۔ اُس کی بیوی نے دروازے کے اندر سے پوچھا۔ ''کون؟''

میں نے اپنا نام بتایا اور آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ وہ گھر میں گئی اور مشین گھسیٹ لائی۔ دروازہ کھول کر، دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر بولی۔ ''یہ اُٹھا کر لے جاؤ۔ مجھ سے اُٹھائی نہیں جاتی۔''

میں نے مشین اُٹھائی اور لان میں آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی اُسے چلانا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ نصف گھنٹے کی مشقت رنگ لائی۔ لان خوب صورت دکھائی دینے لگا۔ کٹی ہوئی گھاس کو ایک کونے میں ڈھیر کر کے مشین کو ڈاکٹر شاہ کی کوٹھی کے اسٹور میں لا پھینکا۔ کٹی ہوئی گھاس خشک ہونے کے بعد ڈسپنسر کی بیوی کے کام آتی تھی۔ وہ 'لو' پر روٹیاں پکاتی تھی۔ لو گرم کرنے کے لیے یہ گھاس بہت مفید ایندھن ثابت ہوتی تھی۔

ڈاکٹر شاہ جی نے میرے پسینے سے تر جسم کو ستائش بھری نگاہوں سے تولا، کہا۔ ''شہر یار! تم بہت لکی ہو۔ تمہاری تعلیم تمہارے ذہن کو مضبوط بنا رہی ہے۔ تمہاری کاشت کارانہ مشقت تمہارے بدن کو لوہا بنا رہی ہے۔ یقیناً تم دو دنیاؤں میں بہ یک وقت رہنے والے انسان ہو۔''

''یہ دو دنیائیں کہیں دو کشتیوں کی طرح مجھے پاٹ نہ دیں؟''

وہ مسکرایا۔ ''دریائی مزاج کو سمجھ کر قدم بڑھاتے رہو گے تو سفر تمہاری مرضی پر سر تسلیم خم کرے گا۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور کمرے میں آ کر کتابیں کھول بیٹھا۔ اسٹڈی سے فراغت کے بعد میں جب اُس کی کوٹھی سے نکلا تو اپنے تئیں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ آنے والے دنوں میں عاشی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اُس پر کڑی نگاہ رکھوں گا کہ وہ کب شاہ سائیں کے ہاں آتی ہے، کیا کرتی ہے، وغیرہ۔ رات کو تا دیر نیند نہیں آئی اور میں عاشی سے راہ و رسم بڑھانے کے طریقوں پر غور کرتا رہا۔

علی الصباح میں تیار ہو کر کھالے کے پاس پہنچ گیا۔ شیدو کے ساتھ بہ طور معاون کنڈیکٹر چوک قریشی تک آیا۔ ویگن اڈے پر لگائی اور کھالے کو ملتان روانہ کرنے کے بعد ڈیرا روڈ والے ویگن اڈے کی طرف نکل گیا۔ مجھے کھالے نے عاشی کی فیملی سے متعارف ہونے کا ایک نادر نسخہ بتا دیا تھا جس پر عمل کرتے ہوئے میں ٹہلتے ہوئے نیاری کی دکانوں کی طرف نکل گیا۔ ایک دکان پر سے میں نے ایک زنانہ ہار خریدا۔ یہ پیتل ساختہ تھا مگر عام نظر میں سونے کا گمان

ہوتا تھا۔ موتیوں اور سنہرے دھاگے نے اِس کی خوب صورتی میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ ہار کو جیب میں ڈال کر میں استاد امجد کی گلی میں گھس گیا۔ دو منزلہ گھر تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کچھ پیش و پس کے بعد میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ عاشی کے بھائی نے کھولا۔ مجھے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ شناسائی کی ایک لہر اُس کی آنکھوں میں پل بھر کو دکھائی دی پھر معدوم ہو گئی۔

میں نے پوچھا۔ ''مجھے پہچانا؟''

''آپ کو کہیں دیکھا تو ہے۔ کہاں؟ یہ ذہن میں نہیں آ رہا۔'' اُس نے اُلجھے اُلجھے انداز میں کہا۔

''تم نے مجھے سائیں جیت شاہ کے مزار پر دیکھا ہوگا۔ میں نے تمہیں اور تمہاری بہن کو وہاں دیکھا تھا۔ یاد آیا؟''

اُس کی آنکھوں میں سراسیمگی سمٹ آئی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ''آپ کو کیا کام ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تم دونوں میرے سامنے سے گزر کر اپنی موٹر سائیکل کی طرف گئے تھے۔ میری سائیکل بھی وہیں کھڑی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد جب میں اپنی سائیکل نکالنے لگا تو میں نے ایک ہار عین اُسی جگہ پر پڑے دیکھا جہاں تمہاری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ ہار تمہاری بہن کا گرا ہوگا۔''

وہ ہکلا سا گیا۔ ''م...... مگر...... باجی نے تو......''

ایسے ہی وقت میں اُس کے عقب میں دروازے کا ایک طاق تھوڑا سا ہلا اور ایک نسوانی آواز اُبھری۔ ''کیسا ہار بیٹا؟ میری بیٹی تو ہار پہنتی ہی نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''خالہ جان! میں نے ہار اُس وقت دیکھا تھا جب آپ کے بچے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر مزار سے نکل گئے تھے۔ مجھے نہیں علم کہ وہ ہار آپ کی بیٹی کا ہے یا کسی اور کا...... میں نے تو محض اندازہ لگایا تھا۔ مجھے تو ہار کی قیمت کا بھی اندازہ نہیں کہ وہ سستا ہے یا مہنگا۔ دیکھنے میں تو سونے کا لگتا تھا، اِس لیے اتنی محنت کر کے آپ کا گھر تلاش کیا ہے میں نے۔''

تجسس نے اُسے دروازے کی اوٹ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اُسے دیکھا۔ وہ ہاتھ بڑھائے ہار مانگ رہی تھی۔ میں نے اپنی جیب میں سے ہار نکالا اور اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر ہار لوٹاتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''بیٹا! تم نے ناحق تکلیف کی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ میری بیٹی کا ہار نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ سونے کا نہیں، پیتل کا ہے۔ میاری والی دکانوں پر ایسے جھوٹے زیورات عام ملتے ہیں۔''

میں نے مصنوعی شرمندگی کا مظاہرہ کیا۔ تکلیف دہی پر معذرت چاہی اور از راہِ گفتگو کہا۔ ''چونکہ میں نے آج تک سونا خریدا ہے نہ زیورات، اِس لیے میری نظر دھوکا کھا گئی۔ میں سمجھا کہ یہ بہت قیمتی ہوگا۔ اگر پتا ہوتا کہ یہ معمولی نوعیت کا ہار ہے تو وہیں پڑا رہنے دیتا یا پھینک دیتا۔''

اُس نے مجھے سراہتی نگاہوں سے دیکھا۔ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئی۔ ''بیٹھک کھول کر بھائی کو بٹھاؤ، میں چائے لاتی ہوں۔''

میری مراد بر آ رہی تھی۔ بہ ظاہر میں نے معذرت چاہی۔ وہ بولی۔ ''نہیں بیٹا! کسی نیک ماں کی اولاد لگتے ہو، چائے پلائے بغیر نہیں بھیجوں گی۔ چل وحید! دَر کھول ناں بیٹھک دا!''

وحید اُس کے پہلو سے نکل کر اندر کی طرف بھاگ گیا۔ چند ثانیوں کے بعد اُس نے ڈرائنگ روم کا گلی میں کھلنے والا دروازہ کھول دیا اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ چند لمحوں کے بعد میں بیٹھک میں تھا۔ کمرے کی آرائش سے ذوق اور نفاست جھانک رہی تھی۔

میں وحید کے ساتھ محوِ کلام تھا جب اُس کی ماں چائے کا کپ ٹرے میں رکھے بیٹھک میں آ گئی۔ اُس نے چائے میرے سامنے میز پر رکھی، بیٹھک کا بیرونی دروازہ بند کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں چائے پیتا رہا۔ وہ مجھے دیکھتی رہی اور مجھ سے میرا بائیو ڈیٹا پوچھتی رہی۔ پڑھا ہوں؟ کہاں تک پڑھا ہوں؟ آگے کیا پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں؟...... اُس نے چند ہی منٹوں میں اَن گنت سوالات مجھ سے کر دیے۔ اُس نے مجھ سے میرے گھر کا پتا بھی دریافت کیا اور اچھی طرح سمجھنے کے بعد بولی۔ ''میں بھی تمہارے گھر آؤں گی اور تمہاری بہن سے ملوں گی۔ تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔''

میں اُس کی نگاہوں کو اچھا لگا تھا، وہ میرے دل کو بھائی تھی۔ ادھیڑ عمری میں بھی خوب صورت دکھائی دیتی تھی۔ ویسے بھی عاشی جیسی خوب صورت لڑکی کو جنم دینے والی ماں کو خوب رُو ہونا چاہیے تھا۔ چہرے پہ پھیلی معصومیت، لہجے میں غیر معمولی مٹھاس اور اپنائیت بھرے رویے نے مجھے اُس کا گرویدہ کر دیا تھا۔ پہلی ملاقات میں اُس کے نجی معاملات کو زیرِ بحث لانا اُسے چونکانے کے مترادف تھا اِس لیے میں خواہش کے باوجود اُس کے شوہر اور بیٹی کے بارے میں کچھ نہ پوچھ سکا۔ اُس کے پاس سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر زیادہ دیر بیٹھنا بھی معیوب اور بے محل تھا، اِس لیے بادلِ ناخواستہ اُٹھنا پڑا۔

اجازت لے کر عاشی کے گھر سے نکلا اور دل ہی دل میں

'کھالا استاد زندہ باد' کا نعرہ لگاتے ہوئے ویگن کے اڈے کی طرف چل دیا۔ کھالے نے ہی مجھے عاشی کے دروازے پر دستک دینے کے لیے مضبوط جواز فراہم کیا تھا۔ مجھے ماننا پڑا کہ اُس کا ذہن شیطان کی راجواڑی تھا۔ ہر مقفل دَر کی چابی اُس کے ہاں سے میسر تھی۔

آ کر ہوٹل کے ہاں چے پر نیم دراز ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر دو چار ڈرائیور اکٹھے ہو گئے۔ اُنہیں کھالے کی کمی بُری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ آج کھالا اپنے وقت پر نہیں پہنچا۔ مجھے تشویش ہوئی۔ شیدو نے ویگن کی روانگی کا وقت ہونے کی اطلاع دی اور حسبِ عادت ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ہارن بجانے لگا۔ سواریاں خودکار معمول کے مطابق ویگن کی سیٹوں پر براجمان ہو گئی تھیں۔ اِس لیے ویگن کو اڈے سے نکالنا پڑا۔

مجھے ویگن سمیت نور پور میں ایک گھنٹا ٹھہرنا تھا جو مجھ پر کٹھن ثابت ہوا۔ خدا خدا کر کے روانگی کا وقت ہوا اور میں نے ویگن نور پور سے نکالی۔ چوک قریشی والے ویگن اڈے پر پہنچا تو پتا چلا کہ کھالا ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ دل میں بے طرح کی کھد بد ہونے لگی۔ اسما خان زادی تھی، اُس سے بعید نہ تھا کہ وہ کھالے کو کسی مصیبت میں ڈال دیتی۔ جوں جوں ویگن کی روانگی کا وقت قریب ہوتا جا رہا تھا، میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دل میں متعدد بُرے خیال آئے، ہر بار ''اللہ خیر کرے'' کا جملہ بے اختیار دل سے دُعا بن کر نکلا اور لبوں پر مچل گیا۔

کھالا دکھائی دیا تو دل کو چین آیا۔ حسبِ سابق اُس کی چال اور چہرے بشرے سے عیاں جوش کی کیفیت نے مجھے اُس کے بتانے سے پہلے ہی سمجھا دیا کہ کھالے کی واپسی نہیں، بلکہ یہ فاتح کی واپسی تھی۔ ہوٹل والے کو بلند آواز میں چائے کا آرڈر دینے کے بعد میرے پاس بیٹھ گیا۔

میں نے گلہ کیا۔ ''اتنی دیر لگا دی تم نے کھالے اُستاد! کچھ تو خیال کرتے، دل میں برے برے خیال آ رہے تھے کہ کہیں جنگلی بلا حیدر خان کی کڑکی میں نہ پھنس گیا ہو۔''

اُس نے اپنی مونچھوں کو بل دیا، کالر کھول کر گریبان کو کندھوں پر ڈالا اور فخر سے بولا۔ ''دھت تیرے بزدل کی، کھالا گیا تھا، ہاں کھالا...... کوئی نتھو خیرا نہیں گیا تھا کہ پھنس جاتا۔ سمجھو کہ بلی پھنس گئی ہے محبت کی کڑکی میں...... ہاں!''

میں نے اُسے تاؤ دلانے کے لیے منہ بنایا۔ ''ہونہہ! بلی پھنس گئی...... یہ بتاؤ، اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے؟''

وہ اردگرد دیکھ کر بولا۔ ''میں حسین آگاہی چلا گیا تھا۔ خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگا، سوچا کہ کوئی تحفہ ہی لے جاؤں۔''

''پھر؟'' میں چونکا۔

''پھر کیا؟'' وہ بولا۔ ''کوئی شے پسند ہی نہیں آئی۔''

میں نے کھوجتی نظروں سے اُسے گھورا۔ ''تمہارے پاس پیسے کتنے تھے؟''

وہ بولا۔ ''کل کے دو پھیروں کا سارا کیش میرے پاس تھا۔''

''خرچ کر دیتے تو خان کو کیا جواب دیتے؟'' میں نے کہا۔ ''وہ تو تمہاری چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دیتا۔''

اُس نے ہاتھ نچایا۔ ''اوئے پروا نہیں۔ دمڑی کے لیے چمڑی کی قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔''

''یہ تو تمہارے جیسے کسی احمق انسان کا قولِ زریں لگتا ہے۔''

''یہ میرا اپنا قول ہے، بکواس نہ کرو اور کان کھول کر میری فتح یابی کا ماجرا سنو۔ دنگ رہ جاؤ گے۔'' وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔

چائے سرو کر دی گئی۔ وہ چائے پینے کے ساتھ ساتھ مجھے دن بھر کی کارگزاری بتاتا رہا، میں انہماک سے سنتا رہا۔

وہ حسین آگاہی سے بے نیلِ مرام نکلا تھا۔ دل بوجھل سا تھا۔ محبوبہ کے پاس خالی ہاتھ جانے پر طبیعت پُر ملال تھی۔ اُس نے اپنے جیسے کسی ڈرائیور کو جا پھانسا۔ اُس کے پلان میں ایک رکشے کی اشد ضرورت تھی۔ رکشا ڈرائیور کے ساتھ اُس نے اپنی مرضی کے مطابق سودے بازی کی اور اُسے لے کر کالج کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ رکشے سے چند قدموں کی دوری پر کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد اُسے اسما کی کار دکھائی دی۔ وہ اُس کے قریب سے گزر گئی۔ اُسے افسوس ہوا کہ جس کے لیے وہ اتنی مسافت طے کر کے یہاں پہنچا تھا، اُس نے اُسے ایک نظر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ وہ جلدی سے رکشا میں بیٹھا اور کار کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

اسکولوں اور کالجوں میں چھٹی ہونے پر شہر میں گہما گہمی خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے تو لوگوں کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے مگر عاشقوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ رکشا کبھی کار کی دُم پکڑ کر چل نہیں سکتا مگر بے انتہا رش کی وجہ سے وہ کار کے ساتھ چپکے رہنے میں کامیاب رہا تھا۔ کھالے کی پُر اشتیاق نظروں نے اسما کی رہائش گاہ دیکھ لی۔ شہر کے پوش ایریا میں واقع کوٹھی کو دیکھنے کے بعد بڑے دو جڑوی آہنی گیٹ پر دست کناں ہونے کی جرأت کھالے میں پیدا نہ ہو سکی۔ اُس نے رکشا ڈرائیور کو فارغ کیا اور زیبائشی پودوں سے لدی پھندی کوٹھی کے عین سامنے،

سڑک کے دوسرے ہاتھ پر واقع فٹ پاتھ پر کافی دیر تک کھڑا رہا۔ شاید کہ حسن کی جھلک ہی دکھائی دے، مگر وہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوا۔

اگر عام رہائشی علاقہ ہوتا تو بعید نہیں کہ کھالا کوٹھی کے بارے میں مکمل جان کاری لے کر لوٹتا۔ وہ جدید طرز کی کالونی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک امیرزادہ وہاں سکونت پذیر تھا۔ کھالے کو احساسِ کمتری نے کھل کھیلنے کا موقع نہیں دیا اور وہ حدودِ اربعہ، کوٹھی کا ایلی ویشن اور علاقے کا نام ذہن نشین کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ اُس کی بتائی ہوئی کہانی تمام ہوگئی۔ میں نے اُس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ عجیب جذبات آ گیں قوسِ قزح رقصاں تھی۔ میں نے کہا۔ ''فرض کرو، وہ تمہارے سامنے آجاتی تو تم اُسے کیا کہتے؟''

دل میں پلتے کئی حساس جذبے آنکھوں سے ہویدا ہوگئے، بولا۔ ''اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیتا۔''

میں ہنسا۔ ''پھر کیا ہوتا؟''

وہ بولا۔ ''وہی ہوتا جو منظورِ خدا ہوتا۔ اسا کی بات چھوڑو، اَب تم مجھے عاشی کے بارے میں بتاؤ۔ تم نے کیا تیر مارا؟''

میں نے بھی اپنی رام کہانی سنائی۔ وہ مسکرانے لگا۔ ''اگر میں تمہارے جتنا پڑھا ہوتا اور میرا رنگ روپ بھی تمہارے جیسا ہی ہوتا تو میں نے اُسے پٹا لینا تھا۔''

''کیسے؟'' میں متعجب ہوا۔

''عاشی کو اور کیسے؟''

میں نے ملامت انگیز نگاہوں سے اُسے گھورا۔ باتوں میں خاصی دیر گزر گئی تھی۔ ویگن کی سواریاں اشاروں کنائیوں سے کھالے کو متوجہ کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

گھر پہنچتے ہی چاچا چراغ کی عدالت میں پیشی بھگتنا پڑی۔ میری عدم موجودگی میں میرے حصے کا زیادہ کام اُسے سرانجام دینا پڑتا تھا۔ بڑھاپے کے باعث زیادہ تھک جاتا تھا۔ تھکن غصے کا روپ دھار کر مجھ پر برس پڑتی تھی۔ میں نے بہ دقت تمام اُسے مطمئن کیا۔ ملکہ کو پڑھانے کے لیے شام کو بخت خان کی حویلی پر پہنچا تو بخت خان نے کہا کہ میں پڑھانے کے بعد کچھ دیر یہیں رہوں۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ اُس نے اور بھی چند لوگوں کو شام میں بلوا رکھا ہے۔ کوئی خاص معاملہ زیرِ بحث آئے گا۔

میں ملکہ کے کمرے میں ہی تھا جب نوکرانی نے آکر کہا۔ ''خان جی تمہیں دارے پر بلا رہے ہیں۔''

میں نے اپنی گود میں رکھی ہوئی ملکہ کی کاپی صوفے پر رکھی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دارے کے خاص کمرے میں پہنچ کر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ صوفوں پر ڈاکٹر شاہ جی، امیر نواز، کھالا اور مراد بخش دیوانہ براجمان تھے۔ میری حیرت کا سبب امیر نواز اور دیوانے کی وہاں موجودگی تھی۔

چائے کا دور چل رہا تھا۔ میں سب کو سلام کرکے ایک طرف بیٹھ گیا۔ میرے سامنے بھی بشیرے نے چائے لا رکھی۔ رسمی گفتگو کے بعد امیر نواز نے کہا۔ ''خان چاچا! میرا خیال ہے کہ بات شروع کی جائے۔''

بخت خان نے باری باری سب کو دیکھا پھر گمبھیر لہجے میں گویا ہوا۔ ''فرداً فرداً، اِس موضوع پر میری آپ تمام لوگوں کے ساتھ بات چیت ہوچکی ہے۔ میں نے سوچا کہ مل بیٹھ کر کوئی حتمی لائحہ عمل تیار کرلیا جائے۔ مشاورت کا عمل ہمیشہ کامیابی کی طرف بڑھاتا ہے۔ کیوں ڈاکٹر شاہ! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

ڈاکٹر شاہ جی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ غیر فطری انداز میں سرد نگاہوں سے اُسے گھورتا رہا۔

بخت خان نے بات جاری رکھی۔ ''یہ طے ہوچکا ہے کہ سائیں دل جیت شاہ کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ میں گزشتہ دو تین مہینوں سے اپنے طور پر نگرانی کررہا ہوں، اِس کھوج میں ہوں کہ اُس کے کاروبار کی نوعیت مجھ پر کھل جائے مگر بے سود۔ اُس کے ہاں آنے والے لوگوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل نہیں کرسکا سوائے گاڑیوں کے نمبروں کے۔ میں نے گاڑیوں کے متعلقہ رجسٹریشن کے دفاتر سے رابطہ کیا۔ مختلف اوقات میں یہاں آنے والی گاڑیوں کی تعداد سات ہے۔ آج تک ساتوں گاڑیاں یہاں اکٹھی نہیں ہوئیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، رجسٹریشن والوں کے ریکارڈ کے مطابق اُن گاڑیوں کے مالکان کی فہرست یہ ہے......''

اُس نے اپنے سامنے پڑے ہوئے شیشے کی نفیس میز کی طرف اشارہ کیا۔ ایک آف وائٹ کلر کی فائل پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے پھر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر ہمیں دکھایا، بولا۔ ''مگر اِن ساتوں مالکان کا گاڑیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی مرتبہ تو کوئی ان گنت مرتبہ بک چکی ہے۔ میں نے بہتیری کوشش کی کہ مجھے موجودہ مالکان تک رسائی حاصل ہوسکے مگر ایسا عملی طور پر ممکن نہ ہوسکا۔''

ہم سب پوری توجہ اور انہماک سے اُس کی بات سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہاں بڑے پیمانے پر کوئی دو نمبر دھندا ہورہا ہے۔ غالب قیاس یہی ہے کہ یہ گینگ اسلحے یا منشیات کے کاروبار سے منسلک ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ ہم سب مل کر سراغ لگائیں اور نور پور کو بُرائی سے پاک کریں۔ چونکہ دل جیت شاہ کے ارادت مندوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور لوگوں کی شعوری سطح بھی کم ہے، اِس لیے ہمیں سائیں پر بڑا مضبوط ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ تاط ہوجائے اور ہمیں رسوائی کا شکار ہونا پڑے۔''

اُس نے ایک ذرا توقف کیا، سگریٹ سلگائی اور ڈاکٹر شاہ جی سے مخاطب ہوا۔ ''ڈاکٹر شاہ! آپ کیا کہتے ہیں اِس بارے میں؟''

ڈاکٹر شاہ جی نے صوفے میں پہلو بدلا اور قدرے مضطرب انداز میں بولا۔ ''برائی کی ایک سمت نہیں ہوتی، یہ چاروں طرف اپنے اثرات پھیلاتی ہے۔ شاہ سائیں لوگوں کی سادگی اور عقیدت سے بھرپور فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ نہ صرف لوگوں کو دھوکا دیتا ہے بلکہ وہ کسی کریمنل گینگ کا مرکزی کردار بھی بنا ہوا ہے۔ میں پردیسی ہوں، آج یہاں، کل وہاں یا نہ جانے کہاں...... مگر نور پور آپ لوگوں کا مستقل بسیرا ہے۔ گاؤں تو گھر کے صحن کی طرح مقدس ہوتا ہے۔ اِسے پاک صاف رکھنا ہر فرد کا فرض ہے۔ میں اور کیا کہوں...... ماسوائے اِس کے کہ جیسے بھی ممکن ہو، کسی بھی قربانی کے عوض، جیت شاہ کی بیخ کنی کی جائے۔ مجھ سے جو ممکن ہوا، آپ کے لیے کروں گا بھلے نور پور میں میرا عارضی قیام ہی کیوں نہیں۔''

میں نے امیر نواز اور دیوانہ کے چہروں کو دیکھا جن کی زبان سے میں نے دل جیت شاہ کے خلاف کچھ نہیں سنا تھا۔ دیوانہ تو شاہ سائیں کا بیعت شدہ مرید تھا۔ سوال کرنا مناسب نہیں تھا، اِس لیے خاموش بیٹھ کر تیل اور تیل کی دھار دیکھنے پر ہی اکتفا کررہا تھا۔ اپنی اپنی آرا پیش کرنے کا سلسلہ چھڑ گیا۔ امیر نواز بڑا پُرجوش دکھائی دے رہا تھا جبکہ میں، دیوانہ اور کھالا بڑے انہماک سے ڈاکٹر شاہ جی، بخت خان اور امیر نواز کی باتیں سن رہے تھے۔

چائے کا دوسرا دور چلا۔ کھالے نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے عاشی کی مزار پر آمد، جیت شاہ سے ملاقات اور میری حاصل کردہ معلومات کا قضیہ اپنے انداز میں پیش کردیا۔

ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے ستائش بھری نگاہوں سے دیکھا کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ عاشی پر اَب کوئی جن بھوت عاشق ہوگا اور اُسے دورے پڑنے لگیں گے۔ وہ اپنے بڑوں کی حکم عدولیاں کرے گی، اُلٹی سیدھی باتیں کرے گی اور جیت شاہ کے کارندے بڑے مشاقانہ انداز میں عاشی کے بڑوں تک بات پہنچائیں گے کہ اس کا علاج محض دل جیت شاہ کے پاس ہے۔ عاشی کی نگرانی بھی ہمیں شاہ سائیں تک پہنچنے میں خاصی معاون ثابت ہوسکتی ہے۔''

سبھی نے تائید کی۔ بخت خان بولا۔ ''کیا جنوں بھوتوں کی کہانیوں میں کچھ بھی صداقت نہیں ہے؟''

ڈاکٹر شاہ جی نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''جو لوگ جنوں کی عمل داری کو مانتے ہیں، وہ بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، بہت سے واقعات کو دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں مگر اُن کے ہاں منطقی اور سائنسی رویوں کا فقدان پایا جاتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جن خدا کی مخلوق تو ہیں مگر وہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے کی قدرت نہیں رکھتے وہ بڑی مضبوط اور نہ جھٹلائی جانے والی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔''

امیر نواز متجسس ہوا۔ ''مثلاً؟''

''وہ کہتے ہیں کہ جن علاقوں تک پیروں کی پہنچ نہیں ہوئی، وہاں کبھی کوئی لڑکی جنوں کے زیرِ اثر نہیں آئی۔ یورپ سمیت دُنیا کا نسبتاً بڑا حصہ اِس کی مثال ہے۔ یہ لوگ کوہِ قاف کو جنوں، پریوں اور دیوزادوں کا مرکز بیان کرتے ہیں مگر وہاں ایسا کوئی مظہر آج تک سامنے نہیں آیا۔ ترقی یافتہ شہروں کی خوب صورت اور نازک اندام لڑکیوں تک بھی جنوں کی رسائی دیکھنے میں نہیں آتی پھر کوئی وجہ بھی تو سامنے نہیں آتی کہ آخر دیہاتوں پر ہی یہ نادیدہ مخلوق حملہ آور کیوں ہے؟'' ڈاکٹر شاہ جی کے لہجے سے تاسف کا دبیز تاثر عیاں تھا۔

''رائی ہو تو اُس کو پہاڑ بنایا جاتا ہے۔ آخر کسی نہ کسی حد تک تو......'' بخت خان نے کہا۔

''ان لوگوں کی کچھ پیشن گوئیاں سچ بھی تو ثابت ہوتی رہتی ہیں، یہ کیا ہے؟'' دیوانے نے اپنا حصہ ڈالا۔

''جوا دو آدمیوں کے درمیان کھیلا جائے تو ایک کی جیت یقینی ہوتی ہے۔ فرض کیا کہ کسی عورت کو جیت شاہ پھونک مارتا ہے اور دعویٰ کرتا کہ اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوگا تو دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ بچہ پیدا ہوگا یا نہیں پیدا ہوگا۔ اگر پیدا ہوتا ہے تو جیت شاہ کی بلے بلے ہوجائے گی۔ لوگ اس کے دعوے کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں گے اور اگر نہیں پیدا ہوگا تو بات دَب جائے گی اور قسمت کو موردِ الزام ٹھہرا دیا جائے گا۔ جیت شاہ مزید انتظار کرنے کا مشورہ دیتا رہے گا۔ سمجھاتا رہے کہ اَبھی کچھ دیر ہے، اندھیر میری دُعا سے ٹل جائے گا۔'' ڈاکٹر شاہ جی نے قدرے کھل کر کہا۔

کھالا استعجاب آمیز آواز میں بولا۔ ''تو کیا ان لوگوں کی دعا سیدھی عرش پر نہیں جاتی؟''

''ہر دعا عرش پر جاتی ہے۔ خدا ہر کسی کی سنتا ہے۔ وہ ہر

ایک سے محبت کرتا ہے۔"

"مگر جو اُس کے پیارے ہوتے ہیں، ان کی جلد مراد پوری ہوجاتی ہے۔"

"کون اُس کا پیارا ہے؟ یہ تعین ہم کیسے کرسکتے ہیں؟"

"نشانیاں دیکھ کر..... آخر خدا بھی تو اپنی نشانیوں سے ہی دکھائی دیتا ہے ناں!" میں نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے مگر نشانیوں کو ہمیشہ آنکھوں پر عقیدت کی پٹی باندھے بغیر دیکھا جائے تو سب کچھ واضح ہوجاتا ہے۔ خدا نے اپنی جو نشانیاں بیان کی ہیں، وہ سائنس، منطق اور ذہنی استدلال پر پوری اترتی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ماورائی یا غیر فطری نہیں ہے۔ یہاں جن نشانیوں کو بیان کیا جاتا ہے، جن کراماتوں کا ذکر کیا جاتا ہے، اُنہیں عقیدت بھرا دل تو قبول کرلیتا ہے مگر وہ کسی بھی پیمانے پر، کسی بھی کسوٹی پر اپنی سچائی ثابت نہیں کرسکتیں۔ میں نے دل جیت شاہ کو دیکھا ہے۔ مجھے اُس میں کوئی بھی ایسی نشانی دکھائی نہیں دی جو اُس کا اللہ سے قرب کا رشتہ آشکار کرتی ہو۔"

بہت دیر تک ڈاکٹر شاہ جی نے اِس موضوع پر ہمارے سوالوں کے جواب دیے اور ہمیں اَز حد مطمئن کیا۔ پھر یہ طے پایا کہ میں عاشی کی جبکہ کھالا اور امیر نواز جیت شاہ کی خفیہ نگرانی کریں گے۔ دیوانے کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات میں آنے والوں کو گھیرنے کا پلان ترتیب دے گا۔ اُسے تفویض کیا گیا کام مشکل تھا مگر بخت خان کو اُس کی ذہانت پر بھروسا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی معترض تھا کہ جب تک رات کی تاریکی میں آنے والوں کے عزائم کا علم نہ ہو، اُن کے طریقِ کار سے آگہی نہ ہو، تب تک اُنہیں گھیرنا کسی بھی لحاظ سے سودمند اور مناسب نہیں ہوگا۔ کمزوری مزاحمت کے بعد اُس کی بات مان لی گئی۔

بخت خان نے حویلی کے بیرونی دروازے پر سب کو الوداع کہا۔ مجھے روک لیا۔ کہنے لگا۔ "شہرے خان! ملکہ بی بی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

میں نے ملکہ کی تعلیمی استعداد کے بارے میں بتایا۔ مطمئن ہوکر اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر مجھے تھما دیے، بولا۔ "یہ رہی تمہاری ٹیوشن فیس..... مجھے تمہاری صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔"

میں نے غیر ارادی طور پر نوٹ گنے۔ سو روپے والے نوٹوں کی تعداد دس تھی۔

میں نے تعجب سے کہا۔ "مگر خان جی! یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "میں کسی بے گانے کو نہیں، اپنے پتر کو دے رہا ہوں اور دیگی پتر کو دی جانے والی رقم کم یا زیادہ نہیں ہوتی۔"

میں نے پس و پیش کیا مگر اُس نے میری ایک نہیں چلنے دی بلکہ میرے ہاتھ سے نوٹ لے کر میری جیب میں ڈال دیے۔ کاشت کاری کے بعد یہ میری زندگی کی پہلی کمائی تھی۔ میں نے نوٹ چاچی کے ہاتھ پر جا رکھے۔ اُس کے پوچھنے پر میں نے اُسے بتایا کہ یہ رقم بخت خان نے مجھے ملکہ کو پڑھانے کی اُجرت کے طور پر دیے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئی۔

پھر اچانک، کچھ سوچ کر، اُس نے نوٹ میری طرف بڑھائے، بولی۔ "شہرے پتر! تیری پہلی کمائی پر میرا حق نہیں بنتا، جاؤ، اپنی بہن کے ہاتھ پر رکھو۔"

میں ہچکچایا۔ فرزانہ اور شانو نے بھی اپنی ماں کی تائید کی۔ بادلِ ناخواستہ میں نے نوٹ لے کر پروین کی کھلی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ ہولے ہولے لرز رہا تھا، آنکھوں میں نمی تیر گئی اور لبوں پر کوئی بے صدا دُعا مچل گئی۔ مٹھی بھینچ کر چند ثانیوں تک مجھے وارفتگی کے عالم میں دیکھتی رہی پھر 'بھائی' کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ پگلی خوشی کے عالم میں بھی رو رہی تھی۔ وہ لمحہ بڑا عجیب تھا کہ میرے اندر دیوانہ وار پدرانہ جذبات کو نمود دینے لگا تھا اور میرے بدن میں وہ طاقت بھر رہا تھا جو کسی بھی انسان کو مقدس بار اُٹھانے والا 'بھرا' بنا دیتی ہے۔ میں نے اُس کی پیشانی کو چوما، زُلفوں پر ہاتھ پھیرا اور دِلاسا دیا۔

اُس نے آدھے نوٹ میری جیب میں ڈال دیے، آدھے چاچی کی اجازت سے اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ لیے اور بھاگتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔

کھانا کھانے کے بعد میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلا۔ بغیر سوچے سمجھے میں نے کھال والے راستے کے بجائے گلی کا راستہ لیا۔ بخت خان کی حویلی والے چوک میں شفیع محمد کی دیوار کے پاس پہنچا ہی تھا کہ زیناں کی مدھم سی پکار سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا، گلی کی نکڑ میں کھڑی دکھائی دی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے بلائے جانے کا مقصد پوچھا۔ اُس نے، جواب دیے بغیر قریب آکر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُس کے ہاتھ میں تہہ کیا ہوا سفید کاغذ دبا ہوا تھا۔ مجھے یاد آگیا، اُس نے وعدہ لیا تھا کہ میں اُس کا خط ڈاکٹر شاہ جی تک پہنچاؤں گا۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ عافیت تھی کہ کوئی دیکھنے والا نہیں

تھا۔ یہ عجلت رقعہ تھاما اور بغیر کچھ کہے پلٹ کر تیز تیز چلتا ہوا اُس سے دور ہوگیا۔ میرا ارادہ بغیر کہیں رُکے ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کا تھا مگر خط جیب میں ڈالتے ہی دل میں اُسے پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ یہ جانتے ہوئے کہ کسی کا خط پڑھنا غیر اخلاقی حرکت ہے اور اِس خط میں ماسوائے عشقیہ التجاؤں کے کچھ بھی ہونا متوقع نہیں تھا، میں اسے پڑھنے کی خواہش پر قابو نہ پا سکا اور کھالے کے گھر پہنچ گیا۔ کھالا اپنے کمرے میں موجود تھا۔ شکر ہوا کہ خالدہ سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔

میں نے لالٹین کی روشنی میں خط پڑھا۔ خط میں وہ تمام لذتیں، اظہار کی تمازتیں اور وصل کی التجائیں موجود تھیں جو محبوب کی بے پروائی اور بے نیازی سے دل برداشتہ ہو کر کی جاتی ہیں۔ اپنی قلبی بے چینی کو عیاں کرنے کے بعد اُس نے لکھا تھا۔ ''آپ نے کہا تھا کہ انسان کو جس منزل کی طلب ہو، اُسے پانے کے لیے اُسے اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ میں نے آپ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کی اور پہلے قدم پر ہی ٹھوکر کھائی۔ آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ناکامیاں کبھی حتمی نہیں ہوتیں، جزوی ہوتی ہیں اور ایک بڑی کامیابی کو جنم دیتی ہیں۔ میں بھی اُس گھڑی کی منتظر ہوں جب میری طلب میں حائل ناکامیاں کسی بڑی اور معتبر کامیابی کو جنم دیں گی اور آپ میرے وجود کو اپنی زندگی کا جزو بنانے پر رضامند ہو جائیں گے.....''

اُس کے باپ نے ہزاروں طالبوں کو علم دیا تھا۔ وہ ایک مطلوب کو پڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے خوابوں کی تعبیریں کاغذ میں لپیٹ کر ڈاکٹر شاہ جی کی طرف روانہ کی تھیں۔ اَب اپنے بستر میں لیٹی خوابوں کی نئی بنت سے الجھ رہی ہوگی۔ چشمِ تصور میں اپنے محبوب کو خط پڑھتے اور سر تسلیم خم کرتے دیکھ رہی ہوگی مگر مجھے یقین تھا کہ اُس کی ہر التجا درقبول سے سر ٹکرا کر مایوس پلٹے گی۔ وہ ایک پتھر سے اُوس میں بھیگی پتیوں سے بھی نرم جذبات کا لمس مانگ رہی تھی جو سوائے احمقانہ خواہش کے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

میں نے کھالے کے شدید اصرار پر خط کے چند منتخب اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ وہ سنتا رہا، سر دھنتا رہا پھر انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے مخصوص اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یار شہرے! ایک دم زبردست کُڑی ہے یہ زیناں..... کیا پٹاخہ قسم کا خط لکھا ہے اُس نے۔ تم نے ایسا ہی جاندار خط مجھے لکھ کر دینا ہے جو میں اسما کو دے کر آؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''فکر نہ کر اُستاد کھالے! تمہیں تو اپنے خالص بی پازیٹو خون کے ساتھ خط لکھ کر دوں گا جو آنکھوں کے راستے اُس کے دل میں اُتر کر پورے جسم میں پھیل جائے گا۔''

وہ متشکر نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا پھر اچانک دانت پیس کر بولا۔ ''مگر میرے خون کا گروپ تو بی پازیٹو نہیں ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ تمہارے جیسے عاقبت نااندیش عاشقوں کے خون کا گروپ بدلتا رہتا ہے۔'' میں ہنسا۔

''کب بدلتا ہے؟'' وہ جز بز ہوا۔

''جب محبوبہ بدلتی ہے۔''

چند ساعتوں تک مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر پٹڑی بدل گیا، بولا۔ ''مجھے تو زیناں بے چاری پر ترس آ رہا ہے۔ اُسے بھرے پُرے نور پور میں کوئی بانکا پسند ہی نہیں آیا۔''

''تو کیا تمہیں خط لکھتی؟'' میں نے گھورا۔

''کیا میں انسان نہیں ہوں، بانکا سجیلا جوان نہیں ہوں؟''

''تم میں یہ خوبیاں سو جود نہیں ہیں۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ توقف کے بعد بولا۔ ''افسوس! اُس بیوقوف نے اگر دل لگانے کا ارادہ کیا بھی تو کس سے؟ جس کو شاید اُس کی ماں نے بھی پیار سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا خیال ہے؟''

میں نے ڈانٹا۔ ''بکواس نہ کیا کرو۔ تم نہیں جانتے کہ ڈاکٹر شاہ جی کتنا عظیم شخص ہے۔''

''ہونہہ! عظیم وزیم کچھ نہیں..... بس مغرور اور عقل سے فارغ انسان ہے۔ وہ زیناں جیسی خوب صورت اور سمجھ دار لڑکی کے قابل ہی نہیں ہے مگر اُسے دیکھو! وہ خود کو دُنیا سے بلند تر خیال کرتا ہے۔ واہ!'' وہ استہزائیہ انداز میں ہاتھ نچا کر بولا۔

میں مسکرایا۔ ''اُس کا خیال غلط بھی تو نہیں ہے۔''

اس کی شکل سے عیاں تھا کہ اُس نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا مگر خاموش رہا۔ پھر جماہیاں لینے لگا۔

میں اُس کے گھر سے نکل کر ڈاکٹر شاہ جی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک دم چونک گیا۔ اپنی جھولی میں پھیلی ہوئی تصاویر کو بجلی کی سرعت کے ساتھ سمیٹنے لگا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اُس کی غیر معمولی عجلت کے باوجود اُس کے قریب پہنچ جاؤں گا اِس لیے اُس نے مجھے دیکھتے ہی کچن میں جانے اور چائے بنا کر لانے کا حکم صادر کر دیا۔ میں نے ایک نظر اُس کے ہاتھوں میں دبی تصاویر کو دیکھا۔ عام نوع کی، چھ ضرب چار انچ سائز کی چند تصویریں تھیں جن کی تعداد

میرے اندازے کے مطابق دس کے لگ بھگ تھی۔

میں پلٹ کر کچن میں چلا گیا۔ چائے بنا کر لایا، پیش کی، پھر پوچھا۔ ''شاہ جی! کس کی تصویریں دیکھ رہے تھے آپ؟''

''یہ میرے بچپن کی چند تصویریں تھیں جنہیں میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ کبھی جی چاہے تو اپنے بچپن میں جھانک لیتا ہوں۔'' اُس نے کہا۔

''آپ تو پلٹ کر دیکھنے کو حماقت قرار دیتے ہیں۔''

''حماقت غیر انسانی عمل تو نہیں ہے۔''

''کیا آپ اپنا بچپن مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں!'' اُس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ''تصویریں میرے کسی راز کو آشکار نہیں کرتیں مگر میں پھر بھی انہیں دُنیا سے چھپا کر، تنہائی میں بیٹھ کر دیکھنے کا خواہاں ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''میں بھی ایک راز آپ کے لیے اُٹھا لایا ہوں۔''

میں نے جیب میں سے تہ کیا ہوا محبت نامہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''یہ لیجیے! ملاحظہ کیجیے۔''

وہ چند لمحے الجھی الجھی نگاہوں سے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا رہا، پھر ہاتھ بڑھائے بغیر بولا۔ ''یہ گیا ہے؟''

''میں آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''پھر بھی!''

''اٹھا کر دیکھ لیجیے۔''

اُس نے ایک شکوہ بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور خط اُٹھا لیا۔ کھول کر پڑھا۔ میری متجسس آنکھیں اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پر جمی ہوئی تھیں۔ جوں جوں پڑھتا جاتا تھا، رنگ بدلتا جاتا تھا۔ کبھی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کی بساط بچھ جاتی، کبھی ہونٹ بھنچ جاتے تو کبھی ایک زہر خندی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر تیرنے لگتی۔ اُس نے خط پڑھنے کے بعد احتیاط کے ساتھ تہ کیا اور جیب میں ڈال لیا۔ میرا قیاس غلط ثابت ہوا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ خط پڑھتے ہی پھاڑ کر پھینک دے گا اور مجھے ڈانٹے گا۔ مجھے اُس کے چہرے پر ایسے کے آثار دکھائی نہیں دیے تو مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ ''شاہ جی! کیا لکھا ہے اُس نے؟''

وہی سفاک اور زہر میں بجھی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر ناچنے لگی، بولا۔ ''شہریارا تمہاری پھوپی تمہیں کیا لکھتی ہے؟''

میں ایک ذرا ٹھٹک گیا۔ جھینپ کر بولا۔ ''وہ تو بس یونہی.....''

''ہاں! زیناں نے بھی بس ایسے ہی الٹی سیدھی باتیں لکھ بھیجی ہیں، کوئی کام کی بات نہیں ہے اِس میں۔''

''کچھ تو لکھا ہی ہوگا؟''

''کیا تم نے یہ تحریر بغیر پڑھے مجھ تک پہنچائی ہے؟'' میرے سوال پر توجہ دیے بغیر اُس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

میں گڑبڑا گیا۔

وہ میری نگاہوں کی چوری کو پکڑ چکا تھا، بولا۔ ''شہریارا! بعض جھوٹ بے مقصد نہیں ہوتے۔ یقیناً تم نے خط پڑھ لیا تھا۔ مجھ سے میرا ردِعمل دریافت کرنے کے لیے پوچھ رہے تھے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ بتاؤں تمہیں، کیا لکھا ہے؟ اِس میں لکھا ہے کہ اُس نے مجھے اپنا سب کچھ مان لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نہیں جانتی کہ 'سب کچھ' کسے کہتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ محبت کا رُکھ آبیاری کا مسلسل عمل مانگتا ہے۔ خالی بالٹی کو دیکھ کر جڑیں مایوس ہو جاتی ہیں، پیڑ سوکھ جاتا ہے۔ ہاں! وہ بے چاری تو یہ بھی نہیں جانتی کہ جب پیڑ سوکھ جائے تو کیا ہوتا ہے؟..... چھاؤں روٹھ جاتی ہے۔''

اُس کا لہجہ دم بہ دم تغیر پذیر تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ''اُس نے سوچ رکھا ہے کہ محبت ملاقاتوں، جذبوں کے تبادلے اور چوری چھپے دیکھنے دکھانے کے سادہ سے عمل کا نام ہے۔ میں اُس کے نزدیک تنہائی کا مارا ہوا شخص ہوں، محبت سے محروم رہا ہوں اور مجھے چاہنے والے کسی وجود کی اشد ضرورت ہے۔ وہ ہرگز نہیں جانتی کہ میرے ہاتھوں میں تھامی ہوئی بالٹی پانی سے محروم ہے۔ میں تھکا ہارا انسان ہوں۔ مجھے چھاؤں دینے والا شجر جب میرا اب نہیں ہو پائے گا، تب سوکھ جائے گا اور پھر میں جو چھاؤں کا عادی ہو چکا ہوں گا، دھوپ میں جلنے لگوں گا۔ تب میرا کیا بنے گا؟ نہیں..... میں محروم ہوں، ٹھیک ہوں۔ مایوسی کا شکار ہو کر زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ تم اُسے کہہ دینا، مجھے دوسرا خط نہ لکھے۔ مانتا ہوں کہ منہ زور عمر میں ایسے الفاظ تراشنا ناگزیر ہوتا ہے مگر وہ اُسے لکھے جو زندگی کا طلب گار ہو اور جسے سایہ کشا زُلف درکار ہو۔''

وہ شعلہ گماں تھا، جل بجھا اور راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ اُسے بکھرا ہوا دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کی آنکھیں بجھ سی گئی تھیں۔ اک نئے روپ میں میرے سامنے کھل گیا تھا۔ میں نے اُسے کبھی اتنا دل گرفتہ اور نڈھال نہیں دیکھا تھا۔ سر جھکائے، بہت دیر تک گم صم بیٹھا غیر محسوس آہیں بھرتا رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں چائے کے دوسرے کپ کا متقاضی ہو گیا۔ میں اُسے تنہا چھوڑ کر کچن میں چلا آیا۔

واپس کمرے میں آیا تو اُسے پہلی سی حالت میں افسردہ

دیکھا۔ میں نے چائے پیش کی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا، میں اُسے دیکھتا رہا پھر کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ اُسے سنبھلنے میں کچھ وقت درکار تھا۔ آج پہلی مرتبہ میں نے اُسے عام انسان کے رُوپ میں دیکھا تھا اور سمجھ میں آیا تھا کہ اُس پر دُکھ، عشق اور جذبے اپنے گہرے اثرات چھوڑتے ہیں وگرنہ میں اُسے آج تک پتھر دل سمجھتا آیا تھا۔ وہ نامساعد حالات سے گھبراتا تھا، دل پر ہونے والی دستک پر مضطرب ہوتا تھا مگر اُس کے پاس اپنے تاثرات چھپانے کا ہنر موجود تھا۔

میں ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی سے نکل کر گھر روانہ ہوا۔ اپنی گلی سے گزرتے ہوئے اچانک زیناں، عاشی اور ملکہ کے چہرے میری نظروں میں لہرا گئے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اُن کی بے طرح کی یادداشتوں نے مجھ پر حملہ کیوں کیا؟ سمجھ نہ آیا۔ ایسی باتیں سمجھنے اور سمجھانے کی نہیں ہوتیں مگر مجھے بھی میرے دل نے جتلایا کہ میں کافی دنوں سے اپنی عزیز از جان غزالہ کو فراموش کیے ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر شاہ جی نے کہا تھا کہ عشق ایسا رُکھ ہے جو سدا بہار آبیاری مانگتا ہے۔ میرے پیڑ کی جڑوں کی مٹی بے آب و گیاہ ہونے لگی تھی۔ میں غیر معتدل دھڑکنوں کو پہلو میں سنبھالے ہوئے پھوپی کبریٰ کے دروازے کے سامنے رُک گیا۔

چوبی دروازے کی درزوں سے جھانکا۔ صحن میں لالٹین کی متحرک روشنی تھرک رہی تھی۔ کوئی لالٹین اُٹھائے صحن میں چل پھر رہا تھا۔ میں اِس انتظار میں کچھ دیر کھڑا رہا کہ لالٹین بردار سامنے آئے گی مگر وہ پھوپی کبریٰ تھی یا غزالہ، کمروں کی اوٹ میں ہی رہی۔ میں نے دروازے کو آہستگی سے دھکیل کر دیکھا۔ دروازے کی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ دونوں طاقوں کے بیچ میں ہاتھ ڈالا اور اپنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے چٹخنی کھول دی۔ دَبے پاؤں کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا نکڑ تک آیا۔ سر نکال کر صحن میں دیکھا۔ دل بلیوں اچھل پڑا۔ وہ غزالہ ہی تھی جو ایک ہاتھ میں لالٹین جبکہ دوسرے ہاتھ میں برتن پکڑے چولھے سے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے ہلکی آواز میں سیٹی بجا کر اُسے متوجہ کیا۔ وہ ٹھٹک کر دیکھنے لگی۔ پہچان کر اٹھلاتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔ کچھ ہی دیر بعد لہراتی ہوئی کمرے سے برآمد ہوئی اور سیدھی میری طرف چلی آئی۔

ایک سرگوشی فضا میں سرسرائی۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اماں جاگ رہی ہے، دیکھ لے گی تو میری شامت آجائے گی۔“

”دیکھنے کو جی چاہا، چلا آیا۔ کہتی ہو تو واپس چلا جاتا ہوں۔“ میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

”مجھے دیکھ لیا ہے، اَب جاؤ ورنہ اماں.....“

میں نے اُسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ ڈگمگائی اور سنبھلنے کی کوشش میں مجھ سے آن ٹکرائی۔

میں نے اُسے بانہوں میں جکڑتے ہوئے کہا۔ ”تم نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو؟ میں تمہیں دیکھنے اور ملنے کے لیے آیا ہوں، تمہاری دھمکیاں سننے نہیں آیا۔ بتاؤ! پھوپی کس کمرے میں ہے؟“

اُس نے اپنا چہرہ میری چھاتی میں چھپا لیا اور ہاتھ کے اشارے سے کمرے کی نشان دہی کی۔ لالٹین کی ناکافی روشنی میں اُس کا حسن دکھائی نہیں دیتا تھا مگر بھائی دیتا تھا۔ میں چند لمحوں میں ہی بے خود ہونے لگا۔ خالدہ نے غزالہ کے بدن کو بولنا نہیں سکھایا تھا مگر مجھے سننا سمجھا دیا تھا۔ اُس کا بدن آنِ واحد میں زبان بن گیا، میرا پورا وجود کان بن کر جوانی کے پھوٹتے نغموں کی تال پر دھڑکنے لگا۔

ایسے میں وہ کراہی۔ ”اے! چھوڑو، مجھے کچھ کچھ ہو رہا ہے۔“

میں نے اُس کی زلفوں کو لبوں سے پرے ہٹا کر کان میں سرگوشی کی۔ ”پہلے بتاؤ، کیا ’کچھ کچھ‘ ہوتا ہے، پھر چھوڑوں گا۔“

”مجھے نہیں پتا..... اَب چھوڑو بھی ورنہ میں اماں کو آواز دے کر بلا لوں گی۔“ اس کی آواز مرتعش تھی۔

”بھلے بلا لو، میں کوئی ڈرتا ہوں اُس سے۔ تم میری منگیتر ہو۔ عن قریب بیوی بن جاؤ گی۔ پورا نور پور جانتا ہے۔“

”جب بیوی بنوں گی تب دیکھا جائے گا، اَبھی تو میری جان چھوڑو ناں!“ وہ کسمسائی۔

”چھوڑ دوں؟“

”ہاں تو!“

”دل سے کہو تو اَبھی چھوڑ دوں گا۔“

وہ کہنا چاہتی تھی مگر دل آڑے آیا۔ زبان پکڑی گئی۔

”بولو ناں!“

حسن کے دربار میں میری وارفتگی کی گستاخیاں برابر بڑھتی جا رہی تھیں اور اُس کی برائے نام مزاحمت بھی دَم توڑتی جاتی تھی۔ گزرنے کو تو شاید پانچ دس منٹ گزر گئے تھے مگر یوں لگا جیسے وقت نے محض چند پلکیں ہی جھپکائی تھیں کہ پھوپی کبریٰ کی تیز آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ ”اے کرماں ماری! کہاں مر گئی ہو، جاتی ہو تو واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتی ہو۔“

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مجھ سے علیحدہ ہوئی۔ پھولی ہوئی

سانسوں کے درمیان بولی۔ ”اس سے پہلے کہ اماں بے نقط سناتی ہوئی کمرے سے نکل آئے اور تمہاری شامت آجائے، فوراً چلے جاؤ۔“

میں نے اُس کی بانہہ پکڑنا چاہی مگر وہ میرا ارادہ بھانپ کر لہراتی ہوئی دہلیز سے نکل گئی۔ صحن کے وسط میں پہنچ کر پلٹی اور ہاتھ لہراتے ہوئے جانے کا اشارہ کرنے لگی۔ وہ میرے اور اپنی ماں کے بیچ میں حائل کھڑی تھی۔ ماں اپنی جانب بلا رہی تھی۔

ایسے میں ماں کی طرف منہ کر کے بولی۔ ”آ رہی ہوں اماں! سانس تو لے لیا کرو۔ میں چولھے سے راکھ نکال رہی ہوں۔“

پھر میری طرف منہ کر کے اونچی آواز میں بولی۔ ”کیا پتا تھا، راکھ میں انگارے دَبے ہوں گے۔ ہاتھ کیا جلے، یوں لگتا ہے جیسے پورے جسم میں آگ جل اُٹھی ہو۔“

میرے لبوں پر زندگی ایک مسکراہٹ بن کر دم بھر کو اُبھری، پھر دل تک چلی گئی۔ میں نے ہاتھ لہرا کر باہر کا قصد کیا۔ اَبھی لعل خان کے دروازے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ اپنے عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ مجھے گھر پہنچنے میں بہت دیر ہو گئی تھی اور چوروں کی طرح دیوار پھلانگنا ضروری ہو گیا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں شب کے پچھلے پہر میں گھر کی عقبی کھڑکی سے نکل کر جیت شاہ کے مزار کی طرف جاؤں گا اور سن گن لینے کی کوشش کروں گا مگر سویا تو پھر علی الصباح آنکھ کھلی۔ میں کمرے میں ہی نماز پڑھنے کا عادی تھا مگر اس دن میں سائیں جیت شاہ کے مزار کی طرف جا نکلا۔ ایسے ہی وقت میں مسجد کے اسپیکروں سے اذان کی صدا آئی۔ میں نے ٹینکی کے یخ بستہ پانی سے وضو گیا، مزار کے بائیں پہلو میں صحن کو ’صافے‘ کی مدد سے جھاڑ کر نماز پڑھنے کے لیے جگہ بنائی اور خدا کے حضور سربسجود ہو گیا۔

دعا مانگنے کے بعد مزار کے احاطے کا کھوجتی نظروں سے جائزہ لیا۔ یہاں کے باسیوں کی اَبھی آنکھ نہیں کھلی تھی، صبح نہیں ہوئی تھی۔ سائیں دل جیت شاہ کی رہائش گاہ میں زندگی کی علامتیں ندارد تھیں۔ میں ٹہلتے ہوئے مشرقی دیوار تک گیا، پارکنگ کا سرسری انداز میں جائزہ لینے کے بعد پلٹ کر مغربی دیوار تک چلا گیا۔ دیوار کے پار جنگل میں جھانکا۔ پرندوں کو صبح کی خبر ہو گئی تھی۔ چہکاروں نے ماحول میں موسیقی بکھیر دی تھی۔ کافی دیر تک دیوار کی منڈیر پر ٹھوڑی ٹکائے درختوں کے بیچ نظریں جمائے کھڑا رہا۔ کوئی حرکت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ تھک کر پلٹا، سائیں کی رہائش گاہ کو خوابیدہ پایا تو سوچ میں پڑ گیا۔

ڈاکٹر شاہ جی نے گزشتہ شام کو ہمیں مخاطب کر کے کہا تھا کہ نشانیوں کو کھلی آنکھ سے دیکھنا اور ٹٹولنا پڑتا ہے۔ ہرے شیشوں والی عینک کے پار ہر طرف ہرا ہرا ہی دکھائی دیتا ہے۔ صبح کی روئیدگی نے اُس گھڑی میری آنکھوں کو تازہ دَم رکھا تھا اور میری آنکھوں پر کوئی پٹی بندھی ہوئی نہیں تھی۔ یعنی میں منظر کے قلب میں پیوست سچائی تک پہنچنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

میں سائیں کی رہائش گاہ کی بیرونی دیوار تک گیا۔ کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ نور پور کے تمام گھروں سے اِس وقت جھاڑو پھیرنے سے پیدا ہونے والی مخصوص آواز برآمد ہوتی تھی۔ عورتیں نماز سے فارغ ہوتے ہی صحن کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ دل جیت شاہ کی دو بیویاں تھیں۔ اندازے کے مطابق ایک دو نوکرانیاں بھی ضرور موجود ہوں گی مگر تا حال گھر سے جھاڑو کی مخصوص سرسراہٹ، برتنوں کی جھنکار، نلکے کا شور، بچوں کی چہکاریں..... کچھ بھی تو سنائی نہیں دیتا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی ٹھیک کہتا تھا۔ نشانیاں دیکھنے سے دکھائی دیتی ہیں۔ لوگوں کو علی الصباح جاگنے اور نماز پڑھنے کی تلقین کرنے والا خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہا تھا۔ وہ راستہ دکھاتا تھا مگر خود اُس راستے کے برابر اپنا راستہ بنا کر چلتا تھا۔

میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ نور پور کے بڑے کہتے تھے کہ سائیں جگ جیت شاہ دریائے سندھ کے پار سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔ اُس نے اپنی نور پور کی زندگی نہایت عسرت اور مشقت میں گزاری تھی۔ ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا، محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ تب نور پور کی مسجد ایسی نہیں تھی۔ چکنی مٹی کی چار دیواری میں گھرا ہوا بے چھت احاطہ مسجد کہلاتا تھا جس میں سب سے پہلی صف سائیں جگ جیت نے کہیں سے لا کر بچھائی تھی۔ وہ اِس صحن کی صفائی کرنے کے بعد فجر کی اذان دیا کرتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اسپیکر کے بغیر ہی اُس کی جاندار اور دل کش آواز ساتھ کے دیہاتوں تک پہنچا کرتی تھی۔ وہ امامت کی سعادت بھی باقاعدگی سے حاصل کرتا تھا۔

اُس نے علم کی شمع روشن کر رکھی تھی۔ علی الصباح گاؤں کے تمام بچے اُس کے پاس قرآن پاک کا سبق لینے آیا کرتے تھے۔ سہ پہر میں وہ پھر سب کو بلوا لیا کرتا تھا۔ سائیں جگ جیت شاہ کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ اُس نے اپنی زندگی میں کسی سے نقد رقم کا تحفہ یا نذرانہ قبول نہیں کیا تھا۔

اُس کی بیوی کے پاس نور پور کی لڑکیاں اور عورتیں پڑھا کرتی تھیں۔ وہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ کڑھائی سلائی کا کام بھی کرتی تھی۔ اِسی جگہ پر، جہاں جگ جیت شاہ کا مزار سر

اُٹھائے کھڑا تھا، دونوں میاں بیوی ایک کچے کمرے میں سر جھکائے کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک ہی بیٹا تھا، دل جیت جسے سائیں جگ جیت نے بڑی محنت سے پڑھایا۔ چوک قریشی کے سرکاری اسکول میں اُسے چھوڑنے جاتا اور خود سارا دن وہاں پلے داری کرتا۔ جب دل جیت کو چھٹی ہوتی، وہ اُسے سائیکل پر بٹھا کر نور پور لے آتا۔

سائیں جگ جیت شاہ کی آخر دم تک معاشی حالت جوں کی توں رہی تھی۔ اُس کے بعد اُس کے بیٹے سائیں دل جیت نے اُس کی کچی قبر پر خانزادوں کی مالی معاونت کے ساتھ عالی شان مقبرے کی تعمیر شروع کر دی۔ مقبرہ، پھر رہائش گاہ، پھر مہمان خانے...... آج دل جیت کے پاس دُنیا کی ہر نعمت موجود تھی مگر مجھے اُس کے ہاں وہ نشانی دکھائی نہیں دی جو اُس کے باپ کی زندگی کے لمحے لمحے سے عیاں تھی۔ جس نشانی کا تذکرہ نور پور کے بڑے بوڑھے کرتے تھے، جن کی آنکھیں کہرے کی ٹھٹھرتی راتوں میں بھی، جب وہ کھیتوں کو پانی لگا کر گھروں کو لوٹ رہے ہوتے تھے، خستہ حال حجرہ نما کمرے میں گھی کے چراغ کی روشنی میں سائیں جگ جیت شاہ کو خدا کے دربار میں جھکا دیکھا کرتی تھیں۔

دل میں شک جاگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دل جیت شاہ بغیر بتی جلائے نماز پڑھ رہا ہو۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پارکنگ ایریا میں آیا۔ دیوار پھاند کر رہائش گاہ کے پچھواڑے پہنچا۔ برساتی پرنالے کی دونوں اینٹوں پر پیر ٹکائے اوپر اُٹھتا گیا۔ چند ہی منٹوں کی مشقت نے مجھے چھت پر پہنچا دیا۔ میں دو کمروں کی چھتوں کے بیچ کی ننھی سی منڈیر پر چلتا ہوا آگے بڑھا تاکہ میرے پیروں کی چاپ سے چھت میں دھمک پیدا نہ ہو۔ صحن کی سمت والی منڈیر کے پاس سینے کے بل لیٹ کر احتیاط سے صحن میں جھانکا۔ صحن سنسان تھا اور سبھی کمروں کے دروازے بند تھے۔ کمروں کی بتیاں بھی گل تھیں۔ اگر کوئی بتی روشن ہوتی تو دروازے کے نچلے حصے کا خلا روشن ہوتا۔

مجھے وہاں لیٹے ہوئے کافی دیر گزر گئی۔ سورج نے اپنا آپ دکھانا شروع کر دیا۔ پورا گاؤں بیدار ہو گیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے دھندوں میں رُجھ گئے تھے لیکن دل جیت شاہ کے گھر کے سبھی دروازے بند تھے۔ میں مایوس ہو کر چھت سے اُترنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شمالی گوشے کا آخری دروازہ کھلا۔ میں محتاط ہو گیا۔ دیکھا، سائیں دل جیت شاہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا انگڑائیاں لے رہا تھا۔ چیک دار دھوتی اور سفید رنگ کی بغیر بازوؤں والی بنیان پہنے وہ بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ جماہیاں لیتے ہوئے، سلیپر کو کاہلانہ انداز میں فرش پر رگیدتے ہوئے سیڑھیوں کی مخالف سمت میں برآمدے کے آخر پر واقع غسل خانے کی طرف بڑھا۔ میں سرک کر پیچھے ہٹا اور جنوبی منڈیر پر سے لٹک کر دیوار کے ساتھ گھسٹتا ہوا زمین پر جا گرا۔

میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ کھلی آنکھوں دیکھ چکا تھا کہ سائیں دل جیت دن چڑھے بیدار ہوا تھا اور اُس نے یقینی طور پر فجر کی نماز ادا نہیں کی تھی۔ یہ اچنبھے کی بات تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی کہتا تھا کہ جو شخص پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اللہ اُس سے ناراض ہوتا ہے، راضی نہیں ہوتا اور وہ جس سے راضی ہوتا ہے، وہ تقویٰ اور عبادت شعاری کو اپنا وتیرہ بنا لیتا ہے۔ اپنے گھر میں بیدار ہونے والا پہلا شخص سائیں تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ گھر میں علی الصباح بیدار ہونے کی روایت سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔

تاخیر کے سبب میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں نہیں جا سکا، اِس لیے کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ زندگی کے معمولات کے ساتھ ساتھ نور پور میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں بھی میرے جلو میں چلی آ رہی تھیں۔ میں سردار حیات خان اور دریام خان کے ڈیروں سے اُٹھ کر بخت خان کی چھتری تلے آن بیٹھا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا چلن دونوں وڈیروں پر سخت گراں گزر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُنہیں اپنے رویے پر بھی پچھتاوے کا احساس ہونے لگا تھا کیونکہ میں دریام خان کی گالیاں اور سردار حیات خان کا طمانچہ رخسار پر وصول کرنے کے بعد دونوں کے پاس ایک بار بھی نہیں گیا تھا۔ میں نے اپنے تئیں یہ طے کر لیا تھا کہ اَب میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ بخت خان، جو میرے سمیت پورے نور پور کی نظروں میں اکھڑ مزاج، بدتمیز اور وکھری ٹائپ کا وڈیرا تھا، ایک نئے روپ میں مجھ پر آشکار ہوا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور خان لوگوں کی نظروں میں اَب بھی پہلے جیسے ہی تھے مگر میں اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ وہ انسانیت کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔

سردار حیات خان کو میرے غیاب کے سبب کچھ مشکلات کا سامنا درپیش تھا۔ میں بغیر تنخواہ کا ملازم تھا جو اُس کے "شعبۂ اکاؤنٹس" کو سنبھالا کرتا تھا۔ اُس کے منشیوں کا ایک طرح کا سپروائزر تھا۔ اَب اُسے وہ سارا حساب کتاب خود کرنا پڑتا تھا جس سے اُس کی اَب تک جان چھوٹی رہی تھی۔ اُس نے ایک دو مرتبہ مجھے بلوایا تھا مگر میں نے بڑے اَدب سے معذرت کر

لی تھی جبکہ دریام خان کا غصہ اَنا کا رُوپ دھار گیا تھا۔ اُس نے مجھے بلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں تاڑ چکا تھا کہ دریام خان، حیات خان اور حیدر خان، تینوں وڈیرے ہی، بخت خان سے بگاڑ پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

مجھے امیر نواز نے ٹیوب ویل کی پختہ حوضی میں نہاتے ہوئے سمجھایا تھا۔ "شہرے خان! بابا بُرا آدمی نہیں ہے۔ چاچا دریام کچھ مختلف سوچ رکھنے والا خان ہے۔ ہاں! چاچا بخت خان تو فرشتہ ہے۔ ہمارا خاندان اُس کی مخالفت محض اُس کے خیالات کی وجہ سے کرتا ہے۔ میں ایسا نہیں کرتا۔ تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ بخت خان کا تھاما ہوا ہاتھ کبھی نہ جھٹکنا۔ وہ تمہیں انسان بنائے گا، چاچا دریام اور چاچا حیدر خان تمہیں بدمعاشی کے راستے پر لے جائیں گے۔ بخت خان تم پر مہربان ہے، بعید نہیں کہ وہ تمہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملتان، لاہور یا کسی بھی بڑے شہر میں بھیج دے۔ دولت کے لحاظ سے وہ نور پور کے دوسرے وڈیروں سے کم تر ہے مگر ہاتھ کا سخی ہے۔"

میں نے اُس کی باتیں پلے سے باندھ لی تھیں۔ امیر نواز کی ایک خوبی مجھے پسند تھی۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ شراب پیتا تھا مگر آپے سے باہر نہیں ہوتا تھا۔ شکل و صورت میں یکتا تھا، جوان جہان تھا مگر نور پور کی کڑیوں پر میلی نگاہ نہیں ڈالتا تھا۔ جوانی کے تیز الاؤ والے شعلوں کے لیے اُس نے نور پور سے دور کئی سرو مور پیچھے بنا رکھے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اپنی موج میں رہنے والا شخص ہے مگر بخت خان نے مجھے اُس کے بارے میں کہا تھا کہ امیر نواز کی جملہ خرابیوں اور خامیوں پر اُس کا انسان دوست رویہ پانی پھیر دیتا ہے۔

کھالے کی ہدایات سے سرفراز ہوتے ہوئے میں نے چوک قریشی پر بہ کثرت جانا شروع کر دیا تھا۔ عاشی کی گلی میں، مین روڈ کی طرف منظور درزی کی دکان تھی۔ وہ اَدھیڑ عمر مگر جواں قلب انسان تھا۔ موسیقی اُس کی کمزوری تھی۔ اُس نے مظفر گڑھ کے کسی کاریگر سے بڑا سا ڈیک (دیسی ساختہ ٹیپ پلیئر) اور دو عدد جہازی سائز کے چوبی دھامے (اسپیکر باکس) بنوا کر دکان میں سجائے ہوئے تھے۔ اُس کے پاس فوک گلوکار عطاء اللہ خان کے اَب تک ریلیز ہونے والے تمام البم موجود تھے جو اُس نے اپنے دائیں ہاتھ پر رکھے ہوئے مقفل چوبی ریک میں ترتیب وار رکھے ہوئے تھے۔ سرائیکی اور اردو گیتوں کا اتنا بڑا ذخیرہ میں نے اور کہیں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے ایک سوٹ سلائی کے لیے دیا اور راہ و رسم پیدا کر لی۔

اُس نے علاقائی رواج کے مطابق مجھ سے میرا شجرہ

... گوشے میں اور ملک ...
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
... ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
... کے لیے 600 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
... ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
... عزیزوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

نسب دریافت کیا۔ وہ میرے باپ کا واقف کار نکلا۔ نور پور کے اکثر بڑوں کو جانتا تھا۔ دُکھ آمیز لہجے میں بولا۔ ''ہائے! کیا جوانی تھی سوہنے خان کی..... پر بھوکی زمین اُسے چاٹ گئی۔ بڑا کرم خون ہوا کرتا تھا اُس کا، اِدھر کوئی بات ہوئی، اُدھر اُس کا ہاتھ گھوم گیا۔ طاقت بھی تو سوہنے رَب نے اُس کے وجود میں بہت بھر رکھی تھی ناں.....''

''کیا وہ تم سے کپڑے سلوایا کرتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کہنے لگا۔ ''سوہنا تو ہر عید پر میرے پاس ہی آیا کرتا تھا۔ بڑا نخرہ تھا اُس کا اُس موئے دیوانے شاعر کے کام سکھنے سے پہلے نور پور کے سبھی لوگ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ اِسی بہانے گاؤں کے حالات کا بھی پتا چلتا رہتا تھا۔ اَب میرے پاس کوئی نہیں آتا۔ بڑے عرصے کے بعد تمہاری شکل دیکھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں بھی اُسی سے کپڑے سلوایا کرتا تھا۔ اب وہ نخرے دکھانے لگا ہے۔''

ماں کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اُس کی اولاد کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ میں نے بھی منظور درزی کے ہنر کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے، اُس کے موسیقی کے شوق کو سراہا اور یوں دوسری ملاقات میں ہی ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔

عاشی کا گھر اُس کی دکان سے تقریباً سو فٹ کے فاصلے پر واقع تھا۔ چوک قریشی چونکہ بڑا شہر نہیں تھا، بلکہ اَبھی پوری طرح قصبہ بھی نہیں بنا تھا اِس لیے منظور درزی یہاں کے باسیوں کو فرداً فرداً جانتا تھا۔ کون کیا کرتا ہے؟ کیسا ہے؟ اُسے کیسا ہونا چاہیے؟ وہ جانتا تھا اور کے ٹو فلٹر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے اظہار بھی کرتا جاتا تھا۔

میں آدھے دن کا بیشتر حصہ اُس کے پاس گزارنے لگا۔ اپنا سوٹ سِل جانے کے بعد بھی دکان پر آمد و رفت کا میں نے جواز یہ پیش کیا تھا کہ مجھے آدھا دن ویگن کے سلسلے میں چوک قریشی میں رہنا پڑتا تھا۔ میں ڈرائیوروں کی صحبت پسند نہیں کرتا تھا اور آوارہ گردی کرنے کے بجائے اُس کے ہاں آ بیٹھتا تھا۔ اُس نے میرے خیالات کی تعریف کی اور کھلے دل سے اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت مرحمت کر دی۔

میں اُس سے عاشی کے خاندانی معاملات پر گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر جھجک آڑے آ جاتی۔ میرا کام وحید نے آسان کر دیا۔ اُس نے گلی میں سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھ کر پہچان لیا۔ 'بھائی جان' کہہ کر مخاطب ہوا اور اپنے گھر لے جانے پر بہ ضد ہوا مگر میں نے اُسے ٹال دیا۔ اُس کے جانے کے بعد منظور نے پوچھا۔ ''تم سجاول کے بیٹے کو جانتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں! اِس محلے میں امجد ڈرائیور کو بھی جانتا ہوں۔ کبھی کبھار اُس کے ہاں آیا کرتا تھا، گلی میں آتے جاتے وحید سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔''

ہم اَبھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ وحید دوبارہ پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی درخواست کا اعادہ کیا۔ میں بہ ظاہر طوعاً و کرہاً اُس کے ساتھ چل پڑا۔ دکان سے نکل کر اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں نے مجھے بلوایا تھا۔

عاشی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا دوسرا اتفاق تھا۔ حسبِ سابق اُس کی ماں چائے بنا لائی۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میرے بیٹے نے جب تمہارے بارے میں بتایا کہ تم بھائی منظور کی دکان پر بیٹھے ہو تو میرے دل میں تم سے ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟''

ہماری ثقافت کا ایک اہم جزو 'حال دینا' ہے۔ ملنے والے اپنے ہر متعلقہ شخص کا فرداً فرداً نام لے کر اُس کا احوال بیان کرتے ہیں۔ اختصار کو بے رُخی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ چونکہ پڑھی لکھی خاتون تھیں، اِس لیے میں نے مختصر طور پر حال بیان کیا۔ اُس سے اُس کے شوہر اور بیٹی کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ بولی۔ ''عاشی کے ابو کو بلب کی روشنی میں الوداع کرتی ہوں، بلب کی روشنی میں خوش آمدید کہتی ہوں۔ رہی عاشی، تو وہ آدھا دن کالج میں گزار کر آتی ہے تو پڑھنے بیٹھ جاتی ہے۔''

وحید بولا۔ ''آپ بھی تو آدھا دن اسکول میں لگا آتی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''عاشی کو پڑھا کر استانی لگوانے کا ارادہ ہے؟''

وہ بولی۔ ''ہاں پتر! ارادہ تو یہی ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ بھی اپنے منہ سر جوگی ہو جائے گی۔''

ہمارا خاندان لڑکیوں کی پڑھائی کو بادلِ ناخواستہ قبول کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ نوکری کا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی کمائی کو بُرا بلکہ حرام خیال کیا جاتا تھا مگر اِس طرف دھیان نہیں جاتا تھا کہ کبھی بالواسطہ طور پر لڑکیوں کی کمائی کھا بھی رہے تھے چونکہ عورتیں اور بچیاں کھیتوں میں باقاعدگی سے جایا کرتی تھیں اور کام کاج میں اپنے گھر کے مردوں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔ اِس طرح وہ گھر میں آنے والی آمدنی کی حصہ دار ہوتی تھیں۔ چارے کی من

ڈیڑھ من کی گٹھڑی سر پر لادنا معیوب خیال نہیں کیا جاتا تھا، دو چار کتابوں اور ایک ہینڈ بیگ کا وزن بُرا سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی عموماً کہا کرتے تھے کہ ہمارے معاشرے میں منافقت اس حد تک رچی بسی ہے کہ اِسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''ہم تو بیٹیوں کی نوکری کو اچھا نہیں سمجھتے خالہ جان!''

وہ ایک ذرا مسکرائی، نرم لہجے میں بولی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو مگر جس چیز کو تم بہ آسانی جھیل سکتے ہو، میں نہیں جھیل سکتی۔ تم یہ گوارا کر لیتے ہو کہ تمہاری بہن یا بیٹی تمام عمر کسی کی غلامی کرتی رہے، دستِ سوال دراز کیے پاکستی کی جانب ایک ٹانگ پر کھڑی رہے، اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے جھڑکیاں سنتی رہے..... جب، اور جس کا جی چاہے، مار پیٹ کر گھر سے نکال دے اور وہ بھائیوں کے در پر، بھابیوں کے رحم و کرم پر بیٹھ جائے، تا عمر آنسو بہاتی رہے، اُس کے فیصلے کیے جائیں اور اُس سے پوچھا تک نہ جائے۔ ہاں! تم لوگ یہ بھی گوارا کر لیتے ہو کہ اپنی اُجڑ کر آئی ہوئی بہن کو اُس کے چار پانچ بچوں سمیت تمام عمر پالتے رہو، اپنی قسمت کو کوستے رہو اور اسے جیتے جی در گور رکھو مگر میں یہ دُکھ نہیں جھیل سکتی۔''

میں متعجب ہوا۔ ''میں سمجھا نہیں خالہ جی!''

وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو گے تو سمجھ میں آ جائے گا۔ میں ایک دوسرے انداز سے بتاتی ہوں۔ وحید کے ابو بہت جذباتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اُنہوں نے کئی سال پہلے، ایک مرتبہ مجھے معمولی جواز پر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اُن کا موقف تھا کہ میں اسکول میں پڑھانے جاتی ہوں۔ لوگ مجھے دیکھتے ہیں۔ عورت، جس کی جوانی کو لوگ آتے جاتے ہوئے دیکھیں، وہ گھر میں رکھے جانے کے قابل نہیں ہوتی۔ یہ وحید کے ابو کا قول تھا۔''

چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''اُس وقت عاشی میری گود میں تھی۔ میں اُسے لے کر اپنے میکے چلی گئی۔ ایک سال وہاں رہی۔ چونکہ میری تنخواہ معقول تھی، میں کسی پر بوجھ نہیں تھی بلکہ میرے والدین کو میرے وہاں رہنے سے مالی معاونت حاصل ہو گئی تھی، اِس لیے مجھے اَکڑ کر بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ وحید کے ابو کی ضد ایک سال میں ہی اپنی موت آپ مر گئی۔ برادری نے منت سماجت کی، بڑوں نے اُنہیں برا بھلا کہا اور میں بڑے ناز نخرے سے واپس اِس گھر میں آئی۔ پھر اُنہیں جرأت نہیں ہوئی کہ مجھ پر ہاتھ اُٹھاتے یا گالی دیتے۔''

میں انہماک سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''عاشی میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اِسے اپنے خون سے پال کر جوان کیا ہے میں نے۔ اس کی پھوپیوں نے آج تک اُنگلی تانے رکھی کہ وہ پڑھ لکھ کر بے حیا ہو جائے گی، پَرلے شہر جا کر آوارہ اور بدچلن ہو جائے گی۔ میں نے ان کے ابو کو باور کرا دیا کہ جو کام بیوی کر سکتی ہے، وہ کام بیٹی بھی کر سکتی ہے۔ وہ مان گئے۔ اَب جب وہ پڑھ لکھ گئی ہے اور اللہ نے چاہا تو عن قریب سی ٹی کر کے کسی سرکاری سکول میں استانی لگ جائے گی تو اُنہی پھوپیوں کی رال ٹپکنے لگی ہے۔ بیٹوں کے لیے رشتہ مانگنے لگی ہیں۔ اُن کا دل بھی بہنوں کے لیے پسیجا ہوا ہے مگر مجھے پروا نہیں.....''

میری تمنا پوری ہو رہی تھی۔ جو میں پوچھنا چاہتا تھا اور پوچھنے سے جھجکتا تھا، وہ اَز خود مجھے بتلا رہی تھی۔ ''اُن کے بھانجے اور بھتیجے اَن پڑھ ہیں یا بہت کم پڑھے ہیں۔ اُن کے رویے بھی میرے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ میں اپنی مرضی کروں گی، کسی باشعور اور سلجھے ہوئے بندے کو اپنی دھی کی بانہہ تھماؤں گی۔''

میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ''ہونا تو پھر یہ چاہیے کہ آپ بھی اپنی مرضی نہ جتائیں بلکہ اپنی بیٹی کو انتخاب کا حق تفویض کریں۔''

وہ جھٹ سے بولی۔ ''کیوں نہیں! میں یقیناً ایسا ہی کروں گی۔ وہ جسے چاہے گی، اگر وہ اُس کے لائق ہو گا میری نظر میں، تو میں اُس کے انتخاب کو قبول کروں گی۔''

''کوئی ایسا سامنے آیا؟''

''نہیں۔ اَبھی وہ پڑھ رہی ہے۔''

دوسری ملاقات میں ہی وحید کا بھرم سے بے تکلف ہونا مجھے بہت اچھا لگا۔ میں جب اُن کے ڈرائنگ روم سے نکل کر منظور درزی کے پاس آیا تو اُس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''بڑی دیر لگا دی جوان! خیر تو تھی؟''

میں نے اُسے مطمئن کیا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے امجد ڈرائیور کی نظر بھی مجھ پر پڑی۔ اُس نے گھر چلنے کا حکم صادر کیا۔ میں نے تھوڑی پس و پیش کے بعد حکم مان لیا اور اُس کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ ایک ہی دن میں مجھے عاشی کے بارے میں مطلوبہ معلومات حاصل ہو گئیں مگر اُس لڑکے کے بارے میں پتا نہیں چلا جس کے ساتھ اُس کا 'معاشقہ' چل رہا تھا۔ اَبھی یہ طے نہیں ہوا تھا کہ کیا دونوں کے بیچ استوار ہونے والے تعلق کو معاشقہ کہا جا سکتا تھا یا نہیں۔

میں دوپہر کو ویگن پر کھالے کے ساتھ بیٹھ کر یا شیدو کے

ساتھ پائیدان پر لٹک کر نور پور لوٹ آتا تھا۔ کھالے کو اپنی پیش رفت سے آگاہ کرتا اور راہنمائی حاصل کرتا۔ وہ بڑے کام کے مشورے عنایت کرتا تھا۔ مجھے بعض اوقات حیرانی ہوتی کہ اُس نے اتنی چالاکیاں اور نفسیاتی الجھنوں کے فوری سلجھاوے کہاں سے سیکھ رکھے تھے۔ اُس کی ہر ترکیب کائیاں ہوتی اور ہر تیر نشانے پر جا لگتا تھا۔

منظور درزی کے ہاں آمد و رفت کے مختصر دورانیے میں عاشی ایک مرتبہ مجھے دکھائی دی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کے دو جزوی برقعے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اِس نوع کے برقعہ کو یہاں 'امیریلا برقعہ' یا 'فیشنی برقعہ' کہا جاتا تھا۔ اِس کے مقابلے میں سفید رنگ کے شٹل کاک برقعے کو 'دیسی' یا 'ٹوپی والا' برقعہ کہا جاتا تھا جو یہاں زیادہ رائج تھا۔

عاشی کو اُس کے چمک دار سیاہ برقعے نے پوری طرح چھپا رکھا تھا۔ محض سفید اور نازک ہاتھ دکھائی دیتے تھے۔ میں اُسے پہچان نہ پاتا اگر اُسے اپنے گھر میں داخل ہوتے ہوئے نہ دیکھتا۔

ان دنوں مجھے بیک وقت کاشتکاری کے معمول کے کام کاج کرنا پڑتے تھے، ملکہ کو پڑھانے اور ڈاکٹر شاہ جی سے پڑھنے کے لیے جانا پڑتا تھا اور کھالے کے ساتھ ہر روز صبح چوک قریشی جانا پڑتا تھا۔ آدھا دن وہاں گزر جاتا تھا۔ بعض اوقات ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں سے اُٹھ کر کھالے اور مراد بخش کی محفل میں بیٹھنے کا اعزاز بھی حاصل کرنا پڑتا تھا۔ کھالے اور دیوانے کی آپس میں نوک جھوک کا سلسلہ ہر دم جاری رہتا تھا مگر طویل اور مختصر دورانیے کے ترکِ تعلقات کے باوجود ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے مواقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔ زَیناں جب بھی ملتی، کبھی زُبان سے تو کبھی لوگوں کی موجودگی کے باعث آنکھوں سے ڈاکٹر شاہ جی کا جوابی خط طلب کرتی اور میں مایوسی سے اپنا سر نفی میں ہلا دیتا۔

ایک دِن اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے۔ چونکہ وہ مجھ سے تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی تھی، اِس لیے اشارے کنائے سے ہی اپنا مدعا بیان کرنے پر مجبور تھی۔ میں اتفاق سے ڈاکٹر شاہ جی کے پاس جا رہا تھا۔

میں نے ہمت کر کے شاہ جی سے کہہ ہی دیا۔ ''زَیناں ہر روز مجھ سے اپنے خط کا جواب مانگتی ہے۔''

اُس نے چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورا۔ ''کیا تم نے دلالی شروع کر دی ہے؟''

جملہ خاصا تضحیک انگیز تھا۔ ندامت ہوئی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''دراصل مجھے اُس کی رونی صورت پر ترس آتا ہے۔''

''اُس پر ترس آتا ہے تو اُسے سمجھاؤ کہ اپنی محبت کی نارچ کا رُخ کسی اور جانب موڑ لے۔ مجھے معاف ہی رکھے۔'' اُس کے لہجے کی زہر خیزی میرے لیے تعجب کا باعث نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ ''آپ تو کہتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں خدا بستا ہے، پھر دل توڑتے ہوئے آپ اپنے کہے ہوئے الفاظ سے انحراف کیوں کرتے ہیں؟''

اُس نے ایک نگاہِ تاسف مجھے دیکھا، بولا۔ ''شہر یار! بچہ ناسمجھی میں آگ کو چھونا چاہے، نہر میں کودنا چاہے یا بوڑھا کڑواہٹ محسوس کرتے ہوئے دوا کھانے سے انکار کر دے تو کیا اُس کی دل آزاری کے خوف سے اُس کی بات کو مان لینا دانشمندی کہلائے گا؟''

میں لاجواب ہو گیا۔ باتوں میں اُس سے جیتنا مشکل تھا۔ میں نے کہا۔ ''مگر وہ آگ کو چھونے کی کوشش نہیں کر رہی، وہ اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کی خواہش دل میں رکھتی ہے۔ جانتی ہے کہ اُس کی بیماری کو اس انداز میں مشتہر کر دیا گیا ہے کہ کوئی اُسے لینے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ آپ جانتے ہیں، آپ اُسے قبول کر سکتے ہیں۔''

اُس کے لبوں پر پھر وہی موذی زہریلی مسکراہٹ تیر گئی، بولا۔ ''نہیں! ابھی اُس کے مستقبل پر سوالیہ نشان معلق نہیں ہوا۔ ابھی وہ محض اپنی جسمانی ضرورت کے محاذ پر کھڑی بل کھا رہی ہے۔''

میں زَیناں کی حمایت میں اپنی تمام تر قابلیت اور علمیت کو بروئے کار لے آیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ ہر بار کی طرح مجھے ہی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اچانک ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور آن کی آن میں میرے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ میں نے کھالے سے اپنے باپ کے قتل کے محرک پر ہونے والی گفتگو کے دوران یہ سوچا تھا کہ میں ڈاکٹر شاہ جی کو یہ خوں چکاں داستان سناؤں گا اور اُن سے قاتل کی تلاش میں مدد طلب کروں گا۔ چونکہ میری نظر میں وہ بہت ذہین اور معاملہ فہم انسان تھا، اِس لیے ممکن تھا، کہ کوئی ایسا نکتہ سجھا دیتا کہ میری مشکل حل ہو جاتی۔ میں نے اپنی اُسی سوچ کے تابع کہا۔ ''شاہ جی! میرا ذاتی نوعیت کا ایک پیچیدہ معما ہے، کیا اُسے حل کرنے میں آپ میری مدد کریں گے؟''

وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''وائے ناٹ! تمہارے کام آ کر مجھے خوشی ہوگی۔''

چونکہ کہانی طویل تھی، اِس لیے میں نے مناسب جانا کہ پہلے چائے تیار کر کے ڈاکٹر شاہ جی کو پیش کر دوں تاکہ بیچ میں اُٹھنا نہ پڑے۔ میں نے جب اپنے خاندانی پسِ منظر کو چھیڑا، ڈاکٹر شاہ کی تمام تر توجہ میرے الفاظ پر مرکوز ہو گئی۔ میں نے اپنے تئیں جزئیات تک کو موضوعِ سخن بنایا تھا اور کوشش کی تھی کہ اُس پر سب کچھ عیاں ہو جائے۔ وہ سنتا رہا، پل پل چہرہ متغیر ہوتا رہا اور میں اپنی ہی رو میں آگے، اور آگے بڑھتا رہا۔ کوئی گھنٹا بھر کے بعد میرے دُکھ کا قصہ تمام ہوا تو اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ ہولے سے بولا۔ ''چائے.....''

مجھے اُس کے لبوں سے پھوٹنے والے اِس واحد لفظ کی توقع تھی، اِس لیے کوئی دیر کیے بغیر میں اُٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ اُس نے چائے کا ایک گھونٹ حلق میں اُتارا، طویل سانس حلق سے خارج کی اور بولا۔ ''شہر یار! کیا تم چاہتے ہو کہ اِس موضوع پر ہم گفتگو کریں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''تو اَب جو میں کہنے جا رہا ہوں، غور سے سنو۔ پھر فیصلہ کرنا کہ ہمیں اِس راکھ کو کریدنا چاہیے یا نہیں۔ او کے؟''

''یس سر!''

''تمہاری سنائی ہوئی داستان میں کئی جذباتی موڑ ہیں، کئی نفسیاتی خامیاں ہیں اور کئی گنجلک الجھنیں ہیں جنہیں سلجھاتے ہوئے، کہیں انگلیاں، کہیں زبان تو کہیں ہونٹ چھل جائیں گے۔ تب کہیں جا کے چھپے ہوئے کرداروں پر سے پردہ کشائی ہوگی۔ کہو! کیا اتنی ہمت رکھتے ہو؟''

میں اُس کی بات سمجھ نہیں پایا تھا۔ مگر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''آپ بات کیجیے، مجھ میں حوصلہ ہے۔''

وہ چند لمحے تک مجھے تُولتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا، اپنے تئیں کچھ طے کرتا رہا، پھر بولا۔ ''شہر یار! کیا تمہاری ماں بہت خوب صورت تھی؟''

میں نے کہا۔ ''لوگ یہی کہتے ہیں۔ شادی پر لیا گیا ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹو بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔''

''اور تمہارا باپ بھی؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں! وہ بہت خوبصورت اور کڑیل جوان تھا۔ اُس کا نام امام بخش تھا، مگر لوگ اُسے سوہنا خان کہتے تھے۔''

''کیا تمہارے ننھیال سے تمہارے باپ کی رشتہ داری تھی؟''

''نہیں..... جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، ایک دوسرے سے شناسائی کا تعلق بھی نہیں تھا۔''

''پھر دونوں کی شادی کس طرح سرانجام پائی؟'' ڈاکٹر شاہ جی نے مجھ پر نظریں گاڑ دیں۔

میرا سر جھک گیا۔ سوچا جھوٹ بول دوں، پھر سوچا، جھوٹ بولوں گا تو پہلے کی طرح بھٹکتا رہوں گا اور ڈاکٹر شاہ جی میری کوئی مدد نہیں کر پائے گا۔ میں نے کہا۔ ''میرا باپ بیل خریدنے کے لیے شاہ جمال گیا تھا۔ بیل پسند نہیں آیا، میری ماں نظر آ گئی جو پہلی نظر میں ہی اُسے پسند آ گئی۔ میرے ننھیال والے امیر لوگ نہیں تھے، بلکہ ہم سے بھی گئے گزرے تھے مگر اُنہوں نے غیر برادری کی بنیاد پر رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ میرا دادا اور چاچا چراغ بھی اِس رشتے پر رضامند نہیں تھے۔''

''تمہاری ماں کا نام کیا تھا؟''

''رضیہ..... سبھی اُسے 'رجو' کہتے تھے۔'' میں نے بتایا۔ ''پھر دونوں کے بیچ میل ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا جس کے نتیجے میں ایک دن دونوں غائب ہو گئے۔ دونوں دیہاتوں میں بڑا ہنگامہ کھڑا ہوا۔ ایک ماہ کے بعد، جب معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تو دونوں نور پور میں آئے۔ اُنہوں نے شادی کر لی تھی۔''

''کیا تمہارے ننھیال والوں نے کوئی رابطہ کیا؟''

''نہیں..... بلکہ میرے بڑے ماموں نے یہ کہا تھا کہ رجو ہمارے لیے مر چکی ہے۔ اگر وہ یا سوہنا خان کبھی شاہ جمال میں نظر آئے تو اُن کا خون کر دیا جائے گا۔''

''بڑوں نے صلح کی کوشش کی؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں کی ہوگی۔ اگر کی بھی ہو تو اُس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔''

''کیا یہ ممکن ہے کہ دونوں کو تمہارے کسی ماموں نے قتل کیا ہو؟''

میں نے پورے وثوق سے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں شاہ جی! اُن کے بازوؤں میں اتنا دم نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو فوری طور پر حملہ کرتے۔ اتنا لمبا انتظار نہ کرتے۔ ویسے بھی اتنے برسوں کی گرد انتقام کے شعلوں کو بجھا دیتی ہے۔''

اُس نے تضحیکی انداز میں سر ہلایا، بولا۔ ''بالکل ٹھیک۔ اَب ہم اِس کہانی کو دوسرے رُخ سے دیکھتے ہیں۔ کیا اِس کہانی میں کوئی تیسرا کردار بھی تھا..... ولن؟''

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ چہرہ پل بھر کو متغیر ہوا۔

ڈاکٹر شاہ جی، جو یک ٹک مجھے گھور رہا تھا، فوراً بولا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اِس راکھ کو کریدنے کے مراحل میں بہت سے جذباتی موڑ آئیں گے۔"

میں سنبھل گیا، بولا۔ "جی! مجھے احساس ہے۔ میں نے اِس انداز سے کبھی نہیں سوچا۔"

"غیرت کے بعد رقابت ہی ایسا جذبہ رہ جاتا ہے جو انسان کو خون خرابے پر مجبور کرتا ہے۔" شاہ جی نے قدرے سرد لہجے میں کہا۔ "غیرت والے ڈُبک گئے مگر ضروری تو نہیں کہ ناکام عاشق نے بھی مفاہمت کرلی ہو۔"

میرے لبوں سے بہ دقت نکلا۔ "جی ....." پھر چند ساعتیں سوچ کر کہا۔ "ممکن تو ہے مگر....."

"مگر تمہیں معلوم نہیں ہے۔" شاہ جی نے ہنکارا بھرا۔ "تھوڑا ذہن پر زور دو..... سوچو، کسی ایسے شخص کے بارے میں جو اُس رات کے بعد ہمیشہ کے لیے یا کچھ عرصہ کے لیے غائب ہوگیا ہو؟"

اُس رات سے اُس کی مراد وہ بھیانک رات تھی جس نے میری زندگی میں سرخ اندھیرے بھر دیے تھے۔

میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ کھالے، چاچے چراغ اور امیر نواز سے ہونے والی گفتگو کو ذہن میں کھنگالا، کوئی ایسا فرد سجھائی نہیں دیا۔ میں نے انکار کیا تو وہ بولا۔ "تم نے جو کچھ اُس رات میں مٹی کے بھڑولے میں سے جھانک کر دیکھا، تفصیل سے بتاؤ۔ کسی بھی بات کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا۔"

میری زُبان ٹیپ پلیئر کی طرح چل پڑی۔ میں نے اُس خوں چکاں واقعے کو برسہا برس کے دورانیے میں کبھی محو نہیں ہونے دیا تھا۔ کبھی زبان سے، کبھی دل ہی دل میں، دہراتے ہوئے زندہ رکھا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا، توجہ سے سنتا رہا اور تفہیمی انداز میں سر ہلاتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو قاتل تک پہنچا جاسکتا ہے۔"

وہ شاید تھک گیا تھا۔ جماہیاں لینے لگا۔ مجھے اب جانا چاہیے تھا۔ اجازت چاہی تو اُس نے کہا۔ "تم صرف اتنا کھوج لگاؤ کہ نور پور کا کون سا شخص اِس واقعے کے بعد سے اَب تک غیر موجود ہے یا کوئی ایسا فرد جو چند ماہ کے غیاب کے بعد لوٹ آیا ہو۔ یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے مگر کس طرح ممکن ہے، یہ تم بہتر جانتے ہو۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور گھر کی راہ لی۔ گزشتہ چند دنوں سے کام کاج میں میری عدم دلچسپی چاچا چراغ کا پارا چڑھنے کا سبب بن رہی تھی۔ فرزانہ اور پروین، دونوں مل کر میری عدم موجودگی میں میری جھوٹی سچی وکالت کر کے اُسے ٹھنڈا کر دیتی تھیں۔ وہ کبھی چپ ہوجاتا، کبھی دونوں کی خبر لینے لگتا۔ میں کوشش کرتا کہ میرا سامنا اُس سے کم سے کم ہو۔

اسی آنکھ مچولی میں بدھ کا دِن آگیا۔ طبیعت میں عجیب ہیجان اور بے قراری کی ملی جلی کیفیت علی الصباح سے محسوس ہو رہی تھی۔ کھالا اپنی ویگن پر تھا، بخت خان دکھائی نہیں دیا تو مجبوراً مجھے مراد بخش دیوانے کی صحبت اختیار کرنا پڑی۔ وہ ماسٹر ولی محمد کا کرتہ سینے میں جتا ہوا تھا۔ ابھی ہم روایتی تبادلۂ احوال کر رہے تھے کہ ماسٹر ولی محمد چائے کی چینک اور پیالہ اُٹھائے آن وارد ہوا۔ مجھے دیکھ کر قدرے خوش دلی سے بولا۔ "شہرے پتر! یہ پکڑو، میں دوسرا پیالہ اُٹھالاتا ہوں۔"

وہ میرے روکنے کے باوجود پلٹا اور گھر سے پیالہ اُٹھا لایا۔ ہمیں چائے کے لبالب پیالے تھمانے کے بعد آدھ سلے کرتے کا جائزہ لینے لگا۔ اپنی ہی رو میں کویا ہوا۔ "میں نے کہا کہ یارن خان کے آنے سے پہلے سوٹ سلوالوں۔ بعد میں تو دیوانہ اُس کی حویلی کا ہو کر رہ جائے گا۔"

دیوانے نے جھٹ پوچھا۔ "خان کب آرہا ہے ماسٹر جی؟"

وہ بولا۔ "ٹھیک سے تو علم نہیں ہے مگر اُس کا نوکر بتا رہا تھا کہ چند دنوں میں ہی آنکلے گا۔"

دیوانے کی آنکھیں جگمگا اُٹھیں۔ یارن خان کی آمد کی موہوم سی اطلاع بھی اُس کے لیے بڑی جاں افزا تھی۔ ماسٹر جی کی بات درست تھی۔ یارن خان جتنا عرصہ بھی یہاں رہتا تھا، دیوانے کا گھروندا متفلل رہتا تھا۔ رات دن خان کی حویلی میں گھسا رہتا تھا۔ چونکہ خان شعروشاعری کا دلدادہ تھا، اِس لیے دیوانے کی چاندی ہوجایا کرتی تھی۔ مہینا بھر دُم چھلا بنے رہنے کا تگڑا انعام وصول کیا کرتا اور صبح تا شام اُس کی سخاوتوں، اچھی عادتوں اور ادب پروریوں کے قصیدے سنایا کرتا تھا۔

دیوانے کی حد سے متجاوز دلچسپی کے سبب یارن خان کا قصہ چھڑ گیا۔ وہ بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرنے لگا۔ میرا چائے کا پیالہ خالی ہوگیا تو ماسٹر ولی محمد نے اپنے لیے چائے انڈیل لی۔ ایک لمبا گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے بولا۔ "اوئے چاپلوس شاعر! اَب اُس کی اتنی تعریفیں بھی مت کر کہ میری زُبان کھل جائے۔ وہ نور پور کا بڑا خان زادہ ہے۔ ایک وقت تھا، جب اُسی کا حکم چلتا تھا۔ میں نے وہ زمانہ دیکھ رکھا ہے جب یہ حیات خان اور وریام خان دونوں اُس کے دارے پر کھڑے (چارپائیاں) سیدھے کرتے تھے۔"

"ماسٹر جی!" دیوانے نے صدائے احتجاج بلند کی۔ "وہ اِن کی طرح ظالم اور کنجوس نہیں ہے۔"

"وہ اِن سے بھی آگے کی شے ہے پتر!" ماسٹر جی کے جھریوں بھرے چہرے میں یک دم کئی داستانیں سمٹ آئیں، ہاتھ لہرا کر بولا۔ "یہ نور پور کی قسمت چنگی (اچھی) ہے کہ یہاں سے چلا گیا ورنہ تم لوگ دیکھتے کہ یہاں سانسیں بھی اُس کی اجازت سے لینا پڑتیں۔"

مجھے ماسٹر کی بات سن کر اچنبھا ہوا۔ میں یارن خان کو بہت پڑھا لکھا، سنجیدہ اور تارکِ الدنیا قسم کا بندہ سمجھتا آیا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ "ماسٹر جی! وہ ایسا دکھائی تو نہیں دیتا۔"

"اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اُس کی حویلی میں کوئی قدم نہ رکھے، بتاؤ، کسی نے حویلی میں قدم رکھا؟" اُس کے لہجے میں عجیب سی نفرت گھلی ہوئی تھی۔ "کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے۔ صرف اِس لیے کہ نور پور کے خانزادے اور قریشی جانتے ہیں کہ وہ ہتھے سے اُکھڑا تو کوئی بھی سنبھال نہیں پائے گا۔"

"وہ اَب کہاں رہتا ہے؟"

"لاہور میں بہت بڑا بنگلا ہے اُس کا۔" دیوانے نے جھٹ دیدے پھیلائے۔ "دھاگے والی فیکٹری بھی ہے اُس کی بھائی پھیرو میں۔ تم جاہل آدمی ہو، تم نے تو بھائی پھیرو کا نام ہی پہلی مرتبہ سنا ہوگا۔ ہے ناں؟"

اُس کی ٹیڑھی گردن اور ناچتی آنکھیں دیکھ کر مجھے تاؤ تو بہت آیا مگر حقیقت یہی تھی کہ میں نے یہ لفظ پہلی مرتبہ سنا تھا۔ پوچھا۔ "کیا یہ کوئی شہر ہے؟"

"ہاں..... لاہور کے نیڑے نیڑے (قریب) واقع ہے۔" اُس نے فاتحانہ انداز میں اپنی علمیت کا رعب جمایا۔ "ماسٹر جی پتا نہیں کس زمانے کی بات کرتے ہیں۔ میں نے خان کو بڑا ابیا (اچھا) اور غریب پرور پایا ہے۔ سچ کہتا ہوں شہرے!"

ماسٹر ولی محمد کی سوختہ نظریں دیوانے پر چپک گئیں۔ چند لمحے ایسے ہی گھورتا رہا، پھر لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتارتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے بولا۔ "ایک یہی بھرے نور پور میں غریب رہ گیا ہے۔ باقی تو سب جائدادوں والے بن گئے ہیں۔"

اُس کے لہجے میں غیر معمولی کاٹ پنہاں تھی جبکہ ہاتھ کا اشارہ دیوانے کی طرف تھا۔ دیوانے کی حالت متغیر ہوگئی۔ طنز برداشت کرنا محال ہوگیا تو مشین اور تختے پر پھیلی قمیص کو سمیٹ کر اُٹھا اور رفع حاجت کے بہانے گھروندے سے نکل گیا۔ ماسٹر جی کے ہونٹ تفریں انداز میں سکڑے، ہنکارا بھرا اور کہا۔ "شہرے! سوہنے کریم کا کرم ہے کہ یارن خان کا دِل نور پور سے اُچاٹ ہوگیا اور وہ لاہور چلا گیا ورنہ اَب تک نور پور کی گلیاں ویران اور گھر کھنڈر ہو چکے ہوتے۔"

میں نے کہا۔ "وہ ایسا کیا کرتا تھا؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ لمبی آہ کھینچی اور اُٹھ کر برتن سمیٹنے لگا۔ جاتے ہوئے دروازے میں رُک کر پلٹے بنا بولا۔ "اُس چاپلوس شاعر سے کہنا کہ میرا سوٹ جلد سی دے۔ میں نے کل کہیں جانا ہے۔"

مجھے اُس کا رویہ عجیب سا لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، کہنے سے ڈرتا بھی تھا حالانکہ یہ اُس کی فطرت کے منافی تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ یارن خان سے قلبی پرخاش رکھتا تھا ورنہ یارن خان ایسا شخص نہیں تھا جو اپنی حویلی، جہاں اسے سال کا محض ایک مہینا گزارنا ہوتا تھا، اتنا سجائے سنوارے رکھتا تھا، وہ ظالم یا جبر نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ شعروادب کا دلدادہ تھا۔ تنہائی پسند تھا۔ ایسا شخص بے ایمان اور فرعون صفت نہیں ہوتا۔ یہ بات مجھے بارہا ڈاکٹر شاہ جی نے کہی تھی کہ مطالعے اور کتاب بینی کا شائق شخص ہزار خامیاں رکھتا ہو، منافق اور ظالم نہیں ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ یارن خان نے کسی موقعے پر ماسٹر ولی محمد کا دل دکھایا ہو، اُس کی کسی فرمائش کو سختی سے رَد کیا ہو یا اُس پر کبھی ہاتھ اُٹھایا ہو جس کا شکوہ ماسٹر جی کے لبوں پر مچل اُٹھتا ہو۔

میری اِن موچوں کی تائید دیوانے نے کی جب وہ کھیتوں سے لوٹ کر آیا۔ ماسٹر جی کی غیر موجودگی کو غنیمت قرار دیتے ہوئے بولا۔ "بڈھا ماسٹر سٹھیا (ساٹھ برس کا) گیا ہے..... نہیں بلکہ بہتریا (بہتر برس کی عمر کا) ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا چھوڑو یار اِس قصے کو، یہ بتاؤ تم نے دل جیت کے مہمانوں کو گھیرنے کا کیا منصوبہ تیار کیا ہے؟"

اُس کی گردن حسبِ توقع تن گئی، لہجے میں فخر سما گیا، بولا۔ "شہرے خان! میں نے ایسا زبردست پلان بنایا ہے کہ آنے والے بھی چوہے کڑکی میں پھنس جائیں گے۔"

میرے کریدنے کے باوجود اُس نے محض 'دیکھ ہی لوگے' کہنے پر اکتفا کیا۔ کچھ دیر تک اُس کی دکان میں بیٹھنے کے بعد میں اپنے ڈیرے پر آگیا اور پوری تن دہی سے اپنے کام میں جُت گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا، میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ سہ پہر کو میں نہا دھو کر کھالے کے باپ کی دکان پر آبیٹھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بجائے ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں رات گزارنے کے، چوک

قریشی چلا جاؤں گا۔ عشرت کالج سے لوٹ آئی ہوگی۔ ممکن تھا کہ وہ کہیں دکھائی دے جاتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُس کا بھائی مجھے اپنے گھر لے جاتا اور اُس کی ماں کے ساتھ ساتھ میری عاشی سے ملاقات بھی ہوجاتی۔ ابھی تک اُس کی محض ایک جھلک دیکھی تھی، اُسے سنا نہیں تھا، سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

کھالے کا باپ دکان پر موجود نہیں تھا۔ کوئی گاہک بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایسے میں دکان کا اندرونی دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ خالدہ دروازے میں کھڑی ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”اماں بلا رہی ہے صاحب جی!“ وہ معصومیت سے بولی۔

میں بادلِ ناخواستہ اُٹھا اور گھر میں چلا آیا۔ وہ میرے آگے آگے چلتی ہوئی بڑے کمرے کے دروازے تک آگئی۔

میں نے پوچھا۔ ”ماسی صفو کو کیا کام ہے مجھ سے؟“

وہ بولی۔ ”اندر لیٹی ہے، خود ہی آکر پوچھ لو۔“

میں اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ ماسی صفو کسی بھی چارپائی پر لیٹی دکھائی نہیں دی۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کہاں ہے ماسی؟ مجھے تو دکھائی نہیں دیتی۔“

وہ پلٹی، میری طرف بڑھی اور عین مقابل ٹھہر کر مجھے دیکھنے لگی۔ اُس کے معصوم چہرے پر شرارت کے عکس لرزاں تھے۔ میں آنِ واحد میں اُس کا ارادہ بھانپ گیا مگر ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ اُس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور خاموش مگر ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے بلو! جھوٹ کیوں بولا تم نے؟“

”یہاں بیٹھ جاؤ، سچ سننے کی ہمت ہے تو سچ بولنے لگتی ہوں۔“ اُس نے مجھے آہستگی سے پیچھے دھکیلا اور چارپائی پر بٹھادیا۔

”ماسی اور غفوراں کہاں ہیں؟“

”اُنہیں بڑی بی بی نے حویلی میں بلایا تھا۔ ابھی گئی ہیں، گھنٹا بھر وہیں رہیں گی۔“ وہ میرے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ ٹکا کر پیروں میں بیٹھ گئی۔ ”ابا حیات خان کے فارم پر گیا ہے۔ کھرلیوں کے کنڈے اور مویشیوں کے سنگل (آہنی زنجیریں) ٹھیک کر رہا ہے۔ شام سے پہلے کسی صورت نہیں لوٹے گا۔“

یکبارگی مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ کھالے کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ خالی گھر کے کمرے کی تنہائی میں خالدہ اور میں کسی بھی دیکھنے والی نگاہ میں مجرم بن سکتے تھے۔

میں نے اُٹھنا چاہا مگر وہ اپنے پورے بوجھ سمیت میرے گھٹنوں پر لَد گئی۔ اپنا چہرہ بھی ٹکا دیا۔ بولی۔ ”صاحب جی! مجھ سے بھاگتے کیوں ہو؟ مجھے تم اچھے لگتے ہو، دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے، کچھ مانگتی بھی تو نہیں ہوں...... پھر مجھے دھکے کیوں دیتے ہو؟“

اُس نے سر اُٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ اُس گھڑی اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھوں کی تیز چمک پریشان کن تھی۔ میں نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پیچھے دھکیلا۔ اُس کے لیے میری یہ حرکت غیر متوقع تھی۔ وہ پیچھے کی جانب گری مگر دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر سنبھل گئی۔ میں اِس دوران میں کھڑا ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ کوئی جواب دیے بغیر دروازے کی طرف بڑھا مگر پہنچ نہیں پایا۔ اُس نے عقب میں آکر مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

میں نے غصے سے کہا۔ ”چھوڑ دو مجھے، جانے دو۔ یہ کیا بے ہودگی ہے؟“

اُس کی گرفت میں مزید سختی آگئی، بولی۔ ”میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ کچھ دیر رُکو، پھر چلے جانا۔“

میں نے گردن جھکا کر اپنے پیٹ کے بالائی حصے پر اُس کے ہاتھ دیکھے۔ اُس نے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا رکھی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور علیحدہ کر دیے۔ وہ بجلی کی مستعدی سے میرے پہلو سے نکل کر سامنے آگئی۔ میں گھبرا گیا۔ بھاگ نکلنے کی راہ مسدود دکھائی دی تو اُسے باہر کی طرف دھکیلنا چاہا۔ وہ پیچھے ہٹنے کے بجائے مجھ سے چپک گئی اور مجھے دھکیلنے لگی۔

کچھ دن پہلے وہ نیم تاریکی میں ٹکرائی تھی۔ آج پوری کی پوری حواس پر چھا رہی تھی۔ وہ مجھے چارپائی پر گرانا چاہتی تھی مگر کامیاب نہ ہو پائی۔ یہ ضرور ہوا کہ میری پشت سامان والی جستی پیٹی سے جا ٹکرائی۔ پیٹی کا آہنی کنڈا ریڑھ کی ہڈی میں لگا۔ یوں لگا جیسے طاقتور برقی رو بدن میں اُتر گئی ہو اور آنِ واحد میں پورا بدن مفلوج ہوگیا ہو۔ میں بہ دقت تمام اپنے پیروں پر کھڑا رہ پایا۔ وہ میری حالت سے بے خبر اپنی یورش پر تمام تر توتیں مرتکز کیے مجھے بانہوں میں جکڑے ہوئے تھی۔ میں نے اُسے تھپڑ مارنے کے لیے اپنا ہاتھ اُٹھانا چاہا مگر دل دھک سے رہ گیا۔ میری شدید تر خواہش کے باوجود ہاتھ میں حرکت نہیں ہوئی۔ میں نے جلدی سے باری باری دونوں پیروں کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر ناکامی پر بُری طرح گھبرا گیا۔

میں پھٹی پھٹی نظروں سے اُس کی وارفتہ یلغاروں کو دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا مگر پورا بدن سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ بہ دقت تمام میرے منہ سے نکلا۔ ”چھوڑ دو مجھے، بلو! پرے ہٹو۔“

اُس نے میرے کہے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں پھر چلایا۔ ”میں کہہ رہا ہوں، مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چوٹ لگ گئی ہے۔“

”مجھے بھی چوٹ لگی ہوئی ہے۔ پہلے اس زخم پر پھاہا (مرہم) رکھو۔“

”خدا کے لیے بلو! پرے ہٹو، میں کہیں نہیں جاؤں گا مگر مجھے چھوڑ دو تو سہی...... مجھے تمہاری یہ حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔“ میرا گلا خشک ہوگیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ میری آواز پورے نور پور میں گونج رہی ہوگی اور آدھی دُنیا سن رہی ہوگی مگر اُس نے جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ وہ اپنی پیش قدمی میں حدیں پھلانگنے پر کمربستہ تھی۔ ایڑیوں کے بل اوپر اُٹھی اور میرے بھانپنے سے قبل میرے سینے سے آ لگی۔ اُس نے میری بغلوں میں سے ہاتھ نکال کر پیٹی پر رکھ لیے تھے یا پیٹی کی باہر کو نکلی ہوئی اَنی کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا کہ میں بُری طرح اُس کی بانہوں کے شکنجے میں جکڑا گیا۔ میں پوری قوت اور تمام تر خفگی کو بروئے کار لا کر اُسے پرے ہٹنے کا کہہ رہا تھا مگر وہ جیسے بہری ہو کر رہ گئی تھی۔

ایسے میں اچانک کمرے میں روشنی کچھ کم ہوگئی۔ ایک سایہ سا لہرا گیا۔ میں نے بے ساختگی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ میرا دل جیسے اچانک نیچے اٹک گیا اور بدن کو یکبارگی سے اوپر کھینچ لیا گیا تھا۔

بلو میری جسمانی کیفیت اور ذہنی اذیت سے بے نیاز جوانی کے شجرِ تشنہ کام کو سیراب کرنے کے لیے میری گردن کو چوم رہی تھی اور میں دہشت زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دروازے کے بیچوں بیچ کھالا شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دونوں بانہیں پھیلا کر دروازے کی چوبی چوکھٹیں تھام رکھی تھیں۔ میں خالدہ کو کھالے کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر میری زبان نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ بلو نہ تو میرا چہرہ دیکھ رہی تھی اور نہ ہی اپنے عقب میں کھالے کو دیکھ رہی تھی۔

میرے نیم مفلوج ذہن نے اچانک کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک خیال بڑی تیز رفتاری سے میرے دماغ میں اُترا کہ کھالا دروازے میں رُکا ہوا کیوں ہے؟ اُسے تو فی الفور ہم پر شکرے کی طرح جھپٹ پڑنا چاہیے تھا مگر وہ یوں کھڑا تھا جیسے اُس کے بدن میں حرکت کی سکت ہی نہ رہی ہو۔ یہ اُس کا غیر فطری فعل تھا۔

میں نے اپنی ہمت مجتمع کی۔ ”بلو! چھوڑ دے مجھے، وہ دیکھ، تیرا بھائی دروازے میں کھڑا دیکھ رہا ہے۔“

مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے علیحدہ ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ میں نے قدم اُٹھانا چاہا مگر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پہلو کے بل زمین پر دھم سے آن گرا۔ کھالے کو دیکھ کر میں دہشت سے بھول گیا تھا کہ میرا جسم بے حس و حرکت ہوگیا ہے۔

میں نے اُٹھنے کے لیے ہاتھ کو حرکت دینا چاہی تو بے اختیار میرے منہ سے چیخ برآمد ہوگئی۔ میری بانہیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ چارپائیوں کے نیچے سے کھالے اور بلو کے پیر دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر ساکت کھڑے تھے۔ میں کھالے کی سرشت سے آگاہ تھا۔ غیرت کے معاملے میں وہ کسی مفاہمت کا قائل نہیں تھا۔ پوری سختی کے ساتھ اپنے دانت بھینچ کر میں انتظار کرنے لگا کہ کب وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا ہے اور اپنی پنڈلی کے ساتھ بندھے ہوئے چمکدار خنجر سے میری گردن کاٹتا ہے۔ ایسا ہی ایک خنجر اُس نے مجھے بھی تحفے میں دے رکھا تھا جو اِس وقت میرے ٹرنک میں پڑا تھا۔ اگر وہ اِس وقت میرے پاس ہوتا بھی تو میرے کسی کام نہیں آسکتا تھا۔

میں مسلسل اپنے جسمانی اعضا کو حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا مگر سوائے گردن کے، کسی عضو میں حرکت نہیں دے سکا تھا۔ خالدہ دونوں چارپائیوں کے بیچ، جہاں سے وہ مجھے دھکیل کر پیٹی کے پاس لائی تھی، کھڑی تھی جبکہ کھالے کے گھٹنوں تک دونوں پیر مجھے دروازے میں دکھائی دے رہے تھے۔

تین چار...... یا زیادہ منٹ گزر گئے تھے۔ میری آنکھوں میں بے بسی سے آنسو تیرنے لگے۔ ایسے ہی وقت میں خالدہ روتی ہوئی کھالے کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ خدا کے واسطے دیتے ہوئے معافیاں مانگنے لگی۔ کھالا لب بستہ، بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ شاید میرے اُٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر اُس نے پوری قوت سے خالدہ کو ٹھڈا مارا اور چنگھاڑا۔ ”اوئے خان کے بچے! چوہوں کی طرح بل میں کیوں پڑتے ہو؟ اُٹھو اور میرا سامنا کرو۔“

اُس کی دھاڑ سن کر میرا دل کانپ اُٹھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی بے گناہی کا واسطہ دیتے ہوئے خدا سے مدد مانگی۔ خالدہ اُٹھ کر پھر اپنے بھائی سے چمٹی۔ اُس نے زور

دار طمانچا اُس کے منہ پر جڑا اور بالوں سے پکڑ کر پرے گھما پھینکا۔ کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ چارپائیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اُن سے ٹکرائی۔ اوپر والی چارپائیاں گرنے کی آواز سنائی دی۔

کھالا قدم بہ قدم چلتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ دونوں چارپائیوں کے بیچ ایک ذرا رُکا، جھکا اور پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اُس کے عزائم دیکھ کر میری رہی سہی جان بھی ہوا ہوگئی۔

چند لمحوں بعد وہ میری پنڈلی پر پاؤں رکھ کر دہاڑ رہا تھا۔

"بے غیرت انسان! اُٹھ کھڑا ہو، دیکھ..... اپنا حشر ہوتا تو دیکھ ناں..... یار کے گھر میں ڈاکا مارنے کا انجام تو اپنی آنکھوں سے دیکھتا جا..... اُٹھ اوئے....."

وہ غراتی ہوئی آواز میں گالیاں دیتے ہوئے میرے پہلو سے جڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر کلیجا ساتھ نہیں دیتا تھا تو اِس گھر میں داخل نہ ہوتے۔ سوچ لیتے کہ یہ کھالے کا گھر ہے۔ کھالا ہر گناہ معاف کرسکتا ہے مگر کسی یار مار کو معاف نہیں کرسکتا۔"

میں گھگیایا۔ "یار کھالے....."

اُس نے اُلٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مارا۔ "گندی زبان سے میرا نام نہ لے، مجھے یار نہ کہہ بے غیرت....."

اُس نے اوپر تلے تین چار گالیاں دیں۔ مجھے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ میرا گال اندر سے پھٹ گیا تھا۔ کھالے کا چہرہ فرطِ غیظ سے سیاہ ہو رہا تھا۔ اُس نے خنجر والا ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ میں اُسے روکنا چاہتا تھا مگر خوف اور دہشت سے میرے منہ سے موائے گھر گھراہٹ کے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا خنجر والا ہاتھ نیچے آنے سے پہلے ہی میرا دل دھڑکنا بند کردے گا۔ خالدہ بھاگتی ہوئی آئی۔ کھالے سے چمٹ گئی اور خدا رسولؐ کے واسطے دینے لگی۔ کھالے نے اُسے جھٹک کر چارپائیوں کے بیچ پھینک دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

جان بچانے کے لیے میں نے اپنی آخری کوشش کی۔

"کھالے! مم..... میں اُٹھ نہیں سکتا..... میں مر رہا ہوں کھالے....."

اُس کا وحشیانہ قہقہہ کمرے میں گونج اُٹھا۔ ہنستے ہنستے پھر میرے پاس بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "ہاں شہرے خان! تو مر رہا ہے۔ میں جانتا ہوں مگر تو یہ نہیں جانتا کہ میں تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ یہ دیکھ....."

اُس نے خنجر پوری قوت سے میرے بازو میں گھونپ دیا۔ مجھے اُس کا خنجر والا ہاتھ نیچے آتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ یوں لگا جیسے خنجر راہ میں ہی رُک گیا ہو۔ تکلیف نہیں ہوئی۔ اُس کا ہاتھ پھر ہوا میں بلند ہوا۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئیں کہ خنجر کا پھل خون سے تر تھا۔ میں نے گردن اُٹھا کر اپنے بازو کو دیکھا۔ خون سے قمیص سرخ ہو رہی تھی۔ ایسے میں اُس نے دوسرا وار بھی کردیا۔ پہلے زخم کے اوپر یا کچھ فاصلے پر خنجر بازو کی مچھلی میں پیوست ہوگیا۔ اَب کے تھوڑی سی چبھن محسوس ہوئی تھی۔ میں چلایا۔ "کھالے! میرا قصور نہیں ہے....."

"اَبے چپ رہ گدھے کی اولاد....."

اُس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور آنکھوں سے موت کا رقص ہویدا تھا۔ مجھے یک ٹک دیکھے جا رہا تھا، پھر اُس نے میرے بازو کی طرف نگاہ کی۔ ایسے میں چونک گیا۔ ایک انچ چوڑا پھل دو مرتبہ بازو کے پار ہو چکا تھا مگر میرے بازو میں حرکت نہیں ہوئی تھی۔ اتنے ضبط کی توقع کسی ذی حس انسان سے نہیں کی جاسکتی۔ وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تجھے درد نہیں ہوتا۔ ہیں؟ اچھا..... اپنی برداشت دکھا رہا ہے کھالے کو۔ ہیں؟"

اُس کے لبوں سے پھر قہقہہ اُبل پڑا۔ میں نے بہ وقت تمام کہا۔ "کھالے! میرا جسم سُن ہوگیا ہے۔ مجھے چوٹ لگی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے مجھے مت مار، میری مدد کر، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا..... خدا کے لیے کھالے..... پہلے میری بات تو سن لو، پھر بے شک مار دینا....."

اُس نے پہلو بدلا۔ اُس کا چہرہ فرطِ غیظ سے بالکل سیاہ پڑ گیا اور آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ دانت کچکچا کر بولا۔ "پہلے میری بات سن لو..... ہاں..... تاکہ تم مجھے اپنی لچھے دار باتوں میں اُلجھا لو۔ اور تم نے کوئی گناہ نہیں کیا..... ہاں..... کارے (کمین) کی عزت پر ہاتھ ڈالنا کوئی گناہ تھوڑا ہی ہے۔ ہم نے اپنی بہنیں خانزادوں کے لیے ہی تو پال رکھی ہیں۔ شہرے! تم معافی کے قابل نہیں ہو۔ تم یار مار ہو، تم نمک حرام ہو..... بس!"

اُس کا ہاتھ برق رفتاری سے ہوا میں بلند ہوا اور آنکھیں میرے سینے پر جم گئیں۔

معاشرتی ناہمواریوں سے مزین دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

"آمریت!"

"مردہ باد!"

"جمہوریت!"

"زندہ باد!"

"ہاتھوں میں ہاتھ دو۔"

"آمریت کو مات دو۔"

"جمہوریت۔"

"زندہ باد!"

"آمریت۔"

"مردہ باد!"

لوگوں کا ہجوم اس قسم کے پرجوش نعرے لگاتا ہوا ایک بڑی سی عمارت کے وسیع و عریض احاطے میں آکر ٹھہر گیا۔ یہ سب جمہوریت کے حامی تھے، مگر مختلف سیاسی پارٹیوں سے ان کا تعلق تھا جو جمہوریت کی علمبردار اور حامی تھیں۔ ان میں "الف" پارٹی کے لوگ بھی شامل تھے۔ "ب" بھی موجود تھی، "پ" سیاسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے بھی اس میں موجود تھے۔ "ت" نامی سیاسی پارٹی بھی شامل تھی۔ اس وقت یہ سب ایک اور ہم آواز ہو کے آمریت کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔

ان کے دائیں جانب ایک اور گروہ کے لوگ بھی موجود تھے، ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ یہ مختصر یا تھوڑی تعداد رکھنے والا گروہ آمریت کا حامی تھا مگر یہ خاموش تھے۔

انارکی اور بے چارگی کا سنگین منظر نامہ

بمقابلہ جمہوریت

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

سیاست سے کھلواڑ... اب تو عہدِ حاضر کا خاصہ بنتا جارہا ہے اور اس ہنسی ٹھٹھول کا براہِ راست نشانہ عوام کو بننا پڑتا ہے... مگر کیا کیجیے کہ حالات "نہ اگلے چین نہ نگلے چین" کے مانند حلق میں پھنس کر رہ گئے ہیں... ایسے میں اگر کسی کا دم گھٹتا ہے تو گھٹ جائے، جب حالات اتنے سفاک ہو جائیں تو کہیں سنگساری اور کہیں سنگباری کے واقعات رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔

جس عمارت کے سامنے یہ دونوں مخالف گروہ کھڑے تھے، اس کے اندر کا منظر سادہ تھا۔ ایک ہال کمرے کے وسط میں ایک مستطیل میز تھی اور اس کے دونوں سروں پر صرف دو مگر قدرے اونچی پشت گاہ والی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جو خالی تھیں، دونوں کرسیوں کے عقب میں دو دروازے تھے جو اس وقت بند نظر آرہے تھے، ہال کمرے میں خاموشی تھی، کمرا خالی تھا۔

عمارت کے باہر احاطے میں دونوں مذکورہ گروہ کے لوگ اب خاموش کھڑے تھے کیونکہ ان کے سامنے بنے ایک چبوترے پر چھریرے جسم کا حامل ایک شخص ڈائس پر کھڑا مائک پر ان سے مخاطب تھا۔

"آپ لوگوں کے ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے کمال "نظم وضبط" کا مظاہرہ کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے سہی خاموشی اختیار کی اور مجھے کچھ کہنے کا موقع دیا۔ زندہ اور باشعور قوموں کا یہی وتیرا ہونا چاہیے کہ وہ ہر مسئلے کا حل، خواہ وہ سیاسی ہو، مذہبی ہو یا سماجی، Table talk کے ذریعے نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جسے عام فہم میں "مکالمہ" بھی کہا جاتا ہے۔ جذباتیت کسی مسئلے کا حل ہرگز نہیں، عموماً دیکھا گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں جذباتیت کی رو میں بہہ جانا ایک روایت بن گیا ہے، اس سے ناانصافی، بے رحمی اور تخریب کاری جنم لیتی ہے، تنگ نظری اور تعصب بھی اس کا باعث بن سکتا ہے، یاد رکھیے...... جذباتیت میں چور بھی چھپا ہوتا ہے، جی ہاں...... چور...... جذباتیت کا مظاہرہ وہی لوگ کرتے ہیں جن کے پاس اپنے کسی موقف کے دفاع کے لیے کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہوتی یا وہ لاجواب ہونے لگتے ہیں پھر نام نہاد جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہڑبونگ مچانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ بات آئی گئی ہوجائے، خیر......!" وہ آدمی سانس لینے کو رکا۔ پھر مزید کہنا شروع ہوا۔

"میرا بذات خود کسی گروہ سے تعلق نہیں ہے، میں نیوٹرل ہوں، ہاں! سچ اور حق بات کا داعی ضرور ہوں، جمہوریت بہتر ہے یا آمریت...... ابھی ذرا دیر بعد ہی اس عمارت کے اندر ایک بڑے ڈیموکریٹ اور ڈکٹیٹر کے درمیان Table talking کا آغاز ہونے والا ہے، یہ دونوں مذکورہ اشخاص مدلل بحث کے ذریعے اپنے اپنے موقف یا نظریے کو درست ثابت کرتے ہوئے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہر مکالمے کا کوئی نتیجہ برآمد ہونا چاہیے۔

چونکہ کسی بھی تعمیری بحث یعنی بحث برائے اصلاح کو منطقی انجام تک پہنچنا چاہیے۔ اس لیے اس مکالمے کی خوبی یہ ہے کہ جیسے ہی یہ بحث اپنے منطقی انجام کو پہنچے گی اس کی تمثیل ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے، اس کے بعد یا جمہوریت رہے گی یا پھر آمریت......"

اتنا کہہ کر آدمی نے خاموشی اختیار کرلی۔

آمریت پسند گروہ پر مکمل خاموشی طاری تھی جبکہ جمہوریت پسند گروہ چہ میگوئیوں کا شکار تھا۔ وہ ایک دوسرے سے سینہ پھلا کر کہہ رہے تھے۔

"دیکھنا آمریت کا منہ کالا ہوگا اور جمہوریت کا بول بالا۔"

"الف" پارٹی سے تعلق رکھنے والے نے کہا تو "ب" پارٹی کے ایک عہدے دار نے اس کی حمایت میں کہا۔

"ہاں بابا کیوں نہیں...... کیوں نہیں...... جمہوریت آخر جمہوریت ہے۔ ریت تھوڑی ہے جو ڈھے جائے، یہ پکی اینٹوں کی دیوار رکھتی ہے بابا۔" وہ اپنی اجرک درست کرتے ہوئے بولا تو "پ" سے تعلق رکھنے والے نے بھی جمہوریت کے حق میں لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

"خوچہ امارا بھی یقین اسی پر ہے مملکت خداداد کو جمہوریت ہی راس آئے گا۔"

"ت" کی سیاسی پارٹی کے کارکن نے بھی جمہوریت کے حق میں گرہ لگانا اپنا فرض اولین سمجھا، بولا۔ "شاوا جے شاوا...... جمہوریت دی گل اے، بھلا کوئی جمہوریت دے پچھے وی پے سکدا اے" (بھلا کوئی جمہوریت سے انکار کرسکتا ہے)

"ٹ" سے تعلق رکھنے والے نے اپنی ریش دراز پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "الحمدللہ...... سانچ کو آنچ نہیں۔"

معاملات مدلل رخ اختیار کرتے جارہے تھے۔

❖❖❖

ہال کی خاموش اور ساکت فضا کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وقت کو موت آگئی ہو۔ مستطیل میز کے دونوں سروں پر دھری کرسیاں ہنوز خالی تھیں۔ دفعتاً ہال میں سرسراہٹ ابھری۔ کرسیوں کے عقب کے دونوں دروازے بیک وقت کھلے تو ایک دروازے سے لمبا چوڑا شخص برآمد ہوا، اس کے کاندھوں پر اجرک دھری تھی سر پہ اونچے شملے والا پگڑ باندھ رکھا تھا، پیروں میں پشاوری جوتے تھے، گویا اس کی وضع قطع ایسی تھی کہ وہ ملک کی چند بڑی جمہوریت پسند سیاسی پارٹیوں کی نمائندگی کر رہا ہو، اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی وہ بڑے کروفر سے چلتا ہوا اپنی کرسی پر آکر براجمان ہوگیا، یہ ڈیموکریٹ تھا، اس کی آنکھوں میں اس وقت غضب کی نخوت تھی، چہرے کے تاثرات میں گھمنڈ آمیز تناؤ تھا اور وہ بڑی کھا جانے والی نظروں سے اپنے سامنے والی خالی کرسی کے عقب میں کھلے دروازے کی طرف گھورے جارہا تھا، جدھر ایک ڈکٹیٹر کھڑا تھا، وہ درمیانے قد کا آدمی تھا، خوب گھٹا ہوا جسم تھا اس کا، اس نے قیمتی سوٹ زیب تن کر

رکھا تھا، چہرہ سپاٹ اور آنکھیں کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھیں۔ اس نے صرف ایک نظر سامنے کرسی پر بیٹھے ڈیموکریٹ پر ڈالی اور خاموشی سے اپنی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ ڈیموکریٹ نے اپنی دستی گھڑی پر وقت دیکھا اور سامنے بیٹھے ڈکٹیٹر سے بڑی مغرور اور نخوت زدہ آواز میں بولا۔

"میرے پاس وقت کم ہے، جلدی بات کرو۔"

"میرے پاس وقت ہے، ابھی بات شروع کرتے ہیں۔" ڈکٹیٹر نے جواباً بردباری سے کہا۔ پھر ہولے سے کھنکار کر کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ ڈیموکریٹ بول پڑا۔ "ویسے تم نے بلاوجہ اپنا اور میرا وقت ہی ضائع کیا، اول آخر شکست تمہاری ہے۔"

"شاید تمہاری بات درست ہو۔" ڈکٹیٹر نے سپاٹ لہجے میں اور کھلے دل سے اعتراف کیا اور تب کچھ کہنے سے قبل اس کے ہونٹوں پر پہلی بار اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی، بولا۔

"پہلے اپنی افادیت گنواؤ۔"

"بے شمار۔" ڈیموکریٹ نے گردن اکڑا کر کہا۔ "پہلا فائدہ بیرونی امداد کے دروازے ہم پر کھلے رہتے ہیں، ہماری وجہ سے ملک میں دولت کی ریل پیل ہوجاتی ہے اور......"

"اور...... پھر بندر بانٹ شروع ہوجاتی ہے۔" ڈکٹیٹر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ اس کے لہجے میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔ "یہ سارا روپیہ عام عوام کو ملنے کے بجائے صرف حکومت وقت کی پارٹی کے لوگوں کو ملتا ہے، عوام کو وعدوں پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔"

"یہ محض پروپیگنڈا ہے۔" اس کی بات پر ڈیموکریٹ آنا کانی کرنے لگا۔ ڈکٹیٹر نے اگلا سوال داغا۔

"گزشتہ سال ملک میں سیلاب آیا، تیرہ سے زائد ممالک نے سروے کرنے کے بعد امداد جاری کی تو "وطن کارڈ" کی صورت میں یہ روپے زیادہ تر تمہاری پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کو ملے، جبکہ عوام کے لیے "وطن کارڈ" کا حصول ایک فضول اور نہ ختم ہونے والے "لانگ پروسس" کے نام پر "جام" کردیا گیا، کیوں؟ جبکہ یونیسیف کے ایک ادارے کے اعداد و شمار کے مطابق سیلاب زدگان کے لیے تیرہ سے زائد ممالک کی طرف سے اربوں ڈالرز کی شکل میں ملی ہوئی امدادی رقم اتنی تھی کہ اس سے دس مملکت خداداد بن سکتی تھیں، مگر یہاں تو بے چارہ ایک اجڑا اجڑا ملک ہی پورا تعمیر نہ ہوسکا۔"

"دلیل دو، یا ثبوت پیش کرو۔" ڈیموکریٹ کا خون ابلنے لگا تھا۔

"اتنی امداد آنے کے باوجود پھر کیوں اب تک سیلاب سے متاثر بستیاں آباد نہیں ہوئی ہیں، لوگ ابھی تک بے گھر ہیں، کیمپوں میں زندگیاں گزار رہے ہیں، ایک سال گزرنے کے باوجود ابھی تک وطن کارڈز پوری طرح تقسیم کیوں نہیں ہوئے؟"

"تم اب گڑھے مردے مت اکھاڑو، کسی نئے ایشو پر بات کرو۔" ڈیموکریٹ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ جواباً ڈکٹیٹر کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ ابھری، بولا۔

"تمہاری وجہ سے ملک اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے، توانائی کا ایسا بحران آیا کہ بڑی بڑی صنعتیں بند ہوگئیں، لوگ بیروزگار ہوگئے۔"

"یہ پرانا ایشو ہے، اسے چھوڑو۔"

"اس ضمن میں صرف ایک سوال کا جواب جاننا چاہوں گا۔" ڈکٹیٹر نے ڈیموکریٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ہاں! پوچھو۔" وہ بیزار نظر آنے لگا۔

"آج سے کئی سال پہلے تمہارے جیسی ہی ایک جمہوریت کی علمبردار پارٹی برسراقتدار تھی تو، اس وقت کے بجلی اور پانی کے ایک وفاقی وزیر نے مذکورہ پارٹی لیڈر کی توجہ اس خدشے کی طرف دلاتے ہوئے کہا تھا کہ آئندہ آٹھ دس سالوں میں مملکت خداداد میں بہت شدید بجلی اور توانائی کا بحران آنے والا ہے لہٰذا اس مصیبت سے بچنے کے لیے اگر ابھی سے قدم اٹھا لیے جائیں تو اس سے بچا جاسکتا ہے، مگر اس کی بات نہیں مانی گئی کیوں......؟ کیا یہ بات جمہوریت کے اصولوں کی منافی نہیں؟"

"اڑے بابا! ابھی کی، آج کی بات کرو ناں...... وہ اس وقت کی حکومت یا پارٹی جانے......" ڈیموکریٹ نے ہاتھ جھٹک کر کہا تو ڈکٹیٹر نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ہم یہاں صرف کسی ایک سیاسی پارٹی کی کارکردگی پر بات کرنے کے لیے اکٹھے نہیں ہوئے ہیں، بات جمہوریت اور آمریت کی ہورہی ہے کہ کون مملکت خداداد کے لیے سودمند ثابت ہوسکتی ہے، تم دو، دوبار "بھاری" عوامی مینڈیٹ کے ساتھ برسراقتدار آتے رہے...... مگر ایک دوسرے کے ساتھ رساکشی اور کرسی کھینچنے اور بچانے کے سوائے تم نے عوام کے لیے کیا، کیا؟"

"ہمارا دو دوبار برسراقتدار آتے رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام جمہوریت پسند ہے اور اول آخر ہمیں ہی پسند کرتی ہے۔" ڈیموکریٹ کے لہجے میں غرور تھا۔

"غلط، تمہاری جمہوریت، جاگیردارانہ نظام کے تحت پھلتی پھولتی ہے، لیڈرشپ کے تحت نہیں۔" ڈکٹیٹر نے بڑے مستحکم لہجے میں یہ بات بتائی۔

"تم اپنے بارے میں بتاؤ، تم نے بھی تو اب تین چار بار مملکت خداداد کی باگ ڈور سنبھالی، تم نے کون سے تیر چلا دیے۔" ڈیموکریٹ نے خارزار لہجے میں ڈکٹیٹر کو گھور کر کہا۔

"ہمارے دور اقتدار میں عام آدمی ہم سے خوش تھا، وہ سکون اور چین کی نیند سوتا تھا، بدمعاشی اور بھتا خوری بند ہوگئی تھی، سیاسی ٹارگٹ کلنگ بالکل بند ہو کے رہ گئی تھی، جبکہ مذہبی ٹارگٹ کلنگ میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی تھی، دن دہاڑے گھروں میں گھس کر گن پوائنٹ پر کبھی لوٹ مار نہیں ہوئی، بسوں اور عام مسافروں پر فائرنگ کبھی نہیں ہوئی، شناختی کارڈ چیک کر کر کے دوسری زبان کے لوگوں کو قتل نہیں کیا گیا۔ لسانیت کو ہوا نہیں ملی، بیرون ملک سے لوگ یہاں سرمایہ بھیجنے لگے، زرمبادلہ میں خاطر خواہ نہیں تو مقابلتاً اضافہ ضرور ہوا۔ جنگل میں ایک شیر کی حکمرانی سب کے لیے ساجھی تھی، جبکہ تم جمہوریت کے علمبردار جب بھی اقتدار میں آتے ہو، تو تمہاری آپس کی لڑائیاں، قتل، ٹارگٹ کلنگ اور بدمعاشیاں عروج پر ہوتی ہیں، بھتا خوری کے لیے علاقے بانٹ لیے جاتے ہیں اور جہاں بھتا خوری کے سلسلے میں ذرا بھی "اوور لیپنگ" ہوئی وہاں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ تم جمہوری پارٹیوں نے اس ملک کو اس عوام کو دیا ہی کیا ہے، آج تک سوائے تخریب کاری اور انارکی کے، میں جمہوریت کے خلاف نہیں، مگر آج مملکت خداداد کے جو حالات دگرگوں ہیں انہیں دیکھتے ہوئے مجھے اس کا ایک ہی حل نظر آتا ہے اور وہ ہے آمریت۔"

"بکواس بند کرو اپنی......" ڈکٹیٹر کی تیز و تند باتیں سن کر ڈیموکریٹ غصے سے پھٹ پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ دونوں دست و گریبان ہو جاتے، وہی آدمی جانے کہاں سے نمودار ہوا، اس کے ہمراہ تین اور بھی آدمی تھے، جو کہیں پس منظر میں ان کی گفتگو نوٹ کر رہے تھے اور نمبر لگا رہے تھے، انہوں نے آ کر انہیں سنبھالا۔ نہ صرف یہ بلکہ نتیجے کے طور پر اس شخص نے جو تھوڑی دیر پہلے باہر لوگوں سے مخاطب تھا، ان دونوں سے بولا۔

"ہم نے آپ دونوں کی گفتگو سے نتیجہ نکال لیا ہے کہ اب مملکت خداداد میں کس کی حکومت ہونی چاہیے۔" وہ رکا پھر بولا۔ "مگر آپ دونوں پہلے آرام سے بیٹھ جائیں اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کر کے رزلٹ سنیے۔"

وہ دونوں بیٹھ گئے۔

اسی آدمی نے ایک کاغذ ہاتھ میں لیا اور پڑھنے لگا۔

"جیسا کہ ملکی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے، گزشتہ روز عام عوامی رائے لی گئی تھی کہ کیا وہ اس سلسلے میں جمہوریت اور آمریت کے مابین "مکالمہ" یا "ڈائیلاگ" کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں کہ دونوں میں سے کون سی "ترکیب" مملکت خداداد کے حال اور مستقبل کے لیے بہتر رہے گی، تو اس سلسلے میں متفقہ طور پر تقریباً اسی فیصد لوگوں نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ جس سے یہ ایک بات تو ظاہر ہو ہی گئی کہ عوام کی خاصی تعداد جمہوریت یا جمہوری پارٹیوں سے نالاں ہے، خیر..... میں آپ کو رزلٹ بتائے دیتا ہوں...... کہ...... موجودہ حالات کے تناظر میں جمہوریت کے بجائے...... آمریت ہی......" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ڈیموکریٹ اپنی کرسی سے اچھل کے اس آدمی پر جھپٹ پڑا اور پرچہ لے کر اس کے پرزے پرزے کر ڈالے اور باہر آ کر اپنے خاص گروہ سے چلا چلا کے کہنے لگا۔

"جمہوریت جیت گئی، آمریت ہار گئی۔"

لوگ خوش ہو کر نعرے لگانے لگے۔ دوسرا گروہ منہ لٹکا کے خاموش کھڑا تھا۔

اندر ڈکٹیٹر بہت مطمئن نظر آ رہا تھا اور اس پریشان حال آدمی کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔

"مکالمے" کے نام پر چلنے والی یہ بحث اپنے نتیجے کی جانب تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔

ڈکٹیٹر کی بات سن کر وہ آدمی باہر نکلا اور ڈکٹیٹر کے خاص گروہ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں اس نے نہایت دھیمے اور رازدارانہ لہجے میں انہیں ڈکٹیٹر کا پیغام سنایا اور پھر واپس عمارت کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈکٹیٹر گروپ سے ایک شخص نہایت خاموشی کے ساتھ جمہوریت پسندوں کے خوشی سے مچلتے ہوئے گروپ میں شامل ہو گیا اور کسی ایک جمہوریت پسند پارٹی کے کارکن کے کان میں کچھ کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہاتھوں میں ہاتھ دیے کھڑے خوشی اور فتح و کامرانی کے نعرے لگانے والے جمہوریت پسند گروہ میں کھلبلی مچ گئی، دیکھتے ہی دیکھتے "الف"، "ب"، "پ" وغیرہ پارٹیوں کے لوگ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو گئے، کہاں تو تھوڑی دیر پہلے آمریت کے خلاف متحد تھے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بھائی چارے کا سمبل بنے ہوئے تھے اور اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے۔

ڈکٹیٹر نے صرف یہ پیغام دیا تھا کہ کسی طرح کسی ایک جمہوریت پسند پارٹی تک یہ بات پہنچا دو کہ فلاں جمہوریت پسند پارٹی نے اس "مکالمے" کی کامیابی کا سارا کریڈٹ اپنی سیاسی جماعت کے نام کر کے عوام میں عام مقبولیت حاصل کرنا چاہی ہے تاکہ آنے والے عام انتخابات میں اس کی جماعت لنگڑی لولی جمہوری حکومت قائم کرنے کے بجائے بھاری اور اکثریت سے ووٹ مینڈیٹ لے کر...... ایوان میں مضبوط حکومت بنا لے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا وہاں قیام کرنا اکیس کے مفاد میں تھا لیکن اس کے درباریوں کے تیور کچھ اور تھے۔ وہ بادشاہ پر زور ڈال رہے تھے کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی ملازمت میں نہ رکھے۔

"کیا یہ وہی شخص نہیں جس نے جالوت کو قتل کر کے ہمیں شکست سے دوچار کرایا تھا اور ہمارا قتل عام ہوا تھا۔ ہم وہ دن کبھی نہیں بھول سکتے۔"

حضرت داؤد علیہ السلام کی بڑے پیمانے پر مخالفت ہو رہی تھی۔ انہیں تو اب یہ شک ہو رہا تھا کہ موت یہاں بھی ان کے

مخالف حالات اور جالوت سے مقابلہ کرنے والے نبی کا احوال

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اللہ کی اپنے بندوں سے محبت دنیاوی ممتا سے ستر گنا زیادہ ہے تب ہی وہ ان کی رہنمائی کے لیے گاہے بگاہے نبیوں کو مبعوث کرتا رہا ہے... جب جب انسان نے اندھیروں کی طرف سفر شروع کیا تب تب اپنا نور اس نے دنیا میں بھیجا۔ بنی اسرائیل... ایک ایسی قوم جس پر اللہ نے اپنی نعمتوں اور رحمتوں کی بارش کر دی مگر... افسوس کہ یہ قوم لالچ، طمع اور گمراہی سے خود کو نہ بچا سکی۔ ایسے میں ہی حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا اور یہ وہ نبی ہیں جنہیں اللہ نے بادشاہت اور نبوت ایک ساتھ عطا کی... نہ صرف یہ بلکہ ان پر پرندوں کی زبان کو بھی آسان کر دیا اور آپ علیہ السلام کے سامنے پتھروں کو بھی زبان عطا کر دی۔ سبحان اللہ... تو کون ہے جو سبق حاصل کرے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

رضوانہ ساجد

تعاقب میں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی مجھے قتل کردے گا۔ اکیس بادشاہ بھی ان کے دباؤ میں آکر مجھے نکال دے گا۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ جس حال میں رکھے میں خوش رہوں گا۔ انہوں نے بادشاہ سے بات کی۔

''تیرے درباری مجھے برداشت کرنے کو تیار نہیں۔'' حضرت داؤد علیہ السلام نے اکیس سے کہا۔ ''تو ایسا کر مجھے دارالسلطنت سے دور کوئی علاقہ رہنے کو دے دے۔ میں اپنے آدمیوں کو لے کر وہاں چلا جاؤں۔ تو جب کہے گا میں اپنے لشکر سے تیری مدد کروں گا۔''

یہ بات بادشاہ کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے صقلاج کا علاقہ انہیں رہنے کو دے دیا۔ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں تھا۔ کبھی یہ اسرائیلیوں کے پاس تھا پھر اس پر فلسطینیوں نے قبضہ کرلیا تھا اور اب حضرت داؤد علیہ السلام کو مل رہا تھا۔

یہ شہر سرحد پر واقع تھا اور یہاں پہلے ہی سے کچھ اسرائیلی خاندان آباد تھے لہٰذا حضرت داؤد علیہ السلام کو اس شہر میں اپنائیت محسوس ہوئی۔ ان کے ساتھی بھی بھاگتے بھاگتے تنگ آچکے تھے۔ بہت دن بعد انہیں رہنے کے لیے قصیل دار شہر ملا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو صقلاج میں رہتے ہوئے ایک سال ہوگیا تھا۔ یہاں کے رہنے والے ان کے شکر گزار تھے کہ ان کی موجودگی کی وجہ سے عمالیقی لوٹ مار کے لیے اس طرف نہیں آئے تھے ورنہ یہ خانہ بدوش لٹیرے آئے دن لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ صقلاج کے لوگ ان کے احسان مند تھے۔

ایک دن اکیس بادشاہ کا قاصد صقلاج آیا اور پیغام دیا کہ وہ اپنے سپاہیوں سمیت جات میں حاضر ہوجائیں۔

فلسطینی دیکھ رہے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، اپنی قوم سے الگ ہوگئے ہیں۔ ان کی قوم دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک گروہ طالوت کے ساتھ ہے دوسرا حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ۔ اب اسرائیلیوں میں اتحاد باقی نہیں رہا تھا۔ وہ کمزور ہوچکے ہیں لہٰذا ان پر حملہ کردیا جائے۔ اسی حملے میں ساتھ چلنے کے لیے حضرت داؤد علیہ السلام کو پیغام بھیجا گیا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ سخت رنجیدہ ہوئے۔ کیا مجھے اپنی قوم پر تلوار اٹھانی پڑے گی؟ میں قسم کھا چکا ہوں کہ طالوت کو نہ تو قتل کروں گا اور نہ اس سے جنگ کروں گا۔ اے خدا! میری قسم کو قائم رکھ۔ مجھے اس امتحان سے بچالے۔

انہوں نے اکیس بادشاہ سے وفاداری کی شان دکھائی۔ قاصد سے کہہ بھی دیا کہ بادشاہ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اپنے ساتھیوں کو لے کر چل بھی دیے لیکن دل میں یہی تھا کہ یہ معرکہ ٹل جائے۔

وہ ''رفیق'' کی طرف روانہ ہوگئے جہاں فلسطینی فوجیں اکٹھی ہورہی تھیں۔ راستے بھر ان کے سپاہی بھی چہ میگوئیاں کرتے رہے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، طالوت سے لڑنے پر کیونکر آمادہ ہوگئے ہیں جبکہ وہ یہ کہتے رہے تھے کہ طالوت خدا کا ممسوح ہے وہ اس کے خلاف تلوار نہیں اٹھائیں گے۔

یہی سوچتے سوچتے وہ افیق تک پہنچ گئے۔

انہیں دیکھتے ہی فوج کے عہدے داروں کے ماتھے شکنوں سے بھر گئے۔ وہ اس برہمی کی حالت میں اکیس بادشاہ کے سامنے پہنچے۔

''حضور آپ نے داؤدؑ کو کیوں بلالیا۔ اس کا ہمارے درمیان کیا کام۔''

''کیا تم نہیں جانتے کہ یہ طالوت کا دشمن ہے اور بہادر بھی ہے۔ یہ ہماری جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر لڑے گا۔''

''یہ شخص ہمارے ساتھ صرف اس لیے جارہا ہے کہ طالوت پر دباؤ ڈال کر اپنے لیے معافی حاصل کرلے اور عین جنگ کے دوران ہم سے الگ ہوکر اپنی قوم کے ساتھ مل جائے۔''

''داؤدؑ ہمیشہ ہمارا وفادار رہا ہے۔''

''مگر ہم اس پر اعتبار نہیں کرسکتے۔ اسے فوراً واپس بھیج دیں۔ یہ ہمارے ساتھ نہ جانے پائے۔''

اکیس بادشاہ عجیب کشمکش میں تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر اس کی فوج مخالفت کررہی تھی بالآخر اس نے حضرت داؤد علیہ السلام سے معذرت کرلی۔

''میری فوج تمہاری مخالف ہے لہٰذا میں مجبور ہوں۔ میرے افسران کو اشتعال مت دلاؤ بلکہ چپ چاپ صقلاج روانہ ہوجاؤ۔''

انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے خدا کا شکر ادا کیا جو قدم قدم پر ان کی مدد کررہا تھا۔ خدا نے ان کی قسم کی لاج رکھ لی تھی۔ وہ طالوت کے خلاف تلوار اٹھانے سے بچ گئے تھے۔

دوسرے دن وہ اپنے ساتھیوں سمیت پھر صقلاج کی طرف چل پڑے۔ ابھی صقلاج دور تھا کہ بربادی کے آثار نظر آنے لگے۔ بستی کی طرف سے دھواں اٹھتا نظر آرہا تھا۔ قریب گئے تو حقیقت آشکارا ہوگئی۔ وہ اپنی آنکھوں سے شہر کو دیکھ رہے تھے جو جل کر خاکستر کردیا گیا تھا۔ مکانوں اور کمینوں کی جگہ راکھ کے ڈھیر تھے۔ ان کے تمام ساتھی اپنے بیوی بچوں کو اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے مگر اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس شہر کو جس نے بھی آگ لگائی تھی وہ یا تو انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے یا وہ جل کر راکھ ہوگئے تھے۔

یہ حادثہ ایسا تھا کہ تمام لوگ مشتعل ہوکر حضرت داؤد علیہ السلام کے خلاف ہوگئے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ اس بربادی کا باعث داؤدؑ ہے۔ اگر وہ ہمیں اس ملک میں نہ لاتا تو ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اس کے خدا نے اسے اس قابل نہیں سمجھا کہ اسے بچاتا تو ہم بھی اسے کیوں بچائیں۔ ان مشتعل لوگوں نے یہ تک طے کرلیا تھا کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کو سنگسار کردیں گے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ جو مصیبت آئی ہے اس کے تم ہی نہیں میں بھی شکار ہوا ہوں۔ میری دو بیویاں بھی اسیر ہوئی ہیں لیکن مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ میں خدا کے خلاف ایک لفظ بھی کہوں۔ تم ٹھہرو میں خدا سے پوچھتا ہوں، اب ہمیں کیا کرنا ہے؟ حضرت داؤد علیہ السلام سب کو چھوڑ کر ایک اکیلے گوشے میں عبادت کرنے لگے انہوں نے خدا سے دریافت کیا۔ ''اگر میں ان لٹیروں کو پیچھا کروں تو کیا میں ان کو جالوں گا؟''

جواب آیا۔ ''تو یقیناً ان کو جالے گا اور ضرور سب کچھ چھڑا لے گا۔''

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے لوگوں کو خوش خبری سنائی۔ ''خدا اب بھی ہمارے ساتھ ہے، خداوند اسرائیل کے خدا نے کہا ہے یہ عمالیقی لٹیرے تھے۔ تو اگر ان کا پیچھا کرے تو ان کو ضرور پالے گا اور ضرور سب کو چھڑا لے گا۔''

ان کے پرستاروں نے ایک مرتبہ پھر کمر ہمت باندھی اور ان کے ساتھ ہولیے۔ راستے میں ایک ندی آتی تھی اسے پار کیا۔ تھکن سے چور تھے مگر چلے جاتے تھے۔ ایک جگہ انہیں ایک آدمی ملا جو شکل سے مصری معلوم ہوتا تھا۔ وہ شخص زمین پر پڑا ہوا تھا اور بری حالت میں تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے روٹی اور شہد دیا۔ پانی پینے کے بعد اس کے کچھ حواس درست ہوئے تو اس نے بتایا۔

''میں مصری ہوں اور ایک عمالیقی شخص کا غلام۔ میں بیمار تھا اس لیے میرا مالک مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم بہت سی ٹکڑیوں پر حملے کرتے رہے ہیں اور صقلاج کو بھی ہم نے ہی جلایا تھا۔''

''کیا تم بتاسکتے ہو وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟'' حضرت داؤد علیہ السلام نے پوچھا۔

''اگر آپ قسم کھائیں کہ مجھے قتل نہیں کریں گے تو میں آپ کو اس طرف لے چلتا ہوں جہاں وہ ہوسکتے ہیں۔''

وہ شخص انہیں ایک طرف کو لے کر چلا۔ عمالیقی اس وقت ایک جگہ ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور کامیابی کا جشن منارہے تھے۔ ان کے ناچ گانے کی آوازیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اچانک ان پر حملہ کردیا۔ عمالیقی پہلے تو اس اچانک افتاد سے گھبرا گئے لیکن پھر سنبھل کر مقابلے پر آگئے۔ یہ ایسے سخت جان لوگ تھے کہ اس اچانک حملے کے باوجود مقابلے پر ایسے ڈٹے کہ دوسرے دن شام تک معرکہ گرم رہا۔ سیکڑوں عمالیقی قتل ہوگئے۔ اس کے باوجود سیکڑوں عمالیقی اونٹوں پر بیٹھ کر نکل بھاگے۔ وہ ان تمام لوگوں کو وہیں چھوڑ گئے جنہیں اسیر بنا کر صقلاج سے لائے تھے لہٰذا بڑی کامیابی یہی تھی کہ سب کو ان کے بیوی بچے مل گئے ان میں حضرت داؤد علیہ السلام کی دو بیویاں بھی تھیں۔

گھر بار جل گئے تھے لیکن بچھڑے ہوئے عزیز انہیں دوبارہ مل گئے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام صقلاج میں واپس آگئے۔ اپنی پریشانی سے نجات ملی تو طالوت اور بنی اسرائیل کا خیال آیا جن سے جنگ کرنے کے لیے فلسطینی گئے ہوئے تھے۔

وہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے۔ ''مجھے اپنی قوم کا خیال آرہا ہے۔ نہ جانے ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔ طالوت نے اپنی نادانی سے مجھے خود سے دور کرلیا ہے۔ اگر میں وہاں ہوتا تو اپنی قوم کے کچھ کام آسکتا۔ کوئی خبر آئے تو معلوم ہو وہاں کیا ہورہا ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ جو کچھ ہورہا ہوگا برا ہورہا ہوگا۔''

انہیں صقلاج آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ ایک شخص کو دیکھا جس کے سر پر خاک تھی اور پیراہن چاک تھا وہ بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر حضرت داؤد علیہ السلام پر پڑی وہ سجدے میں گر گیا۔

''تو کون ہے اور کیوں روتا ہے؟'' حضرت داؤد علیہ السلام نے پوچھا۔

''میں اسرائیلی فوج سے آیا ہوں۔''

''کیا خبر لایا ہے؟''

''خبر بہت بری ہے۔ تمام اسرائیلی فوج پراگندہ ہو کر بھاگ گئی اور ہزاروں سپاہی جنگ میں کام آ گئے۔'' یہاں تک کہنے کے بعد وہ پھر رونے لگا۔ جب ذرا دل ہلکا ہوا تو اس نے وہ بات کہہ دی جو حضرت داؤد علیہ السلام سننا نہیں چاہتے تھے۔

''طالوت اور اس کا بیٹا بھی مارے گئے ہیں۔''

''کہیں تو غلط تو نہیں کہہ رہا ہے۔ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ مر گئے ہیں۔''

اس عمالیقی نے یہ تو دیکھ لیا تھا کہ طالوت اس جنگ میں قتل ہوا ہے اور اس طرح قتل ہوا ہے کہ جب اس نے دیکھا کہ اس کے تین بیٹے قتل ہو چکے اور وہ خود بھی تیر اندازوں کے نرغے میں ہے۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس نے اپنی تلوار زمین پر کھڑی کی اور پیٹ کے بل اس پر گر پڑا۔

اب جو اس عمالیقی سے پوچھا گیا تو اس نے اسے اپنے نام سے منسوب کر دیا تا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے دشمن (طالوت) کے مارنے والے سے خوش ہو کر اسے انعام دیں۔

''میں خود کوہ جلبوعہ پر تھا۔ میں نے طالوت بادشاہ کو دیکھا کہ اپنے پیٹ کے ساتھ بھالے کی نوک لگائے ایستادہ۔ طالوت بادشاہ مجھے دیکھ کر چلا اٹھے کہ میرے پاس آؤ۔ میں قریب گیا تو انہوں نے کہا، مجھے اس اذیت سے نجات دلاؤ۔ میں سخت تکلیف میں ہوں مگر میری جان نہیں نکلتی۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے تلوار نکالی اور ایک ہی وار میں انہیں تکلیف سے نجات دلا دی۔ آپ کے دشمن کا قاتل میں ہوں۔ مجھے انعام ملنا چاہیے۔''

انعام کے بجائے حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز گونجی۔ ''تو خداوند کے ممسوح کو ہلاک کرنے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھانے سے کیوں نہ ڈرا۔'' پھر انہوں نے ایک جوان کو نزدیک بلا کر کہا۔ ''نزدیک جا اور اس پر حملہ کر۔''

اس جوان نے اس شخص کو قتل کر دیا۔ یہ اس کے جھوٹ کی اسے سزا تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کی لاش کو مخاطب کیا۔ ''تیرا خون تیرے ہی سر پر کیونکہ تو نے ہی اپنے منہ سے آپ اپنے اوپر گواہی دی اور کہا کہ میں نے خداوند کے ممسوح کو قتل کیا۔''

حضرت داؤد علیہ السلام نے اس مرثیے کے ساتھ طالوت اور جوناتھن کا غم منایا۔

اے اسرائیل تیرے ہی اونچے مقاموں پر
تیرا فخر مارا گیا
ہائے زبردست کیسے گھیت آئے
یہ بات میں نہ بتانا
اسقلون کے کوچوں میں اس کی خبر نہ کرنا
نہ ہو کہ فلسطینیوں کی بیٹیاں خوش ہوں
اے جلبوعہ کے پہاڑو
تم پر نہ اوس پڑے اور نہ بارش ہو
کیونکہ وہاں زبردستوں کی سپر بری طرح
پھینک دی گئی
یعنی ساؤل (طالوت) کی سپر

+++

طالوت اور جوناتھن
وہ عقابوں سے تیز
اور شیر ببروں سے زور آور تھے

اے اسرائیل کی بیٹیو ساؤل پر رو
اس نے تم پر نفیس نفیس ارغوانی لباس پہنائے
سونے کے زیوروں سے تمہاری پوشاک کو آراستہ کیا
ہائے لڑائی میں زبردست کیسے گھیت آئے۔

+++

اب اسرائیلی قوم کا کوئی بادشاہ نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا جو انہیں دشمنوں سے بچاتا۔ اسرائیلی بھاگ بھاگ کر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آ رہے تھے اور انہیں مجبور کر رہے تھے کہ وہ بادشاہت کا اعلان کر دیں۔ خود ان کے ساتھی ان پر زور دے رہے تھے لیکن خدا سے پوچھے بغیر وہ کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ پہلے تو وہ انتظار کرتے کہ خدا ان سے مخاطب ہو اور ان کی رہنمائی کرے۔ پھر وہ اس کی رضا جوئی کے لیے اس کے حضور جھکے۔ خدا نے انہیں مخاطب کیا۔

''یہوداہ کے شہر جبرون چلا جا۔''

ہجرت کے دن ختم ہوئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے خاندان اور اپنے ساتھیوں کے خاندانوں سمیت جبرون چلے گئے۔ جبرون کے لوگوں نے شاندار استقبال کیا۔ لڑکیاں دف بجا بجا کر پھر وہی گیت گا رہی تھیں۔

''ساؤل نے تو ہزاروں کو مارا مگر داؤدؑ نے لاکھوں کو مارا۔''

یہوداہ کے قبیلے کے بزرگوں نے بڑی دھوم دھام سے تاجپوشی کی رسم ادا کی اور ان کو طالوت کے تخت پر بٹھایا۔ اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر تیس برس تھی۔

جبرون میں یہوداہ کے قبیلے نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنا بادشاہ بنایا ادھر ملک کے باقی حصوں میں طالوت کے سپہ سالار انبیر نے طالوت کے ایک بیٹے اشبوست کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ انبیر نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ یہوداہ کے خلاف لشکر کشی کر دی۔ اب بنی اسرائیل واضح طور پر دو حصوں میں بٹ گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نہیں چاہتے تھے کہ یہ خانہ جنگی ہو لیکن یہ جنگ ان پر مسلط کر دی گئی تھی۔

اس خانہ جنگی کے دوران یہوداہ قبیلے اور اسرائیل کے دوسرے قبیلوں کے سیکڑوں جوان خوامخواہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس خانہ جنگی کو دو برس ہو چکے تھے کہ انبیر اور اشبوست کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ انبیر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس جبرون آیا اور ان سے پورے اسرائیل کی بادشاہت کے لیے شرائط طے کرنے لگا۔ ان شرطوں کو مان کر وہ جبرون سے واپس جا رہا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بھانجے یوآب نے اپنے بھائی عسائیل کے قتل کے بدلے میں انبیر کو قتل کر دیا۔ چند دنوں بعد اشبوست بھی اپنے بستر پر اپنے آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

یہ قتل اتنی جلدی جلدی ہوئے کہ اسرائیلیوں نے جان لیا کہ خداوند حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ پھر ہم اس کا ساتھ کیوں چھوڑیں۔

اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اب تک صرف ایک قبیلے کے بادشاہ تھے لیکن اب باقی گیارہ قبیلوں کے نمائندے بھی جبرون آئے اور حضرت داؤد علیہ السلام سے ملے اور ان سے کہا، ہم تیری ہڈی اور تیرا گوشت ہیں۔

ان لوگوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو پورے ملک کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر 37 سال تھی۔ انہیں یہوداہ پر حکومت کرتے ہوئے سات سال ہوئے تھے اور اب وہ پورے ملک اسرائیل کے بادشاہ تھے۔

خانہ جنگی سے فرصت مل چکی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اب پورے ملک کے بادشاہ تھے۔ صرف ایک شہر ''یبوس'' ایسا تھا جو ان کے قبضے میں نہیں تھا بلکہ کسی کے لیے بھی یہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے تسخیر کرنے کا ارادہ کیا۔

''ہم خدائے قادر کی مدد سے یبوس کے ناقابل تسخیر شہر کو فتح کریں گے تا کہ اسے اسرائیل کی سلطنت کا پایۂ تخت بنائیں۔''

اس شہر میں لعانیوں کا ایک قبیلہ آباد تھا۔ اس کے لوگ یبوسی کہلاتے تھے اور شہر کا نام یبوس پڑ گیا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے سرداروں نے سنا تو انگشت بدنداں رہ گئے۔ آج تک کسی اسرائیلی نے اس شہر میں ایک رات کے لیے قیام بھی نہیں کیا تھا، فتح کرنا تو بڑی بات۔ بلند و بالا برجوں اور فصیلوں والا شہر ابھی تک اسرائیلیوں کی عزت کو للکار رہا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا کی طرف سے اشارہ مل چکا تھا اسی لیے وہ نہایت اعتماد کے ساتھ اس شہر کے پھاٹک کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

فصیل سے کسی نے پکار کر کہا۔ ''بزدل یہودیو! تمہیں یہ گمان بھی کیسے ہو گیا کہ تم مٹھی بھر فوج کے ساتھ اس شہر کو فتح کر لو گے۔ ہمارے تو لنگڑے لولے بھی تمہیں بھگا دیں گے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام نے سنا تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس شہر کے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں سوائے ایک زمین دوز نہر کے۔ انہوں نے اپنے لشکر میں اعلان کیا جو شخص اس زمین دوز نہر کے ذریعے سب سے پہلے شہر میں داخل ہو کر کسی یبوسی کو قتل کرے گا اسے میں اپنی فوج کا سپہ سالار بنا دوں گا۔ اس اعلان کو سنتے ہی چند لوگ نہر میں اتر پڑے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا بھانجا یوآب نہایت جوشیلا نوجوان تھا۔ اس وقت بھی وہ سب سے آگے تھا۔

یہ لوگ اسے کوئی عام نہر سمجھ رہے تھے لیکن یہ اندر سے بہت گہری تھی۔ تاریکی میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا' سر کو اوپر رکھنا بھی مشکل تھا۔ کئی تو راستے ہی میں غرق ہو گئے۔ یوآب برابر ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ بالآخر یہ سفر مکمل ہوا۔ روشنی کی ہلکی سی کرن نمودار ہوئی۔ وہ نہر کے دوسرے سرے پر تھا۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ یوآب سب سے پہلے باہر آیا۔ یبوسی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شہر میں داخل ہو گا۔ انہوں نے پھاٹک بند کر دیے تھے لیکن کوئی پہرے پر نہیں تھا۔ سب کے سب فصیلوں پر چڑھ کر یہودیوں کی بے بسی پر ٹھٹھے لگا رہے تھے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ نہر کے ذریعے کچھ لوگ اندر آ چکے ہیں۔ انہیں تو اس وقت معلوم ہوا جب شہر کا دروازہ کھل گیا اور انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کی فوج کو شہر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت تک اپنے دفاع کا وقت گزر چکا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی فوج نے سخت خوں ریزی کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔

یہ شہر صدیوں بعد یہودیوں کے ہاتھ لگا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کا نام یروشلم رکھا۔ جس کا عام مطلب ''سلامتی کا شہر'' ہے۔''

یہ شہر نہ صرف اسرائیل کی سلطنت کی حیثیت سے سیاسی مرکز بنا بلکہ دینی مرکز بھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسی شہر میں قیام اختیار کیا۔

ان کے بڑھتے ہوئے قدم دیکھ کر فلسطینیوں نے ایک مرتبہ اسرائیل پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے اپنے ایک شہر میں جہاں ان کے بت رکھے ہوئے تھے، جمع ہونا شروع کر دیا تا کہ وہاں جمع ہو کر یروشلم کی طرف بڑھیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام صرف بادشاہ نہیں تھے نبی بھی تھے۔ کوئی کام خدا کی مرضی کے بغیر کر ہی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے خدا کی مرضی پوچھی۔

''کیا میں فلسطینیوں سے مقابلے کے لیے جاؤں؟''

''ضرور جا کیونکہ میں انہیں تیرے ہاتھ میں کر دوں گا۔''

انہوں نے اپنے سپہ سالار یوآب کو حکم دیا کہ لشکر تیار کر کے اچانک دھاوا بول دو۔ فلسطینیوں کا لشکر جرار وفائیم کی وادی میں پڑا ہوا تھا۔ اس مرتبہ یہ لشکر عجیب شان سے آیا تھا۔ یہ لوگ اپنے بت اپنے ساتھ لائے تھے اور انہیں وادی میں جا بجا نصب کر دیا تھا۔ گویا حضرت داؤد علیہ السلام اپنا خدا اپنے ساتھ رکھتے تھے تو وہ بھی اپنے بتوں کو اپنے ہمراہ لے آئے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے ان پر بے خبری میں حملہ کیا۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ جان بچا کر بھیڑوں کی طرح بھاگے اور ایسے بھاگے کہ اپنے دیوتاؤں کو بھی وہیں چھوڑ گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان بتوں کو اکٹھا کر کے آگ لگا دی۔

فلسطینیوں نے اپنے دیوتاؤں کی موت کا انتقام لینے کے لیے ایک مرتبہ پھر حملہ کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی فوجوں نے انہیں پھر شکست دی۔ اس مرتبہ فلسطینیوں کو ایسا سبق ملا کہ آئندہ ان کے دلاوروں کی ہمت نہیں ہوئی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے مقابل آئے۔

اس جنگ وجدل کے ماحول سے فرصت ملی اور حضرت داؤد علیہ السلام یروشلم میں اپنے تعمیر کردہ محل میں بیٹھے تو بے چین ہو گئے۔ وہ سوچا کرتے کہ میں تو یہاں دیودار کی لکڑیوں کے گھر میں رہتا ہوں اور خدا کا مقدس صندوق سات پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ ایک گھر میں مقید ہے جہاں چند لوگ ہی اس کا دیدار کرتے ہیں۔

کاہنوں کے شہر نوب میں خیمۂ اجتماع تھا جو ایسی عبادت گاہ تھی جس میں خدا کی خاص حضوری تھی اور جن میں خاص خاص دینی رسومات ادا کی جاتی تھیں لیکن جب سے طالوت نے وہاں کاہنوں کو قتل کیا تھا' اس صندوق کو جبعون میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

جہالت کی تاریکی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چند لوگ ہندوستان سے ایک ہاتھی کسی ایسے ملک میں لے گئے جہاں پہلے کسی نے ہاتھی دیکھا ہی نہ تھا۔ ہاتھی کو ایک تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ لوگوں کو اس بات کا علم ہوا تو اس کمرے کے باہر ہجوم جمع ہو گیا۔ کمرا تاریک اور ہاتھی سیاہ، کسی کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لوگوں نے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر یہ اندازہ لگانا چاہا کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ جس شخص کا ہاتھی کے جسم کے کسی حصے پر ہاتھ لگتا وہ اسی سے ہاتھی کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بنا لیتا۔ جس کا ہاتھ کان پر پڑا اس نے کہا ''یہ بہت بڑے پنکھے جیسا ہے۔'' جس نے ہاتھی کی پیٹھ کو چھوا، اس نے کہا ''یہ تخت کی طرح ہے۔'' جس نے ہاتھی کے پاؤں اور ٹانگوں کو چھوا تھا، اس نے اعلان کیا ''یہ تو ستون جیسا ہے۔''

ہر شخص نے ہاتھی کو جیسا ٹٹول کر دیکھا، ویسا بتایا۔ کسی نے کہا ''الف'' ہے، کسی نے اسے ''ب'' کہا مگر ہاتھی کی ابجد سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ البتہ ان کے ہاتھوں میں روشنی کے لیے شمع ہوتی تو سب کی ایک رائے ہوتی، یہ اختلاف نہ ہوتے اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہاتھی کی شکل وصورت کیسی ہے۔

اقتباس: حکایات رومی وسعدی از ڈاکٹر تصدق حسین

اب حضرت داؤد علیہ السلام سوچ رہے تھے کہ یروشلم میں ایک عبادت گاہ بنائیں اور تابوت سکینہ کو وہاں منتقل کر دیں۔ انہیں خدا کے جواب کا انتظار تھا۔ ایک دن یہ جواب مل گیا۔

خدا فرما رہا تھا۔ ''کیا تو میرے لیے ایک گھر بنائے گا؟ کیونکہ جب سے میں بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لایا آج کے دن تک گھر میں نہیں رہا بلکہ خیمہ اور مسکن میں پھرتا رہا ہوں۔''

حضرت داؤد علیہ السلام نے تابوت سکینہ کو یروشلم لانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تیس ہزار چیدہ چیدہ سپاہیوں کی فوج تیار کی گئی تا کہ یہ قربت تعریم جائے اور ابتداب کے گھر سے وہ صندوق لے کر آئے جو وہاں رکھا ہوا تھا۔ اس صندوق کے لیے ایک خاص خیمہ تیار کرایا گیا تھا کیونکہ اس وقت تک ہیکل تعمیر نہیں ہوا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے تیاریوں کی ساری تفصیلات پر ذاتی طور پر نگاہ رکھی اور موسیقی کے سازوں، سازندوں اور گانے والی جماعت کا خاص انتظام کیا۔

ایک بہت بڑا جلوس خوشی خوشی قربت یعریم کی طرف روانہ ہو گیا۔

گانے والیاں گا رہی تھیں۔

خداوند کے پہاڑ پر کون چڑھے گا۔

اور اس کے مقدس مقام پر کون کھڑا ہو گا۔

وہی جس کے ہاتھ صاف ہیں اور جس کا دل پاک ہے۔

اس صندوق کو قربت یعریم سے لایا گیا۔ جب یہ مجمع یروشلم کے قدیم پھاٹکوں پر پہنچا جو صدیوں تک ان پر بند رہے تھے تو جلوس کے قدم رک گئے۔ سب کو شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ کتنی بڑی مہربانی ہے۔ اب اس شہر میں اس کی پاک حضوری ہو گی۔

گانے والیوں نے پھر گایا۔

اے پھاٹکو اپنے سر بلند کرو

اے ابدی دروازو اونچے ہو جاؤ

اور جلال کا بادشاہ داخل ہو گا۔

یہ جلال کا بادشاہ کون ہے

خداوند جو قوی اور قادر ہے

+++

انہوں نے یہ کارنامہ انجام دے دیا تھا کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو متحد کر دیا تھا۔ اردگرد کے دشمنوں سے انہیں نجات دلا دی تھی۔ یروشلم کو ساری قوم کا مذہبی مرکز بنا دیا تھا۔ عہد کا صندوق، یروشلم میں لا کر رکھا۔ اب انہیں یہ آرزو ہوئی کہ عبادت کے لیے ایک مستطیل عمارت (ہیکل) تعمیر کریں لیکن خدا کی طرف سے ملنے والا جواب خاصا حوصلہ شکن تھا۔

''ہیکل کی تعمیر اس وقت تک ملتوی رکھی جائے جب تک اس کا بیٹا سلیمان تخت نشیں ہو۔''

اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ چونکہ تیرے ہاتھوں نے بہت خون بہایا ہے اس لیے میں تجھے ہیکل کی تعمیر کی اجازت نہیں دے سکتا۔

خدا کی طرف سے اس انکار پر بھی ان کے دل میں رنجش کے بجائے جذبۂ تشکر ہی موجزن تھا کیونکہ اس پیغام میں یہ خوش خبری بھی تھی کہ ان کی بادشاہت ان کی نسل میں منتقل ہوگی اور حضرت سلیمانؑ کا زمانہ ان سے زیادہ پرسکون اور پرامن ہوگا۔

وہ اگر ہیکل کی تعمیر نہیں کر سکتے تھے تو اس مبارک منصوبے کی تیاری تو کر سکتے تھے۔ پس وہ بڑی سرگرمی سے تعمیر کے لیے سامان اکٹھا کرنے میں مصروف رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت سا سونا چاندی، پیتل، لوہا اور عمارتی لکڑی جمع کی تھی اور اسے اس کارِ خیر کے لیے علیحدہ رکھ دیا تھا۔

+++

قرآن مجید، توریت اور اسرائیلی تاریخ اس کی شاہد ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام شجاعت، قوتِ فکر و تدبر جیسے اوصاف میں کامل تھے۔ فتح و نصرت ان کے قدم چومتی تھی اور خدا کا فضل و کرم اس قدر شاملِ حال تھا کہ دشمن کے مقابلے میں ان کی جماعت کتنی ہی مختصر ہوتی کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔ اس لیے بہت تھوڑے عرصے میں شام و عراق، فلسطین اور مشرقی اردن کے تمام علاقوں پر ان کا حکم نافذ ہو گیا۔ ایلہ سے لے کر فرات کے تمام علاقوں اور دمشق تک تمام ملک ان کے زیرِ نگیں تھا اور اگر حجاز کے بھی ان حصوں کو شامل کر لیا جائے جو ان کی قلمرو حکومت کا حصہ بن چکے تھے تو یہ کہنا کسی طرح بے جا نہ ہوگا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی مملکت و حکومت واحد سلطنت تھی جو جدید فلسفہ تاریخ اقوام کے مطابق وحدت عرب یا اس سے بھی زیادہ وسیع وحدت اقوام سامی کی حکومت سمجھی جا سکتی ہے۔ وحی الٰہی کے مشرف نے ان کی عظمت و شوکت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا تھا۔ رعایا کو یہ یقین حاصل تھا کہ اگر حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے کوئی ایسا معاملہ رکھ دیا جائے جو انتہائی پیچیدہ ہو۔ کذب و افترا سے اسے کتنا ہی ڈھانپ دیا گیا ہو تب بھی وحی الٰہی کے ذریعے ان پر حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ جن و انس کسی کو بھی یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کریں۔

ابن جریر نے حضرت ابنِ عباس سے روایت کیا ہے کہ دو شخص ایک گائے کا جھگڑا حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس لے گئے ایک نے دوسرے پر دعویٰ دائر کیا کہ یہ میری گائے ہے اور اس نے غصب کر لی ہے لیکن مدعا علیہ انکار کرتا رہا اور جھگڑے کی بات چیت رات گئے تک چلتی رہی پھر اللہ نے آپ پر وحی فرمائی کہ مدعی کو قتل کر دو۔ صبح ہوئی تو حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعی کو کہا کہ مجھے حکم باری ہے کہ تجھے قتل کر دوں لہٰذا سچ سچ بتا کیا ماجرا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے سچے نبی میں اس پر اپنے دعوے میں بالکل سچا ہوں لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس واقعے سے قبل میں نے دھوکا دے کر اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ یہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کو قصاص میں قتل کر دیا۔

اس قسم کے واقعات ہوتے تھے جن کی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کے حکم اور ان کی عظمت و شوکت کے سامنے سب پست اور فرماں بردار تھے۔

قرآن شاہد ہے۔

''اور ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط کیا اور اس کو حکمت (نبوت) عطا کی اور صحیح فیصلہ کرنے کی طاقت بخشی۔''

شاہی اور بادشاہی کے باوجود حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے مال سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ اہل و عیال کی معاش کا بار بیت المال پر نہیں ڈالتے تھے بلکہ اپنی محنت اور ہاتھ کی کمائی سے حلال روزی حاصل کرتے اور اسے ذریعۂ معاش بناتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''کسی انسان کا بہترین رزق اس کے اپنے ہاتھ کی محنت سے کمایا ہوا رزق ہے اور بے شبہ اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے محنت کر کے روزی کماتے تھے۔''

شیخ بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام دعا مانگا کرتے تھے کہ خدایا ایسی صورت پیدا کر دے کہ میرے ہاتھ کی کمائی آسان ہو جائے کیونکہ میں بیت المال پر اپنی معاش کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ چنانچہ آپ کی اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے

اس طرح پورا کیا کہ آپ کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی طرح نرم کر دیا کہ جب وہ زرہ بناتے تو سخت مشقت اور آلات کے بغیر فولاد کو جس طرح چاہتے کام میں لاتے اور ان کے ہاتھ میں موم کی طرح بہ آسانی ہر قسم کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

قرآن مجید نے اس واقعے کو سورۂ سبا میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''اور ہم نے اس (داؤدؑ) کے لیے لوہا نرم کر دیا تھا کہ نیاز رہیں کشادہ اور اندازے سے جوڑ کڑیاں۔''

سورۂ انبیا میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

''اور ہم نے اس (داؤد) کو سکھایا ایک قسم کا لباس بنانا تاکہ تم کو لڑائی کے موقع پر اس سے بچاؤ حاصل ہو۔''

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ داؤد علیہ السلام سے پہلے لوہے کی صنعت نے اس حد تک ترقی کر لی تھی کہ فولاد کو پگھلا کر اس سے سپاٹ ٹکڑے بنائے جاتے اور ان کو جوڑ کر زرہیں بنائی جاتی تھیں۔ یہ زرہیں بہت بھاری ہوتی تھیں۔ انہیں صرف قوی ہیکل لوگ ہی پہن سکتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہیں خدائے تعالیٰ نے یہ فضیلت بخشی کہ انہوں نے تعلیم وحی کے ذریعے ایسی زرہیں تیار کیں جو باریک اور نازک زنجیروں کے حلقے سے بنائی جاتی تھیں اور ہلکی اور نرم ہونے کی وجہ سے میدان جنگ کا سپاہی اس کو پہن کر بہ آسانی نقل و حرکت بھی کر سکتا تھا اور دشمن سے محفوظ بھی رہتا تھا۔

آپ کو کتاب زبور عطا کی گئی تھی۔ آپ کو یہ معجزہ بھی عطا ہوا تھا کہ آپ جب گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو اس سے فارغ ہونے تک مکمل زبور کی تلاوت کر لیا کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ معجزہ حرکت زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا خدائے تعالیٰ حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے زمانے کو اس مدت میں ایسا سمیٹ دیتا تھا کہ عام حالت میں وہ گھنٹوں کی مقدار بن سکتا ہے یا حضرت داؤد علیہ السلام کو سرعت اور الفاظ کی اس درجہ قوت عطا کر دی گئی تھی کہ دوسرا شخص جس کلام کو گھنٹوں میں ادا کرے۔ حضرت داؤد علیہ السلام بخاری کی نقل کردہ روایت کے مطابق مختصر وقت میں ادا کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔

یہ اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کو آپ کی تلاوت پسند تھی۔ ابن ابی حاتم جعفر بن سلیمان سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام قیامت کے روز عرش کی تجلی کے پاس کھڑے ہوں گے تو اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے کہ اے داؤدؑ آج اسی حسین اور عمدہ آواز کے ساتھ میری بزرگی بیان کرو جس کے ساتھ دنیا میں تم میری بزرگی بیان فرماتے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام فرمائیں گے۔ ''الٰہی اب کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے مجھ سے وہ آواز لے لی ہے۔''

فرمان باری ہوگا۔ ''آج میں دوبارہ تم کو عطا کر دیتا ہوں۔''

اس فرمان کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام جنت کی آسودہ حالی کے ساتھ اپنی پوری قوت عمدہ آواز میں صرف کر دیں گے۔

+++

حضرت داؤد علیہ السلام اب بوڑھے ہو گئے تھے۔ ان کے دو بیٹے امنون اور ابی سلوم ان کے خلاف بغاوت کر چکے تھے۔ ایک وقت تو وہ آیا تھا جب حضرت داؤد علیہ السلام کو یروشلم سے نکلنا پڑ گیا تھا لیکن پھر ان بغاوتوں پر قابو پا لیا گیا۔ امنون اور ابی سلوم یکے بعد دیگرے مارے گئے اور حضرت داؤد علیہ السلام کو دوبارہ یروشلم آنا نصیب ہوا لیکن اب کہن سالی کی بدولت بستر پر لیٹے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ پھر انتظامی معاملات میں خلل پڑنے لگا۔ حضرت داؤد علیہ السلام دو بغاوتیں فرو کر چکے تھے اس لیے انہوں نے سوچا اپنے جانشین کا اعلان فرما دیں۔ انہیں خدا کا پیمان یاد تھا کہ تیرے بیٹا سلیمان بادشاہ بنایا جائے گا اور ہیکل تعمیر کرے گا۔

ایک عام اجتماع میں حضرت داؤد علیہ السلام نے حاکموں، امرا اور کاہنوں کو تاکید کی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کا جانشین اور بادشاہ تسلیم کریں۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے مشیروں کو طلب کیا اور ان سے کہا۔ ''ہمارے بیٹے سلیمان کو شاہی خچر پر سوار کر کے میرے ملازموں کے ہمراہ جیحون لے جاؤ۔ وہاں ناتن نبی اور صندوق کاہن سے اسے مسح کر کے اسرائیل کا بادشاہ بنائیں۔ اسے شاہی تخت پر بٹھایا جائے کیونکہ ہم نے اسے اسرائیل کا بادشاہ بنایا ہے۔''

جب حضرت سلیمان علیہ السلام تخت پر بیٹھ چکے اور فضا نعروں سے گونج چکی تو حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا کے یہ الفاظ یاد آئے۔ ''ہم تیری بادشاہت کو کبھی ختم نہیں کریں گے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام کو نصیحت کی۔

''اے میرے بیٹے سلیمان اپنے باپ کے خدا کو پہچان اور پورے دل اور روح کی مستعدی سے اس کی عبادت کر کیونکہ خدا

سب دلوں کو جانتا ہے۔ اگر تو اسے ڈھونڈے تو وہ تجھ کو مل جائے گا اور اگر تو اس کو چھوڑے تو وہ ہمیشہ کے لیے تجھے رد کر دے گا سو ہوشیار ہو کیونکہ خدا نے تجھ کو مقدس کے لیے ایک گھر بنانے کو چنا ہے سو ہمت باندھ کر کام کر۔"

انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے ہیکل اور اس کی جزئیات کا خاکہ پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ "اس نقشے کا ہر حصہ خدا کی عین ہدایت کے مطابق ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ بہت بھاری ذمہ داری ہے لیکن ہمیشہ ہمت سے کام لینا۔"

خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا۔

"میرے بیٹے سلیمان کو ایسا کامل دل عطا کر کہ وہ تیرے حکموں اور شہادتوں اور آئین کو مانے اور ان سب باتوں پر عمل کرے۔"

حضرت داؤد علیہ السلام اب محسوس کر رہے تھے کہ وہ جلد ہی اس رحیم خالق کے پاس پہنچ جائیں گے جس کا دستِ کرم ہمیشہ انہیں سنبھالتا رہا۔

+++

مشہور محدث حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا عالم بالا میں جب حضرت آدم علیہ السلام کی صلب سے ان کی ذریت نکالی اور ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے ایک خوبصورت چمکتی پیشانی والے شخص کو دیکھ کر دریافت کیا۔ پروردگار! یہ کون شخص ہے، جواب ملا، تمہاری ذریت میں سے بہت بعد میں آنے والی ہستی داؤدؑ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا، اس کی عمر کیا مقرر کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ساٹھ سال۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ الٰہی! میں اپنی عمر کے چالیس سال اس کو بخشتا ہوں۔

اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتقال کے وقت حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر مبارک سو سال تھی۔ توریت وغیرہ میں صرف اتنا بتایا گیا کہ آپؑ نے کہن سالی میں انتقال فرمایا۔

مسند احمد میں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا۔

"حضرت داؤد علیہ السلام میں بہت سخت غیرت و حیا تھی۔ آپ جب باہر جاتے تو باہر سے دروازے بند کر جاتے اور کوئی آپ کے آنے تک داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ کی بیوی نے اچانک صحن کے بیچ میں کسی کو کھڑے پایا تو اس کو کہنے لگیں، اللہ کی قسم ہم کو داؤدؑ رسوا کر دیں گے۔

اتنے میں حضرت داؤد علیہ السلام واپس آ گئے۔ پوچھا تو کون ہے؟ اس شخص نے کہا میں وہ ہوں جو بادشاہوں سے نہیں ڈرتا اور رکاوٹیں مجھے آنے سے نہیں روک سکتیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام فوراً بولے پھر تو اللہ کی قسم آپ ملک الموت ہیں۔ اللہ کے فرمان کو مرحبا ہو۔ پھر کچھ ٹھہرے اور روح قبض ہو گئی۔

جب غسل و کفن اور سارے معاملات سے فارغ ہوئے تو سورج اپنی تپش ڈالنے لگا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کو فرمایا۔ داؤدؑ پر سایہ فگن ہو جاؤ۔ پرندوں نے آپ (داؤدؑ) کی نعش مبارک پر سایہ کر لیا حتیٰ کہ رات نے ظلمت طاری کر دی اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کو فرمایا پر سمیٹ لو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ ہمیں ساتھ ساتھ اشاروں سے سمجھا رہے تھے کہ کیسے پرندوں نے پر پھیلائے اور کیسے سمیٹے اور وہ پرندے بڑے پروں والے باز تھے اور یہ کئی تھے اور سایہ فگن تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ "داؤدؑ شنبہ (ہفتہ) کے دن اچانک وفات پا گئے تھے اور پرندے آپ پر سایہ فگن تھے۔"

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات سو سال کی عمر میں ہوئی اور (ہفتہ) کا دن تھا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملک الموت آپ کے پاس تشریف لائے تو آپ سیڑھیوں سے اتر رہے تھے۔ فرشتے نے عرض کیا مجھے بھی اجازت دیجیے کہ میں بھی آپ کے ساتھ اتروں۔ پھر کہا اے اللہ کے نبی! سال، مہینے، روزی سب کچھ ختم ہو گئے تو حضرت داؤد علیہ السلام وہیں سیڑھیوں پر سجدے میں گر گئے اور فرشتے نے سجدے کی حالت میں روح قبض کر لی۔

ماخذات: قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت

بے ضرر نظر آنے والے پھولوں جیسے انسانوں کا فریب

شیریں زہر

عفشاں مسلم

قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ خون کی ایک بوند سے پیدا ہونے والے انسان کو ذرا سی عقل دے کر کل کائنات کو اس کے لیے مسخر کر دیا اور پھر اس کی مسلسل عرق ریزی اور تحقیق کبھی ایسا رنگ بھی لائے گی اس کا تو اسے خود بھی گمان نہ تھا۔ زندگی کی بساط پر مہروں نے ثابت کر دیا کہ دانش سے بازی کیسے پلٹی جاتی ہے... وہ جو کبھی پھولوں کو زندگی کہتے تھے، جانے کیسے اچانک قاتل روپ میں ڈھل گئے۔

شہد کی فارمنگ کے لیے بنائے گئے ٹریوی فارم کے لکڑی کے بڑے بڑے درجنوں صندوق نما ڈبے اُفقی رخ پر ایک دوسرے پر دھرے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ان ابوں کا کوئی چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ ہو۔ میرے گھر اور اُن کے درمیان خالی میدان تھا لیکن کچن کی کھڑکی سے وہ مجھے صاف نظر آ رہے تھے حالانکہ میرے گھر اور اُن کے بیچ لگ بھگ آدھے میل کا فاصلہ تھا۔

گرمیوں کی راتوں میں، جب میں بیڈ روم کی کھڑکی کھول کر سونے کے لیے لیٹتی تو چہار سُو چھائے سناٹے میں چھتوں سے چمٹی ہزاروں، لاکھوں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ مجھے صاف سنائی دیتی تھی جو بعض اوقات کانوں کے پردے سے یوں ٹکراتی کہ لیٹنا دوبھر ہو جاتا مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ اُس وقت یہ آوازیں مجھے احساس دلاتی تھیں تم بہت بوڑھی ہو چکی ہو، اتنی بوڑھی کہ چت لیٹے لیٹے تمہاری کمر اکڑ

جاتی ہے۔ میں بھی اسے جرم ضعیفی کی سزا سمجھ کر تسلیم کر لیتی اور سونے کی کوشش کرنے لگتی مگر اس کے باوجود نہ تو مجھے ٹریوی اور نہ ہی شہد کی مکھیوں سے کوئی شکایت تھی۔

بات یہ ہے کہ میں بچپن سے یہ آوازیں سنتی آئی ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن کے دنوں میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے مجھے ہوا میں زندگی کا تاثر ملتا تھا۔ ان مکھیوں کا ایک ساتھ بڑے سے چھتے کو بنانا اور پھر اس میں شہد پیدا کرنا مجھے بہت انوکھا اور دلچسپ عمل لگتا تھا۔ چھتے کو دیکھ کر مجھے دوستی کا درس ملتا تھا۔

میرے والدین نیوزی لینڈ کے ایک بہت خوبصورت دیہات میں رہتے تھے۔ قدرتی نظاروں اور خالق کے پیدا کردہ جانوروں اور حشرات الارض کی مختلف اقسام سے متعلق میری معلومات شہروں میں بسنے والے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھیں مگر شہد کی مکھیوں سے مجھے خصوصی لگاؤ تھا۔ جب میں ذرا بڑی ہوئی تو ان سے میری محبت اور بڑھ گئی۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ جب میں خود کام کرنے کے قابل ہو جاؤں گی تو شہد کا فارم بناؤں گی۔ میں بڑی ہو گئی مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

میں پڑھ لکھ گئی تو کاؤنٹی سیکریٹریٹ میں کلرک بھرتی ہو گئی اور پھر چالیس برس تک وہیں نوکری کرتی رہی۔ وقت گزرتا چلا گیا اور پھر چالیس برس کی ملازمت کے بعد میں ریٹائر کر دی گئی۔ ریٹائرمنٹ کی پہلی شب مجھے احساس ہوا کہ میری زندگی کے سنہری دن کاؤنٹی کے دفتر اور فائلوں میں کھو گئے۔ اب انہیں واپس لانا بھی چاہوں تو وہ ماہ و سال مجھے کبھی نہیں مل پائیں گے۔ پل کے نیچے سے ایک بار بہہ جانے والا... پانی کب لوٹ کر آتا ہے۔

بڑھاپا ہو تو جسم کو توانائی کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ شہد سے زیادہ توانائی فراہم کرنے والی شاید ہی کوئی اور قدرتی شے ہو۔ مجھے روزانہ شہد استعمال کرنے کی عادت تھی مگر بہت ہی مناسب انداز میں۔ ٹریوی میرے لیے اکثر اپنے فارم سے خالص شہد لے کر آتا تھا۔

ٹریوی ہمیشہ مجھے مسز آرتھر کے نام سے پکارتا تھا۔ آرتھر میرے شوہر کا نام تھا جنہیں اس جہاں سے گزرے بیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اب میں بالکل تنہا اور عمر کے اس حصے میں تھی جہاں میرے اندر یہ خواہش شدت سے سر اٹھانے لگی تھی کہ لوگ اب تو مجھے میرے اصلی نام سے پکاریں، وہ نام جو میرے والدین نے رکھا تھا نہ کہ اس شخص کے نام سے جس سے میں نے صرف شادی کی تھی اور وہ بھی کب کا اپنا نام قبر کے کتبے پر لکھوا کر مٹی میں سو چکا ہے۔ ان سب باتوں اور خواہشوں کے باوجود جب ٹریوی مجھے مسز آرتھر کہہ کر پکارتا تو مجھے کچھ خاص برا نہیں لگتا تھا۔

میرے نزدیک ٹریوی بہت اچھا لڑکا تھا۔ وہ بوائے اسکاؤٹ تھا۔ جب بھی مجھ سے ملتا ہمیشہ احترام سے پیش آتا تھا۔ اس نے کبھی میرے سامنے کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی، البتہ میرے آس پڑوس کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ پورے قصبے میں مجھے باؤلی بڑھیا کہتا پھرتا ہے۔ ممکن ہے وہ لوگ سچ کہتے ہوں، البتہ میں نے اس کے منہ سے ایسا کبھی نہیں سنا تھا۔

ممکن ہے کہ وہ مجھے باؤلی سمجھتا ہو اور ممکن ہے وہ اپنے طور پر درست سمجھتا ہو۔ ایک مرتبہ میں نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ وہ مجھے راستے میں مل گیا تھا، چرچ کے پاس۔ میرے لیے شہد لے کر آ رہا تھا۔ اس نے بڑے احترام سے مجھے مادام مسز آرتھر کہہ کر پکارا۔ میں نے اس کے ہاتھوں سے شہد لیا اور وقت گزاری کے لیے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اس کے ہاتھ میں چاک تھا۔ وہ میری باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا اور اس دوران برابر کی دیوار پر دائرے بناتا رہا۔ ممکن ہے کہ وہ اس وقت ان دائروں سے مجھے یہی باور کرانا چاہ رہا ہو کہ بڑھیا کا دماغ گھوما ہوا ہے۔

ٹریوی فارم پر کھڑے ہو کر عین شمال کی جانب دیکھا جائے تو وہاں ایک سبز قطار دکھائی دے گی۔ یہ سبز قطار دراصل میرے باغ کے اونچے اونچے گھنے درخت ہیں۔ ان درختوں کی سبز قطار کے ساتھ ہی مرینا کا گھر ہے۔ وہ میری بہت پرانی ہمسائی ہے۔ اس کے گھر کے سامنے بڑا سا لان ہے جسے اس نے نہایت سلیقے سے سنوارا ہوا ہے۔ وہ بھی میری طرح بیوہ اور بوڑھی ہے مگر اسے اپنے لان سے بہت محبت ہے۔ کبھی وہ میری دوست تھی مگر پھر اس نے مجھ سے ایک ایسی زیادتی کی کہ ہماری دوستی اور پڑوسی کے رشتے کا تعلق ہی ختم ہو گیا۔

وہ بہت لالچی تھی مگر مجھے اس کی اس عادت سے کبھی کوئی سروکار نہ رہا مگر ایک دن اس نے میری زمین ہتھیالی، غیر قانونی طور پر لیکن قانون کی مدد سے۔ بات یہ ہے کہ میرا گھر جس زمین پر تھا، وہ کوئی ڈیڑھ ایکڑ کا پلاٹ تھا۔ یہ ہماری خاندانی جائداد تھی۔ ایک دن یہ ہوا کہ اس نے نہ جانے کن کن لوگوں سے ساز باز کر کے کاغذات میں ردوبدل کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ زمین اس کے نام ہو گئی۔ میں بوڑھی عمر عورت کیا کر سکتی تھی، چپ کر کے گھر بیٹھ گئی۔

میری زمین اور اس پر لگا باغ ہتھیا کر وہ بہت خوش تھی۔ بڑی شان سے اپنے لان اور باغ کے سامنے اکثر صبح و شام

ہاتھ میں چھڑی تھام کر چہل قدمی کرتی تھی۔ اس ظلم کے بعد تو میرے دل سے یہی بددعا نکلتی تھی کہ خدا کرے وہ مجھ سے پہلے اس دنیا سے اٹھ جائے۔

☆☆☆

مرینا بہ ظاہر خوبصورت، صحت مند اور چاق و چوبند نظر آتی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیمار نہ تھی۔ کئی برس پہلے اسے دماغ کا دورہ پڑا تھا جس کی وجہ سے اسے کافی عرصے اسپتال میں رہنا پڑا۔ وہ اُس دورے میں بچ تو گئی مگر بے چاری کافی کمزور ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اُس کے دماغ میں کچھ ایسی کیمیائی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں، جن کی وجہ سے اسے دورہ پڑا جو خطرناک تھا۔ یہ میری زمین ہتھیانے سے پہلے کی بات ہے۔ اس کی زندگی بہ دستور خطرے میں تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اگر اسے وہ دورہ پھر پڑ گیا تو شاید بچنا محال ہو جائے گا۔ مجھے امید تھی کہ ایسا ہوا تو وہ میرے لیے خوشی کا باعث بنے گا۔

اُس نے جو جرم کیا تھا، شاید ہی وہ کبھی کاؤنٹی کے لوگوں میں گفتگو کا موضوع بنا ہو۔ ہوا یہ تھا کہ دو پرائیویٹ پراپرٹی کے درمیان میرا ڈیڑھ ایکڑ کا پلاٹ تھا۔ اس پلاٹ کے ایک طرف مرینا کا گھر اور دوسری طرف ٹریوی کا شہد فارم تھا۔ ان دونوں کے بیچ واقع اس پلاٹ پر میرا باغ تھا جہاں سیب، ناشپاتی، چیری اور خوبانی سمیت کئی پھل دار درخت تھے۔ میرے لیے وہ باغ آمدنی کا نہیں خوشی کا بڑا ذریعہ تھا۔ میں اکثر ٹریوی اور مرینا سمیت کئی لوگوں کو تازہ پھل بہ طور تحفہ دے دیا کرتی تھی۔

مرینا کو تازہ پھلوں اور شہد کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑی خوشی سے میرے تحفے لے کر شکریہ ادا کرتی تھی۔ ویسے وہ پھلوں سے زیادہ شہد کی رسیا تھی۔ وہ ہر چیز کے ساتھ شہد استعمال کرنے کی عادی تھی۔ مجھے بھی شہد پسند ہے مگر میں اُس کی طرح دیوانی نہیں تھی۔ میرے باغ میں پھلوں کی اچھی خاصی مقدار پیدا ہوتی تھی مگر میں انہیں بیچتی نہیں تھی۔ سارا پھل احباب کو بہ طور تحفہ دے دیتی تھی۔

جب خزاں کے ستائے درختوں پر بہار میں نئی کونپلیں پھوٹتیں، ان پر بُور لگتے اور جب وہ پھل میں بدلتے تو سچ مجھے مجھے دلی مسرت ہوتی تھی۔ میں پھلوں کو ہر روز دیکھا کرتی تھی۔ انہیں بڑھتا دیکھ کر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ننھے سے بچے کو بڑا ہوتا دیکھ رہی ہوں۔

میرا پھلوں کا باغ بچوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ قصبے کے بچے کھیلتے کودتے وہاں آ جاتے، درختوں پر چڑھتے، پھل توڑتے اور وہیں بیٹھ کر جی بھر کر کھاتے تھے۔ مجھے یہ اچھا لگتا تھا اور کئی دفعہ تو میں خود بھی ان بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتی تھی۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک مرتبہ مرینا کو اپنی زمین کے سروے کا خیال آیا۔ یہ سروے کاؤنٹی انتظامیہ کرتی ہے، جس کے لیے وہ فیس لیتی ہے۔ جب مرینا نے اپنی جائداد کے سروے کی درخواست دی تو انہوں نے بھی فیس مانگی، جس پر وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں فیس کی رقم میں حصہ ڈالوں۔

''مگر کس لیے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تم اپنی جائداد کا سروے کروا رہی ہو، میرا اس سے کیا تعلق جو میں فیس ادا کرنے کے لیے حصہ ڈالوں؟'' مجھے سخت حیرت تھی کہ وہ یہ بات مجھ سے کہنے کیوں آئی ہے۔

''اس لیے کہ مجھے شبہ ہے کہ ہماری زمین کی تقسیم درست نہیں کی گئی تھی۔'' مرینا نے وضاحت پیش کرنا شروع کی۔ ''تمہاری اور میری زمین ساتھ ساتھ ہے اور یہ ہم دونوں کے فائدے میں ہے کہ اپنی اپنی زمین کی حد جان لیں۔''

''مگر مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' یہ سن کر مجھے غصہ آنے لگا۔ ''میں جانتی ہوں کہ جو میری زمین ہے وہ میرے پاس ہے۔ مجھے اس کی ازسرنو پیمائش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''ضرورت ہے۔'' اس نے یہ سن کر ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ پیمائش غلط کی گئی تھی جس کی وجہ سے میری کچھ زمین تمہارے اس باغ میں شامل ہو چکی ہے۔'' اس نے کھلی کھڑکی سے باغ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ دوبارہ پیمائش ہوئی تو مجھے وہ زمین مل جائے گی جو اس وقت تمہارے قبضے میں ہے۔'' اس نے جیسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''وہ زمین میری ہے۔ مجھے مل جائے تو میں اپنے لان کو زیادہ بڑا کر سکوں گی۔'' اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک صاف نظر آ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس کی بات سن کر میں طیش میں آ گئی تھی لیکن میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اگر تم سمجھتی ہو کہ ایسا کچھ ہے تو خود فیس ادا کرو اور پیمائش کروا لو۔'' یہ کہہ کر میں نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تمہارا مسئلہ ہے، صرف تمہارا۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

مجھے یقین ہے کہ جھگڑا تب شروع ہوا جب اس نے یہ حساب کتاب لگانا شروع کیا کہ میرے باغ میں لگے پھل دار درخت کتنے ہیں اور ہر سال موسم میں اُن سے کتنے پھل اترتے ہیں اور ان سے وہ سالانہ کتنی آمدنی حاصل کر سکتی ہے۔

خیر، مرینا کی خواہش کے مطابق سروے ہوا۔ نارنجی جیکٹ اور پیلے ہیلمٹ میں ملبوس کاؤنٹی کے لینڈ ڈیپارٹمنٹ کے تین چار سروئیر صبح سویرے اپنے آلات کے ساتھ پہنچ چکے تھے۔ وہ پیمائش اور اپنے نقشے کے مطابق کام میں مصروف تھے۔ اس وقت میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ کاش ٹریوی فارم کی ساری شہد کی مکھیاں نارنجی جیکٹ والوں پر ٹوٹ پڑیں اور انہیں ڈنک مار مار کر موت کی نیند سلا دیں مگر ایسا نہیں ہوسکا۔ وہ دوپہر تک اپنا کام نمٹا کر واپس چلے گئے۔

ایک ماہ بعد لینڈ ڈیپارٹمنٹ نے سروے رپورٹ اس کے حوالے کردی۔ جیسے ہی یہ اسے موصول ہوئی، وہ سیدھی میرے پاس پہنچی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ وہ بہت پُرجوش نظر آرہی تھی۔

''یہ دیکھو۔'' جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، اس نے ایک لفافہ میری آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔ ''میرا اندیشہ درست نکلا۔'' یہ کہہ کر اس نے فخریہ انداز سے میری طرف دیکھا۔

''ہوا کیا ہے؟'' میں سمجھ تو گئی تھی مگر پھر بھی استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری بات غلط نکلی، میری زمین کے ایک حصے پر تم قابض ہو۔'' اس کا لہجہ بہت گستاخ ہورہا تھا۔ ''یہ پڑھ لو۔ ڈیپارٹمنٹ نے تصدیق کردی ہے۔ اس میں رپورٹ اور نقشہ بھی ہے۔ اچھی طرح اپنی تسلی کرلو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے لفافے سے وہ دونوں چیزیں نکال کر میری طرف بڑھائیں۔

مرینا کیا کچھ کہہ رہی تھی، مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا مگر جب میں نے رپورٹ پڑھی اور نقشہ نکال کر دیکھا تو میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ نقشے میں ہم دونوں کے پاس موجود زمینوں کی 'درست' اور 'از سرِ نو' حد بندی کی گئی تھی۔ نقشے کے تحت میری زمین کا وہ حصہ جس پر پھل دار درخت تھے، اُس کے حصے میں چلا گیا تھا۔

سروے رپورٹ میں وضاحت کی گئی تھی کہ یہ زمین سو برس قبل میرے پردادا نے خریدی تھی مگر اس وقت سروے تکنیک اتنی ایڈوانس نہیں تھی جس کی وجہ سے یہ غلطی ہوئی۔ ڈیپارٹمنٹ نے وضاحت کی تھی کہ جدید تکنیک کی مدد سے اب سروے کی اس پرانی غلطی کو درست کرلیا گیا ہے۔ میں یہ بات سمجھتی تھی مگر پھر جس طرح وہ لالچی انداز سے سروے سے پہلے ہی میرے باغ کی آمدنی کا اندازہ لگاتی پھر رہی تھی، اس سے شک تھا کہ کچھ نہ کچھ سازباز ہوئی ہے۔

سروے رپورٹ اور نقشہ اس کے ہاتھ لگنے کی دیر تھی کہ اس نے پورے قصبے میں اس بات کو مشہور کرنا شروع کردیا۔ وہ لوگوں پر زور دے رہی تھی کہ جلد از جلد مجھ سے باغ کا قبضہ اسے دلوائیں۔

میں عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار تھی۔ انہی دنوں ایک روز وہ شام کے وقت مجھے سرِ راہ مل گئی۔ بڑے تپاک سے سلام دعا کے بعد کہنے لگی ''میں بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے میری زمین پر لگے درختوں کی بہت اچھی طرح نگہبانی کی۔ اب جب ان پر پھل لگیں گے تو ان میں سے کچھ تمہیں بھی ضرور دوں گی۔'' میں اس کی بات سن کر دانت پیس کر رہ گئی۔ وہ درخت میرے دادا نے اپنے ہاتھوں سے لگائے تھے۔ میرے باپ نے عمر بھر ان کی دیکھ بھال کی اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کھنچی آڑی ترچھی لکیروں کی بنیاد پر اب وہ اس کی مالکن بن بیٹھی ہے اور کتنی ڈھٹائی سے مجھے میرے ہی درختوں کا پھل کھلانے کا وعدہ کررہی تھی۔

میرے درخت، میرا باغ لینڈ ڈیپارٹمنٹ کے نئے نقشے کے بعد بہت زیادہ دنوں تک میرا نہیں رہا۔ اس نے کاؤنٹی پولیس میں درخواست دی اور مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس پر قبضہ جمالیا۔ اس نے باغ کے گرد بہت اونچی باڑھ بنوادی تاکہ کوئی بچہ یا بڑا اندر آکر پھل نہ توڑ سکے۔ بہت جلد پھلوں کا موسم آگیا۔ اس نے سارے پھل اتروائے اور دریا پار والے آڑھتی کو بیچ کر نوٹ کھرے کرلیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب سے باغ اس کے قبضے میں گیا تھا، اس نے ایک بار بھی مجھے پھل نہیں دیے تھے۔

☆☆☆

میرے باغ کو ہتھیائے گئے کئی موسم بیت گئے مگر اب بھی باغ کے ان پھل دار درختوں سے میری انسیت برقرار تھی۔ جب تک وہ میرے تھے، بالکل آزاد تھے۔ ان کے گرد کوئی باڑھ نہ تھی۔ بچے آزادانہ طور پر وہاں آکر کھیلتے کودتے تھے مگر اب تو اس بات کو بہت عرصہ ہوگیا۔ صبح اور شام کا زیادہ تر وقت میں کچن میں گزارتی تھی۔ جس کی کھڑکی سے میرا باغ صاف نظر آتا تھا۔ میں اسے حسرت سے تکتی رہتی تھی۔ یہ میرا اور درختوں کا وہ جذباتی رشتہ تھا۔ مرینا چاہ کر بھی کرلے، اس رشتے کو ختم نہیں کرسکتی تھی۔

اُس صبح بھی گھر کا داخلی دروازہ عام دنوں کی طرح کھلا تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہوکر ڈائننگ ٹیبل پر کہنیاں ٹکا کر کافی پی رہی تھی۔ کچن کی کھڑکی کھلی تھی۔ میری نگاہیں درختوں پر تھیں کہ اسی دوران ٹریوی آگیا۔ وہ میرے لیے اپنے فارم کا تازہ شہد لے کر آیا تھا۔ مجھے اس کا آنا برا نہیں لگا مگر اس وقت میرا دل اس سے باتیں کرنے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

''ہائے مسز آرتھر۔'' اندر داخل ہوتے ہی اس نے احترام سے کہا۔ ''کیا حال ہیں اور مرینا کے باغ کا کیا حال ہے؟ ویسے کیا کررہی ہے وہ؟'' اس نے میز پر شہد کے دو چھوٹے مرتبان رکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''شاید اب وہ تمہارے فارم سے شہد چرانے کا منصوبہ بنارہی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مذاق کررہی تھی۔'' میں نے اس کی حیرانی دور کرنے کے لیے وضاحت کی۔ ''ویسے اس بار میرے لیے تم کیا لے کر آئے ہو؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا، حالانکہ جانتی تھی کہ وہ ہر بار صرف شہد ہی لے کر آتا ہے۔

''شہد۔'' اس نے پوری بتیسی نکال کر بڑے جوش سے جواب دیا۔ ''آج ہی چھتے سے نکالا ہے۔''

''اے سنو!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ سر جھکائے بل صاف کررہا تھا۔

''جی مسز آرتھر۔''

''کیا تم اب بھی مرینا کے لیے شہد لے کر جاتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے کچھ پتا نہیں ہے۔'' اس نے استفساریہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے فارم کا شہد بہت اچھا ہوتا ہے۔''

''میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا ورنہ مجھے کیا۔''

''اسے تو ہمارا شہد بہت پسند ہے۔ مسز آرتھر... آپ تو جانتی ہیں کہ وہ شہد کی کتنی دیوانی ہے۔ ہر چیز میں شہد ملا کر کھاتی ہے۔''

''اچھی طرح جانتی ہوں۔ اسے بھی اور تمہارے شہد کو بھی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''بس... بہت کرلی تم نے اپنے شہد کی تعریف۔ اب چپ ہوجاؤ۔ میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہورہا ہے۔'' میں نے ویسے ہی پیشانی کو دباتے ہوئے کہا۔ دراصل تو یہ ہے کہ اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کا من نہیں ہورہا تھا۔

''پتا ہے مسز آرتھر، مرینا باغ کے قریب اور اونچی باڑھ لگوا رہی ہے؟''

''کیا...'' یہ سن کر میں چونک گئی۔ ''مگر کیوں؟ باڑھ تو ہے ہی لگی ہوئی ہے۔''

''پاپا بتا رہے تھے کہ دو روز پہلے کوئی آدمی اس کے باغ سے خوبانی توڑ رہا تھا کہ مرینا نے اسے پکڑ لیا۔'' اس نے سادگی سے وجہ بتائی۔ ''ہوسکتا ہے اسی لیے مزید اونچی باڑھ لگوا رہی ہو۔''

''کرنے دو اسے جو کررہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اب تم بھی چلو، مجھے آرام کرنا ہے۔''

ٹریوی نے درست کہا تھا۔ چند روز کے اندر اندر اس نے نہایت بھدے انداز کی بہت اونچی باڑھ لگوادی تھی، درختوں کے اطراف وہ باڑھ اتنی بے ڈھب اور پرانے انداز کی تھی کہ میں نے کچن کی کھڑکی ہی بند رکھنا شروع کردی مگر کب تک میں کچن کی کھڑکی بند رکھتی۔ آخر میں نے اس کا حل نکال لیا۔ باڑھ کے دوسرے طرف میری زمین تھی۔ میں نے اپنے حصے پر باڑھ کے ساتھ ساتھ ایک قطار کی صورت پودے لگانا شروع کردیے، تاکہ بدصورت باڑھ میری نظروں سے اوجھل ہوجائے۔ ان میں کچھ پھل دار درخت بھی تھے مگر وہ بہت سست رو تھے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اپنی زندگی میں کبھی ان کا پھل چکھ پاؤں گی۔ البتہ یہ یقین تھا کہ میرے مرنے کے بعد ہی سہی، یہاں کسی کو پھل توڑتے ہوئے کوئی چور کہہ کر پکڑے گا نہیں۔

مجھے باغبانی کا بہت شوق ہے۔ میری اسٹڈی میں اس موضوع پر کئی کتابیں ہیں۔ انہی دنوں جب میں بدصورت باڑھ کو چھپانے کے لیے پودے لگا رہی تھی، ایک دن ایک کتاب میرے ہاتھ لگی۔ وہ نیوزی لینڈ کے مقامی پودوں، ان کے کیمیائی خواص اور اثرات کے بارے میں تھی۔ میں یہ کتاب بھول ہی چکی تھی، فوراً اسے دوسری کتابوں سے الگ کرکے پڑھنے والی میز پر رکھ دیا۔

رات کو ڈنر سے فارغ ہوکر میں بیڈ پر بیٹھی وہ کتاب پڑھ رہی تھی۔ رنگین تصویروں والی کتاب مجھے بہت اچھی لگی۔ اچانک یہ کتاب مجھے اور بھی زیادہ اچھی لگنے لگی۔ اس میں ایک پودے کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا گیا تھا۔ یہ پودا ٹوٹو تھا اور صرف نیوزی لینڈ میں ہی پایا جاتا تھا۔ اس کے کیمیائی خواص پڑھ کر مجھے لگا کہ یہ پودے باڑھ کے ساتھ لگاؤں۔ ان کے اثرات میرے موڈ کو خوشگوار بنا سکتے تھے۔ اس کی ایک اچھی بات یہ بھی تھی کہ یہ پودا خاصا موٹا ہوتا ہے اور بہت تیزی سے بڑھتا ہے۔ اس میں بہت خوبصورت بڑے بڑے پھول لگتے ہیں، جن کے بیچ میں اس پودے کے ننھے ننھے بے شمار بیج ہوتے ہیں، بالکل سورج مکھی کے پھول میں رہنے والے بیجوں کی طرح۔ مجھے یقین تھا کہ یہ

پھول اچھا شہد بنانے میں بہت مدد دیں گے۔

پودے کے خواص کو تفصیل سے پڑھنے کے بعد مجھے یقین تھا کہ انہیں باڑھ کے ساتھ لگاؤں تو وہ بہت جلد بڑے ہوکر نہ صرف لکڑی کی بدنما اونچی باڑھ کی بدصورتی کو میری نظروں سے اوجھل کر سکتے ہیں بلکہ ان پر شہد کی مکھیاں بھی آکر بیٹھیں گی۔ ویسے بھی مجھے بچپن سے ہی شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ بہت اچھی لگتی تھی۔ دوسرے ہی دن میں نے کافی بڑی تعداد میں ٹوٹو پودے کی فراہمی کا آرڈر دے دیا۔ بہت جلد وہ پودے آگئے۔ میں نے ٹریوی سے مدد لی۔ اُس نے گڑھے کھودے اور میں نے باڑھ کے ساتھ ساتھ پودے لگا دیے۔ وہ موسم بہار کے دن تھے۔ پودوں کے لیے فضا بھی سازگار تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی ان پر بڑے بڑے دلکش پھول کھل اٹھیں گے۔ اب مجھے بے چینی سے ان کے بڑے ہونے اور پھولوں کے کھلنے کا انتظار تھا۔

پودے بڑے ہونے لگے تھے۔ اب میں کچن میں بیٹھ کر کھڑکی سے انہیں دیکھا کرتی تھی۔ یہ منظر آنکھوں کو بھی بھلا لگتا تھا۔ اب مجھے وقت گزاری اور اپنے درختوں کے چھن جانے کا غم بھلانے کا ایک ذریعہ مل گیا تھا۔ میں انہیں باقاعدگی سے پانی اور کھاد دیتی تھی۔ دیکھ بھال کرتی اور شام کو ان پودوں کی قطار کے ساتھ ساتھ چہل قدمی بھی کرتی تھی۔

دن گزرتے گئے۔ بہار میں لگے پودے موسم گرما میں خاصے بڑے ہوگئے تھے۔ اب یہ موسم بھی تقریباً اپنے اختتام پر تھا۔ کھلی فضا میں صبح اور شام کو خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ خزاں آرہی تھی۔ اُس روز میں اپنے درختوں کو قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کی چاہ میں مرینا کے گھر کے سامنے چہل قدمی کررہی تھی۔ میری نظر درختوں پر تھی۔ پتے جھڑ چکے تھے اور وہ ٹنڈ منڈ کھڑے تھے۔ ان کے پھل تو وہ بہت پہلے ہی اتار کر بیچ چکی تھی۔

اُس بار موسم سرما بہت شدید تھا۔ دسمبر کے آخر سے جنوری کے وسط تک، ہر روز ہی برف پڑتی تھی۔ کہیں کہیں تو دس دس فٹ برف کی تہ جم چکی تھی۔ میں اپنے پودوں پر سے روزانہ برف صاف کرتی تھی۔ خوش قسمتی سے ٹوٹو کے پودے بڑے سخت جان اور سدا بہار تھے۔ اس برف باری میں انہیں کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں یہ دیکھ کر بہت خوش تھی۔ پودے جوان ہوچکے تھے اور اب موسم بہار میں ان پر بڑے بڑے سفید پھول کھلنے تھے۔

موسم بہار کا پہلا ہفتہ تھا جب ٹوٹو کا پہلا پھول کھلا۔ سب پودے کلیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند روز میں وہ پودے پھولوں سے لد گئے۔ میری محنت رنگ لا رہی تھی۔

''سنو ٹریوی...'' اُس روز وہ میرے ساتھ پودوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔

''جی مسز آرتھر۔'' اس نے کھرپی چلاتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتی ہوں کہ یہاں پر ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا رکھ لوں اور شہد کی مکھیاں پالوں۔'' میں نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ ''تم مجھے شہد کی مکھیاں اور ڈبا لادو، دیکھو نا یہاں کتنی بڑی جگہ خالی ہے اور اب تو یہ پھول پودے بھی ہیں۔''

''واہ... یہ تو بہت اچھا خیال ہے۔'' وہ خوشی سے چہکا۔

''مجھے شہد نہیں چاہیے بلکہ کچھ رونق ہوجائے گی۔''

''میرے پاپا نے مختلف سائز کے ڈبے بنا رکھے ہیں، آج ہی ان سے پوچھ کر ایک ڈبا اور اس کے حساب سے شہد کی مکھیاں لے آؤں گا۔'' وہ پوری طرح میری خوشی میں شریک ہونے کو تیار تھا۔ ''ابھی جا کر لے آؤں؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اجازت طلب کی۔

''ذرا گوڈی مکمل کرلو، پھر جا کر لے آنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر کام میں لگ گیا۔

سہ پہر کا وقت تھا جب ٹریوڈی بابا اور مکھیاں لے آیا۔ شہد فارمنگ کے بارے میں میری معلومات اتنی تھیں کہ چاہتی تو اپنا فارم کھول سکتی تھی۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ اب میں اپنی پسند کا خالص اور خاص شہد جلد ہی حاصل کرلوں گی۔

شہد فارمنگ کے لیے چھوٹا سا ڈبا کیا لگا کہ میری مصروفیت بھی بڑھ گئی۔ میں دن بھر شہد کی مکھیوں کو ٹوٹو پودوں کے رسیلے پھولوں کا رس چوستے دیکھتی تھی۔ ویسے بھی ٹوٹو پر اتنے پھول کھلے تھے کہ مکھیوں کو رس چوسنے کے لیے اِدھر اُدھر جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ دیکھ دیکھ کر میں بہت خوش ہوتی تھی مگر جب بھی باڑھ میں قید میرے پیارے درختوں پر نظر پڑتی تو کلیجا کٹنے لگتا تھا۔

جب سے بہار کا موسم آیا تھا، تب سے میں روزانہ دیکھتی تھی کہ مرینا دن کے مختلف اوقات میں پھل دار درختوں کے گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ وہ اکثر سر اٹھا اٹھا کر درختوں کو دیکھتی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ ابھی سے یہ منصوبہ بنا رہی ہے کہ کتنا پھل اترے گا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے موسم گرما میں تیار ہونے والے پھلوں کی آمدنی کا ابھی سے پکا حساب کتاب لکھ کر رکھا ہوگا۔ خیر، مجھ سے تو اس نے میری ساری خوشیاں ہی لوٹ لی تھیں۔ وہ جانتی تھی نا کہ میں بوڑھی عورت ہوں، اس کا کیا بگاڑ لوں گی۔ وہ ایسا سوچتی تھی تو بہ ظاہر ٹھیک

سوچتی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ یہ رائے قائم کرتے ہوئے اس سے کہیں پر کچھ بھول ضرور ہوئی ہوگی، جسے وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی تو بھی یاد نہ کر پاتی۔ لالچ کی پٹی آنکھوں پر بندھی ہو تو عقل پر خود بخود پردے پڑ جاتے ہیں۔

وہ موسمِ بہار کے آخری دن تھے۔ ٹوٹو کے سدا بہار پودوں پر بڑے بڑے سفید پھول اتنی بڑی تعداد میں لگے تھے کہ کم و بیش انہوں نے ان پودوں کا اوپری حصہ مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔ دن بھر ان پھولوں پر شہد کی مکھیاں منڈلاتی رہتی تھیں۔ ڈبے میں شہد کے کئی چھتے بننا شروع ہو گئے تھے اور ہر روز وہ بڑے ہوتے جا رہے تھے۔

اُس دن مجھے گھر کا کچھ سامان خریدنے اور بینک سے پیسے نکلوانے کے لیے جانا تھا۔ بازار گئی تو مجھے کئی جگہوں پر بچے ملے۔ وہ سب مجھے جانتے تھے۔

"گڈ مارننگ مسز آرتھر۔" ننھے بوائے اسکاؤٹ ہیری نے بڑے احترام سے میرے سامنے آ کر کہا۔

"سنو..." میں نے پیار سے کہا۔ "میں نے مسز مرینا کو اپنے باغ کا انچارج بنا دیا ہے۔ پھل لگنے لگے ہیں۔ اب جب تمہیں پھل چاہیے ہوں تو اس سے جا کر کہنا۔"

"شکریہ مسز آرتھر۔" اس نے خوش دلی سے کہا اور چلا گیا۔ میں مسکراتے ہوئے بینک کی طرف بڑھ گئی۔

اُس روز مجھے راستے میں جتنے جاننے والے ملے، میں نے سب سے یہی بات کی۔ ویسے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ پھل دار درخت جب تک میرے تھے، تب تک میں ہر موسمِ بہار میں اپنی جان پہچان والوں کو یہی دعوت دیتی تھی۔ ویسے قصبے میں گنتی کے ہی چند لوگ تھے جو جانتے تھے کہ اب وہ باغ میری ملکیت نہیں رہا ہے۔ اس لیے سب نے میری بات پر یقین کر لیا۔

مجھے موسمِ گرما پہلے نہیں مگر اب اچھا لگنے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سردیوں میں میری بوڑھی ہڈیاں بہت تکلیف دیتی تھیں مگر گرمیوں میں بالکل صحت مند رہتی تھیں۔ ویسے بھی وہ موسمِ گرما بہت خوش گوار تھا۔

وہ اگست کا مہینا تھا۔ درختوں پر پھل پک چکے تھے۔ اِدھر میں بھی شہد کے ڈبے سے کئی چھتے اتار کر تین درمیانے درجے کے مرتبان بھر چکی تھی۔ وہ سب میرے کچن کی الماری میں تھے۔ اب بھی ٹریوی میرے اور مرینا کے لیے شہد لے کر آتا تھا۔ وہ ہم دونوں کے لیے ایک ساتھ ہی شہد کی بوتلیں لاتا تھا۔ پہلے مجھے دیتا، اس کے بعد مرینا کی طرف جاتا تھا۔ اب جب بھی وہ شہد لے کر آتا، میں اسے کسی نہ کسی کام میں لگا دیتی تھی۔ اکثر اس کے ذمے پودوں کی صفائی، کھاد اور پانی دینے کا کام ہوتا تھا۔ اسے بھی باغبانی کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑے مزے سے کام کرتا رہتا اور میں کچن میں بیٹھ کر اسے دیکھا کرتی تھی۔ اس دوران مرینا کے لیے اس کی لائی ہوئی شہد کی بوتلیں میری نگاہوں کے سامنے ہوتی تھیں۔

ایک دن ٹریوی آیا اور پودوں کی صفائی ستھرائی کرنے کے بعد شہد دینے مرینا کے گھر چلا گیا۔ میں کچن میں بیٹھی تھی۔ باغ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ کچھ لوگ درختوں پر چڑھ کر پھل اتار رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دریا پار سے آئے پھلوں کے بیوپاری کے کارندے ہی ہوں گے جو اس علاقے کے تازہ پھلوں کو خرید کر، بہترین پیکنگ میں پیک کر کے نیوزی لینڈ کے مختلف شہروں کی منڈیوں میں بیچتے تھے۔ اسی دوران ڈور بیل بجی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا، سامنے مرینا کھڑی تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

"خیریت؟" میں نے اسے دیکھتے ہی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یہ تم نے لوگوں سے کیا بکواس کی ہے؟" اس نے بڑی رکھائی سے بولنا شروع کیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ تم نے مجھے اپنے باغ کا انچارج بنا دیا ہے۔" اس نے برہمی سے کہنا شروع کیا۔ "اب جس بھی مفت خورے کو مفت میں پھل چاہئیں، وہاں جا کر مجھ سے مانگ لے یا خود توڑ لے۔"

"میرے خیال میں، اس میں تو کوئی بُری بات نہیں کہ تم کسی کو دو چار پھل دے دو۔" وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ "یہ تو میں نے اس لیے کہا تھا کہ تم بھی لوگوں کو پھل کا تحفہ دے کر خوش ہو گی میری طرح، اسی لیے..."

"مجھے مفت میں مال اڑا کر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔" اس نے میری بات پوری نہ ہونے دی اور بھنائے ہوئے لہجے میں چلاتے ہوئے کہا۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے۔" میں نے سکون سے جواب دیا۔ "یہ بڑی پرانی روایت ہے۔ میں نے کبھی ان درختوں کے پھل نہیں بیچے مگر تم نے پچھلے سال پہلی بار انہیں فروخت کیا اور کسی کو بھی انہیں چکھنے نہیں دیا۔ یہ تو بہت بری بات ہے۔"

"ہو گی مگر تمہارے لیے، میرے لیے نہیں۔" وہ چلا اٹھی۔ "تم جو کرتی تھیں، ضروری نہیں کہ میں بھی وہی کروں۔ اب وہ درخت میری ملکیت ہیں، ان کا پھل میرا ہے اور وہ میں بیچوں گی۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں ایک غریب

بیوہ عورت ہوں۔" اس نے معصوم بن کر غربت کے پردے میں اپنی لالچ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز مرینا..." میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "لوگوں میں پھل بانٹنے سے تم مزید غریب نہیں ہو جاؤ گی۔"

"اپنی بکواس بند کرو۔" وہ ایسے چلائی جیسے ابھی مجھ پر حملہ کر دے گی۔ "لوگوں کو مفت میں میرے باغ سے پھل لینے کی دعوت دینا بند کر دو ورنہ میں پولیس میں تمہارے خلاف شکایت درج کروا دوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے شعلے اور منہ سے تھوک کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

"اوکے۔" میں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ اسے سخت غصے میں دیکھ کر مجھے روحانی تسکین مل رہی تھی۔

"ویسے یہ کام تم بھی کر سکتی ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں میں یہ کر سکتی ہوں۔" وہ ایک بار پھر چلائی۔

اس کی باتیں سن کر میں دل میں بہت خوش تھی۔ اسے شدید غصہ آ رہا تھا مگر میں اس کی سنی ان سنی کر کے اپنے ٹوٹو کے سفید پھولوں کو دیکھتی اور مسکراتی رہی۔ سفید سفید پھولوں پر گہری اور زرد آڑی دھاریوں والی شہد کی مکھیاں ٹڈی دل کی طرح چھائی ہوئی، ان کا رس چوسنے میں مصروف تھیں۔

"میرا خاص شہد..." میں نے خود کلامی کی اور باغ کی طرف دیکھنے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ میری یہ حرکت اسے اور طیش دلا دے گی۔

"کیا بکواس ہے۔" وہ تیزی سے مڑی اور غصے میں بڑبڑاتے ہوئے واپس چل دی۔ یہ مرینا سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں نے پھر کبھی اسے زندہ نہیں دیکھا۔ ویسے بھی مجھے اس سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ مجھے تو لالچی لوگوں سے ویسے ہی بچپن سے سخت نفرت تھی۔

مرینا کے میرے ہاں آنے کے دو دن بعد کا ذکر ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ میں اپنے پودوں کے پاس ٹہل رہی تھیں۔ فضا میں خاموشی تھی۔ صرف شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی جو کسی عمدہ موسیقی سے بھی زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ میں اپنی ہی دھن میں مگن تھی کہ ٹریوی آ گیا۔ وہ ہاتھ میں شہد کی دو بوتلیں پکڑے ہوئے تھا۔

"گڈ مارننگ مسز آرتھر۔"

"گڈ مارننگ۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "یہ دونوں میرے لیے ہیں؟" میں نے اس کے ہاتھ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یقیناً..." وہ شرارت سے مسکرایا۔ "لیکن صرف ایک، دوسری آپ کے باغ کی انچارج کے لیے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "یہ مجھے دو۔ میں کچن میں جا کر اپنے لیے کافی اور تمہارے لیے ڈونٹ بناتی ہوں، تب تک تم انہیں کھاؤ اور پانی دے دو۔"

"ابھی کر دیتا ہوں یہ کام۔" اس نے مستعدی سے کہا اور شہد کی دونوں بوتلیں مجھے تھما دیں۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ گھنٹا بھر کے لیے مصروف ہو گیا۔

"لگتا ہے تمہیوں کو یہ پھول بہت پسند ہے۔" اس نے پانی کا ڈول اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں... مجھے بھی یہی لگتا ہے۔"

"دیکھوں نا، سارے پھولوں کو انہوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ "بہت سارا شہد بنا رہی ہوں گی۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بوتلیں لیے ہوئے کچن میں چلی آئی۔ ٹریوی کے آنے سے ایک ساتھ کئی کام نکل آئے تھے۔ جب تک وہ یہاں تھا، مجھے نہایت سکون سے کافی اور ڈونٹ بنانے کے علاوہ ایک اور کام بھی کرنا تھا۔

"سنا ہے مرینا تم سے لڑ کر گئی ہے؟" اس نے کام نمٹا لیا تھا اور اب کچن میں میرے سامنے بیٹھا ڈونٹ کھا رہا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ مجھ سے کیوں لڑ کر گئی ہو گی؟" میں نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا اس سے سوال کر دیا۔

"کچھ اندازہ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ "ہو سکتا ہے کہ وہی درختوں والا..."

"سچ سچ بتاؤ، تمہیں کیسے پتا چلا اس لڑائی کے بارے میں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"وہ میں..." وہ کچھ کہتے ہوئے اٹکا۔

"بتاؤ، شاباش... اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے۔"

"وہ دو تین دن پہلے جب لڑنے آئی تھی، تب میں سائیکل پر یہاں سے گزر رہا تھا۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر میں آ گیا اور اُدھر چھپ کر ساری باتیں سن لی تھیں۔" اس نے نظریں نیچی کر کے شرمندہ لہجے میں کہا۔

"اوہ شرارتی بچے!" میں نے پیار سے اس کے کان مروڑے۔

ویسے اگر... کوئی اور بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ لوگوں کو تو دو لوگوں کی لڑائی میں مزہ آتا ہے اور پھر لڑنے والی دونوں بڑھیا ہوں تو لوگوں کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔

"پتا ہے ٹریوی، وہ ذرا سی پاگل ہے۔ اس کے دماغ کے کچھ اسکرو ڈھیلے ہیں۔" میں نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر پیچ کس کی طرح گھماتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔''

''سچ...'' اس نے حیرت سے کہا۔

''وہ دماغی مریضہ ہے۔ اس کا میڈیکل پرابلم ہے یہ۔''

''اچھا...'' اس کا لہجہ اور چہرہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

''مجھے نہیں پتا تھی یہ بات۔'' اس نے بھولپن سے جواب دیا۔

''یہ بات سب کو بتادو کہ اس سے دور رہا کریں ورنہ پتا نہیں وہ کب، کس سے لڑنے لگے۔''

''میں سب دوستوں کو بتادوں گا۔'' یہ سنتے ہی اس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے ایسے لوگوں سے۔''

''تم مت ڈرو اُس سے۔'' میں نے فوراً اس کی ہمت بندھائی۔ ''وہ صرف ان لوگوں سے لڑتی ہے جو مفت میں اس سے کچھ لینا چاہیں مگر تم تو اسے مفت میں اتنا سارا شہد دیتے ہو۔ اس کے کتنے ہی کام کردیتے ہو۔ وہ تم سے تو ہرگز نہیں لڑے گی، تم سے تو وہ خوش ہوتی ہوگی۔''

''اچھا...'' وہ بہ دستور حیرت زدہ تھا۔

''اور نہیں تو گیا۔ جایا کرو اس کے پاس شہد لے کر۔'' میں نے سامنے رکھی مرینا کے حصے کی شہد کی بوتل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے نا کہ اس بے چاری کو شہد کتنا پسند ہے۔ اب تم اسے شہد نہیں دو گے تو کون دے گا۔''

''یہ تو ہے۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ڈونٹ ختم کر کے اس نے بوتل اٹھائی۔

''بائے مسز آرتھر، میں جارہا ہوں آپ کی پاگل پڑوسن کے ہاں۔'' اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا اور چلا گیا۔

مجھے ڈر تھا کہ مرینا کے پاگل پن کے بارے میں سن کر کہیں وہ بہت زیادہ نہ ڈر گیا ہو اور شہد اس کے ہاں لے جانے کے بجائے کہیں باہر زمین پر اُنڈیل کر نہ چل دے یا اُسے دیے بنا اپنے گھر نہ لوٹ جائے۔ اسی لیے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اٹھی اور باہر چل دی۔ وہ مرینا کی طرف ہی جارہا تھا۔ جب وہ اس کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوگیا تو میں مسکراتے ہوئے واپس کچن میں آگئی۔

اوہ مرینا... تم اور تمہارا شہد۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

گئے دنوں میں جب ہم اچھے ہمسائے تھے، تب وہ کبھی کبھار سہ پہر کی چائے پر مجھے بلا لیتی تھی اور بڑے چاؤ سے قہوے میں شہد ملاتی اور پھر کیک پر شہد لگا کر مجھے پیش کرتی تھی۔ بہت ہوکا تھا اسے شہد کی مٹھاس کا۔ اس کا بس چلتا تو کھانے کی ہر چیز پر شہد لگا کر کھاتی مگر افسوس کہ نمک مرچ لگے گوشت پر شہد لگا کر کھانے سے بالکل مزہ نہیں آتا ہوگا۔

ایسا میں نے تو کبھی نہیں کیا تھا مگر مجھے یقین ہے کہ اُس نے یہ تجربہ اپنی زندگی میں کبھی ایک بار تو ضرور کیا ہوگا۔

وہ چاہتی تو لمبی عمر اور صحت مند زندگی جیتی مگر شاید وہ خوشی کے لفظ سے نا آشنا تھی۔ شہد اور دولت دیکھ کر اس کی آنکھیں ایک جیسے حریصانہ انداز میں چمک اٹھتی تھیں۔ یہی وجہ ہوگی کہ اسے دماغی مرض لاحق ہوا اور اس کے بعد اس نے اپنی ہوس کی بھوک مٹانے کے لیے میرے باغ پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔

درخت پوری طرح پھلوں سے خالی ہوگئے تھے۔ خزاں کی آمد میں چند روز باقی تھے۔ انہی دنوں ہیلووین کا تہوار آگیا۔ میری بچوں سے بڑی دوستی تھی۔ میں جانتی تھی کہ رات کے اندھیرے میں بچے ڈراؤنا بہروپ بنا کر مجھے ڈرانے کے لیے ضرور آئیں گے۔ وہ ہر سال ایسا کرتے تھے۔

وہ رات ہیلووین کی رات تھی۔ ڈور بیل بجی، میں جانتی تھی کہ بچے ہوں گے مگر پھر بھی میں نے بند دروازے کے پیچھے سے پوچھا کون ہے، مگر جواب نہیں ملا۔ میں نے کنڈی کھولی۔ جیسے ہی دروازے کا پٹ کھلا پانچ چھ بچے بھوتوں کا روپ دھارے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔ میں نے ڈرنے کی اداکاری کی اور ایک زوردار چیخ ماری۔ میرے چیختے ہی انہوں نے ماسک اتار دیے اور ہنسنے لگے۔

میں نے سب بچوں کو ایک ایک چاکلیٹ اور کچھ پیسے دیے۔ یہ چاکلیٹ میں کچھ روز پہلے اسی مقصد کے لیے خرید کر لائی تھی۔ بچے خوشی خوشی مڑے اور کہنے لگے۔ ''ہم مسز مرینا کے گھر جارہے ہیں۔''

''ارے نہیں، مت جاؤ وہ سو رہی ہوگی۔''

''یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔'' ٹریوی نے کہا۔ وہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

''اگر وہ تم لوگوں کو اس روپ میں دیکھ کر ڈر گئی تو...''

''اسی لیے تو جارہے ہیں۔'' وہ باہر نکلتے ہوئے یک زباں ہوکر بولے۔

میں نے بچوں کو وہاں جانے سے روکنے کی سنجیدہ کوشش کی تھی۔ وہ دماغی مریضہ ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بے دھیانی میں دروازہ کھولنے پر وہ اس طرح کے بھوت دیکھتی تو دماغ کو جھٹکا لگ سکتا تھا۔

ہیلووین کی اُس رات کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں نے پردہ اٹھا کر کھڑکی سے جھانکا، اس کے کچن کی لائٹ غیر معمولی طور پر روشن تھی۔ میں اٹھی اور اس کے ہاں چل دی۔

میں نے ڈور بیل بجائی مگر کافی دیر تک جواب نہ ملا تو میں نے دروازے کو اندر کی طرف ہلکا سا دھکیلا، وہ کھل گیا۔ میں کچن میں داخل ہوئی اور جو کچھ دیکھا، میرے لیے وہ غیر متوقع نہیں تھا۔ ایسا کبھی نہ کبھی ہونا ہی تھا۔ آخر کو اسے پہلے بھی دماغ کا دورہ پڑ چکا تھا۔ میرے لبوں پر ہلکی سے مسکراہٹ دوڑ گئی البتہ دل میں دکھ کا احساس بھی تھا۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا مگر جو کچھ ہوا اس کا ذمے دار کوئی اور نہیں وہ خود ہی تھی۔

مرینا کچن کے فرش پر آڑی ترچھی بے سُدھ پڑی تھی۔ میز پر شہد کا بڑا سا مرتبان اوندھا گرا ہوا تھا جس سے ٹپکنے والا شہد فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ شہد کی دعوت اڑانے کے لیے چیونٹیاں پہنچ چکی تھیں۔ جتنی چیونٹیاں وہاں تھیں، انہیں دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ اس حالت میں اسے کم از کم گھنٹا دو گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔ میں جھک کر گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کی شہ رگ اور ہاتھ کی نبض دیکھی۔ وہ زندہ تھی مگر نبض بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میں نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ دھڑکنیں بھی کم اور خاصے وقفے کے ساتھ تھیں۔

میں اٹھی اور فون اٹھا کر اسپتال کا نمبر ملانے لگی۔ چاہتی تو پلٹ کر واپس گھر جاسکتی تھی مگر اسے اب طبی امداد کی اشد ضرورت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی جو حالت ہے، اب اسے یونہی بے سُدھ اسپتال میں پڑے رہنا ہوگا۔ پہلے بھی تو اسے دماغ کا دورہ پڑا تھا۔ ضروری نہیں کہ ہر بار انسان اتنا خوش نصیب ہو کہ صحت یاب ہوکر گھر لوٹ آئے۔

ایمبولینس تھوڑی ہی دیر میں پہنچ گئی۔ جیسے ہی وہ اسے لے کر چلے، میں نے بھی کچن کی لائٹ بند کی اور اپنے گھر لوٹ آئی۔ وہ خنک رات تھی، میں آرام دہ بستر میں لیٹی ہوئی تھی لیکن رہ رہ کر میرے دماغ میں مرینا اور اپنے باغ کا خیال آرہا تھا۔ آخری بار جب وہ مجھ سے لڑنے کے لیے آئی تھی تو کہہ رہی تھی کہ یہ باغ میرے بڑھاپے کا سہارا ہے مگر افسوس کہ وہ مجھ سے میرا باغ ہتھیا کر صرف دو موسم کے پھل ہی اتار کر چند پیسے کما سکی تھی۔

صبح میں خاصی دیر سے اٹھی اور ناشتے سے فارغ ہوکر اسپتال پہنچی۔ اسے آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اسے اچانک کسی خوف کے باعث دماغی دورہ پڑا اور وہ کوما میں چلی گئی۔ اس کی حالت شدید خطرے میں تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر بروقت اسپتال پہنچا دیا جاتا تو شاید اس کی جان بچ سکتی تھی مگر وہ دورہ پڑنے کے بعد کئی گھنٹے بغیر کسی طبی امداد کے پڑی رہی جس کی وجہ سے اب اس کی جان بچنے کا امکان بہت کم ہوگیا تھا۔ میں نے شیشے کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ اس کے منہ سے آکسیجن کی نالی لگی ہوئی تھی۔ اس کی دماغی حالت معلوم کرنے کے لیے کئی تاروں کے سرے اس کے سر سے جڑے ہوئے تھے۔ وہ نیم مردہ نظر آرہی تھی۔ میں نے کچھ دیر اسے دیکھا اور پھر افسردگی سے پلٹ آئی۔

وہ کئی روز تک اسپتال میں رہی۔ میں دو تین بار اسے دیکھنے کے لیے گئی مگر وہ بہ دستور کوما میں تھی۔ ڈاکٹر اس کی زندگی کی طرف سے مایوس ہوچکے تھے، بس موہوم امید کے سہارے علاج کررہے تھے..... اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر دماغ رفتہ رفتہ موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

میں ناشتا کررہی تھی کہ ٹریوی آگیا۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھی۔ ''مسز آرتھر، مسز آرتھر۔'' وہ باہر سے ہی چلاتا ہوا آرہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، میں نے پوچھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ یوں چلاتا ہوا کیوں آیا ہے۔

''مسز مرینا، مسز مرینا...'' اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''ان کا انتقال ہوگیا آج صبح۔'' اس نے اٹکتے ہوئے بتایا۔

''اوہ میرے خدا۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں نے سینے پر کراس کا نشان بنا کر آنکھیں موندلیں۔ ''ایسا تو ہونا ہی تھا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور جب آنکھیں کھولیں تو ٹریوی جاچکا تھا۔

میں کل رات ہی یہ سوچ کر سوئی تھی کہ آج صبح گھر کی پرانی دستاویز میں اپنی زمین کی الاٹمنٹ کی وہ دستاویز تلاش کروں گی جو میرے پردادا کے زمانے کی ہے۔ مجھے سو فیصد امید تھی کہ اس الاٹمنٹ کا ریکارڈ کاؤنٹی کے لینڈ ڈیپارٹمنٹ میں ضرور موجود ہوگا۔ میں خود کاؤنٹی سیکریٹریٹ میں طویل عرصے تک کام کرچکی تھی، جانتی تھی کہ آرکائیو شعبے میں تمام ریکارڈ موجود ہے۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی مگر ہمت نہیں ہورہی تھی مگر آج ہمت کر ہی لی۔ مرینا کی موت کی خبر افسوسناک تھی مگر اب اس کی وجہ سے میں دن بھر ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر تو بیٹھنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

چمڑے کا وہ بڑا سا تھیلا میرے پردادا کی نشانی تھا۔ براؤن رنگ کے اس بیگ میں کئی پرانی دستاویز، تصاویر، خطوط، ڈائریاں اور اسی طرح کی چیزیں موجود تھیں۔ میں

نے تھیلا کیا کھولا کہ ذہن کے دریچے ماضی کی طرف کھل گئے۔ میں ایک، ایک کاغذ کو اچھی طرح پڑھتی رہی۔ یہ بھول ہی گئی کہ کس لیے تھیلا کھولا تھا۔ آخر اچانک زرد رنگ کا ایک کاغذ مجھے مل گیا۔ یہ کاغذ کافی موٹا اور بوسیدہ تھا مگر اس کے باوجود اس پر لکھی تحریر بالکل صاف اور واضح تھی۔ یہ زمین کی الاٹمنٹ کی دستاویز تھی اور اس پر کاؤنٹی کی بڑی سی مہر بھی ثبت تھی۔ اس پر زمین کی الاٹمنٹ کی تاریخ پندرہ اکتوبر، 1891ء درج تھی۔

میں نے وہ دستاویز علیحدہ کر کے احتیاط سے فائل میں لگائی اور باقی ساری چیزیں تھیلے میں رکھ کر اسے بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ میں یہ دستاویز کبھی تلاش نہیں کرتی اگر مرینا میرے درختوں کے پھلوں کو بیچنے کے بجائے علاقے کے لوگوں اور بچوں میں مفت بانٹ دیا کرتی۔ مجھے اپنے درختوں کو قید سے آزاد کروانا تھا۔

شام کو ڈنر کے بعد میں نے تفصیلی طور پر ایک درخواست ٹائپ کی۔ دستاویز کی کاپی اس کے ساتھ منسلک کی اور یہ بھی لکھا کہ میرا باغ ناجائز طور پر مرینا کی جائداد میں شامل کیا گیا ہے۔ اس لیے اس قدیم اور اصلی دستاویز کی روشنی میں ازسرِنو پیائش کر کے میری ملکیتی زمین کی حدود متعین کی جائیں۔

دوسرے دن میں نے درخواست لینڈ ڈیپارٹمنٹ میں جمع کروادی۔ چونکہ میری درخواست ان کے ایک فیصلے کے خلاف تھی، اس لیے مجھ سے فیس بھی نہ لی گئی اور کارروائی بھی فوراً ہوئی۔ دوسرے ہی دن نارنجی جیکٹیں اور پیلے ہیلمٹ پہنے کاؤنٹی کے لینڈ ڈیپارٹمنٹ کا عملہ پیائش کے آلات لے کر پہنچ گیا۔ انہوں نے کئی گھنٹے تک کام کیا اور واپس چلے گئے۔

اس کے صرف دو روز بعد ہی مجھے کاؤنٹی سے ایک خط ملا، جس میں انہوں نے معذرت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ نہ صرف میرا باغ بلکہ مرینا کے گھر کے داخلی دروازے سے صرف تین میٹر دور تک کی زمین میری ملکیت ہے۔ انہوں نے پولیس کو بھی مطلع کر دیا تھا تاکہ وہ اس غلطی کے ازالے کے لیے مجھے میری زمین کا فوری قبضہ دلوائیں۔ اس سے اگلے ہی روز شیرف پہنچ گیا اور مجھے میرا باغ اور کافی ساری زمین واپس مل گئی۔

جن دنوں کی یہ بات ہے، اس وقت خزاں آچکی تھی۔ درخت ٹنڈ منڈ ہو رہے تھے۔ میرے درختوں کے پتے بھی جھڑ گئے تھے۔ موسم بہت افسردہ تھا۔ اسی دوران کاؤنٹی چرچ نے اعلامیہ شائع کروایا جس کے مطابق مرینا کی تدفین اتوار کو ہونی تھی۔ تدفین میں تاخیر کا سبب یہ بتایا گیا تھا کہ مرحومہ کے کچھ رشتے دار دور دراز سے آرہے تھے۔ اسی لیے ان کی درخواست پر تاخیر کی گئی۔ مرینا کی تدفین میں، میں نے بھی ایک اچھے ہمسائے کی طرح بھرپور شرکت کی اور تمام دعائیہ رسوم میں شریک ہوئی۔

مرینا کی تدفین کے بعد میری طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی۔ کئی روز تک بستر سے اٹھ نہ سکی۔ اس دوران ٹریوی باقاعدگی سے میری خیریت پوچھنے کے لیے آتا تھا۔ اس کی زبانی ہی یہ پتا چلا تھا کہ تدفین کے تیسرے روز ہی مرینا کا گھر فروخت ہوگیا تھا۔ جس دن اس نے یہ بات بتائی، اُسی شام نئے ہمسائے مجھ سے ملنے چلے آئے۔

وہ میاں بیوی تھے۔ ٹریوی کا ہم عمر لڑکا ان کے ساتھ تھا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ مجھے اچھی عادات کے مالک لگے۔ میں نے انہیں تفصیل سے سارا قصہ سنایا کہ کس طرح میرا باغ اُن کے گھر کی مرحومہ مالکن نے ہتھیایا اور کس طرح وہ مجھے واپس ملا۔ مجھے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ اس زمین کو، جو تنازعے سے پہلے مرینا کے پاس تھی، اپنے استعمال میں لاسکتے ہیں۔ ویسے بھی مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے اپنا باغ چاہیے تھا، وہ مجھے واپس مل چکا تھا۔ میں اُس زمین پر کبھی اپنا حق نہیں جتانا چاہتی تھی جو کبھی مرینا کے پاس تھی۔ میری اس اجازت پر وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ بہت جلد برف باری کا موسم آجائے گا۔ دوسرے دن موسم اچھی تو طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں باہر چلی آئی۔ سردیاں شروع ہوتے ہی ٹوٹو کے پھول اور شہد کی مکھیاں، دونوں غائب ہو چکے تھے۔ ویسے بھی مجھے اب ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کھرپی سنبھالی اور ایک ایک کر کے سارے پودے اکھاڑنے لگی۔ گھنٹا بھر میں آدھے پودے صاف ہو چکے تھے۔

''ارے یہ کیا کر رہی ہیں مسز آرتھر۔'' اسی دوران ٹریوی پہنچ گیا اور زمین پر پڑے ٹوٹو کے اکھاڑے گئے پودے دیکھ کر حیرت سے بولا۔

''اب ان کی ضرورت نہیں۔'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میرے ہمسائے بہت اچھے ہیں۔'' بہ ظاہر میری نظر درختوں کی طرف تھی۔

''یہ...'' اس نے باغ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں... یہی سمجھ لو۔'' اسے تو کہہ دیا مگر میرا اشارہ

ہرگز ان کی طرف نہیں تھا۔ اشارہ تو مرینا کے گھر میں بسنے والے نئے ہمسائیوں کی طرف تھا مگر وہ بچہ کیا سمجھتا میری ذو معنی بات۔

''مگر پھر بھی۔'' اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ ''انہیں نہیں اکھاڑنا چاہیے تھا۔'' اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ مجھ سے ناراض ہے۔

''ضروری تھا۔''

''مگر کیوں؟''

''کل مزدور آئیں گے اور یہ باڑھ ختم کر دیں گے۔'' میں نے اسے ٹوٹو اکھاڑنے کی وجہ سمجھانا شروع کی۔ ''جب باڑھ اکھاڑیں گے تو یہ پودے بھی اکھاڑنا پڑیں گے۔ ان کی جڑیں تو باڑھ کے نیچے ہیں۔''

''یہ پودے میں گھر لے جاؤں؟'' وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔

''ہرگز نہیں...'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ان سے بنا شہد بالکل بے ذائقہ، پھیکا بلکہ کڑوا ہے۔ تمہارا اچھے ذائقے والا شہد بھی خراب ہو جائے گا۔ میں نے خود اس کا سارا شہد پھینک دیا ہے اور ہاں، جاتے ہوئے یہ ڈبا بھی لے جانا۔'' یہ کہہ کر میں رکی۔ ''بھئی یہ شہد کی فارمنگ بہت مشکل کام ہے، میرے بس کا روگ نہیں۔''

''آپ کو فارمنگ کی بھلا کیا ضرورت ہے۔'' اب وہ بھی پودے اکھاڑنے کے لیے میرے ساتھ کھرپی لے کر بیٹھ گیا تھا۔ ''میں جو آپ کے لیے مزیدار شہد لے کر آتا ہوں۔''

''واقعی...'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ہوتے ہوئے مجھے شہد کی کیا کمی ہے۔''

ٹوٹو کے سارے پودے اکھاڑ لیے گئے تھے۔ اب وہ ڈھیر کی صورت میں سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ٹریوی کے جانے کے بعد میں نے ایک گڑھا کھودا اور کچن میں رکھے شہد کے دو مرتبان اٹھائے اور سارا شہد گڑھے میں ڈال کر دوبارہ مٹی ڈال دی۔

دوسرے دن مزدور آگئے۔ انہوں نے لکڑی کی باڑھ نہ صرف ہٹادی بلکہ اسے کلہاڑی سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر لکڑی کے اسٹور میں بھر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ باڑھ کے یہ کٹے ہوئے ٹکڑے پوری سردی میرے آتشدان کو روشن اور مجھے گرم رکھنے کے لیے کافی ہوں گے۔

☆☆☆

موسمِ بہار آگیا تھا۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر سبز کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ مجھے خوشی تھی کہ اس بہار میں میرے درخت آزاد ہیں اور موسمِ گرما میں میرے باغ کے پھل لوگوں کو اپنی جانب پھر متوجہ کریں گے۔ ایک بار پھر میرے باغ کے پھلوں پر سب کا حق ہوگا۔

بہار کے موسم میں ایک بار پھر دل میں خیال آیا کہ کچھ پھول والے پودے لگاؤں۔ میں اپنی اسٹڈی میں رکھی کتابوں میں پھولوں کے پودوں کی کتاب تلاش کر رہی تھی کہ وہی کتاب ایک بار پھر ہاتھ میں آگئی، جس میں ٹوٹو کے بارے میں پڑھنے کے بعد میں نے وہ پودا لگایا تھا۔ کتاب بہت اچھی تھی۔ ورق گردانی کرتے ہوئے ٹوٹو کے خواص والا صفحہ سامنے آگیا اور میں ایک بار پھر وہی پڑھنے لگی:

''ٹوٹو پودے میں ایک ہی بہت بڑی برائی ہے اور وہ یہ کہ اس کا وہ حصہ جسے شہد کی مکھیاں چوستی ہیں، ایک بہت ہی زہریلا مادہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر اس مادے کو چوسنے والی مکھیوں کا تیار کردہ شہد استعمال کیا جائے تو وہ دوسرے شہد کے مقابلے میں بہت میٹھا اور خوش ذائقہ محسوس ہوگا۔ اگر کوئی شخص اس شہد کو متواتر کئی مہینوں تک استعمال کرلے تو کسی بھی اچانک پیش آنے والی خوف کی صورتِ حال میں وہ کوما میں جاسکتا ہے اور اس کی موت واقع ہوسکتی ہے۔ اسی زہریلے خواص کی بدولت لوگوں میں یہ پودا مقبول نہیں رہا، حالانکہ اس کے بڑے بڑے سفید پھول آنکھوں کو بہت بھلے لگتے ہیں۔''

یہ پڑھ کر میں مسکرادی۔ ''اسی لیے تو ٹوٹو لگایا تھا۔ اگر مرینا کو حد سے زیادہ شہد پسند نہ ہوتا تو شاید وہ اب بھی میرے باغ پر قابض ہوتی۔'' اس خیال پر میں مسکرادی اور سوچنے لگی کہ دیکھو بے چارے ٹریوی کو کبھی پتا ہی نہیں کہ چلا کہ وہ مرینا کے لیے جو شہد لے کر آتا تھا، میں کچن میں آکر کتنی صفائی سے وہ شہد نکال کر ٹوٹو والا شہد اس میں بھر دیتی تھی۔ بھلا ہو ہیلووین تہوار کا۔ نہ وہ رات آتی، نہ وہ بچے اُس کے گھر جاتے اور نہ ہی وہ اچانک اتنی خوف زدہ ہوتی کہ ٹوٹو کے شہد کا مضرِ دماغ مادہ اسے کوما میں لے جاتا۔ مجھے کتاب میں لکھی تحریر کا کامیاب تجربہ ہو چکا تھا۔

مرینا کی موت کا خیال آتے ہی افسوس کی ایک ہلکی سی لہر من میں اٹھی۔ میں نے کھلی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ میرے سرسبز آزاد کھڑے درخت ہوا میں جھوم رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں مسکرادی اور کتاب میں سے وہ صفحہ آہستہ سے پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا۔

''الوداع ٹوٹو۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے کاغذ کے پرزے سنک میں بہادیے۔

کسی کے دل میں چاہت کی ندیا دھیرے دھیرے بہتی ہے تو کہیں طوفانی لہریں اسے اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی تسخیرِ کائنات کا خواب تھا مگر کسی کو عشق میں سرِبازار رسوائی منظور نہ تھی۔ جبکہ وہ ایسی محبت کی آرزومند تھی جو ندیا کے دونوں کناروں کے مابین پانی کے مانند بہتی ہو اور چاہتی تھی کہ یہ دونوں کنارے ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جو پانی آگے بڑھ جاتا ہے کنارے اس کا ساتھ نہیں دیتے... پیچھے سے آنے والا پانی ان کی ہریالی کا سبب بنتا ہے۔ زندگی کے اس فلسفے کو وہ آخری سانس تک نہ سمجھ سکی، کیونکہ وہ ایک ایسی عجیب میکانکی محبت کے حصار میں تھی جس میں جذبات کے گرداب نے اس کی آنکھوں میں دھول اور دامن میں خاک بھر دی تھی... وہ جو غفلت میں عجلت کا شکار تھی... محبت میں رقابت کو ہوا دے رہی تھی... خواہشوں کے دھوکے میں سازشوں میں پناہ تلاش کررہی تھی... معلوم نہیں اس کی جنوں خیزی میں کس کا ہاتھ تھا، معاشرتی نظام کا، جدید سہولتوں یا خیالات کی بے سمت اڑان کا... جو کچھ بھی تھا اس کے ستارے گردش میں آچکے تھے... اسیری خواہشوں کی ہو یا سلاخوں کی... ذہنی تباہی کا سبب ضرور بنتی ہے... اور بالآخر بن گئی۔

ام اقبال

اچھوتی محبت

[illegible]

سب جانتے تھے کہ ساحرہ احسن کی دیوانی ہے مگر... جانے کیوں ان دنوں بے کلی کا شکار رہنے لگی تھی۔ اسی کیفیت میں کچھ دن گزر گئے۔ اپنے آخری پرچے سے ایک دن قبل ساحرہ نے احسن کو بتایا۔ ”تین دن بعد میری شادی ہونے والی ہے۔“

اس کے چہرے پر بہت خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ احسن اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

”یہ تمہیں کیا ہو گیا احسن!“ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے ساحرہ سنجیدہ ہوگئی۔ ”یہ خبر تمہارے لیے غیر متوقع تو نہیں ہونا چاہیے تھی۔ میں نے امتحانات شروع ہونے سے پہلے تم سے جو باتیں کی تھیں، کیا وہ تمہیں یاد نہیں؟“

”یاد...... ہیں......“ احسن کی آواز بھرا گئی۔

”تو پھر اب کیا ہوا؟“

احسن جذباتی ہو گیا۔ ”ہر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن اسے موت آئے گی۔ اس کے باوجود وہ ہنسی خوشی زندگی گزارتا ہے لیکن جب موت اچانک اس کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے تو اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔“

”ایسی باتیں کر کے میرا دل نہ دکھاؤ احسن......! میری شادی کہیں بھی ہو، محبت تو مجھے تم ہی سے ہے اور رہے گی۔“

”شاید یہ دنیا کی پہلی اور آخری انوکھی محبت ہوگی۔“ احسن نے افسردگی میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اگر تم تنہائی میں مجھ سے ملتے رہتے تو میں یہ شادی نہیں کرتی۔ جب تک تمہیں ملازمت نہیں مل جاتی، میں انتظار کر لیتی لیکن تم اس کے لیے تیار ہی نہیں ہوئے!“

”مجھے حیرت ہے کہ تم اس قسم کی باتیں اتنی بے حجابی سے کرتی کیسے ہو۔“ احسن کے لہجے میں تلخی آگئی۔

”مگر میں یہ باتیں تمہارے علاوہ کسی سے نہیں کرتی۔“ ساحرہ نے سنجیدگی سے برجستہ کہا۔ ”میں تم سے جسمانی طور پر نہ سہی لیکن ذہنی طور پر تو بہت قریب ہوں۔ چار سال کے قریب گزر چکے ہیں، ہمیں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے اور اس سارے وقت میں ہم ایک دوسرے کی محبت سے سرشار رہے ہیں۔ میں تم سے ہی یہ باتیں کر سکتی ہوں۔“

”ہوں۔“ احسن نے نظریں دوسری طرف کر لیں۔

”احسن! جو باتیں میں نے پرچے شروع ہونے سے

پہلے تم سے بہت کھل کر کی تھیں، اس کے بعد تو تمہیں میرا مزاج سمجھ لینا چاہیے تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کو بہت کشادہ دلی سے تسلیم کرنا چاہیے احسن!''

''آج تو تم کچھ زیادہ ہی بالغ ہونے کا ثبوت دے رہی ہو۔'' احسن کے لہجے میں پہلے سے زیادہ تلخی تھی۔ ''زندگی کی حقیقتوں کو خوب سمجھنے لگی ہو۔''

''کیا آج طنز ہی کرتے رہو گے؟''

''جب دل پر قیامت گزر جائے تو آدمی کی زبان سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔''

''کیوں قیامت گزر رہی ہے تمہارے دل پر! کیا تم نے میری ان باتوں کو مذاق سمجھا تھا کہ شادی اور محبت، دو مختلف باتیں ہیں؟'' ساحرہ اپنے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ''میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ محبت تو مجھے تم سے ہی رہے گی۔''

''انوکھی محبت!'' احسن نے دہرایا۔

''تم اسے کوئی بھی نام دے لو۔ میں نے جو کہا ہے، وہ حقیقت ہے۔''

''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری زندگی برباد کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔''

''ہرگز نہیں۔'' ساحرہ مسکرائی۔ ''جب تمہیں ملازمت مل جائے گی تو میں خود تمہاری شادی کراؤں گی۔ خود ڈھونڈوں گی تمہارے لیے کوئی بہت خوب صورت سی لڑکی..... ! میں تو خوب صورت بھی نہیں ہوں احسن!..... یہ بات شاید دنیا کی کوئی لڑکی اپنی زبان پر نہیں لا سکتی لیکن میں ہر حقیقت کو کشادہ دلی سے قبول کرتی ہوں۔''

احسن کچھ نہیں بولا۔ اس کے دل و دماغ کی کشمکش خوف ناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔

ساحرہ پھر بولی۔ ''میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہی ہوں کہ میں شادی کے بعد بھی تم سے ملتی رہوں گی۔ خواہ تم مجھ سے تنہائی میں ملو یا نہ ملو۔ ہاں اگر تنہائی میں ملو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں تم سے یہ بھی کہہ چکی ہوں کہ میں اپنے شوہر کی ملکیت نہیں بنوں گی۔''

احسن اب بھی خاموش رہا۔

''کیا اب تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے؟'' ساحرہ نے کچھ افسردگی سے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔'' احسن کے دماغ نے کچھ الفاظ اس کی زبان کی طرف دھکیل ہی دیے۔

''اچھا سنو!'' ساحرہ نے کہا اور کچھ سوچنے لگی۔

احسن کچھ نہیں بولا۔ اس کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم بھی تیزی سے اٹھنے لگے تھے۔ یہ وہی پارک کی فٹ پاتھ تھی جہاں وہ بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے باتیں کرتے تھے۔

''میں اب بھی اس شادی سے انکار کر سکتی ہوں۔'' ساحرہ خاصے توقف کے بعد بولی۔

احسن چلتے چلتے ایک جھٹکے سے رک گیا۔ ''تو کر دو انکار!'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''مگر اس کی ایک شرط ہے۔'' ساحرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن رکو مت، چلتے رہو! لوگ ہماری طرف دیکھنے لگے ہیں۔''

یہ بات احسن نے بھی محسوس کر لی تھی۔ وہ پھر چلنے لگا۔ اس مرتبہ اس کی رفتار سست تھی۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کیا شرط ہے؟''

''میری شدید خواہش ہے کہ میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد تم ہو۔'' ساحرہ نے کہا۔ ''اگر ہماری ملاقاتیں تنہائی میں ہونے لگیں تو میں انتظار کر لوں گی۔ جب تمہیں ملازمت مل جائے گی تو ہم شادی کر لیں گے۔''

''نہیں۔'' احسن نے تیزی سے کہا۔ ''شادی سے پہلے یہ ممکن نہیں۔''

''خود کو اس جھوٹے معاشرے سے باندھے رکھو گے!'' اس مرتبہ ساحرہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

''میں تمہاری بات پر تبصرہ کرنے کے بجائے بس اتنا کہوں گا کہ اگر سب تمہاری طرح سوچنے لگیں تو یہ معاشرہ تکیپٹ ہو کر رہ جائے۔ جنگل بن جائے گی یہ دنیا جہاں صرف جانور رہتے ہوں گے۔''

ساحرہ یہ کہتے کہتے رک گئی کہ جانور تو انسان بھی ہے۔ وہ رکی اس لیے کہ اس نے احسن کا مقصد سمجھ لیا تھا۔ اس نے ''جانور'' کا لفظ لغوی معنوں میں استعمال نہیں کیا تھا۔

''جانوروں کی سی وحشت۔'' احسن پھر بولا۔ ''میں اپنے اندر نہیں سمو سکتا۔''

''میں بھی تو مجبور ہوں احسن!'' ساحرہ نے سنجیدگی سے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میرے اندر کی آگ مجھے اندر سے جلاتی چلی جا رہی ہے۔ اگر اس پر پانی نہیں پڑا تو میں جل جل کر خاک ہو جاؤں گی۔ میری دوست شیبا کو تو تم جانتے ہی ہو۔ میں اس وقت اسی کے گھر جا کے اس کے ساتھ اسٹڈی کرتی

ہوں۔ اس کے ساتھ اسٹڈی کرنا تو محض ایک بہانہ ہے۔ اس طرح مجھے تم سے ملنے کا موقع آسانی سے مل جاتا ہے۔''

''یہ سب میں جانتا ہوں۔''

''ہاں۔'' ساحرہ نے کہا۔ ''میں یونہی رو میں بولتی چلی گئی۔ میں تمہیں شیبا کی بات بتانا چاہتی تھی۔ اس کا خیال بھی یہ ہے کہ میری شادی جلد از جلد نہ ہوئی تو میری صحت برباد ہو جائے گی۔ کل تو اس نے یہ بھی کہا تھا کہ صحت کی وہ بربادی کسی مرض کا سبب بھی بن سکتی ہے۔''

''غلط کہا ہے شیبا نے۔'' احسن پھر تیزی سے بولا۔ ''یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا ہے کہ تم اس معاملے میں ابنارمل ہو، لیکن زیادہ وقت گزر جانے سے یہ ابنارملٹی کسی بیماری کا سبب نہیں بن سکتی۔''

ساحرہ اس بات کا جواب نہیں دے سکی۔ شیبا نے تو یہ بات اس لیے کہی تھی کہ ساحرہ نے اپنے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جو راستے اپنا لیے تھے، وہ اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ ساحرہ اب اس معاملے میں بے بس بھی ہو چکی تھی۔ وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر اس راستے پر دھیرے دھیرے آگے بڑھی تھی اور اب اتنا آگے جا چکی تھی کہ واپسی کا امکان نہیں رہا تھا۔ کم از کم وہ یہی سمجھتی تھی لیکن احسن کو وہ یہ سب کچھ نہیں بتا سکی۔

''میں اس معاملے میں بحث نہیں کرنا چاہتی احسن!'' ساحرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن یہ ایک بار پھر کہوں گی کہ تم سے میری محبت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ شادی اور محبت کے بارے میں میرے جو خیالات ہیں، ان سے بھی تم واقف ہو چکے ہو۔ میں اپنے شوہر کی ملکیت نہیں بنوں گی۔ اگر آج کا مرد پوری طرح آزاد ہے تو عورت کیوں نہیں!''

''عورت کی یہ آزادی اس معاشرے کو.....''

''پلیز احسن!'' ساحرہ نے چڑ کر کہا۔ ''مجھے اس جھوٹے معاشرے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''تو پھر شادی کے بغیر ہی آزاد ہو جاؤ۔'' احسن نے تلخی سے کہا۔

یہ ساحرہ کے لیے ایک معاشرتی مجبوری تھی لیکن وہ ضدی یہ لفظ ''معاشرہ'' اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔ وہ بولی۔ ''شادی اس لیے ضروری ہے کہ بات لیگلائز ہو جائے۔''

''تو کیا یہ معاشرے کا خوف نہیں؟'' احسن نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں۔'' ساحرہ نے کہا۔ ''میں اپنے والدین کی وجہ سے، صرف والدین کی وجہ سے مجبور ہوں۔''

''لیکن مجھ سے تنہائی میں ملنے کے لیے تیار ہو۔''

''تمہاری بات اور ہے۔ معاملہ اگر کھل بھی گیا تو تم سے میری شادی ہو جائے گی۔ بات کھلنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا لیکن تمہاری جگہ کوئی اور ہوا اور بات کھل گئی اور وہ مجھ سے شادی کے لیے بھی تیار نہیں ہوا تو میرے والدین کو اس بدنامی سے شدید صدمہ پہنچے گا۔ رہی میری بات، تو میں اسے برا ہی نہیں سمجھتی اور نہ یہ بدنامی کا سبب بننا چاہیے لیکن بدبخت..... بدبخت.....'' وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ وہ ''معاشرے'' کا لفظ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔

''بدبخت۔'' احسن نے تلخی سے کہا۔ ''چپ کیوں ہو گئیں؟ بات پوری کرو۔ معاشرہ ہی کہنا چاہتی تھیں نا!''

''ہاں۔'' ساحرہ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ بدبخت، جھوٹا معاشرہ!''

''جس کی بنیاد.....''

''بس آ گئی۔'' ساحرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

وہ دونوں بس اسٹاپ پر پہنچ گئے تھے اور اتفاق سے اسی وقت بس آ کر رکی تھی۔

''میں تم سے فون پر رابطہ کروں گی۔'' ساحرہ نے کہا اور بس میں سوار ہونے کے لیے اس کی طرف بڑھ گئی۔

احسن گم صم کھڑا ساحرہ کو بس میں سوار ہوتے دیکھتا رہ گیا۔

بس میں بیٹھی ہوئی ساحرہ کچھ دیر افسردہ رہی۔ اسے قدرے دکھ یہ تھا کہ اس کی شادی کی خبر احسن سے برداشت نہیں ہوئی تھی۔ ساحرہ سوچ رہی تھی کہ بعض مردوں کی سوچ ایسی کیوں ہوتی ہے؟ وہ محبت کے نتیجے میں اسی لڑکی سے شادی کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟

اور یہ احسن؟..... ساحرہ نے بیٹھے بیٹھے منہ بناتے ہوئے سوچا، وہ تو بس ''معاشرہ، معاشرہ'' رٹتا رہتا ہے، پاگل!

خیر! اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا کہ وہ احسن کے لیے کوئی بہت خوب صورت لڑکی تلاش کرے گی۔ ان دونوں کی شادی کرا دے گی۔ احسن بھول جائے گا کہ محبت کے نتیجے میں شادی ضروری ہے۔

اسی قسم کی سوچ بچار کے ساتھ وہ بس سے اتر کر شیبا کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئی۔

شیبا حسب معمول اپنے کمرے میں کتابیں لیے قالین پر بیٹھی تھی۔

ابتدائی رسمی گفتگو کے ساتھ ساحرہ نے شیبا کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنی ایک کتاب کھولی اور اگلے دن کے پرچے کے حوالے سے شیبا سے ایک سوال کیا۔

شیبا جواب دینے کے بجائے تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا جانی؟" ساحرہ ہنسی۔ "اس طرح کیوں دیکھنے لگیں.....؟"

"معمول کے خلاف ہوا ہے آج۔" شیبا بولی۔ "تم تو کتابیں رکھ کر سیدھی کمپیوٹر کی طرف جایا کرتی تھیں۔"

"آج ذہن تھوڑا سا الجھا ہوا ہے۔"

"کیوں؟ اور ذہن الجھا ہوا ہے تو اسٹڈی کیا خاک کروگی۔"

"اسٹڈی شروع کروں گی تو وہ خیالات ذہن سے نکل جائیں گے۔"

"خیالات کیا ہیں؟"

"سب بتاؤں گی تمہیں! پہلے اسٹڈی کرلی جائے۔"

"اچھا!" شیبا نے طویل سانس لی۔ "جیسی تمہاری مرضی۔"

اس دن تک ساحرہ نے شیبا کو اپنی شادی کے سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

شیبا نے اسٹڈی ختم کرنے سے چند منٹ پہلے کتابیں بند کردیں اور ساحرہ سے بولی۔ "کیا اب بھی تمہارا ذہن الجھا ہوا ہے؟"

"نہیں۔" ساحرہ مسکرائی۔ "میں نے کہا تھا نا کہ اسٹڈی کروں گی تو وہ خیالات ذہن سے نکل جائیں گے۔"

"وہی خیالات تو جاننا چاہتی ہوں۔"

"خوش ہوجاؤ گی سن کر!"

"اگر ایسی بات ہے تو اس میں تمہارا ذہن کیوں الجھا ہوا تھا؟"

"الجھا ہوا تو احسن کی باتوں کی وجہ سے تھا۔ میں تمہیں یہ خوش خبری دینا چاہتی ہوں کہ پرسوں میری شادی ہورہی ہے۔"

"پرسوں؟" شیبا چونکی۔ "اور تم مجھے آج بتا رہی ہو؟..... بات اچانک تو طے نہیں ہوئی ہوگی۔"

"ہاں بات تو چند روز سے چل رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ معاملات جب طے پا جائیں گے، تبھی تمہیں بتاؤں گی۔ سب کچھ آج صبح فائنل ہوا ہے۔ پرسوں کی تاریخ بھی طے پا گئی ہے۔"

"اب اتنی جلدی ہوگئی احسن کو!" شیبا نے ہنس کر کہا۔

"کہاں ملازمت مل گئی اسے؟"

"ملازمت تو اسے ابھی نہیں ملی..... اور بات بھی تم شاید غلط سمجھ رہی ہو۔ میری شادی احسن سے نہیں ہورہی ہے۔"

"کیا!" شیبا چونکی۔

"ہاں۔" ساحرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میری شادی کہیں اور ہورہی ہے۔ اسی اطلاع پر تو احسن نے ایسی باتیں کی تھیں کہ وقتی طور پر میرا ذہن الجھ گیا تھا۔"

"وقتی طور پر؟" شیبا اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔" ساحرہ نے کہا۔ "احسن کو جھٹکا سا لگا تھا یہ سن کر، لیکن مجھے امید ہے کہ وہ کچھ دن میں ٹھیک ہوجائے گا۔"

شیبا کی حیرت کم نہیں ہوئی۔ "اور تم بالکل مطمئن نظر آرہی ہو۔"

"کیا مجھے مطمئن نہیں ہونا چاہیے؟ کیا تم ہی نے یہ نہیں کہا تھا کہ میری شادی جلد از جلد ہونا چاہیے؟"

"لیکن میرا خیال تھا کہ تم احسن کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروگی۔"

"اب میں بھی کیا کرتی! وہ ملازمت ملنے سے پہلے شادی کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔"

"کیا تمہیں اس سے محبت نہیں؟"

"وہ تو ہے۔"

"تو تم نے اسے سمجھایا کیوں نہیں کہ وہ ملازمت کی شرط ختم کردے؟"

"سمجھایا تھا۔ وہ مانا ہی نہیں۔"

"شادی تمہارے والدین نے طے کی ہے؟"

"ہاں۔"

"احسن کو بہت صدمہ ہوا ہوگا لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ تمہیں بہت چاہتا تھا، بلکہ اب بھی چاہتا ہوگا۔"

"میں بھی اسے چاہتی ہوں جانی!"

"پھر بھی خوشی خوشی دوسری جگہ شادی کررہی ہو؟"

ساحرہ نے طویل سانس لی۔ "تم بھی احسن کی طرح باتیں کرنے لگیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے جانی کہ میری شادی دوسری جگہ ہورہی ہے؟"

"کچھ نہیں ہوتا اس سے؟"

"کچھ بھی نہیں! میں شادی کے بعد بھی احسن سے ملتی رہوں گی۔"

"شادی تو اب اس سے نہیں کرسکو گی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ محبت اور شادی، دو الگ الگ باتیں ہیں۔" شیبا اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

ساحرہ پھر بولی۔ "جس سے محبت ہو، اس سے شادی ہوجائے تو اچھا ہے لیکن اگر نہ ہو..... میرا مطلب ہے کہ شادی کسی اور سے ہوجائے تو اس میں کوئی بہت زیادہ حرج تو نہیں۔ شادی کے بعد بیوی شوہر کی، یا شوہر بیوی کی ملکیت نہیں بن جاتا۔"

"تم نے اپنے ان خیالات کا اظہار پہلے کبھی نہیں کیا۔" شیبا دھیمی آواز میں بولی۔ اس کے چہرے سے تشویش ظاہر ہونے لگی تھی۔

"کوئی ایسی بات ہی نہیں چھڑی۔"

"احسن تمہارے ان خیالات سے متفق ہے؟"

"متفق ہی تو نہیں۔" ساحرہ نے منہ بنایا۔ "جب میں یہاں آئی تھی تو اسی کی باتوں کی وجہ سے الجھی ہوئی تھی۔ وہ ایسا نظر آنے لگا تھا جیسے اس کی جان پر بن گئی ہو..... لیکن..... ٹھیک کرلوں گی میں اسے۔"

شیبا نے اس کی باتوں پر شاید دھیان نہیں دیا اور پوچھا۔ "جہاں تمہاری شادی طے کی گئی ہے، کیا اس کے لیے تمہارے والدین نے تمہیں مجبور کیا تھا؟"

"نہیں تو....."

"یعنی تم اس شادی سے انکار بھی کرسکتی تھیں؟"

"ہاں، کرسکتی تھی۔"

"اور تم نے نہیں کیا؟" شیبا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیوں کرتی؟ آخر تم بھی تو یہ کہہ چکی ہو کہ میری شادی جلد از جلد ہوجانا چاہیے۔" ساحرہ نے شیبا کی بات پھر دہرائی۔

"لیکن میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم احسن کے بجائے کسی اور سے شادی کرلو۔ اب مجھے اس پر یقین نہیں آسکتا کہ تم بھی اس سے محبت کرتی تھیں۔"

"کرتی تھی نہیں، اب بھی کرتی ہوں۔"

"جھوٹ بول رہی ہو تم!" شیبا جھنجلائے ہوئے سے انداز میں کھڑی ہوگئی اور ٹہلتے ہوئے بولی۔ "قیامت ڈھا دی ہے تم نے احسن کے دل پر.....! میں کالج کا زمانہ بھولی نہیں ہوں۔ جب ہم دونوں فرسٹ ایئر میں تھے۔ احسن تھرڈ ایئر میں تھا۔ ہم کلاس فیلو نہیں تھے لیکن جب بھی کسی وقت لڑکے لڑکیاں لان میں بیٹھی ہوتی تھیں یا کینٹین میں یکجائی ہوتیں تو احسن کی نظریں تمہارے چہرے کے علاوہ کسی چہرے پر نہیں جمتی تھیں۔"

ساحرہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ یہ سمجھنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ احسن کی طرف داری کرتے ہوئے شیبا جھنجلائی کیوں تھی اور اتنی جذباتی کیوں ہورہی تھی۔

شیبا خاموش ہونے کے بعد بھی ٹہلتی رہی۔

"جانی!" ساحرہ دھیمی آواز میں بولی۔ "یہ تو بہت ممکن ہے کہ تمہیں میری باتوں سے اتفاق نہ ہو لیکن تمہیں اتنا برہم تو نہیں ہونا چاہیے۔"

"بہتر ہوگا کہ ہم اس موضوع پر اب گفتگو نہ کریں۔" شیبا کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

"ٹھیک ہے۔" ساحرہ اپنی کتابیں سنبھالتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ معمول کے مطابق شیبا اسے چھوڑنے کے لیے برآمدے تک آئی مگر اس کے انداز میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں تھی۔

"جانی!" ساحرہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "کیا بہت ناراض ہوگئی ہو مجھ سے؟ کیا تمہیں میرے خیالات برے لگے ہیں یا میرا احسن سے شادی نہ ہونا؟"

"سبھی کچھ....." شیبا نے کہا۔ "لیکن..... میں نے ابھی کہا تھا نا.....! اب یہ باتیں نہ کرو۔"

"اتنا تو بتا دو! کیا اب تم مجھ سے ناراض ہوگئی ہو؟"

"ایسا بہرحال نہیں ہے کہ اب میں تم سے ملنا ہی نہ چاہوں۔" شیبا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"شکر ہے۔" ساحرہ نے طویل سانس لی۔ "میرے سینے سے بوجھ اتر گیا۔ اچھا، خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

ساحرہ اس کے بنگلے سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ یہ اسے کبھی معلوم نہیں ہوسکا کہ شیبا اسے رخصت کرنے کے بعد تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی تھی اور بستر پر گری پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ اس وقت ساحرہ اس کی یہ حالت دیکھتی تو سکتے میں رہ جاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ شیبا پر یہ ردعمل کیوں ہوا تھا۔ ساحرہ تو کیا، کوئی بھی شیبا کی اس حالت کا سبب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ شیبا نے اپنے دل کی یہ بات کبھی کسی کو بتائی ہی نہیں تھی کہ احسن اس کا محبوب تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ کالج ہی کے زمانے میں وہ اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ احسن اسے بے تحاشا بھا گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ احسن کے قریب ہونے کی کوشش میں کامیاب ہونے کے بعد اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتی، اسے یکایک محسوس ہوا کہ احسن تو ساحرہ کی طرف متوجہ تھا اور ساحرہ بھی اس کی متوالی نظر آئی تھی۔

شیبا نے یہ احساس ہونے سے پہلے اپنے اور احسن کے بارے میں بہت سے خواب دیکھ ڈالے تھے اس لیے ساحرہ اور احسن کی محبت کا علم اس کے لیے ایک صدمے سے کم نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ دو تین روز تک اتنی نڈھال رہی تھی کہ کالج بھی نہیں جا سکی تھی۔

ساحرہ اور احسن کے بارے میں کالج کے دوسرے لڑکے لڑکیوں نے بھی محسوس کر لیا تھا جس کا سبب خود احسن کا رویہ تھا۔ ساحرہ کے سامنے آنے پر احسن کو اپنی آنکھوں پر جیسے اختیار ہی نہیں رہتا تھا۔ اس کی نگاہیں ساحرہ کے چہرے پر جم کر رہ جاتی تھیں۔ اس کے برخلاف ساحرہ میں ایسا جنون نہیں تھا لیکن محبت وہ احسن ہی سے کرنے لگی تھی۔ اسی لیے شیبا نے فیصلہ کیا تھا کہ ساحرہ اور احسن کے بیچ سے ہٹ جائے۔ اس نے دھیرے دھیرے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی اور اپنے دل کو سمجھایا تھا کہ انسان کو اپنی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے ضد نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے دماغ میں اکثر یہ خیال بھی آیا کہ اب وہ کبھی کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ کالج میں وہ کوشش کرنے لگی کہ احسن سے اس کا آمنا سامنا ہی نہ ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ سے اس کا قرب دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ اس بڑھتے ہوئے قرب میں شیبا کی ہی کوششوں کا دخل تھا۔ وہ کوششیں لاشعوری بھی تھیں۔ اسی لیے ایک بار چونک گئی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ کیا اس لیے کہ ساحرہ کے قرب سے اسے تسکین ملتی تھی کیونکہ اس کا محبوب ساحرہ کو چاہتا تھا۔

گویا لیلیٰ اور سسی لیلیٰ کا سا معاملہ تھا۔

یہ احساس ہونے کے بعد شیبا پژمردگی سے مسکرا دی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شیبا نے ساحرہ کو اپنے بہت قریب کر لیا تھا۔ ان کی ملاقاتیں کالج کے باہر بھی ہوا کرتیں۔ کالج میں سبھی نے سمجھ لیا تھا کہ ساحرہ اور شیبا بہت گہری دوست بن گئی تھیں۔

ساحرہ جب شیبا سے اپنی اور احسن کی باتیں کرتی تو اس کا انداز بڑا والہانہ ہوا کرتا تھا۔ شیبا سوچا کرتی تھی کہ شادی کے بعد ساحرہ اور احسن کا جوڑا دنیا کی نظر میں ایک مثالی جوڑا ہوگا۔ مگر اب اچانک جیسے ساری دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اس کو یہ جان کر شدید ذہنی جھٹکا لگا تھا کہ ساحرہ کسی اور سے شادی کر رہی تھی۔ اسے یہ خیال قطعی نہیں آیا کہ اب اس کے لیے میدان صاف ہو گیا تھا اور وہ احسن تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ احسن اس کی پذیرائی ہرگز نہیں کرے گا۔ اس کا دل چور چور ہو چکا ہوگا۔

خود شیبا جس طرح یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب کبھی شادی نہیں کرے گی، اسی طرح احسن کا فیصلہ بھی یہی ہو سکتا تھا۔ ساحرہ سے اس کی چاہت بہت شدید تھی۔ اسے بہت گہرا صدمہ ہوا ہوگا۔ خود شیبا اس صدمے کو محسوس کر رہی تھی اور وہی صدمہ اس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔

ساحرہ اور احسن کی محبت کا علم ہو جانے کے بعد شیبا نے احسن کا سامنا کرنے سے گریز کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی بہت کچھ سمجھایا تھا لیکن وہ احسن کی محبت کو اپنے دل سے مکمل طور پر تو کیا، ذرا بھی نہیں نکال سکی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ احسن اسے کبھی نہیں مل سکے گا لیکن اس نے اپنی تسکین کا ایک ذریعہ نکال لیا تھا کہ کبھی کبھی احسن کی آواز سن لیا کرتی تھی۔ اسے نہ جانے کب اور کس سے احسن کا موبائل فون نمبر معلوم ہو گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی احسن کو فون کر لیا کرتی تھی اور فون کرنے کے لیے اس نے ایک نیا نمبر استعمال کیا تھا۔ احسن دوسری طرف سے ''ہیلو، ہیلو'' کرتا رہتا اور وہ خاموشی سے اس کی آواز سنتی رہتی۔

دو تین مرتبہ کے بعد جب احسن نے اس نمبر کی کال ریسیو کرنا چھوڑ دی تو شیبا نے ایک اور نمبر استعمال کیا۔ اس کے بعد اس نے معمول ہی بنا لیا تھا کہ ایک نمبر سے بس ایک ہی مرتبہ فون کیا کرتی۔ اس طرح اس کے پاس بے شمار ''سم'' جمع ہو گئی تھیں۔

اس وقت اسے خود کو سنبھالنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر اس نے اپنے آنسو خشک کر کے بیڈ کی دراز سے ایک نئی ''سم'' نکالی اور اپنا موبائل فون کھول کر اس کی پرانی ''سم'' نکالی۔ نئی ''سم'' لگا کر اس نے موبائل بند کیا اور احسن کے نمبر ملانے لگی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ احسن اس وقت کس حال میں تھا، وہ آواز سے ہی احسن کی کیفیت کا اندازہ لگا لیتی اور ایسا ہی ہوا۔

احسن نے کئی گھنٹوں کے بعد کال ریسیو کی تھی اور ''ہیلو'' کہا تھا۔

شیبا نے اس کے لہجے میں ایسی شدید مردنی پہلے کبھی نہیں محسوس کی تھی۔ اس کے دل پر شدید چوٹ لگی اور آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبا گئیں۔ اس نے جلدی سے موبائل آف کر دیا۔ جب اس نے تکیے پر سر رکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''ساحرہ!'' اس کے دل میں ایک چیخ گونجی۔ ''بہت برا کیا تو نے احسن کے ساتھ!''

♥♥♥

احسن اپنے بستر پر نڈھال پڑا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اپنے موبائل کی طرف دیکھتا رہا جس پر کال آئی تھی اور جواب میں کچھ بولے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

نہ جانے کون یہ حرکت کرتا ہے، اس نے سوچتے ہوئے موبائل بستر پر ایک طرف ڈال دیا، پھر اس کا دھیان اس کی طرف سے ہٹ گیا۔ وہ گم نام کال آنے سے پہلے بھی وہ ساحرہ اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب اس کا ذہن پھر اسی طرف لگ گیا۔ چند گھنٹوں میں اس کے چہرے پر ایسی زردی کھنڈ گئی تھی جیسے وہ برسوں کا بیمار ہو۔ رات بھر اسے نیند نہیں آ سکی۔ وہ بستر پر ساکت پڑا تھا لیکن اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔

صبح جب اس کی ماں عابدہ اسے جگانے آئیں تو وہ جاگ ہی رہا تھا۔ ''کیا سوئے نہیں بیٹا!'' ماں نے تشویش سے پوچھا۔

''سو گیا تھا امی جان! ابھی ابھی آنکھ کھلی ہے۔'' احسن جھوٹ بولتے ہوئے بستر سے اٹھا۔

''چلو جلدی سے نہا دھو لو! میں ناشتا تیار کر رہی ہوں۔''

احسن سر ہلاتا ہوا غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے بخار ہو گیا ہے۔ اس حالت میں اس نے نہانا مناسب نہیں سمجھا، منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کیے، بالوں میں کنگھا پھیرا۔ پھر تھرمامیٹر نکال کر اپنا ٹمپریچر دیکھا۔ معمولی سی حرارت تھی لیکن قلبی واردات کے بوجھ کے باعث وہ زیادہ بخار محسوس کر رہا تھا۔

ناشتے کے دوران میں اس کے باپ زبیری نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کل رات سے تم الجھے الجھے سے نظر آ رہے ہو بیٹا..... رات کو کھانا بھی تم نے ٹھیک سے نہیں کھایا تھا، خیریت تو ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں ابو جان!'' احسن نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''یوں ہی ذرا تھکن سی محسوس کر رہا ہوں۔''

''تھکن تو ہوگی ہی۔'' عابدہ بول پڑیں۔ ''ملازمت کے لیے جانے کہاں کہاں دھکے کھاتے پھرتے ہو۔''

''کئی بار کہہ چکا ہوں۔'' زبیری بھی بولے۔ ''ملازمت کے لیے اپنے دماغ پر زیادہ دباؤ نہ ڈالو۔ جب ملنا ہوگی، مل جائے گی۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں اتنی تگ و دو کی کیا ضرورت ہے۔ آج تو بیمار سے لگ رہے ہو۔ اب دو تین روز گھر سے کہیں آؤ جاؤ نہیں، بس آرام کرو۔''

''جی بہتر۔'' احسن نے کہا۔ خود اس کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ گھر سے نکلے۔

ناشتے کے بعد زبیری اپنے دفتر چلے گئے۔ وہ انکم ٹیکس پریکٹیشنر تھے۔ دفتر ان کا ذاتی تھا۔

عابدہ، ملازمہ سے گھر کی صفائی کرانے میں مصروف ہو گئیں۔ احسن اپنے کمرے میں جا لیٹا۔ لیٹنے سے پہلے اس نے اسپرین کی ایک گولی کھا لی تھی۔ اس کے دماغ میں پھر ماضی کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ زندگی کے نہایت خوش گوار لمحوں کی پرچھائیاں۔ لیکن اب صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ ان پرچھائیوں کو گم ہو جانا چاہیے تھا۔ زندگی ایک اذیت ناک موڑ پر آ گئی تھی۔ اب مستقبل ان پرچھائیوں کی رفاقت میں نہیں گزارا جا سکتا تھا لیکن احسن محسوس کر رہا تھا کہ وہ زندگی بھر ان پرچھائیوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکے گا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اس لیے ان سب خیالات کے باوجود اسے نیند آ گئی۔ جب وہ جاگا تو تین بج رہے تھے۔ اس کی ماں عابدہ بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھی تشویش سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''ارے!'' احسن نے اٹھنا چاہا۔

''لیٹے رہو۔'' عابدہ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بخار ہے تمہیں! میں تم سے کھانے کے لیے پوچھنے آئی تھی تو تم سو رہے تھے۔ میں نے تمہاری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تھا۔ بخار ہی کی وجہ سے میں نے تمہیں اس خیال سے نہیں جگایا کہ شاید سونے سے، آرام کرنے سے ہی تمہارا بخار اتر جائے۔''

''معمولی حرارت ہے امی جان!''

''ٹمپریچر لو۔''

عابدہ نے خود تھرمامیٹر نکال کر اس کا ٹمپریچر لیا۔

''سو ہے۔'' وہ بولیں۔ ''اب بہتر یہی ہے کہ تم کھانا نہ کھاؤ۔ میں تمہارے لیے جوشاندہ بنا کر لاتی ہوں۔''

عابدہ حکمت کی بہت قائل تھیں۔ اس کے برخلاف زبیری ایلوپیتھ پر بھروسا کرتے تھے۔

ماں کے جانے کے بعد احسن کی نظر اپنے موبائل فون پر پڑی۔ اس نے تعجب سے دیکھا کہ موبائل آف تھا۔ اس نے اپنے دماغ پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ بستر پر لیٹنے کے بعد کیا اس نے موبائل آف کر دیا تھا؟

اسے یاد نہیں آیا تو اس نے سوچا، شاید بے خیالی میں بند ہی کر دیا ہو۔ اس نے موبائل آن کر کے رکھ دیا اور لیٹا رہا۔ دماغ پر پھر خیالات کی یلغار شروع ہو گئی۔

عابدہ اس کے لیے جوشاندہ بنا لائیں۔ احسن کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ لیکن ماں کی خاطر اسے جوشاندہ پینا ہی پڑا۔

''موبائل آن کرلیا تم نے؟'' عابدہ بولیں۔

احسن چونکا۔ ''آپ نے بند کیا تھا؟''

''ہاں۔'' عابدہ نے جواب دیا۔ ''کال آئی تھی، میں نے ہی بند کر دیا تھا تاکہ دوبارہ کال نہ آئے۔ تمہاری نیند خراب ہوتی۔ ایک گھنٹی سے تو تمہاری آنکھ نہیں کھلی تھی لیکن بار بار گھنٹی بجتی تو جاگ جاتے۔''

احسن کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''جانے کس کی کال ہو!''

''کوئی ساحرہ تھی۔ میں نے اسکرین پر اس کا نام دیکھ لیا تھا۔ تمہارے کالج کے زمانے کی کوئی دوست ہوگی۔ میں اس سے کیا بات کرتی، اس لیے فون بند ہی کر دیا۔ کالج ہی کی کوئی لڑکی ہے نا؟''

''جی۔''

''کوئی خاص بات ہوگی تو پھر فون کرلے گی۔ تم اب اوڑھ لپیٹ لو۔'' عابدہ نے خود ہی احسن کو کمبل اڑھایا۔ ''پسینا آئے گا تو اتر جائے گا بخار! سونے کی کوشش کرو، نیند آجائے تو اچھا ہے۔''

احسن نے آنکھیں بند کرلیں لیکن وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد ساحرہ کو فون کرے، معلوم تو ہو کہ اس نے کال کیوں کی تھی۔

جب اسے قدموں کی آہٹ سے اندازہ ہوگیا کہ عابدہ کمرے سے چلی گئیں تو اس نے جلدی سے اپنا موبائل فون اٹھا کر ساحرہ کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے فوراً کال ریسیو کی گئی اور ساحرہ کی آواز آئی۔ ''شکر ہے کہ تم نے فون کیا۔ میں تو سمجھی تھی کہ بہت ہی زیادہ ناراض ہوگئے ہو۔ میری کال تک ریسیو کرنا گوارا نہیں رہا۔ فون بند کر کے بیٹھ گئے۔''

''غلط سمجھ رہی ہو۔'' احسن نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''دراصل امی جان بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے تم سے کیا بات کرتا۔ اسی لیے فون بند کر دیا تھا۔''

''وہ اتنی دیر تک بیٹھی رہیں، کیوں؟'' ساحرہ کے لہجے میں شوخی آگئی۔ ''کوئی لڑکی تو نہیں دیکھ لی تمہارے لیے؟ اسی کے بارے میں بات کر رہی تھیں کیا؟''

احسن نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میری شادی کا تو اب سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''ارے چھوڑو، شادی تو تمہارے فرشتے بھی کریں گے۔ میں خود کراؤں گی تمہاری شادی!''

احسن کو ساحرہ کے اس لب و لہجے سے تکلیف پہنچی۔

''زندہ درگور تو کر دیا ہے تم نے مجھے!'' وہ بولا۔

''ارے واہ! بس شادی ہو رہی ہے میری! میں مری تو نہیں جا رہی ہوں، زندہ رہوں گی اور تم سے ملتی بھی رہوں گی اور.....'' وہ ہنسی۔ ''کسی نہ کسی دن تم سے اپنی بات منوا تو لوں گی۔''

''انہی باتوں کے لیے فون کیا تھا؟''

''ارے نہیں! وہ تو میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ آج کا پرچہ بھی اچھا ہوگیا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ شاید کچھ گڑبڑ ہو جائے۔ تمہاری کل کی باتوں سے میرا دل تھوڑا سا بوجھل سا ہوگیا تھا۔''

''تم جس معاملے میں ابنارمل ہو، اس معاملے میں آدمی کا دماغ بہت تیز ہوتا ہے۔ تمہارا پرچہ خراب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا گیا۔ ''میں نے پڑھائی پر کبھی زیادہ توجہ نہیں دی لیکن ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوئی ہوں۔ خیر چھوڑو، مجھے یہ بھی کہنا تھا کہ آج میں کسی طرح تم سے ملنا چاہتی تھی لیکن گھر میں آج ہی سے اتنا ہنگامہ شروع ہوگیا ہے کہ گھر سے میرا نکلنا ممکن ہی نہیں، اور کل شادی ہے۔ اب میں تمہیں پرسوں فون کرسکوں گی۔ ملیں گے کسی جگہ۔''

''اب اس کی کیا ضرورت ہے!'' احسن نے ٹھنڈی سانس لی۔

''ارے واہ! اس کی ضرورت تو ساری زندگی رہے گی۔''

احسن خاموش رہا۔

''اچھا، اب میں بند کرتی ہوں۔'' ساحرہ بولی۔

''ٹھیک؟''

''ٹھیک۔'' احسن کی آواز بہت دھیمی ہوگئی۔

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے ریسیور چوما گیا ہو اور پھر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی لڑکی بھی ہوسکتی ہے؟ احسن نے سوچتے ہوئے اپنا موبائل بند کیا۔

ایک گھنٹے بعد عابدہ نے اس کے کمرے کا چکر لگایا۔ احسن نے اس طرح آنکھیں بند کرلیں جیسے سو رہا ہو۔ عابدہ بیگم نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا اور ہٹا لیا۔ چند لمحے کھڑی رہیں، پھر کسی سوچ میں ڈوبی آہستہ آہستہ چلتی کمرے سے نکل گئیں۔

احسن محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بخار میں کچھ تیزی آگئی تھی۔

آدھا گھنٹا اور گزرا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی

بجی۔ اس نے جلدی سے اٹھایا لیکن اسکرین پر ایک نیا اور اجنبی نمبر دیکھ کر اس پر جھنجلاہٹ سی طاری ہوگئی۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ وہی گم نام فون ہوگا۔ اس نے سوچا کہ آج اس نامعلوم شخص کو کھری کھری سنا ہی دے گا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''کون ہو تم!'' احسن نے تڑختی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''کیا چاہتے ہو؟ فون کرتے ہو تو بولتے کیوں نہیں ہو؟ کیا تمہیں کوئی بیماری ہے؟..... کیا میں تمہیں کسی اچھے اسپتال کا پتا بتاؤں؟''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ!'' دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔

احسن چونک پڑا۔ ''کو..... کون!'' وہ ہکلا سا گیا۔

''میں بھی اسی کالج میں پڑھتی تھی جہاں آپ نے پڑھا ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''میں آپ سے آج ہی ملنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں؟'' احسن نے دھیمی آواز میں پوچھا اور پھر کہا۔ ''میں آج کسی سے نہیں مل سکتا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''آپ شاید نہ ملنے کے لیے بہانہ بنا رہے ہیں۔ ہاں اتنا یقین مجھے ضرور ہے کہ آپ بہت ڈسٹرب ہوں گے۔ آپ سے آج ملاقات بہت ضروری ہے احسن!''

''لیکن.....''

''مجھے ساحرہ کے بارے میں بات کرنا ہے۔'' دوسری طرف سے بات کاٹ دی گئی۔

''جی؟'' احسن چونک پڑا۔

''جی ہاں، ساحرہ کے بارے میں ضروری بات کرنا ہے آپ سے!''

''کون ہیں آپ؟'' احسن کے تنفس کی رفتار کچھ تیز ہوگئی۔

''جب آپ مجھے دیکھیں گے تو پہچان لیں گے۔''

اگر احسن کی طبیعت خراب نہ بھی ہوتی تو وہ اپنی ذہنی کیفیت کے باعث کسی لڑکی سے ملنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن ساحرہ کا نام آجانے کی وجہ سے وہ بے تاب ہوگیا تھا۔ وہ لڑکی اس سے ساحرہ کے بارے میں جانے کیا بات کرنا چاہتی تھی؟

''کہاں ملنا چاہتی ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''کسی ریسٹورنٹ میں! جہاں آپ مناسب سمجھیں۔''

احسن نے ایک ایسے ریسٹورنٹ کا نام لیا جو اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''آپ کب آسکیں گے؟''

''آپ کب ملنا چاہتی ہیں؟''

''میں تو فوراً ملنا چاہتی ہوں۔''

''تو میں آدھے گھنٹے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

بخار کے باوجود احسن بستر سے اٹھ گیا۔

''مگر میرے گھر سے اس ریسٹورنٹ کا فاصلہ آدھے گھنٹے سے زیادہ کا ہے۔''

''میں انتظار کرلوں گا۔''

''شکریہ احسن صاحب!'' اس جواب کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

احسن نے الماری کھول کر وہ ہینگر نکالا جس میں اس کے کپڑے ٹنگے تھے۔ اسی وقت عابدہ کمرے میں آئیں اور چونکیں۔

''کیا کہیں جا رہے ہو؟'' انہوں نے تیزی سے پوچھا۔

''جی امی جان!'' احسن نے بہانہ سوچ لیا۔ ''میری طبیعت زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے، میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔''

عابدہ نے قریب آکر احسن کا ماتھا چھوا۔

''ہاں۔'' وہ تشویش سے بولیں۔ ''بخار تیز تو ہوا ہے۔ ایک سو ایک سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ ایک بار جوشاندہ اور پی لو۔ دو گھنٹے اور دیکھ لو۔ اگر اس کے بعد بھی.....''

''نہیں امی جان! میں اب جوشاندہ نہیں پیوں گا۔''

''تم باپ بیٹے بس!..... ایلو پیتھ، ایلو پیتھ!..... اچھا خیر!..... تم ٹیکسی میں جانا۔ اس حالت میں موٹر سائیکل چلانا مناسب نہیں ہوگا۔ تم کپڑے بدلو، میں پڑوس کے کسی بچے سے ٹیکسی منگواتی ہوں۔''

ٹیکسی اسٹینڈ قریب ہی تھا، احسن پیدل وہاں تک جاسکتا تھا لیکن وہ ماں سے اس بحث میں پڑ کر ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کچھ نہیں بولا۔ جب وہ باہر نکلا تو ٹیکسی گھر کے دروازے پر موجود تھی۔

عابدہ نے ایک اسپتال کا نام لیتے ہوئے اس کی تعریف کی اور کہا۔ ''وہیں جانا۔ ابھی میں نے تمہارے ابو جان کو بھی فون پر بتا دیا تھا۔ وہ بھی یہی کہہ رہے تھے۔''

''جی اچھا۔''

''وہاں پہنچ کر مجھے فون بھی کر دینا۔''

''جی..... جی.....''

احسن بے تابانہ گھر سے نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

ڈرائیور کو اس نے ریسٹورنٹ کا نام بتایا۔

ٹیکسی چل پڑی۔ احسن کا دماغ اس وقت بہت زیادہ الجھا ہوا تھا۔ نہ جانے کون لڑکی ہے اور ساحرہ کے بارے میں اس سے کیا بات کرے گی؟ وہ سوچتا رہا لیکن کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔

ٹیکسی ریسٹورنٹ کے سامنے رکی تو احسن نے جلدی سے اتر کر اپنا پرس نکالا۔ وہ کرایہ ادا کر رہا تھا کہ ایک قیمتی کار قریب آ کر رکی۔

"سنیے احسن!" نسوانی آواز تھی۔ "میں نے ہی بلایا ہے آپ کو۔"

احسن نے چونک کر دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی شیبا تھی۔ کالج میں احسن کی اس سے کبھی بات چیت نہیں رہی تھی اور کالج چھوڑے ہوئے اسے ایک سال گزر چکا تھا۔ شیبا کا چہرہ شاید اسے یاد نہ رہتا لیکن ساحرہ کیونکہ شیبا کا تذکرہ کرتی ہی رہتی تھی اس لیے وہ شیبا کو فوراً پہچان گیا۔

ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے احسن کار کے قریب گیا۔

"چلیں۔" وہ ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیبا سے بولا۔

"اب یہیں مل گئے ہیں تو ضرورت نہیں ہے ریسٹورنٹ میں بیٹھنے کی۔ آپ گاڑی ہی میں آجائیں۔" شیبا نے کہا۔

احسن قدرے متذبذب رہا لیکن پھر کار میں بیٹھ گیا جس کا دروازہ خود شیبا ہی نے کھول دیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی شیبا کار حرکت میں لے آئی۔ اس وقت احسن کے ذہن میں یہ خیال چکرا رہا تھا کہ شیبا یقیناً ساحرہ کے بارے میں اہم باتیں کر سکتی ہے۔ وہ جانتا ہی تھا کہ ساحرہ اسٹڈی کرنے کے لیے اس کے گھر جایا کرتی تھی۔

"آپ یقیناً بہت الجھ رہے ہوں گے احسن!" شیبا بولی۔

"پلیز!" احسن نے کہا۔ "ایک کالج میں پڑھتے ہوئے اگر ایک دوسرے کے ساتھ آپ جناب کے ساتھ بات کریں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہم ایک دوسرے کو تم کہہ کر بھی مخاطب کر سکتے ہیں۔"

"دراصل میرا خیال تھا احسن کہ آپ..... میرا مطلب ہے..... تم شاید اتنی بے تکلفی پسند نہ کرو۔"

"تم نے فون پر اپنا نام کیوں نہیں بتایا تھا؟" احسن نے پوچھا۔

"مجھے ڈر تھا کہ میرا نام جان کر آپ ساحرہ کو فون نہ کر بیٹھیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے آپ سے میری ملاقات کا علم ہو۔ اوہ، سوری! میں پھر آپ کہہ بیٹھی۔"

"تم نے مجھے بلایا کیوں ہے؟" احسن نے بے تابی سے پوچھا۔ "ساحرہ کے بارے میں تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہو؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"مجھے اندازہ ہے کہ تم اس بارے میں بات کرنے کے لیے بے چین ہو گے۔" شیبا بولی۔ "میں نے بھی اسی کے بارے میں بات کرنے کے لیے تم سے ملنا ضروری سمجھا تھا۔ تم دونوں کے معاملات مجھ سے کبھی پوشیدہ نہیں رہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ تمہیں اپنی شادی کے بارے میں بتا چکی ہے جو کل ہی ہو رہی ہے۔ آخر تم یہ ضد چھوڑ کیوں نہیں دیتے کہ ملازمت ملنے سے پہلے شادی نہیں کرو گے۔"

"یہ ضد کی نہیں، میرے اصول کی بات تھی۔" احسن نے سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کی دوسری جگہ شادی کی وجہ میرا یہ اصول نہیں ہے۔"

"میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ تمہارا اصول ہی تھا۔"

"نہیں۔" احسن نے جواب دیا۔ "وجہ کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں ساحرہ کے بارے میں بات کرنا ہے۔ اس سے میں سمجھا تھا کہ تم مجھے ساحرہ کے بارے میں یا اس کی شادی کے بارے میں کوئی خاص بات بتانا چاہتی ہو لیکن تم نے تو مجھ سے ہی سوالات شروع کر دیے۔"

"میں وجہ اس لیے جاننا چاہتی ہوں کہ اگر اس کا کوئی حل نکل سکے تو..... تو..... شاید....."

شیبا کی نظریں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ اس سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ شیبا نے غالباً جان بوجھ کر گاڑی اس سڑک پر موڑی تھی۔ ٹریفک کی حد درجہ کمی کے باعث کہا جا سکتا تھا کہ وہ سڑک ویران تھی۔

احسن سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا، پھر بولا۔ "تم نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔"

"حل نکلنے کی صورت میں۔" شیبا کا لہجہ دھیما تھا۔ "ممکن ہے کہ ساحرہ اب بھی اس شادی سے انکار کر دے جو کل ہی ہے۔ میں اس سے بات کر لوں گی۔ اس معاملے میں وہ اتنی ابنارمل ہے کہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ وہ اس شادی سے انکار کر دے اور اس کی شادی تمہی سے ہو۔"

"تمہارے لہجے میں اعتماد نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک سمجھے ہو احسن!" شیبا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "لیکن میں کوشش تو کر سکتی ہوں اگر وجہ معلوم ہو جائے۔"

"مسئلہ ایسا ہے کہ اس کا حل نہیں نکل سکتا، لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم اس کے لیے کیوں بے چین ہو کہ اس کی شادی تمہی سے ہو۔"

"اس لیے کہ تم اسے بے تحاشا چاہتے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکو گے۔" شیبا جذباتی ہو گئی۔ "میرا مطلب ہے، تم اس طرح نہیں جی سکو گے جس طرح زندہ رہنا چاہیے۔"

"ہاں۔" احسن کے لہجے میں درد تھا۔ "لیکن..... لوگ کہتے ہیں، وقت گزرتا رہتا ہے تو یادوں پر دھول جمتی چلی جاتی ہے۔"

"تمہاری یادوں کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ اس پر دھول جمنے میں برسوں لگ جائیں گے اور اس طویل عرصے میں تم شاید جینے کے معنی بھی بھول جاؤ۔ میں صرف سانس لینے کو زندگی نہیں سمجھتی۔"

"تمہاری دوست تو خوش ہے نا!"

"ہاں۔ اس کے خیالات غیر معمولی طور پر عجیب ہیں۔ میں نے بتایا نا کہ ایک معاملے میں غیر معمولی طور پر ابنارمل ہونے کی وجہ سے وہ ہر معاملے میں ابنارمل ہو گئی ہے۔ اس کے خیال میں شادی اور محبت، دو الگ الگ باتیں ہیں۔"

"میں اس کے خیالات سے، اس کی ابنارملٹی سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن میں اس کی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔" احسن ایک دم چپ ہو گیا۔ آخری جملہ بے اختیاری میں اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ ساحرہ کی اس خواہش کے بارے میں کسی کو کچھ بتائے۔

"خواہش۔" شیبا زیر لب بڑبڑائی۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو۔ احسن کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"خواہش۔" وہ پھر بڑبڑائی۔

احسن چپ رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شیبا کو یہ سب باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

شیبا کچھ توقف سے بولی۔ "کیا اس کی خواہش کا تعلق اس کی ابنارملٹی سے ہے؟"

احسن پہلو بدل کر رہ گیا۔ اسے خود پر جھنجلاہٹ ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی بات کہہ گیا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھی۔ شیبا کو ساحرہ کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ وہ صرف ایک لفظ "خواہش!" سے شاید حقیقت کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔

"احسن!" شیبا کچھ توقف سے بولی۔ "اگر تم اس کی شرط مان لیتے تو کیا وہ تم سے شادی کے لیے، تمہیں ملازمت ملنے تک انتظار کر لیتی؟" احسن اب بھی چپ رہا۔

"بتاؤ احسن!" شیبا کے انداز میں بے تابی تھی۔ "وہ شرط پوری ہونے سے اس کی شادی تم سے ہو سکتی ہے؟"

"تم نے شاید۔" احسن تذبذب سے بولا۔ "بات سمجھ لی ہے۔"

"میں اس کی فطرت سے، اس کے مزاج سے، اس کے انداز فکر سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے صرف ایک لفظ نے ہی مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔"

"تو پھر اب مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"احسن!" شیبا کی آواز کانپ گئی۔ "میں ابھی جا کر اسے سمجھا سکتی ہوں اگر تم اس کی شرط مان لو۔"

احسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔"

"پلیز احسن!" شیبا کی آواز بھرا گئی۔ "اس کی بات مان لو۔"

"شیبا!" احسن نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔ "جب میں نے ساحرہ کا اصرار نظر انداز کر دیا تو تمہاری بات کیسے مان سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ساحرہ کے بغیر شاید میں زندہ در گور ہو جاؤں لیکن میں خود کو اپنی ہی نظروں میں نہیں گرانا چاہتا۔ تم کیوں چاہتی ہو کہ میں خود کو اپنی نظروں سے گرا دوں۔"

"شاید میں پاگل ہو گئی ہوں۔" شیبا کی آواز رندھ گئی۔

احسن نے محسوس کیا کہ شیبا کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔ احسن نے جھک کر شیبا کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں واقعی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

"تم رو رہی ہو؟" احسن حیرت سے بولا۔

ٹپ! ٹپ!..... شیبا کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔

"شیبا!" احسن پھر حیرت سے بولا۔

شیبا کچھ نہیں بولی۔ اچانک ایسا لگا تھا جیسے اس پر ہیجان طاری ہو گیا ہو۔ ایکسیلریٹر پر اس کے پیر کا دباؤ بڑھ گیا۔ کار کی رفتار خاصی تیز ہو گئی لیکن اس ویران سڑک پر وہ رفتار کسی حادثے کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں شیبا؟" احسن پریشان ہو گیا تھا۔

"احسن!" شیبا لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے سوچا تھا، میں کسی طرح بھی اپنی زندگی ہنسی خوشی گزار دوں گی۔"

"تو ساحرہ کی شادی سے اس میں کیا رکاوٹ آ سکتی ہے؟"

''تم خوش نہیں رہ سکو گے۔''

''تو اس سے تمہاری خوشی کا کیا تعلق؟'' احسن کے لہجے میں پھر حیرت آ گئی۔

''ہے تعلق! بہت گہرا تعلق ہے۔'' شیبا نے کہا۔ اب اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے تھے۔

اس سے پہلے کہ احسن پھر کچھ کہتا، اس کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا۔ اسے یقین تھا کہ کال اس کی ماں کی ہوگی۔ شیبا سے باتوں میں وہ اپنی ماں کو کال کرنا بھول ہی گیا تھا۔

''جی امی جان!'' اس نے موبائل کان سے لگایا۔

''پریشان کر دیا تم نے!'' عابدہ کی آواز آئی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ اسپتال سے فون کر دینا لیکن اب تو اتنی دیر ہو چکی ہے کہ تمہیں اسپتال سے واپس بھی آ جانا چاہیے تھا۔''

''مسئلہ ہو گیا ہے امی! میں اسپتال آ گیا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب دوسرے مریضوں میں بہت مصروف ہیں۔ آپ فکر نہ کیجیے! میری طبیعت زیادہ خراب نہیں ہے۔''

یکا یک شیبا نے بڑی تیزی سے بریک لگائے۔ چرچراہٹ کی آواز خاصی تیز تھی۔

''ہیں؟'' عابدہ حیرت سے بولیں۔ ''یہ آواز کیسی تھی؟''

''ایک احمق وارڈ بوائے۔'' احسن کو پھر جھوٹ بولنا پڑا۔ ''بڑی تیزی سے اسٹریچر کھینچ کر لے گیا ہے۔''

شیبا نے کار سڑک کے کنارے روک دی اور اپنی آنکھیں خشک کر کے احسن کی طرف دیکھنے لگی۔

''اچھا خیر!'' عابدہ بولیں۔ ''ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد مجھے ایک فون ضرور کر دینا۔''

''اچھا امی جان!'' احسن نے جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''احسن!'' شیبا تیزی سے بولی۔ ''تمہاری طبیعت خراب ہے؟''

''معمولی سا بخار ہے۔''

''اب میں نے غور سے دیکھا ہے تمہیں.....! تمہارا چہرہ تپ رہا ہے احسن!'' شیبا نے کہتے ہوئے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ احسن کی کلائی پر رکھ دیا۔ ''اوہ گاڈ!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ تمہیں پہلے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے تھا احسن! مجھ سے بعد میں مل لیتے۔'' شیبا پھر گاڑی حرکت میں لائی اور اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں اسپتال لے چلتی ہوں۔ تم سیٹ پیچھے کر لو۔ آرام سے دراز ہو جاؤ۔''

''یوں ہی ٹھیک ہے شیبا!'' احسن نے اپنا سر پشت گاہ سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ شیبا کی ساحرہ کے بارے میں باتوں کے باعث اسے اپنی حالت کا احساس ہی نہیں رہا تھا لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ اسے چکر سا آ رہا تھا۔

''بڑی غلطی ہوئی مجھ سے کہ میں نے تمہیں اس وقت بلایا۔'' شیبا کی آواز احسن کو کچھ دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''شیبا!'' احسن آنکھیں بند کیے بڑبڑایا۔ ''تمہاری خوشی..... میری خوشی..... تعلق.....'' بے ربط الفاظ کے باوجود احسن کی بات واضح تھی۔

''خاموشی سے آرام کرو احسن!'' شیبا نے جھرجھراتی سی آواز میں کہا۔ ''تمہیں بہت تیز بخار ہے۔ آرام کرو۔ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔''

''جب..... جب گھر سے..... چلا تھا تو.....''

''ہاں اس وقت بخار اتنا تیز نہیں ہوگا۔'' شیبا اس کی بات سمجھ کر تیزی سے بولی۔ ''لیکن اب بہت تیز ہے۔ شاید ایک سو تین سے بھی زیادہ!''

♥♥♥

شیبا کا اندازہ غلط تھا یا اسپتال پہنچتے پہنچتے بخار میں مزید تیزی آئی تھی۔ ڈاکٹر ٹمپریچر لینے کے بعد حیرت سے احسن کی طرف دیکھنے لگا۔

''یقین نہیں آتا کہ آپ اپنے پیروں پر چل کر آئے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ ہاسپٹلائز ہو جائیں، فوری طور پر۔''

اب خود احسن کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اس کی حالت خاصی غیر ہو گئی تھی۔ سر گھومتا ہوا سا لگ رہا تھا۔

''ٹمپریچر کیا ہے ڈاکٹر؟'' احسن نے شیبا کی گھبرائی ہوئی آواز سنی اور پھر وہ اس طرح ڈگمگایا جیسے کرسی سمیت گر پڑے گا۔ ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے اسے فوراً سنبھالا۔ پھر احسن کے ساتھ جو کچھ ہوا یا جو کچھ اس نے دیکھا، وہ کسی بکھرے ہوئے خواب کے مانند تھا۔ کوئی کمرا..... ڈاکٹر..... نرسیں..... شیبا..... پھر بازو میں ہلکی سی چبھن جس کے بعد اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

غشی تھی، غنودگی تھی یا نیند؟

یہ احسن کے لیے ایک سوال تھا جب اسے ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں ہی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ شیبا کے علاوہ اس کے والدین بھی اس کے بستر کے قریب تھے۔

''شکر ہے تیرا، مولا!'' عابدہ نے اوپر دیکھتے ہوئے

کہا۔ اس وقت ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

زبیری محبت سے احسن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''اب کیسا محسوس کر رہے ہو بیٹا؟''

''ٹھیک..... شاید..... ٹھیک تو ہوں۔'' احسن کی آواز میں کمزوری تھی۔ ''کیا میں بے ہوش ہو گیا تھا۔''

''پہلے انہیں یہ کیپسول کھلا دیجیے!'' شیبا نے ایک کیپسول اور پانی کا گلاس بڑھاتے ہوئے زبیری سے کہا۔

احسن نے خود اٹھنا چاہا لیکن زبیری اور عابدہ نے بہ یک وقت اسے سہارا بھی دیا۔ کیپسول کھانے کے بعد وہ لیٹا تو اس کی نظر ایک طرف ڈیکوریٹ کلاک پر پڑی۔ بارہ بجنے والے تھے۔

''رات ہو گئی۔'' وہ چونک کر بولا۔

''چار گھنٹے تو اسپتال میں رہے ہو تم۔'' عابدہ نے بتایا۔

پھر احسن کو تفصیل معلوم ہوئی۔ اس پر غشی طاری ہو گئی تھی اس لیے اسے فوری طور پر اسٹریچر پر ڈال کر ایک کمرے میں لے جایا گیا تھا جہاں اسے ایک کیپسول کھلانے کے بعد اسے انجکشن لگایا گیا تھا جس کے بعد اس پر گہری غنودگی طاری ہو گئی تھی۔

شیبا نے عابدہ کو فون کر کے صورت حال بتا دی تھی۔ ان کا فون نمبر اسے احسن کے موبائل میں مل گیا تھا۔ عابدہ اور زبیری گھبرائے ہوئے وہاں پہنچے تھے لیکن اتنا وقت گزر جانے کے بعد ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب تشویش کی کوئی بات نہیں کیونکہ بخار کم ہونے لگا تھا۔

شیبا نے احسن کے والدین کو بتایا تھا کہ وہ احسن کی کالج کے زمانے کی دوست ہے۔ اس نے احسن کو ٹیکسی میں دیکھا تھا تو اسے ٹیکسی سے اتروا کر اپنی کار میں اسپتال لے گئی تھی۔

چار گھنٹے بعد انہیں اس بات کی اجازت ملی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو احسن کو گھر لے جائیں۔ اسے ایمبولینس میں گھر لا کے بستر پر لٹایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اسے جگایا نہ جائے اور جب وہ خود جاگے تو اسے کیپسول کھلا دیا جائے۔ کیپسول کے علاوہ صرف ٹیبلٹس تھیں جو اسے چار چار گھنٹے سے کھلانے کی ہدایات کی گئی تھیں۔

''اب تو تم جاؤ بیٹی!'' عابدہ نے کہا۔ ''تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔''

''نہیں ہوں گے۔'' شیبا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں نے پہلے ہی فون کر دیا تھا کہ کسی دوست کی بیماری کے باعث اسپتال میں رک گئی ہوں۔ ابھی ایس ایم ایس بھی آیا تھا گھر سے! میں جواب بھی دے چکی ہوں کہ تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔''

''ہاں شیبا!'' احسن دھیمی آواز میں بولا۔ ''آدھی رات تو ہو گئی۔ اب تمہیں جانا چاہیے۔''

احسن کی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ یہ اسی دیے جانے والے کیپسول کا اثر تھا۔ ڈاکٹر نے چاہا ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ آرام کر لے۔ اس نے شیبا کو رخصت ہوتے دیکھا اور پھر نیند کی آغوش میں جا گرا۔

جب وہ جاگا تو صبح ہو چکی تھی۔ عابدہ اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے اور آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر جاگی تھیں۔ ''اب تمہیں بالکل بخار نہیں ہے۔'' وہ شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

''ہاں نقاہت ضرور ہوگی۔ چلو میں تمہیں سہارا دیتی ہوں۔ باتھ روم میں منہ ہاتھ دھو کر کلی کر لو۔ پھر میں تمہارے لیے ناشتا تیار کر کے لاتی ہوں۔ تمہارے ابو جان کو کوئی ضروری کام تھا۔ تمہاری طرف سے مطمئن ہو کر چلے گئے ہیں۔''

احسن نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے والے تھے۔ احسن کو اشتہا محسوس نہیں ہو رہی تھی اس لیے اس نے صرف کارن فلیکس لے لیا۔

''چلو اب تھوڑی دیر بعد چائے کے ساتھ کچھ سلائس وغیرہ لے لینا یا جیسا تم چاہو۔ ڈاکٹر نے کسی بھی قسم کا پرہیز نہیں بتایا ہے۔''

احسن نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ جاگنے کے چند لمحوں بعد سے ہی اس کے دماغ میں ساحرہ کی شادی کا خیال اور شیبا کی باتیں چکرانے لگی تھیں۔ شیبا کی یہ بات اس کے لیے معما بنی ہوئی تھی کہ اس کی خوشی اسی میں ہے کہ احسن خوش رہے۔

''احسن!'' عابدہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''تمہاری دوست ہے تو بہت خوب صورت!..... شادی تو شاید نہیں ہوئی ہوگی ابھی اس کی!''

''جی۔'' احسن نے ماں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''شادی تو ابھی نہیں ہوئی۔''

''تمہیں کیسی لگتی ہے؟ کیا اپنی بہو بنا لوں اسے؟''

احسن نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ ''اس طرح نہ سوچیے امی جان! وہ بہت بڑے گھرانے کی بیٹی ہے۔ زنجانی شوگر ملز اس کے والد ہی کی ہیں۔''

''اس کے مزاج میں تکبر تو نہیں ہے۔''

''یہ الگ بات ہے۔'' احسن نے کہا، پھر جلدی سے بولا۔ ''چائے پلا دیں امی جان! عادت ہے نا اس کی! سر میں

ہلکا ہلکا سا درد ہونے لگا ہے۔"

"ابھی لاتی ہوں بیٹا!" عابدہ جلدی سے اٹھ گئیں۔

دراصل احسن یہ چاہتا تھا کہ اس موضوع پر زیادہ بات نہ ہو جو اس کی ماں نے چھیڑ دیا تھا۔ تنہائی ملتے ہی اس کی دماغی رو پھر چل پڑی۔ اسے اندازہ ہی نہیں، بڑی حد تک یقین تھا کہ ساحرہ کی شادی کا صدمہ ہی اس کے بخار کا سبب بنا تھا۔

ساحرہ کی شادی اسی دن ہونے والی تھی۔ احسن کے لیے اس کا خیال اذیت ناک تو تھا لیکن پہلے کی طرح اب بھی اس کے دماغ میں یہی بات آئی کہ ساحرہ سے اس کی شادی نہ ہونا ہی اس کے حق میں بہتر رہا ہے۔ ساحرہ کے انداز فکر سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اگر وہ اس کی بیوی بنتی تو بھی خود کو اس کی ملکیت نہیں سمجھتی۔ گویا وہ ایسے معاملات میں بھی آزاد ہوتی جو احسن کے لیے ناقابل برداشت ہوتے۔ ساحرہ سے اس کی شادی اس کے لیے سوہان روح بن کر رہ جاتی۔

ساحرہ کے بارے میں سوچ کے ساتھ شیبا کا خیال بھی اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ شیبا اس سے باتیں کرتے کرتے رونے بھی لگی تھی۔ اس پر کچھ ہیجان بھی طاری ہو گیا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ احسن کی شادی ساحرہ سے ہو ورنہ وہ زندگی بھر خوش نہیں رہ سکے گا جس کی وجہ سے وہ بھی خوش نہیں رہ سکے گی۔

یہ آخری بات احسن کے لیے کسی معمے سے کم نہیں تھی۔

عابدہ چائے بنا لائیں۔ احسن نے پہلا ہی گھونٹ لیا تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔

"کون آ گیا!" عابدہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولتی ہوئی اٹھیں۔ "تمہارے خیال سے تمہارے ابو جان تو جلدی نہیں آ گئے۔"

احسن نے چائے کا دوسرا گھونٹ لیا۔ عابدہ کمرے سے جا چکی تھیں۔ احسن نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے اپنا موبائل نظر نہیں آیا۔

امی جان نے ہی کہیں رکھ دیا ہوگا، اس نے سوچا اور شاید بند بھی کر دیا ہو۔

پھر اس وقت وہ چونک پڑا جب عابدہ کے ساتھ ہی اس نے شیبا کو بھی کمرے میں آتے دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھلوں کی باسکٹ اور دوسرے ہاتھ میں گل دستہ تھا۔

"ہیلو احسن! ہاؤ آر یو!" وہ مسکراتی ہوئی آگے آئی، پھر فوراً ہی ہنس کر بولی۔ "یہ بھی میں نے رسماً پوچھ لیا۔ تم بالکل ٹھیک نظر آ رہے ہو۔"

احسن مسکرا دیا۔ شیبا نے پھلوں کی باسکٹ احسن کے بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھی اور گل دستہ اس کی طرف بڑھایا۔

"تھینک یو شیبا!" احسن نے گل دستہ لے لیا۔

"میں تمہارے لیے بھی چائے بنا کر لاتی ہوں بیٹی!" عابدہ نے کہا۔

شیبا نے تکلفاً بھی انکار نہیں کیا۔ عابدہ کے جاتے ہی اس نے جلدی سے اپنا پرس کھولا اور ایک لفافہ نکال کر احسن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ جلدی سے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لو۔ جب میں چلی جاؤں، تب دیکھنا۔"

"کیا ہے؟" احسن نے لفافہ لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"میری ممکنہ شادی کا دعوت نامہ۔" شیبا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

احسن دھیرے سے ہنس دیا۔ "ممکنہ شادی؟"

"ہاں۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"جب تک کوئی کام ہو نہ جائے، یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ہو گیا۔ اسے ممکنہ ہی سمجھنا چاہیے۔"

"اچھا!" احسن نے کچھ تعجب سے کہا۔ "بہر حال!..... پیشگی مبارک باد۔"

"پیشگی مبارک باد مجھے قبول نہیں! وقت پر ہی دینا۔ اچھا لفافہ تو رکھ لو تکیے کے نیچے!"

"ابھی دیکھ لوں تو کیا حرج ہے؟"

"میں چاہتی ہوں، میرے ممکنہ شوہر کا نام تم کو میرے سامنے نہ معلوم ہو۔"

"عجیب....." احسن اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے لفافہ تکیے کے نیچے رکھ لیا۔

عابدہ چائے لیے ہوئے اندر آئیں۔

"ارے!" شیبا نے جلدی سے اٹھ کر پیالی ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "اتنی جلدی بنا لی چائے۔"

"کسی کام کے لیے پانی گرم کرنا تھا۔ مائیکرو ووو پر رکھ کر ہی آئی تھی احسن کو چائے دینے۔ اتنے میں تم آ گئیں۔ جا کر دیکھا تو پانی کھولا ہی تھا۔ اسی سے ایک پیالی بنا لی۔" عابدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شکریہ امی!"

"لو! پھر کوئی آ گیا۔" عابدہ بولیں۔

کال بیل کی آواز سنائی دی تھی۔ عابدہ دیکھنے چلی گئیں۔

"تمہیں اب بالکل بخار نہیں ہے۔" شیبا نے احسن کی کلائی چھو کر کہا، پھر بولی۔ "تمہیں اتنی جلدی ٹھیک ہونا ہی تھا۔ بس ساحرہ کی شادی کا صدمہ دھیرے دھیرے اثر انداز ہوتا رہا تھا۔ یہ بات میں نے ڈاکٹر کو بھی بتا دی تھی۔"

احسن چونکا۔ "ساحرہ کے بارے میں؟"

"اتنی بے وقوف تو نہیں ہوں احسن!" شیبا نے ہنس کر کہا۔ "میں نے بس اتنا بتایا تھا کہ تمہیں ایک شدید صدمہ پہنچا ہے۔ بعد میں ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا خیال بالکل درست نکلا۔ تمہارے جسم میں کسی وائرس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ ایک گھنٹے میں تمہارے کئی بلڈ ٹیسٹ کر لیے گئے تھے۔"

"ہوں!" احسن نے ٹھنڈی سانس لی۔ شاید اس نے شیبا کی باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا تھا، اسے ساحرہ یاد آ گئی تھی۔

شیبا نے اس کی ٹھنڈی سانس سے شاید کچھ سمجھ لیا اور اسی لیے احسن کا دھیان ہٹانا چاہا۔ "ابھی دوا کی ایک خوراک تو باقی ہوگی جو بارہ بجے کے لیے تھی۔"

"ہاں۔"

"کہیں۔ اب وہ مت کھانا۔ امی نے نہیں بتایا؟ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بخار بالکل اتر جائے تو پھر کوئی خوراک لینے کی ضرورت نہیں۔"

"سب کچھ یاد رکھا ہے تم نے!" احسن پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ "کاش کوئی اور خیال رکھتا میرا۔"

"بس اب غذا پر دھیان دینا ہے تمہیں۔" شیبا نے جلدی سے بات بدلی۔

قدموں کی آہٹیں قریب آنے لگی تھیں۔ احسن نے اپنے والد کی آواز پہچان لی۔ وہ عابدہ کو کچھ بتاتے ہوئے آ رہے تھے۔

"چلیں اچھا ہے۔" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عابدہ نے زبیری سے کہا۔ "ایک دن کے بخار نے بہت کمزور کر دیا ہے احسن کو.....! وہ بھی آب و ہوا بدل لے گا تو اچھا رہے گا۔"

"کیا معاملہ ہے ابو جان؟" احسن نے پوچھا۔

زبیری نے بستر کے قریب آتے ہوئے، احسن کو جواب دینے سے پہلے شیبا کے سلام کا جواب دیا، پھر کہا۔ "بیٹا تم جانتے ہی ہو کہ مجھے اپنے ایک کلائنٹ کے معاملات میں کسی سے بات کرنے کے لیے سال میں ایک آدھ بار اسلام آباد جانا پڑتا ہے۔ آج اچانک کچھ ایسی صورت بنی ہے کہ اب کل ہی مجھے اسلام آباد جانا پڑے گا اور تم جانتے ہی ہو کہ تمہاری امی جان میرے ساتھ ضرور جاتی ہیں۔ اب اس مرتبہ تم بھی چلے چلو۔ صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔"

"نہیں ابو جان!" احسن نے کہا۔ "آپ دونوں ہی چلے جائیے.....! میں پہلے بھی کبھی آپ کے ساتھ نہیں گیا۔"

"اس مرتبہ چلے چلو۔" زبیری نے کہا۔ "تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہاری امی جان کا دل یہیں لگا رہے گا۔"

"میری صحت کو کیا ہوا۔ اب میں ٹھیک ہوں، شام تک آپ مجھے اور بہتر پائیں گے۔ کل صبح تک میں بالکل ٹھیک نظر آؤں گا۔"

"اگر کل صبح تک بالکل ٹھیک نظر نہیں آئے تو چلنا پڑے گا۔" عابدہ بولیں۔

"ٹھیک ہے۔" احسن نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

عابدہ بیگم اور زبیری میں اتنی ہی محبت تھی کہ وہ چوبیس گھنٹے کے لیے بھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہوئے تھے۔ احسن نے سنا تھا کہ شادی کے بعد عابدہ ایک رات کے لیے بھی اپنے والدین کے گھر نہیں رکی تھیں۔ زبیری شہر سے جب بھی کسی کام سے کہیں جاتے تھے، عابدہ ضرور ان کے ساتھ جاتی تھیں۔

"میں تو تین ٹکٹ بنواتا ہوا لایا ہوں۔" زبیری بولے۔

احسن نے کہا۔ "اگر کل صبح میں بالکل ٹھیک نظر آؤں تو ایک ٹکٹ کینسل کروا دیجیے گا۔ آپ کی واپسی کب ہوگی؟"

"بس ایک دن بعد! کل صبح گیارہ بجے کی فلائٹ ہے۔ پرسوں صبح کی فلائٹ سے واپسی ہوگی۔ اگر تم بھی ساتھ ہوئے تو ایک آدھ دن کے لیے مری ہو آئیں گے۔"

اس دوران میں شیبا بالکل خاموش بیٹھی رہی تھی۔ بیٹے سے بات کرنے کے بعد زبیری اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سے چند باتیں کیں اور اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ان کے بیٹے کا اتنا خیال رکھا۔

"شرمندہ نہ کیجیے ابو جان!"

کیونکہ احسن نے زبیری کو ابو جان کہہ کر مخاطب کیا تھا اس لیے شیبا نے بھی ایسا ہی کیا۔

زبیری اپنے کلائنٹ سے فوراً کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔ وہ فون کرنے کے لیے وہاں سے چلے گئے۔ عابدہ بیٹھی رہیں۔

"میرا فون کہاں ہے امی جان؟" احسن نے پوچھا۔

''وہ میں نے بند کر کے دراز میں ڈال دیا تھا، شیبا بیٹی! وہ نکال کر دے دو احسن کو۔''

شیبا جس کرسی پر بیٹھی تھی، وہ احسن کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کے قریب تھی۔ شیبا نے سائڈ ٹیبل کی دراز سے موبائل فون نکال کر احسن کو دے دیا۔

''رات دس بجے ساحرہ کی کال آئی تھی۔'' شیبا آہستہ سے بولی۔ ''تبھی امی جان نے فون بند کر دیا تھا اور گھر آ کے دراز میں ڈال دیا تھا۔''

''یہ ساحرہ کون ہے بیٹا!'' عابدہ نے پوچھا۔ ''پہلے بھی ایک بار اس کی کال آئی تھی تو میں نے تمہارا موبائل بند کر دیا تھا۔''

احسن سے پہلے شیبا بول پڑی۔ ''وہ بھی ہماری کالج کی دوست ہے امی جان!'' پھر شیبا کھڑی ہوگئی۔ ''اب میں چلوں گی۔'' پھر اس نے ہنس کر احسن سے کہا۔ ''اب خوب پھل وغیرہ کھاؤ۔ سوپ پیو، کھانا کھاؤ، صبح تک تمہیں بالکل ٹھیک ہونا ہے ورنہ تو پھر جانا ہی پڑے گا تمہیں امی جان اور ابو جان کے ساتھ۔''

احسن خفیف سا مسکرا دیا۔

♥♥♥

ساحرہ کی شادی کی تیاریاں گزشتہ روز سے ہی شروع ہوگئی تھیں۔ جو تیاری ساحرہ کے گھر کی طرف سے ہونا چاہیے تھی، وہ بھی آغا نصیر ہی کروا رہا تھا۔ ساحرہ کے والدین کی مالی حالت ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ اتنا پیسا خرچ کر سکتے۔

وہ تیاریاں آغا نصیر کی پرسنل سیکریٹری عشرت اعوان کر رہی تھی جس کی عمر لگ بھگ پچاس پچپن سال ہو سکتی تھی لیکن اس نے خود کو بہت زیادہ مین ٹین کیا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ دلکش نظر آتی تھی لیکن بہت سنجیدہ تھی۔ سارا دن اور دوسری صبح بھی ساحرہ کا اور اس کا ساتھ رہا تھا لیکن وہ ایک بار بھی مسکراتی نظر نہیں آئی تھی۔

گزشتہ روز ساحرہ صبح سے شام تک مسلسل عشرت اعوان کے ساتھ رہی تھی اور خریداری کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ بوتیک، جیولری شاپز، واچ ہاؤسز اور جانے کہاں کہاں!

ساحرہ کی ماں بو جان اور باپ سرکار احمد کے لیے بھی کپڑے وغیرہ خریدے گئے تھے اور خاصے زیادہ پیسے دے کر اتنے ارجنٹ سلوائے گئے تھے کہ رات کو آٹھ بجے سے پہلے مل بھی گئے تھے۔ زیورات کی خریداری بو جان کے لیے بھی کی گئی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ اس کے برخلاف سرکار احمد کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا رہا تھا کہ وہ طوعاً و کرہاً اور شاید بیوی کے دباؤ میں یہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔

ساحرہ کو عشرت اعوان سے معلوم ہوا تھا کہ آغا نصیر نے اس شادی سے پہلے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے اس کی ایک نوجوان بیٹی اور اس سے دو سال بڑا بیٹا تھا۔ ان دونوں کی ماں کا انتقال آٹھ سال پہلے ہوا تھا۔ انتقال کے ایک سال بعد ہی اس نے دوسری اور پھر تین سال بعد تیسری شادی کی تھی۔ ان دونوں بیویوں کی اموات پراسرار انداز میں ہوئی تھیں۔

ساحرہ ''پراسرار موت'' کے ذکر پر زیادہ نہیں الجھی تھی۔ اس کا سارا دھیان اپنی شادی پر لگا رہا تھا۔ وہ خوش تھی کہ اگلے دن سے اس کے بدن کا دوزخ ٹھنڈا پڑنا شروع ہو جائے گا۔ اس دوران میں اسے خیال آتا رہا تھا تو صرف احسن کا...! اس سے پہلی مرتبہ ایک بار فون بند ہونے کے بعد تو احسن نے اسے خود کال کر لیا تھا لیکن رات کو فون کرنے کے بعد احسن نے اپنا فون بند کرنے کے بعد مسلسل بند رکھا تھا۔

منا لوں گی اسے بعد میں، ساحرہ نے سوچا تھا۔

رات ہی کو عشرت اعوان نے اس کے مہندی بھی لگوائی۔ مہندی لگوانے سے پہلے بھی ساحرہ نے احسن سے بات کرنا چاہی تھی مگر اس کا موبائل فون بند ملا تھا۔

بہت ناراض ہے لیکن مجھ سے بچ کر تھوڑی رہ سکے گا، ساحرہ نے مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں کہا تھا۔

رات ساحرہ نے بڑی بے چینی میں اور نہ جانے کیا کیا خواب دیکھتے ہوئے گزاری تھی۔ صبح نو بجے عشرت اعوان اسے لینے آ گئی۔

آس پاس رہنے والے اس کار کی آمد و رفت کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے حالانکہ بو جان نے کئی پڑوسیوں کو بتا دیا تھا کہ اس کی بیٹی بیاہ کر ایک بہت بڑے گھر میں جا رہی ہے۔

عشرت جہاں ساحرہ کو ایک شاندار بیوٹی پارلر میں لے گئی وہیں ساحرہ نے وہ لباس بھی پہنا جو آغا نصیر نے خود خرید کر بھجوایا تھا۔

اینا میک اپ مکمل ہونے کے بعد ساحرہ نے آئینہ دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ خود کو ایک اجنبی روپ میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بالوں کا اسٹائل بھی دیدنی تھا۔

بیوٹی پارلر سے ساحرہ کو ایک مسجد میں لے جایا گیا۔ نکاح وہیں ہونا تھا، ابتدا میں آغا نصیر نے سول میرج کی تجویز رکھی تھی جو سرکار احمد نے سختی سے رد کر دی تھی۔

مسجد میں سرکار احمد اور بو جان پہلے سے موجود تھے۔

انہیں لینے کے لیے آغا نصیر نے کار بھجوائی تھی۔ وہی کار انہیں واپس بھی لے جاتی۔

سرکار احمد کی خواہش پر پڑوس کے دو بزرگ بھی آ گئے تھے۔

نکاح کے بعد سرکار احمد اور بو جان نے بیٹی کو مسجد ہی سے رخصت کیا۔ ساحرہ اس شاندار کار میں ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ پر بیٹھی۔ ڈرائیونگ سیٹ خود آغا نصیر نے سنبھالی تھی۔ کار میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ عشرت اعوان مسجد سے کسی اور کار میں رخصت ہوئی ہوگی۔

آغا نصیر کی تصویر ساحرہ کو پہلے ہی دکھا دی گئی تھی لیکن اب وہ جیتی جاگتی حالت میں سامنے آیا تو وہ ساحرہ کو زیادہ متاثر کن محسوس ہوا۔ وہ لمبے قد کاٹھ اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے سیاہ بالوں کی چمک بتا رہی تھی کہ خضاب لگانا اس کے لیے اب تک ضروری نہیں ہوا تھا۔

کار چل پڑی۔ ساحرہ نظریں جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم خوش تو ہو نا ساحرہ!'' آغا نصیر بولا۔

ساحرہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آغا نصیر ہنسا۔ ''میں نے بس بات کرنے کے لیے یہ سوال کر دیا۔ مجھے عشرت اعوان سے معلوم ہو چکا ہے کہ تم خوش ہو۔ مجھے شدت سے یہی خواہش تھی۔ دراصل بعض لڑکیاں زیادہ عمر کے شخص سے شادی کرنا پسند نہیں کرتیں۔''

ساحرہ خاموش رہی۔

''تم مجھے اتنا عمر دراز نہیں پاؤ گی جتنا میں ہوں۔'' آغا نصیر نے معنی خیز جملہ کہا۔

یہی تو میں بھی چاہتی ہوں، ساحرہ نے اپنے دل میں کہا۔

آغا نصیر پھر بولا۔ ''میں نے تمہارے والدین کے بارے میں بھی ایک منصوبہ بنایا ہے۔ اس پر عمل درآمد پہلے بھی کیا جا سکتا تھا لیکن میرا دھیان صرف تم سے شادی کرنے پر لگا رہا۔ کل مجھے خیال آیا تھا لیکن عشرت تمہارے معاملات میں اتنی مصروف ہو چکی تھی کہ اس منصوبے کے سلسلے میں کچھ کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ تو اچھا نہیں ہے نا کہ میری بیوی کے والدین ایک چھوٹے سے مکان میں پسماندگی کی زندگی گزاریں۔ اب عشرت نے اس منصوبے پر کام شروع کر دیا ہوگا۔ آج ہی تمہارے والدین کے لیے ایک خوب صورت فلیٹ خرید لیا جائے گا۔ آج ہی ایک انٹیریئر ڈیکوریٹر کو وہ فلیٹ دکھا دیا جائے گا۔ کل فلیٹ کے لیے فرنیچر خریدا جائے گا اور فلیٹ کو ڈیکوریٹ بھی کیا جائے گا پردے بھی کل ہی سل جائیں گے۔ فلیٹ میں شاید آدھی رات تک کام ہوتا رہے۔ پرسوں صبح تمہارے والدین اس فلیٹ میں منتقل ہو جائیں گے۔ ایک کار بھی انہیں شوفر کے ساتھ مل جائے گی۔ کچھ دن میں ایک اسکول بھی بنوا دوں گا جو تمہارے والد چلائیں گے۔ اگر کوئی اچھا اسکول خریدا جا سکا تو وہ خرید لیا جائے گا۔''

ساحرہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس نے کبھی کبھی ایسی زندگی کے خواب تو دیکھے تھے لیکن اس معاملے میں سنجیدہ یا جذباتی نہیں ہوئی تھی۔ احسن اسے ایسی زندگی نہیں دے سکتا تھا جس سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ تو اس کے جسم کی پکار تھی جس نے اسے آغا نصیر سے شادی کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ شاید وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوتی اگر احسن اس کی بات مان جاتا، اس کے جسم کی پکار سن لیتا۔

آغا نصیر جانے کیا کیا باتیں کرتا رہا اور ساحرہ اپنے خیالوں میں کھوئی رہی۔ بس کبھی کبھی لاشعوری طور پر اثبات میں سر ہلا دیتی تھی۔ جب کار ایک بنگلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی، اس وقت ساحرہ ایسی تدبیروں میں الجھی ہوئی تھی جن میں سے کسی ایک پر عمل کر کے وہ احسن کو منا سکتی۔

کار بہت ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رکی اور ساحرہ کے خیالات کی کڑیاں بکھر گئیں۔ ان کڑیوں کے بکھرنے کا سبب صرف کار کا ہلکا سا دھچکا نہیں تھا۔ اس کی نظر برآمدے میں کھڑی ہوئی شیبا پر پڑی تھی۔

''یہ میری بیٹی شیبا ہے۔'' آغا نصیر کی آواز ساحرہ کے صرف کانوں میں نہیں، کسی گونج کی طرح اس کے سارے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔ ''یہ ہمارے استقبال کے لیے کھڑی ہے، اپنی نئی ممی کے استقبال کے لیے!'' یہ دوسری گونج تھی جو ساحرہ کے وجود میں پھیلی۔ ''تمہاری تو دوست ہے نا یہ!'' تیسری گونج!

ساحرہ کار سے اتری تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ کار کا دروازہ اس کے لیے ایک باوردی ملازم نے کھولا تھا۔ وہاں کچھ اور ملازم بھی اپنی نئی مالکہ کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

''کار کا دروازہ تمہیں کھولنا چاہیے تھا شیبا!'' آغا نصیر کی آواز تھی۔

لیکن شیبا دروازہ کیسے کھولتی! اسے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ ساحرہ کو یوں تکے جا رہی تھی جیسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق کو دیکھ رہی ہو۔

یکا یک ساحرہ اتنی تیزی سے آگے بڑھی جیسے کسی نے

اسے خواب سے نکال کر اچانک حقیقت کی دنیا میں دھکیل دیا ہو۔ وہ شیبا سے لپٹ گئی۔

"جانی.....! جانی!" وہ کہہ رہی تھی۔ "یہ تم ہو.....؟ ارے!..... جانی! میری جان!" ساحرہ کا انداز ہیجانی تھا۔ "تم ہی ہو نا!..... میری پیاری شیبا! میری جان! میری دوست!"

"اب صرف دوست نہیں۔" آغا نصیر ہنس کر بولا۔ "اب یہ تمہاری بیٹی بھی ہے۔"

"نہیں۔" ساحرہ کے منہ سے نکلا۔ "یہ صرف میری دوست ہے۔" پھر اس نے شیبا کو جھنجوڑ ڈالا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟..... مجھے اس روپ میں دیکھ کر خوش نہیں ہوئی ہو؟"

شیبا نے آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر ساحرہ کے شانوں پر رکھ دیے اور مسکرانے کی کوشش کی۔ اب وہ سکتے کی حالت سے باہر آ گئی تھی۔

"میری جان!" ساحرہ نے کہتے ہوئے شیبا کو چوم لیا۔

"اب اندر چلو بھئی!" آغا نصیر پھر ہنسا۔

"چلو!" ساحرہ نے شیبا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

وہ تینوں ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ صوفے پر بیٹھنے کے بعد بھی ساحرہ، شیبا سے لپٹی جا رہی تھی، اسے پیار کر رہی تھی۔

"کچھ ہماری بھی خبر لیں بیگم صاحبہ!" آغا نصیر مسکراتا ہوا بولا۔ "کیا صرف اپنی دوست سے ہی باتیں کرتی رہیں گی؟"

اب ساحرہ چونکی۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھول ہی گئی تھی کہ تھوڑی ہی دیر پہلے اس کا نکاح ہوا تھا۔ وہ دلہن تھی اور اس گھر میں اپنی دوست سے ملنے نہیں، اس گھر میں رہنے کے لیے آئی تھی۔ اس نے چونک کر خود کو شیبا سے الگ کیا اور نظریں جھکا لیں۔ اس کی سانسیں بہت تیزی سے چلنے لگی تھیں۔

"کسی سے کھانا لگوانے کے لیے کہو شیبا!" آغا نصیر بولا۔

"عشرت اعوان کہاں ہیں؟" شیبا نے پوچھا۔

"وہ بہت مصروف ہے، کل تک مصروف رہے گی۔ کسی وقت آئے گی بھی تو ذرا دیر کے لیے.....! کسی ملازم سے کہہ دو کھانے کے لیے۔"

شیبا نے ایک ملازم کو بلا کر اس سے کھانے کی میز لگانے کے لیے کہا۔

آغا نصیر نے ساحرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شیبا سے تو تم مل لیں۔ اس کے بڑے بھائی سے کچھ ہی عرصے بعد مل سکو گی۔ میں نے اسے تعلیم کے لیے باہر بھیجا ہے۔ وہ آکسفورڈ سے پڑھ کر آئے گا۔"

اس بات سے ساحرہ کی ایک الجھن دور ہو گئی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ لڑکی کے علاوہ آغا نصیر کا ایک بیٹا بھی ہے۔

ساحرہ کو ایک اور الجھن بہر حال لاحق ہو گئی تھی۔ شیبا کو دیکھ کر وہ خود تو بہت خوش ہوئی تھی لیکن ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شیبا اگرچہ اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ساحرہ نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ فکرمند تھی۔

"کھانا لگنے تک میں ذرا واش روم ہو آؤں۔" آغا نصیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ساحرہ کو اس کی عدم موجودگی میں شیبا سے کچھ باتیں کرنے کا موقع ملا۔

"کیا تم خوش نہیں ہو شیبا!" ساحرہ نے پوچھا۔

"یہ تم نے کیوں سمجھ لیا؟"

"میرا خیال ہے کہ تم کچھ فکرمند ہو!"

"فکرمند ہونا دوسری بات ہے۔" شیبا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"فکرمندی کی وجہ؟"

"بس کچھ ہے۔ ابھی اسے رہنے دو۔ کچھ دن بعد تمہیں شاید خود ہی معلوم ہو جائے۔ مجھے امید ہے کہ تم اصرار نہیں کرو گی۔"

"اچھا!" ساحرہ نے طویل سانس لی۔ "چھوڑ دیتی ہوں یہ ذکر! ایک اور بات بتاؤ۔ میں تو اپنی شادی کی تیاریوں میں اور شادی کے خیالوں میں الجھی ہوئی تھی اس لیے ایک بار بھی ان سے تفصیل پوچھنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ اب مجھے ان کی وہ بات یاد آ رہی ہے۔ تمہاری والدہ کے بعد آغا صاحب نے مجھ سے پہلے دو شادیاں اور کی تھیں۔ عشرت اعوان نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی اموات پراسرار انداز میں ہوئی تھیں۔ پراسرار کیوں شیبا؟"

"پہلی تو دم گھٹ جانے کی وجہ سے دنیا چھوڑ گئی۔" شیبا نے بتایا۔ "حالانکہ کراچی میں گیس ہیٹر کا رواج نہیں ہے لیکن اسے سردیوں میں الیکٹرک ہیٹر کی گرمی پسند نہیں تھی۔ دراصل وہ رہنے والی پنڈی کی تھی۔ وہیں کی عادت پڑی ہوئی تھی اسے۔ ڈیڈی نے گیس ہیٹر لگوا دیا تھا۔ ڈیڈی ایک دن پہلے کسی کام سے عشرت اعوان کے ساتھ بیرون شہر گئے ہوئے تھے۔ وہ کمرے میں اکیلی سو رہی تھی۔ رات کو کسی وقت گیس بند ہو جانے سے ہیٹر بجھ گیا لیکن گیس کی بندش وقتی طور پر بند

ہوئی تھی وہ دوبارہ جاری ہوئی۔ ہیٹر بجھا ہوا تھا، گیس کمرے میں بھرتی چلی گئی۔ اسی سے اس کا دم گھٹ گیا۔"

"یہ تو اتفاقی بات تھی۔ اسے پراسرار کیوں سمجھا گیا؟"

"اس لیے کہ گیس کیوں بند ہوئی! کیا کسی نے وقتی طور پر والو بند کیا تھا؟ اس سوال کا جواب پولیس کو نہیں مل سکا۔"

"پولیس تک بات چلی گئی تھی؟"

"ہاں۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ پولیس کیسے آ گئی تھی۔ کئی سال پرانی بات ہے۔ پولیس نے کچھ دن تفتیش کی، پھر فائل بند کر دی گئی۔" شیبا نے جواب دینے کے بعد کچھ تلخی سے کہا۔ "ہماری پولیس کو فائل بند کرنے میں تو مہارت ہے نا!"

"ضروری بھی تو نہیں ہے کہ کسی نے والو بند کیا ہو۔ مجھے ٹیکنیکل باتوں کا خود تو کوئی علم نہیں لیکن سنا ہے میں نے! کسی وقت گیس کی لائن میں از خود بھی کچھ گڑبڑ ہو جاتی ہے اور پھر از خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتی ہے۔"

"بہر حال! عشرت اعوان نے ہی اسے پراسرار قرار دیا تھا۔"

"اور دوسری کی موت؟"

"وہ کرنٹ کی وجہ سے ہوئی۔" شیبا نے بتایا۔ "شاید اس نے چیخ پکار کی ہو مگر اتفاق سے اس وقت بھی گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد ڈیڈی آئے تھے اور باتھ روم میں گئے تھے تو انہیں پتا چلا تھا، وہ بالکل جل بھن گئی تھی۔ دراصل ڈیڈی الگ سے پانی گرم کرنے کے لیے باتھ روم میں ایک الیکٹرک راڈ بھی رکھتے ہیں۔ جب باتھ ٹب میں اس کی لاش ملی تو راڈ اس میں گری ہوئی تھی۔ پانی بری طرح کھول رہا تھا۔ باتھ روم میں بھاپ پھیلی ہوئی تھی۔ ڈیڈی نے راڈ کا سوئچ آن دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے سوئچ آف کرنے کے بعد پولیس کو اطلاع دی۔ کھولتے ہوئے پانی سے لاش نکالنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔"

"یہ کیسے ہو گیا؟" ساحرہ حیرت سے بولی۔ "میرے گھر میں تو باتھ ٹب تھا نہیں لیکن میں نے پڑھا تو ہے۔ اس میں پانی بھرنے کے لیے گرم پانی کی لائن الگ ہوتی ہے۔"

"قیاس یہ کیا گیا تھا کہ الیکٹرک راڈ غالباً باتھ ٹب کے سرہانے کی طرف رکھی ہوئی ہو گی۔ دراصل وہ شراب بہت پینے لگی تھی۔ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ اس وقت بھی بہت زیادہ شراب پیے ہوئے تھی۔ شاید وہ ڈگمگائی ہو اور اس کا ہاتھ لگنے سے راڈ کا سوئچ آن ہو گیا ہو۔ وہ اس سے بے خبر باتھ ٹب میں اتر گئی۔ پھر جب وہ نہا رہی تھی تو شاید اس نے ہاتھ اوپر کیے ہوں۔ راڈ اس کے ہاتھ سے ٹکرا کر باتھ ٹب میں گر گئی یا پانی کے چھینٹے اوپر جانے سے وہ خود ہی پھسل کر باتھ ٹب میں گر پڑی ہو۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوا، بہر حال وہ موت اس طرح ہوئی تھی۔" شیبا جواب دینے کے بعد ایک بار پھر تلخی سے بولی۔ "ممکن ہے کہ دونوں ہی اموات اتفاقیہ ہوں لیکن عشرت اعوان نے اس موت کو بھی پراسرار قرار دیا تھا۔"

"کیوں؟" ساحرہ حیرت سے بولی۔ "عشرت اعوان نے اسے کیوں پراسرار قرار دیا؟"

"دراصل....." شیبا کے لہجے میں اب بھی تلخی تھی لیکن اسے اپنی بات پوری کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ آغا نصیر واش روم سے آ گیا تھا۔

کھانے کی میز لگائی جا چکی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد آغا نصیر نے مسکرا کر ساحرہ سے کہا۔ "اچھا بیگم صاحبہ! تم اپنی دوست یا بیٹی سے باتیں کرو۔ ہم چلے دفتر! اب شام کو ملاقات ہو گی۔"

"صبح سے اب تک دفتر نہیں گئے!" ساحرہ نظریں جھکائے دھیمی آواز میں بولی۔ "اب کیا کام یاد آ گیا؟"

"تمہاری خاطر وقت نکالا تھا۔" آغا نصیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب جا کے تھوڑا سا کام دیکھ لوں کیونکہ کل تو.....! اچھا خیر، چھوڑو! رات کو بتاؤں گا۔"

ساحرہ کو اس خیال سے بڑی کوفت ہوئی کہ اب رات کا انتظار کرنا پڑے گا۔

آغا نصیر کے جانے کے بعد وہ بولی۔ "ہاں شیبا! تم عشرت اعوان کے بارے میں کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔"

"ہاں.....! تم نے دیکھا ہی ہو گا کہ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ رہتی ہے۔ نہ جانے کیوں، مجھے ہی نہیں بلکہ بھائی جان کو بھی شبہ ہوا تھا کہ وہ ان اموات کو قتل ظاہر کر کے ہم بھائی بہن کو پھنسوانا چاہتی ہے۔"

"کیا اس وقت تمہارے بھائی جان نہیں تھے۔"

"پہلی موت کے وقت وہ باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور دوسری موت جب ہوئی، ان دنوں وہ چند دن کی چھٹی لے کر آ گئے تھے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

"لیکن وہ تم دونوں کی دشمن کیوں ہو گی؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتی۔ بس ایک شبہ ہے جو ممکن ہے کہ غلط ہو۔"

"تم اور تمہارے بھائی جان تو دوسری موت کے وقت گھر میں ہوں گے بھی نہیں..... ابھی تم بتا چکی ہو نا کہ گھر

میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔"

"ہاں گھر میں تو کوئی نہیں تھا۔ میں اور بھائی جان لان میں چہل قدمی کررہے تھے۔"

"پولیس نے تم سے پوچھ گچھ کی تھی۔"

"پوچھ گچھ تو سبھی سے کی تھی۔ ملازمین سے بھی لیکن انہیں کسی قسم کے شواہد نہیں مل سکے تھے اور ہمارے منہ سے بھی ان کے کسی سوال کے جواب میں ایسا کوئی لفظ نہیں نکلا تھا کہ وہ اسی کو پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ بہرحال اس کیس کی فائل بھی بند ہوچکی ہے۔ ڈیڈی بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اتفاقیہ اموات تھیں ورنہ وہ کیس کی فائل بند نہیں ہونے دیتے۔"

ساحرہ نے سوچتے ہوئے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔ اس کے تصور میں عشرت اعوان کی شخصیت ابھر آئی تھی۔ پھر اسے کچھ اور خیال آیا۔ وہ پوچھ بیٹھی۔ "لیکن اگر وہ قتل ہوئے تھے تو ان میں تم دونوں کا ہاتھ آخر کیوں ہوگا۔"

"ایک جواز تو تھا۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ ہمیں اپنی سوتیلی ماؤں سے حسد ہوگا۔"

"ہوں۔" ساحرہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔

شیبا کچھ طنزیہ انداز میں بولی۔ "اس شادی سے تم اتنی خوش ہو کہ اتنی دیر میں ایک بار بھی تمہاری زبان پر احسن کا نام نہیں آیا۔"

ساحرہ ہنس دی۔ "وہ بہت ناراض ہے مجھ سے۔ فون بھی ریسیو کرنا چھوڑ دیا ہے اس نے لیکن..... مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے، منالوں گی میں اسے!"

"اب بھی ملتی رہو گی اس سے؟"

ساحرہ کچھ سنجیدہ ہوئی، پھر اس نے کہا۔ "اب اگرچہ حالات بدل چکے ہیں لیکن میں اب بھی..... اور آغا صاحب کی بیٹی، یعنی تمہارے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں کہ مجھے احسن سے محبت ہے اور رہے گی۔"

"کیا تم یہ بات ڈیڈی کو بھی بتا سکو گی۔"

ساحرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اگر ضروری ہوا تو کسی مناسب موقعے پر بتا دوں گی لیکن مجھے امید ہے کہ تم ان سے کچھ نہیں کہو گی۔"

شیبا اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

"کل سے اب تک بہت تھک گئی ہوں۔" ساحرہ پھر بولی۔ "اب آرام کرنا چاہتی ہوں لیکن....." وہ مسکرائی۔ "مجھے نہیں معلوم کہ اس گھر میں اب میرا کمرا کہاں ہے۔"

"اب ظاہر ہے کہ ڈیڈی ہی کا کمرا تمہارا کمرا ہوگا۔" شیبا کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ "چلو، دکھا دوں تمہیں!"

ساحرہ اپنے نئے شاندار گھر کا ایک ایک گوشہ دیکھنا چاہتی تھی مگر تھکن کی وجہ سے اس نے پہلے آرام ہی کرلینا چاہا۔

شیبا اسے کمرے میں پہنچا کر چلی گئی۔ وہ کہیں کھوئی کھوئی سی تھی اور ساحرہ نے یہ بات محسوس کرلی تھی لیکن اس نے شیبا سے کچھ کہا نہیں۔

مہکتے ہوئے کمرے کی فضا نے ساحرہ کو مخمور سا کردیا۔ اتنا شاندار کمرا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر جب وہ نرم و گداز بستر پر لیٹی تو خود کو بادلوں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ اس نے تکیہ اٹھا کر اپنے سینے سے بھینچ لیا اور خود کو مزید نڈھال ہوتا محسوس کیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ نیند کی آغوش میں تھی۔

اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب اسے جگایا گیا۔ جگانے والا آغا نصیر تھا۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔ "بہت تھک گئی تھیں شاید! کئی گھنٹے سو لیں۔ ساڑھے سات بج رہے ہیں۔"

ساحرہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"تم جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لیے چائے منگواتا ہوں۔" آغا نصیر نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دروازہ باتھ روم کا تھا۔ ساحرہ اس میں داخل ہوئی۔ اتنے شاندار باتھ روم کا بھی اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا لیکن اس کی نظریں باتھ روم کی دل کشی کا جائزہ نہیں لے سکیں۔ وہ ذرا دیر کے لیے باتھ ٹب کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی اور اسے آغا نصیر کی دوسری بیوی کی موت کا خیال آیا تھا۔

باتھ روم میں ساحرہ نے صرف کلی کی۔ وہ فوری طور پر اپنا میک اپ ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میک اپ ہی کی وجہ سے معمولی نقش و نگار کے باوجود وہ بہت خوب صورت نظر آرہی تھی۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ چونک پڑی۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے آغا نصیر کے سامنے بوتل کھلی ہوئی تھی اور گلاس سے وہ شاید ایک آدھ گھونٹ لے بھی چکا تھا۔ وہ ساحرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "لوگی تم؟" اشارہ شراب کی طرف تھا۔

ساحرہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرے قریب آکر تو بیٹھو!" آغا نصیر بولا۔

"تمہارے لیے چائے آتی ہی ہوگی۔"

"یہ۔" اس نے شراب کی طرف اشارہ کیا۔ "میری ایک بیوی تو یہ بہت پیتی تھی، تم کو بھی اس کا عادی بنا دوں گا۔"

سوات کی ٹھنڈک میں تو ویسے بھی یہ آگ..... یہ پگھلی ہوئی آگ..... اس کی ضرورت ہوگی تمہیں!"

"سوات!" ساحرہ چونک پڑی۔

"ہاں۔" آغا نصیر نے کہا۔ "میں ٹکٹ بنوا تا لایا ہوں۔ کل ہم پشاور روانہ ہوجائیں گے۔ ہنی مون سوات میں منائیں گے۔ دس دن بعد واپسی ہوگی۔ ہماری واپسی کے آٹھ دن بعد میرا بیٹا بھی باہر سے آجائے گا۔ فون آیا تھا اس کا!"

ساحرہ اس کے آخری دو جملے ٹھیک سے سن بھی نہیں سکی۔ اسے فوری طور پر خیال آیا تھا کہ وہ دس دن تک احسن سے مل بھی نہیں سکے گی۔ اس نے شدید بے چینی محسوس کی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ آغا نصیر کی بات رد کردیتی۔

ملازم چائے لے آیا۔ شراب کی بوتل اور گلاس دیکھ کر اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے۔ وہ منظر اس کے لیے نیا نہیں ہوگا۔

ساحرہ چائے بنا رہی تھی جب آغا نصیر نے پوچھا۔ "جانتی ہو، میں نے تم سے شادی کیوں کی؟"

ساحرہ نے نفی میں سر ہلایا۔

آغا نصیر نے ہنس کر کہا۔ "تم شیبا کے ساتھ اسٹڈی کرنے آتی تھیں نا! اتفاق ہے کہ ہمارا آمنا سامنا کبھی نہیں ہوا لیکن میں نے بیڈ روم کی اس کھڑکی سے تمہیں پھاٹک سے اندر آتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد چھپ کر بھی تمہیں کئی بار دیکھا۔ تمہارے چہرے کے دانوں نے مجھے پاگل بنا دیا تھا تمہارا۔ چہروں پر دانوں کی کئی وجوہ ہوتی ہیں لیکن تمہارے دانوں نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ تم بہت ہی پرجوش لڑکی ہوگی۔"

ساحرہ کا جسم سنسنا گیا۔ وہ آغا نصیر کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

آغا نصیر اس کے چہرے کے دانوں پر اس طرح بولتا رہا جیسے اس نے کوئی ریسرچ ورک کیا ہو جس میں انٹرنیٹ بھی اس کے کام آیا ہو۔

اس دوران میں ساحرہ نے چائے پی لی۔ اس وقت تک آغا نصیر دوسرا گلاس بھی آدھا کرچکا تھا۔

"ابھی۔" وہ ساحرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہوا بولا۔ "گھنٹا بھر میں ثابت ہوجائے گا کہ میرا خیال درست ہے یا نہیں.....! ہاں اگر تم شراب کا ایک گلاس بھی پی لیتیں، تب تو غضب ہی ہوجاتا۔"

ساحرہ نے شراب نہیں پی لیکن وہ ایک گھنٹا کسی غضب ناک سمندر کی تمثیل بن گیا۔ ساحرہ کے تنفس کی بلاخیز موجیں ایسی تھیں کہ شاید کشادہ خواب گاہ کی ساری فضا میں بھر گئی ہوں۔

♥♥♥

دوسری صبح احسن کے والدین اسلام آباد چلے گئے۔ احسن کی طبیعت اب تک مکمل طور پر بحال نہیں ہوئی تھی لیکن خود کو بالکل ٹھیک ظاہر کرنے کے لیے وہ انہیں چھوڑنے ائرپورٹ بھی گیا تھا۔

گھر واپس آکر اس نے بستر پر لیٹتے ہی تکیے کے نیچے سے وہ لفافہ نکالا جو گزشتہ روز شیبا اسے دے گئی تھی۔ اس لفافے میں شیبا کے بہ قول "ممکنہ دعوت نامہ" دراصل ایک خط تھا جو شیبا نے اس کے نام لکھا تھا۔ اس تحریر میں ایک سے زائد مقامات ایسے تھے کہ احسن چونک گیا تھا۔ اب اس خط کے الفاظ پھر اس کے سامنے تھے۔ شیبا نے لکھا تھا۔

"احسن! ساحرہ کے بارے میں میرا خیال اب یہ ہے کہ وہ شاید خوف ناک حد تک ابنارمل ہے۔ مجھے اس کی ابنارملٹی کا علم بہت پہلے ہوگیا تھا لیکن اب جو اس نے میرے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو میں کانپ گئی۔ وہ معاشرے کی باغی ہے اور وہ اس بغاوت کو فطرت کے عین مطابق سمجھتی ہے۔ اسی لیے تم سے محبت کے باوجود کسی اور سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے لیکن وہ سمجھتی ہے کہ شادی کے بعد بھی فریقین ایک دوسرے کی ملکیت نہیں ہوجاتے۔ غالباً اس نے یہ بات تم سے بھی کہی ہوگی اور اس کا مطلب کیا ہے، یہ تم نے بھی بہ خوبی سمجھ لیا ہوگا۔

میری شدید خواہش تھی کہ تمہاری شادی ساحرہ سے ہوجائے۔ اسی لیے میں تم سے ملی بھی تھی۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا، یعنی تمہیں جس بات پر آمادہ کرنا چاہا تھا، وہ یقیناً میرا پاگل پن ہی تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ ساحرہ کے بغیر تمہاری زندگی بہت ویران ہوجائے گی۔ میں نے کالج ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ تم اس سے کتنی شدید محبت کرتے ہو۔ پھر تم سے ملنے کے بعد جب میں نے کوشش کرکے غیر جذباتی انداز میں سوچا تو مجھے احساس ہوا کہ ساحرہ سے شادی کرکے تم کبھی خوش نہیں رہ سکو گے۔ اس کا رویہ تمہیں شدید اذیت میں مبتلا رکھے گا۔ عین ممکن ہے کہ صورت حال تمہاری برداشت سے باہر ہوجائے اور تم ساحرہ سے علیحدگی اختیار کرلو..... اس سے بہتر تو یہی ہوگا کہ اس کی شادی تم سے نہ ہو۔ یقیناً ساحرہ کی شادی تمہارے لیے اتنا بڑا صدمہ ہے کہ تم تشویش ناک حد تک بخار میں مبتلا ہوگئے تھے۔ صد شکر کہ تمہاری جسمانی حالت بہت جلد سنبھل گئی لیکن

تمہارا دل تو اب بھی زخم زخم ہوگا۔"

یہاں تک شیبا نے جو کچھ لکھا تھا، اس سے احسن کو مکمل اتفاق تھا۔ یہ سب کچھ وہ خود بھی سوچ چکا تھا لیکن شیبا کا اس حد تک سوچ لینا اس کے لیے قدرے تعجب کی بات تھی۔ پھر اس سے آگے کی تحریر نے تو اسے خاصا چونکا دیا۔ شیبا نے لکھا تھا۔

"یہ زخم زخم ہونا تمہارے حق میں بہتر ہے احسن!..... ممکن ہے کوئی تمہارے ان زخموں پر مرہم رکھ دے، اگر تم چاہو۔ اس کے بعد میں خاصے تذبذب کے بعد لکھ رہی ہوں کہ تم اپنے زخموں کو مندمل کرنے کی ذمے داری مجھے بھی سونپ سکتے ہو۔"

انہی سطروں نے احسن کو چونکا دیا تھا اور پھر باقی خط اس نے بڑی تیزی سے پڑھ ڈالا تھا۔

"تم چونک گئے ہو گے احسن! یقیناً چونک گئے ہو گے۔ میرے جملے کا جو مطلب ہے وہ تم نے سمجھ لیا ہوگا۔ تم اسے میری پیشکش نہ سمجھنا جو میں تمہاری حالت کی وجہ سے کر رہی ہوں۔ نہیں احسن! حقیقت یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔"

یہ پڑھتے ہوئے احسن کا اضطراب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

"میں پہلی نظر کی محبت کو ایک افسانوی بات سمجھا کرتی تھی لیکن یہ محض افسانوی نہیں ہے۔ یہ میں نے اس وقت جانا جب میں نے تمہیں کالج میں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اپنے اس وقت کے جذبات کا اظہار بہت اچھے انداز میں کروں لیکن ایسے الفاظ میرے دماغ کی گرفت میں نہیں آ رہے ہیں، اس لیے میں ایک عام سی بات لکھ رہی ہوں کہ میں نے تمہیں دیکھا اور دل ہار بیٹھی لیکن اس سے پہلے کہ میں تمہارے قریب ہونے کی کوشش کرتی، میں نے ساحرہ سے تمہاری محبت محسوس کر لی۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ تم اس سے شدید محبت کرتے ہو۔ تمہاری نظریں ساحرہ کے علاوہ کسی چہرے پر ٹکتی ہی نہیں تھیں۔ تم ہی نہیں، ساحرہ بھی تمہیں چاہتی تھی اور اس کے دعوے کے مطابق وہ اب بھی تمہیں چاہتی ہے لیکن اب اس کی چاہت کی تشریح کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں..... بہرحال جب میں نے محسوس کیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں آپ دونوں کے درمیان میں آنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ ایسی کوئی کوشش میری محبت کی توہین ہوتی۔ محبت اگر خود غرض ہو تو کیا اسے محبت کہا جا سکتا ہے؟ ہر گز نہیں! سو میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور ساحرہ کو خود سے قریب کرتی چلی گئی۔ اس کی قربت میرے لیے باعث تسکین تھی کیونکہ وہ تمہاری محبوبہ تھی۔ ان باتوں کے بعد تم سمجھ گئے ہو گے کہ تمہیں خوش دیکھ کر ہی میں خوش رہ سکتی تھی، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا دل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دوں لیکن یہ سب کچھ خود کہنے کی ہمت مجھے نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں نے قلم کا سہارا لیا ہے۔ میرے احسن، یقین کرو، میں تمہارے سب زخم مندمل کر دوں گی۔ میری چاہت کی دیوانگی تمہیں ہر غم بھلا دے گی۔ میرے اس اظہار محبت کو تمہاری پذیرائی ملے گی یا نہیں، میں نہیں جانتی۔ اسی لیے میں نے اسے اپنی شادی کا ممکنہ دعوت نامہ کہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہاری بیوی ہی نہیں، تمہاری محافظ بھی بننا چاہتی ہوں۔ مجھے تمہاری حفاظت ساحرہ سے کرنا ہوگی کیونکہ ساحرہ کسی اور سے شادی کر لینے کے باوجود..... میں اب اور کیا لکھوں تم نے میرا مطلب سمجھ ہی لیا ہوگا۔ بس اب میں قلم رکھتی ہوں۔ میں پہلے تو نہیں کہہ سکتی تھی لیکن اب..... صرف تمہاری، شیبا۔"

احسن نے یہ خط متعدد مرتبہ پڑھا تھا اور تمام حالات پر مسلسل غور کرتا رہا تھا۔ ساحرہ اس کی محبت تو یقیناً تھی لیکن اس کی شادی کے بعد اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ اس سے ملتا۔ ایک دوست کی حیثیت سے ملنے میں تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ ساحرہ اس سے صرف دوست کی حیثیت سے نہیں ملے گی۔ اس کا مطالبہ اب بھی قائم رہے گا۔ اس بات پر یقین اس لیے کیا جا سکتا تھا کہ ساحرہ نے اس سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا۔ اس کے نظریات ایسے تھے جو احسن کے خیال میں تو دنیا کی کسی اور لڑکی کے نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر وہ کسی بہت ہی الٹرا ماڈرن گھرانے کی لڑکی ہوتی تو اس کے ان نظریات کا سبب تلاش کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی لیکن اس نے تو ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کا انداز فکر ایسا ہو جانا نہایت تعجب خیز تھا۔

اس کے برخلاف شیبا ایک نہایت ماڈرن اور آزاد خیال گھرانے کی بیٹی تھی۔ یہ خیال اسے یوں تھا کہ اس کے باپ کی تین شوگر ملز تھیں۔ اس کے خیال کے مطابق اتنے مال دار لوگ عموماً نہایت ماڈرن اور آزاد خیال ہوتے ہیں لیکن شیبا.....؟

اس پر شاید مادر پدر آزادی کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔

احسن بڑی سنجیدگی سے اس کا اور ساحرہ کا موازنہ کرتا رہا۔ کال بیل کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ فوراً بستر سے اٹھا۔ وہ متذبذب ہو گیا تھا۔ گزشتہ روز سے اس نے ساحرہ

کی کال ریسیو کرنے سے اجتناب برتا تھا اور اب کال بیل بجتے پر اسے خیال آیا تھا کہ ساحرہ خود ہی نہ آ گئی ہو۔

دوسری مرتبہ کال بیل کچھ توقف سے بجی تو وہ بستر سے اٹھا لیکن بستر ہی پر بیٹھا رہ گیا۔ وہ اس وقت تنہا تھا اور ساحرہ ہمیشہ یہی کوشش کرتی رہی تھی کہ ان دونوں کی ملاقات تنہائی میں ہو۔

تیسری مرتبہ گھنٹی بجی لیکن اس مرتبہ وہ موبائل فون کی تھی۔ احسن نے دیکھا کہ اسکرین پر شیبا کا نام چمک رہا تھا۔

احسن نے فوراً کال ریسیو کی۔ "ہیلو!"

"کیسے ہو احسن؟" شیبا نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں شیبا!"

"ابو جان اور امی جان تو چلے گئے ہوں گے۔"

"ہاں وہ تو جا چکے ہیں۔"

"تم کہہ رہے ہو کہ ٹھیک ہو تو میں یقین کیے لیتی ہوں ورنہ تو میں ڈر گئی تھی کہ شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے کال بیل کی آواز سن کر تم دروازہ کھولنے بھی نہیں آ سکے۔"

"اوہ!" احسن چونکا۔ "دروازے پر تم ہو؟"

"تم کیا سمجھ رہے تھے؟"

"میں آ رہا ہوں۔" احسن نے بستر سے اٹھتے ہوئے موبائل بند کر دیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

شیبا اندر آتے ہوئے بولی۔ "کال بیل سن کر تم کیا سمجھے تھے؟"

"ساحرہ کا خیال آ گیا تھا۔" احسن جواب دیتے ہوئے واپسی کے لیے مڑتا ہوا بولا۔ "اپنی تنہائی کی وجہ سے میں ڈر گیا تھا۔"

شیبا دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ "مجھے تمہاری تنہائی میں یہاں آنے سے اس لیے ڈر نہیں لگا کہ میں تمہارے مضبوط کردار سے واقف ہوں۔"

احسن نے کچھ نہیں کہا۔

شیبا اس کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "ناشتا کب کیا تھا؟"

"صبح ہی کر لیا تھا۔"

"اس کے بعد کچھ کھایا؟"

"نہیں۔"

"کمال کرتے ہو۔ ابھی تمہیں اپنی غذا کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابھی تمہارے لیے چکن سوپ بنا کے لاتی ہوں۔ امی نے کل ہی مجھے بتا دیا تھا کہ فریج اور ڈیپ فریزر میں ہر چیز موجود ہے تاکہ تمہیں کسی بھی ضرورت کے تحت باہر نہ جانا پڑے۔ میں ابھی بنا کے لاتی ہوں۔" وہ کمرے سے جانے کے لیے مڑی۔

"ارے رہنے دو شیبا!" احسن نے جلدی سے کہا۔ "بیٹھو، باتیں کرو۔ ابھی مجھے کچھ خواہش بھی نہیں ہے۔"

"سوپ پینے کے لیے خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی۔" شیبا نے جاتے جاتے سر موڑ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جب تک ابو جان اور امی جان نہیں آ جاتے، مجھے ہی تمہارا خیال رکھنا ہوگا۔"

وہ کمرے سے چلی گئی اور احسن بستر پر بیٹھا پھر شیبا اور ساحرہ کا موازنہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد شیبا لوٹی تو سوپ کے ساتھ وہ اپنے لیے چائے بھی بنا لائی۔ سوپ کا پیالہ احسن کو دے کر وہ خود کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ساحرہ کا فون تو آیا ہوگا؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"ہاں۔ کل دوپہر تک اس نے کئی مرتبہ کال کیا لیکن میں نے ریسیو نہیں کیا۔"

شیبا نے نظریں جھکا لیں۔

"مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس قسم کی بات کرے گی اور میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ اس کی باتوں کا کیا جواب دوں گا۔"

شیبا کچھ نہیں بولی، کچھ سوچتے ہوئے چائے کے گھونٹ لیتی رہی۔ پھر احسن بھی خاموشی سے سوپ پیتا رہا۔ جب وہ سوپ پی چکا تو شیبا نے پیالہ اس سے لے کر ایک طرف رکھنے کے ساتھ پیالی بھی وہیں رکھ دی۔ چائے وہ بھی پی چکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔ "تمہاری طبیعت اب ٹھیک ہے لیکن اگر غذایت کا خیال دو ایک دن اور رکھ لو گے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔" پھر اس نے پوچھا۔ "کھانے کا کیا رہے گا؟"

"امی جان خاصا کچھ پکا کر ڈیپ فریزر میں رکھ گئی ہیں۔ بس گرم کرنا ہوگا۔"

"روٹی تو نہیں ہوگی!"

"میں ڈبل روٹی سے کام چلا لوں گا۔ وہ تو ہے۔"

"نہیں نہیں۔ میں روٹی پکا دوں گی۔ یہ مت سمجھنا کہ میں بڑے گھرانے کی لڑکی ہوں اس لیے مجھے یہ سب کچھ نہیں آتا ہوگا۔" وہ مسکرائی۔

"اچھا کیا....." احسن رک کر بولا۔ "بس یہی باتیں کرتی رہو گی؟"

شیبا اس کا مطلب تو سمجھ گئی لیکن نظریں جھکا کر بولی۔

"اور کیا بات کروں؟"

"تمہارا ایک خط ہے میرے پاس.....! اس کی بات

نہیں کررہی ہو۔ ادھر ادھر کی باتوں میں پڑی ہوئی ہو۔"

"میں اس کی کیا بات کروں۔" شیبا نظریں جھکائے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔ "مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ کہہ چکی۔"

"گویا اب مجھے کہنا ہے۔" احسن کی مسکراہٹ خزاں رسیدہ سی تھی۔

شیبا خاموش بیٹھی رہی۔

احسن یکا یک اٹھا اور ٹہلنے لگا۔ وہ کچھ مضطرب نظر آرہا تھا۔

"شیبا!" احسن کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ "میں مرد ہوں، اس لیے مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اب میں ساحرہ سے بہت خوف زدہ ہوں۔ کل اس کی شادی ہوچکی ہوگی۔ اب تو وہ بہت زیادہ بے باک ہوجائے گی۔"

شیبا اب بھی خاموش رہی۔

"تم اس سے بالکل مختلف ہو!" احسن کچھ توقف سے بولا۔ "زمین اور آسمان کا فرق ہے تم دونوں میں! تمہاری سوچ..... میں سلام کرتا ہوں اسے!..... یہ آسان نہیں ہے کہ کوئی اس طرح سوچ کر اپنی محبت کا گلا گھونٹ دے۔"

"میں نے اپنی محبت کا گلا نہیں گھونٹا احسن!" شیبا تیزی سے بولی۔ "میری محبت آج بھی زندہ ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہ تم نے کل سے پہلے اپنے جذبات ظاہر نہیں ہونے دیے۔ جو زمانہ کالج میں گزرا، اس میں بھی مجھے شبہ تک نہیں ہوسکا کہ ساحرہ کے علاوہ بھی کوئی مجھے چاہتا ہے، اور چاہت بھی ایسی کہ محبوب کی خوشی کے لیے خود کو اذیت میں دھکیل دے۔"

"ہرگز نہیں۔" شیبا پھر تیزی سے بول پڑی۔ "تم خوش رہتے تو میں بھی خوش رہتی۔"

"ایسی باتیں بس کہنے کی باتیں ہوتی ہیں شیبا! انسانی فطرت کے خلاف کچھ نہیں ہوتا۔ میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی رہتی۔"

"میرے دل پر اگر کچھ گزرتی بھی تو کبھی کسی کے سامنے نہیں آئی۔"

"یہ دوسری بات ہے۔"

شیبا اب پھر خاموش رہی۔

احسن ٹہلتے ٹہلتے بستر کے قریب رکا اور پھر بیٹھ کر شیبا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا خط ملنے سے بھی پہلے، ساحرہ سے آخری ملاقات کے بعد میں خود یہ سوچتا رہا تھا کہ ساحرہ کی شادی کے بعد مجھے بھی کسی لڑکی سے شادی کرلینا چاہیے۔ اس طرح مجھے کچھ تو آڑ مل جائے گی۔ میں کسی ایسے معاملے میں ملوث نہیں ہوسکتا کہ خود ہی اپنی نظروں سے گر جاؤں اس لیے مجھے یقیناً کچھ تحفظ کی ضرورت ہے۔ میں اپنے تحفظ کی ذمے داری تمہیں سونپنے کے لیے تیار ہوں شیبا!"

"احسن!" شیبا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور آب دیدہ ہوگئی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا یقین کرلوں کہ میں نے جو سنا ہے وہی تم نے کہا ہے؟"

"ہاں شیبا!" احسن بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

اب اس کی آنکھوں سے دو آنسو بھی ٹپک پڑے۔

"یہ کیا شیبا!" احسن جلدی سے بولا۔

"یہ خوشی کے آنسو ہیں احسن!" شیبا پہلے سے زیادہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "ساحرہ کی شادی کا معاملہ سامنے آنے سے پہلے تک۔ بلکہ تم سے اپنی پہلی ملاقات تک میرے دماغ میں یہ بات پتھر کی لکیر بنی ہوئی تھی کہ تم میرا مقدر نہیں ہو لیکن اس وقت تمہارے جواب نے اس پتھر کو ہی پگھلا دیا ہے جس پر وہ لکیر تھی۔"

"ہمیں جلد از جلد شادی کرلینی چاہیے۔" احسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میرا تعلق مڈل کلاس سے ہے۔ کیا تمہارے والدمان جائیں گے؟"

"میں ہر قیمت پر ان سے منوالوں گی۔" شیبا پرجوش ہوگئی، پھر اس نے پوچھا۔ "اور تمہارے والدین؟ انہیں خیال آسکتا ہے کہ میں ایک بہت ماڈرن گھرانے کی لڑکی ہوں۔"

احسن مسکرایا۔ "تم نے اپنے خط میں پہلی نظر کی بات کی تھی۔ اس میں تم نے اپنی ہی طرف اشارہ کیا تھا لیکن ایسا ہی امی جان کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ انہیں بھی تم پہلی ہی نظر میں بھا گئی ہو۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں، تمہیں اپنی بہو بنالوں۔"

"سچ احسن!" شیبا کے ہونٹ لرز گئے۔

احسن نے اثبات میں سر ہلایا۔

شیبا نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کیا جس پر آنسوؤں کی لکیریں بن گئی تھیں، پھر وہ بولی۔ "تو اب ہمیں اس معاملے میں جلدی کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، ابو جان اور امی جان کل آجائیں گے۔ تم اپنے ڈیڈی سے بات کرلو۔"

"ڈیڈی تو آج سوات چلے گئے ہیں، دس دن بعد لوٹیں گے۔"

"اتنے بڑے کاروباری لوگوں کو تفریح کی اتنی فرصت مل جاتی ہے؟" احسن کے انداز میں تھوڑا سا تعجب تھا۔

"مال دار لوگوں سے زیادہ تفریح کون کرسکتا ہے۔" شیبا نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ اپنی چوتھی بیوی کو گھمانے لے

گئے ہیں۔"

"چوتھی بیوی؟"

"ہاں، تمہیں بعد میں معلوم ہو ہی جائے گا اور تم سوچو گے کہ میں نے تم سے یہ بات چھپائی لہٰذا میں تمہیں ابھی بتا دیتی ہوں۔" شیبا نے اپنے باپ کی چاروں شادیوں کے بارے میں بتایا لیکن پُراسرار اموات کا ذکر اس لیے نہیں چھیڑا کہ بات طویل ہو جاتی۔ اس کے علاوہ اس نے فی الحال یہ بھی ظاہر نہیں کیا کہ اس کے باپ کی چوتھی بیوی ساحرہ تھی۔

"اتنی بیویاں مر گئیں ان کی؟" احسن نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ "ساحرہ تمہارے بارے میں بہت باتیں کرتی تھی مگر اس نے یہ نہیں بتایا۔"

"ڈیڈی کی شادیاں!" شیبا کچھ تلخی سے بولی۔ "ساحرہ کو یہ سب کچھ بتانا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔"

احسن نے سر ہلایا۔ "ساحرہ نے مجھے صرف یہ بتایا تھا کہ تمہارے والد کئی شوگر ملز کے مالک ہیں اور ہاں، یہ بھی بتایا تھا کہ تمہارے ایک بڑے بھائی بھی ہیں جو پڑھنے کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"وہ کچھ دن میں آنے والے ہیں، خیر یہ ذکر چھوڑو! میں نے ابھی کہا تھا کہ ہمیں اپنی شادی کے معاملے میں جلدی کرنا چاہیے۔"

"میں بھی اب جلدی چاہوں گا لیکن تم اپنے ڈیڈی کو تو آ جانے دو۔"

"میں انہیں بعد میں منا لوں گی اور تمہاری امی جان تیار ہیں تو ابو جان بھی تیار ہو ہی جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں احسن..... کہ....." وہ جھجک گئی۔

"کہ.....؟" احسن اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کہ..... ہم ..... آج ہی....." شیبا نے نظریں جھکا لیں۔

"آج ہی؟" احسن حیرت سے بولا۔

"ہاں۔" شیبا کی نظریں بدستور جھکی رہیں۔ "ہم آج ہی سول میرج کر لیں۔"

احسن کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ شیبا کا منہ تکتا رہ گیا تھا۔

"ہاں احسن! آج ہی.....! لیکن میری اس عجلت کی وجہ وہ خواہش ہرگز نہیں ہے جو ساحرہ کی تھی۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ تم پر میرا ایک حق ہو جائے۔ تم میرے بن جاؤ اور میں ہر ایک کا یہ اختیار سلب کر سکوں کہ وہ مجھے تم سے چھیننے کی کوشش کرے۔"

احسن اسے غور سے دیکھنے لگا، پھر سر ہلا کر بولا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ میری طرح تم بھی ساحرہ سے خائف ہو لیکن شیبا! اگر تمہارے والد....."

"میں نے کہا نا!" شیبا نے اس کی بات کاٹی۔ "میں انہیں منا لوں گی۔ دوسری بات یہ کہ ہم ابھی کسی پر ظاہر نہیں کریں گے کہ ہم نے سول میرج کر لی ہے۔ ہاں اگر کوئی مجبوری سامنے آ گئی....." شیبا نے ساحرہ کا نام لیے بغیر کہا۔ "تب شاید وقت سے پہلے ظاہر کرنا پڑ جائے۔"

احسن بے چین سا ہو کر پھر بستر سے اٹھا اور ٹہلنے لگا۔

"میں صرف بندھن چاہتی ہوں احسن!" شیبا بولی۔ "گھریلو طور پر باقاعدہ شادی ہونے سے پہلے ہم صرف دوست رہیں گے۔" شیبا نے "صرف دوست" کے الفاظ پر خاصا زور دیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے شیبا لیکن یہ بڑا عجیب سا لگے گا۔"

"عجیب حالات میں عجیب ہی فیصلے کرنا پڑتے ہیں احسن!" شیبا نے کہا۔ "تمہیں اپنے والدین کی طرف سے تو کوئی اندیشہ نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ امی جان تو تمہارے بارے میں کہہ بھی چکی ہیں اور ابو جان نے بھی میری کوئی خواہش نظر انداز نہیں کی۔"

"تو پھر؟" شیبا نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"اچھا!" احسن نے طویل سانس لی۔ "اگر تم لڑکی ہوتے ہوئے اتنی مضبوط ہو تو میں بھی کمزور نہیں بنوں گا۔"

شیبا کا چہرہ کھل اٹھا۔

"تو تیار ہو جاؤ!" وہ بولی۔ "پہلے تو ہمیں کسی وکیل کے پاس جانا پڑے گا۔"

احسن نے اپنے کپڑوں کی الماری کی طرف دیکھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ شیبا کی کار میں تھا اور شیبا اسے خاصی تیز رفتاری سے چلا رہی تھی۔

"آج دن میں ہی خواب دیکھ رہا ہوں۔" احسن زیرِ لب بڑبڑایا۔

اس دن جو کچھ وہ اپنے تصور میں بھی نہیں لا سکا تھا، حقیقت میں ڈھل رہا تھا۔ جب وہ دونوں عدالت سے لوٹ رہے تھے تو میاں بیوی بن چکے تھے۔ شیبا سیدھی احسن ہی کے گھر پہنچی۔

"اب تو بھوک سے بہت برا حال ہو گیا ہے۔" وہ بولی۔ "تم کپڑے تبدیل کرو، میں روٹی پکاتی ہوں۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

سارا دن اس نے احسن کے ساتھ ہی گزارا۔ ان میں بس ایسی باتیں ہوتی رہیں جو دوستوں میں ہوتی ہیں۔ اس نے احسن کو رات کا کھانا بھی کھلایا اور اس کے بعد رخصت ہو گئی۔

رات کو بستر پر لیٹتے وقت بھی احسن کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شیبا کی آمد سے اب تک جیسے کوئی خواب دیکھتا رہا تھا۔ رات گئے اس کی آنکھ لگی۔ پھر اس کے جاگنے کا سبب کال بیل کی آواز تھی۔

آنے والی شیبا تھی۔ وہ اندر آتے ہی بولی۔ "تم شاور لے لو! میں ناشتا تیار کرتی ہوں۔"

"جو حکم بیگم صاحبہ!"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ناشتا کر رہے تھے۔

"ابو جان اور امی جان اب روانہ ہونے والے ہوں گے اسلام آباد سے۔" شیبا بولی۔ "ایک گھنٹے بعد ہم دونوں ہی انہیں لینے کے لیے ایئر پورٹ چلیں گے۔" وہ اتنی ہی خوش نظر آ رہی تھی جتنی خوش کوئی اچھی بہو اپنے ساس سسر کے آنے پر ہو سکتی ہے۔

مگر یہ خوشی برقرار نہیں رہ سکی، جب روانگی کے لیے تیار ہونے سے قبل شیبا نے خبریں سننے کے لیے ٹی وی کھولا۔

ٹی وی کی بریکنگ نیوز یہ تھی کہ پچاس منٹ پہلے اسلام آباد سے کراچی روانہ ہونے والا طیارہ کریش ہو گیا تھا اور غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق اس بدقسمت طیارے کا ایک مسافر بھی زندہ نہیں بچا تھا۔

"نہیں۔" احسن چیخ پڑا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ وہ ایئر پورٹ فون کر کے انکوائری سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ طیارہ لیٹ تو نہیں ہے؟

لیکن طیارہ تو ہمیشہ کے لیے لیٹ ہو چکا تھا۔

احسن نے دیوانگی کی سی کیفیت میں چیختے ہوئے اپنا موبائل فون ٹی وی کی اسکرین پر دے مارا تھا۔

شیبا اس طرح بیٹھی رہ گئی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

ٹی وی سے بریکنگ نیوز بار بار دہرائی جا رہی تھی۔

شیبا سکتے کے عالم سے باہر آئی اور دھیرے دھیرے احسن کی قریب آ گئی۔ "یہ کیا ہو گیا احسن!" اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

احسن نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے ان میں نمی اتر آئی ہو۔ اس کا سارا جسم اس طرح کانپ رہا تھا جیسے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے اسے شدید کوشش کرنا پڑ رہی ہو۔

شیبا کے کانوں میں بریکنگ نیوز کا ایک اور جملہ گرا۔

"اب تصدیق ہو گئی ہے کہ مسافر طیارے کا کوئی مسافر زندہ نہیں بچا۔"

♥♥♥

ساحرہ کو اس طیارے کی تباہی اور تمام مسافروں کی ہلاکت کا علم سوات جانے والے راستے میں ایک جگہ رکنے پر ہوا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ان مسافروں میں احسن کے والدین بھی تھے۔

رات کو وہ اور آغا نصیر سوات ہوٹل میں تھے۔ ساحرہ بہت خوش تھی کہ آغا نصیر اس کا دیوانہ ہو گیا تھا اور اس کی دیوانگی ہی ساحرہ کو بھی سرشار کر رہی تھی۔ اسے گمان تھا کہ شادی کے بعد اس کے اندر بھری ہوئی آگ پر پانی کے چھینٹے پڑ جائیں گے لیکن ہوا یہ کہ وہ اسے پیٹرول کے چھینٹے محسوس ہوئے۔ آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ اس کی وحشت ہی نے آغا نصیر کو اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ اسے ایک پل کے لیے بھی ساحرہ سے دور رہنا گوارا نہیں تھا۔ اس نے اپنا موبائل تو بند کر ہی دیا تھا کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے مگر ساتھ ہی اس نے ساحرہ کا موبائل بھی بند کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

"جب تک ہم یہاں ہیں، کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کر سکے۔" اس نے کہا تھا۔

ساحرہ کی خواہش تھی کہ وہ کسی وقت احسن سے بات کرے لیکن موبائل آغا نصیر کے پاس ہونے کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکی لیکن سوات میں گزارے جانے والے دس دنوں میں ایک دن بھی ایسا نہ تھا کہ اسے احسن کا خیال نہ آیا ہو۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی رہی تھی کہ کاش آغا نصیر کی جگہ احسن ہوتا۔

دس دن بعد وہ سوات سے لوٹے۔ ساحرہ کو اس کا موبائل واپس مل گیا۔ صبح آغا نصیر کے دفتر جانے کے بعد اس نے اپنے موبائل سے احسن کے موبائل پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔

ایسی تیسی، اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں اپنا موبائل بند کرتے ہوئے سوچا، میں خود جا کر ملتی ہوں اس سے!..... بھلا کوئی تک ہے! شادی کر لی میں نے تو کیا فرق پڑ گیا، میرے دل سے اس کی محبت تو ختم نہیں ہوئی، بے وفا تو نہیں ہوں میں۔

عجیب ہی انداز فکر تھا ساحرہ کا!

وہ نئی کار میں بیٹھ کر احسن کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ کار اسے آغا نصیر نے دی تھی اور ڈرائیونگ اس نے کالج کے زمانے میں شیبا سے سیکھ لی تھی۔ بس شوق تھا اسے کہ

ڈرائیونگ سیکھ لے۔اس وقت اسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ کبھی خود اس کے پاس کار ہوگی۔

وہ احسن کے گھر پہنچ گئی لیکن احسن سے نہیں مل سکی۔ گھر مقفل تھا۔ ساحرہ کو تعجب ہوا۔ احسن کی والدہ تو گھر ہی میں رہتی تھیں۔ اس نے قریب ہی کے گھر میں رہنے والی ایک معمر خاتون سے اس بارے میں پوچھا تو طیارے کے حادثے میں احسن کے والدین کی ہلاکت کا علم ہوا۔

"لاشیں کیا..... نامکمل لاشوں کے ٹکڑوں کی تدفین ہوئی تھی۔" پڑوس کی خاتون نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بے چارے احسن پر قیامت گزر گئی۔ اکیلا رہ گیا دنیا میں.....! اس کی ایک دوست آتی رہی ان دنوں میں۔ اسی نے کسی طرح سنبھالا ہوگا اسے۔"

احسن کے والدین کی حادثے میں ہلاکت، ساحرہ کے لیے بھی افسوس ناک تھی لیکن اس بات نے اسے چونکایا بھی کہ کوئی لڑکی ان دنوں میں احسن کے پاس آتی رہی تھی۔

مزید پوچھ گچھ پر اسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی نیلے رنگ کی کار میں آیا کرتی تھی۔ "نیلے رنگ" کی بات نے ساحرہ کو اور چونکا دیا۔ نیلا رنگ شیبا کی کار کا تھا۔ پھر پڑوس ہی کے کسی شخص نے اسے کار کا نمبر بھی بتا دیا۔ اس کے بعد کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

"لیکن گھر کیوں مقفل ہے؟" ساحرہ نے پوچھا۔

"احسن صاحب کل صبح یہاں سے کہیں اور منتقل ہو گئے۔" اسی شخص نے بتایا۔ "کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہ گھر بیچ دیں گے۔"

ساحرہ کو اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ وہاں سے لوٹی، راہ میں اس نے اپنے والدین سے ملنا ضروری سمجھا۔ اسے آغا نصیر نے بتا دیا تھا کہ ان لوگوں کو کس عمارت میں فلیٹ دلایا گیا تھا۔

بوجان کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ اس نے ساحرہ کو جھنجوڑ دینے کی حد تک خوشی سے لپٹائے رکھا۔ سرکار احمد نے بھی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ اپنے بدلے ہوئے حالات سے بہت خوش تو نہیں مگر نا خوش بھی نہیں تھا۔

بوجان کی خواہش کے خلاف ساحرہ نے ماں باپ کے ساتھ کم ہی وقت گزارا اور وہاں سے روانہ ہوگئی۔ وہ شیبا سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔ یہ اس کے لیے حیران کن تھا کہ اتنی جلدی، بلکہ اچانک احسن سے شیبا کے تعلقات اتنے زیادہ کیسے بڑھ گئے۔

ساحرہ کے ان خیالات میں حسد، جلن جیسے جذبے کی رمق بھی نہیں تھی۔ اس کا انداز فکر ہی ایسا تھا کہ احسن کا کسی بھی لڑکی سے ملنا اس کے لیے کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔ اسے شیبا کی وجہ سے صرف تعجب تھا۔

جب وہ گھر پہنچی تو شیبا کہیں جا چکی تھی۔ ساحرہ نے اس سے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ "کہاں ہو جانی؟" اس نے پوچھا۔

"ایک دوست کے پاس ہوں۔" شیبا نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

ساحرہ کو فوراً احسن کا خیال آیا۔ اس کی دانست میں شیبا کو احسن کی نئی قیام گاہ کا علم ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے فون پر یہ بات چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ "کب آؤ گی؟" اس نے پوچھا۔

"دو ڈھائی بجے تک۔"

"میں انتظار کروں گی۔"

"کوئی خاص بات؟"

"آؤ گی تو بتاؤں گی۔"

ساحرہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ یہ باتیں اس نے بستر پر لیٹے لیٹے کی تھیں۔ اسے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ شیبا احسن ہی کے ساتھ ہوگی۔

کیا وہ احسن کے ساتھ شادی کر سکتی ہے؟ اس کے دماغ میں سوال ابھرا۔ اس کے خیال میں اگر ایسا ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔

دو ڈھائی بجے کے درمیان شیبا آ گئی۔ ساحرہ نے اسے بہت سنجیدہ پایا۔

"میں احسن کے گھر گئی تھی۔" ساحرہ نے کہا۔ "وہاں مجھے ان سب باتوں کا علم ہوا جن سے تم بھی واقف ہوگی۔"

شیبا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

ساحرہ نے کہا۔ "مجھے اس کے والدین کا سن کر بہت افسوس ہوا جو ہونا ہی چاہیے تھا لیکن اس پر تعجب ہوا کہ اس دوران میں تم احسن کے گھر جاتی رہی ہو۔ وہاں کسی نے مجھے تمہاری کار کا نمبر بتایا تھا۔ یقین جانو، مجھے تمہارا وہاں جانا قطعی برا نہیں لگا ہے۔"

شیبا بہ دستور سنجیدگی سے بولی۔ "تم تو سوات جا چکی تھیں۔ تمہاری شادی کے بعد والدین کی وفات احسن کے لیے دوسرا بڑا دھچکا تھا اور اس وقت اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔"

"تمہارا سہارا اس نے بہ خوشی قبول کر لیا؟" ساحرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

شیبا نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ اچھا ہوا۔" ساحرہ بھی مسکرائی۔ "لیکن اس نے اپنا گھر کیوں چھوڑ دیا؟"

"میں نے ہی اصرار کر کے اس کا گھر بدلوایا ہے۔ وہ وہاں رہتا تو والدین کی یاد اسے تڑپاتی رہتی۔ گھر کا ایک ایک گوشہ اسے ان کی یاد دلاتا۔"

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا، لیکن ایک بات سچ سچ بتاؤ!"

شیبا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

ساحرہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم نے صرف ہمدردی میں اسے سہارا دینا ضروری سمجھا تھا یا..... اتنے دن اس کے قریب رہ کر تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی اور جذبہ بھی پیدا ہو گیا ہے؟"

وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ شیبا یکا یک مضطربانہ انداز میں کھڑی ہوئی اور سامنے کے دوسرے صوفے پر جا بیٹھی۔ اس کا یہ سارا عمل قطعی غیر ارادی تھا۔ چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات تھے۔ ساحرہ اسے غور سے دیکھے جا رہی تھی۔ شیبا کی نظریں جو فرش کی طرف تھیں، یکا یک ساحرہ کی طرف اٹھیں۔ جیسے اس نے کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"تم نے پوچھا تھا ساحرہ کہ میرے دل میں کوئی اور جذبہ تو پیدا نہیں ہو گیا..... اب میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ وہ جذبہ جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے، وہ تو بہت پہلے سے میرے دل میں تھا۔ اس وقت سے جب میں نے کالج میں اسے پہلی بار دیکھا تھا۔"

ساحرہ صوفے سے اچک جانے کی حد تک چونک گئی تھی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا ہے ساحرہ!" شیبا نے سنجیدگی سے کہا اور احسن سے اپنی محبت کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ احسن کو بھی بتا چکی تھی۔

ساحرہ چند لمحے اس کا منہ تکتی رہی، پھر مسکراتے ہوئے تیزی سے اٹھی اور سامنے کے صوفے پر جا کے والہانہ انداز میں شیبا سے لپٹ گئی۔

"جانی!..... میری جان!..... تم نے میرے لیے اتنی بڑی قربانی دی تھی؟"

"میں لفظ قربانی تو اپنی زبان پر نہیں لا سکتی لیکن جب میں نے اسے تمہاری طرف متوجہ دیکھ لیا تھا تو پھر یہ بالکل مناسب نہیں تھا کہ میں تم دونوں کے بیچ میں آتی۔"

"تم گریٹ ہو جانی!..... لیکن اب..... میرا مطلب ہے..... کیا تم نے احسن کو اپنے ان جذبات سے آگاہ کر دیا ہے؟"

"جب ڈیڈی سے تمہاری شادی طے پا چکی تھی، تبھی میں نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ میرے خیال میں اس وقت اس کی ضرورت بھی تھی۔ احسن تمہاری شادی سے بہت اداس تھا۔ میں اس کے زخم مندمل کرنا چاہتی تھی۔"

"تمہیں اس میں کامیابی ہوئی؟" ساحرہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"اپنی توقعات سے بڑھ کر....." جواب دیتے ہوئے شیبا سوچ بھی رہی تھی۔ وہ قدرے تذبذب کے عالم میں بولی۔ "جس دن تم سوات گئی تھیں، اسی روز میں نے اور..... احسن نے..... مطلب یہ کہ..... ہم نے سول میرج کر لی تھی۔"

ساحرہ چونکی اور ایک بار پھر شیبا سے لپٹ گئی۔

"شاندار!..... بہت شاندار!..... تم نے تو مجھے خوش کر دیا جانی!..... احسن تو محبت کے معاملے میں بے تکی سوچ رکھتا تھا لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی کہ کسی لڑکی سے اس کی شادی کرائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ میری پیاری دوست ہی اس کی بیوی بن گئی۔"

"عملاً بیوی نہیں بنی ہوں ابھی۔" شیبا نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہم میں طے پایا تھا کہ باقاعدہ شادی سے پہلے ہم ایک دوسرے کے دوست رہیں گے۔ سول میرج میں جلدی تو میں نے اس لیے کی تھی کہ اس پر حق جتا سکوں ورنہ میں گھر چھوڑنے کے لیے بھی اس سے اصرار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو کھانا پینا بھی بھول گیا تھا۔ میں ہی جا کر اسے زبردستی کھلاتی پلاتی رہی ہوں۔ ابھی اسے کھانا کھلا کر ہی آئی ہوں۔"

ساحرہ اس کا منہ تکتے ہوئے سب کچھ سنتی رہی تھی لیکن خوش نظر آ رہی تھی۔

"اب میں ہچکچاہٹ کا شکار ہوں کہ ڈیڈی سے شادی کی بات کس طرح کروں۔" شیبا بولی۔ "کیا تم میری خاطر ڈیڈی سے بات کر سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں!" ساحرہ جلدی سے بولی۔ "احسن کی خوشی کے لیے، تمہاری خوشی کے لیے میں کیا نہیں کر سکتی جانی!"

شیبا مسکرائی۔ "آج ہی بات کرنا۔"

"آج ہی کروں گی۔" ساحرہ نے پُرجوش انداز میں کہا۔

پھر اس کا وقت سوچ بچار میں گزرنے لگا۔ یہ اس کے

لیے خوشی کی بات تھی کہ احسن شادی کر چکا تھا لیکن وہ فکر مند تھی کہ شیبا کی موجودگی میں وہ احسن کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کر سکتی تھی۔ شیبا کی عدم موجودگی میں احسن خود بھی گھر پر نہیں رہتا۔ وہ اس سے ناراض تھا اور اس سے ملنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ساحرہ اسے اسی صورت میں منا سکتی تھی جب وہ اس سے ملتا مگر اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ احسن نے اس کی کال ہی ریسیو کرنا چھوڑ دی تھی۔

سوچتے سوچتے ساحرہ کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہوئی جیسے اسے کوئی تدبیر سوجھ گئی ہو۔ وہ مسکرا دی۔ وہ اس وقت اکیلی ہی تھی۔ شیبا اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

ساحرہ کو اچانک ایک خیال اور بھی آیا۔ اگر وہ کسی دوسرے نمبر پر احسن کو رنگ کرتی تو قوی امکان تھا کہ وہ کال ریسیو کر لے۔

آغا نصیر نے ساحرہ کو ایک خوب صورت موبائل فون پشاور سے دلایا تھا جو اس نے ابھی تک استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنی خواب گاہ کی طرف لپکی۔ اس نے سامان میں سے وہ موبائل نکالا جو آغا نصیر نے اسے ایکٹی ویٹ کر کے دیا تھا۔ ساحرہ نے اس پر احسن کے نمبر ملائے۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔ آواز احسن کی تھی۔

"سب سے پہلے تو میں ابو جان اور امی جان کی رحلت پر افسوس کا اظہار کروں گی احسن!" ساحرہ نے کہا۔

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے طویل سانس لی گئی ہو۔

"پلیز احسن!" ساحرہ پھر جلدی سے بولی۔ "فون بند نہ کرنا۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم مجھ سے کتنے ناراض ہو، تم نے شاید اپنا گھر بھی اس لیے چھوڑا ہے کہ میں تم سے ملنے وہاں نہ آ جاؤں۔"

"اب کیا چاہتی ہو ساحرہ!" احسن کی آواز بے جان سی تھی۔

"تم سے ملنے کے علاوہ میں اور کیا چاہ سکتی ہوں؟"

"اب تم کسی کی بیوی بن چکی ہو۔"

لفظ "کسی" سے ساحرہ نے ایک نتیجہ اخذ کر لیا۔ احسن کو ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس کی بیوی بنی تھی۔ شیبا نے اسے اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔

"بیوی بن گئی ہوں تو کیا ہوا؟" ساحرہ بولی۔ "میں تمہیں اپنے خیالات سے آگاہ کر چکی تھی۔"

"مگر میں ان خیالات سے متفق نہیں ہوں۔"

"تم اب مجھ سے کبھی نہیں ملنا چاہتے؟" ساحرہ مسکرائی۔

"تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا۔

اتنی بے رخی؟ ساحرہ مسکرائی۔ "نہیں احسن! تمہیں تو اب میں اپنی دسترس کے بہت قریب لے آؤں گی۔"

رات کو اس نے آغا نصیر سے شیبا کا ذکر چھیڑا۔

"اب اس کی شادی ہو جانا چاہیے آغا صاحب!"

"کوئی رشتہ تو آئے!"

ساحرہ نے اسے احسن اور شیبا کی محبت کے بارے میں بتایا مگر اس میں اپنا نام نہیں آنے دیا۔

"کون ہے یہ احسن!" آغا نصیر نے چونک کر پوچھا۔

ساحرہ نے اسے احسن کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔

آغا نصیر کا منہ بن گیا۔ "یہ لڑکیاں اتنی جذباتی کیوں ہو جاتی ہیں۔ بس محبت، محبت! یہ نہیں سوچتیں کہ ان کا مستقبل کیسے گزرے گا جو ملازمت کی تلاش میں ہو، کیا وہ شیبا کے اخراجات پورے کر سکتا ہے؟ وہ کہیں ملازم ہو بھی گیا تو اس کی آدھی تنخواہ شیبا کی کار کے پیٹرول میں خرچ ہو جائے گی۔"

"کیا آپ نے ایک غریب لڑکی سے شادی نہیں کی؟"

"لیکن اب وہ لڑکی غریب نہیں ہے۔" آغا نصیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس کے والدین بھی ایک اچھے فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔ کچھ ہی دن بعد وہ ایک اچھے اسکول کے مالک ہوں گے۔"

"احسن کے لیے بھی آپ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اسے اپنی کسی شوگر مل کا منیجر بنا دیجیے گا۔"

"کیا اس میں اتنی صلاحیت ہے؟"

"تھوڑی سی ٹریننگ دلوا دیجیے گا۔ وہ بہت ذہین ہے۔"

آغا نصیر کوئی جواب دیے بغیر اٹھا اور کپ بورڈ سے شراب نکالنے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ساحرہ کی بات ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔ وہ دو پیگ بنانے لگا۔ ایک اپنے لیے اور ایک ساحرہ کے لیے۔ سوات میں وہ شیبا کو اس راہ پر لے آیا تھا۔

ساحرہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ مرد سے کوئی عورت اپنی بات کن لمحات میں منوا سکتی ہے۔

جب آغا نصیر نے تیسرا پیگ شروع کیا، ساحرہ دوسرا پیگ تھوڑا سا ہی پی سکی تھی۔ اس دوران میں آغا نصیر ساحرہ کی پُرجوش رفاقت کے تذکرے کر کے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ شیبا کے بارے میں اس نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ پھر جب اس نے شراب سے مخمور ہو جانے کے بعد ساحرہ کو اپنی آغوش میں لینا چاہا تو وہ تیزی سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھی۔ اس کی یہ حرکت آغا نصیر کے لیے ایک نئی بات تھی۔ وہ حیرت سے ساحرہ کی طرف دیکھنے لگا جو اب منہ پھلائے ہوئے تھی۔

"میں نے جو بات کی تھی، وہ آپ کی بیٹی کی بھلائی کے لیے کی تھی۔ اگر آپ میری وہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تو پھر کیا مجھے برا نہیں لگے گا؟"

"مگر جان من....."

"کوئی جان من نہیں آپ کا!" ساحرہ اپنی آنکھوں میں آنسو لے آئی جو مصنوعی تھے۔ "آپ نے ہمیشہ صرف اپنے جذبات کی آسودگی کے راستے تلاش کیے ہیں۔ آپ کو شاید احساس ہی نہیں کہ آپ کی بیٹی جوان ہے، اس کے بھی جذبات ہوں گے۔ وہ ایک خوب صورت نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ کسی وقت ان دونوں کے قدم بھی اگر بہک سکتے ہیں۔"

آغا نصیر چونکا۔ "اگر بہک سکتے ہیں یا اگر بہک چکے ہیں؟ شیبا نے تمہیں صاف صاف کچھ بتایا ہے؟"

"اس نے مجھے صرف اپنی محبت اور شادی کی خواہش سے آگاہ کیا ہے۔ یہ تو بس میرا اندازہ ہے کہ جب دو جوانیوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

نشے میں ہونے کے باوجود آغا نصیر کے چہرے سے تشویش کا اظہار ہونے لگا۔

گرم لوہے پر ساحرہ نے ایک اور چوٹ لگائی۔ "کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے آپ! یہ کام ایسا ہے جو جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔ میں نے اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سوچی ہے۔ آپ یہ شرط رکھ دیجیے کہ شادی کے بعد احسن کو ہمارے ہی گھر میں رہنا ہوگا۔ وہ یہاں رہے گا تو کبھی سر اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔" ساحرہ نے احسن کو اپنے قریب کرنے کی یہی ایک تدبیر سوچی تھی۔

"میں شیبا سے بات کروں گا۔" آغا نصیر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ سے بات کر سکتی تو بہت پہلے کر چکی ہوتی اور مجھ سے نہ کہتی۔ میں پھر کہوں گی کہ اس معاملے میں آپ کو جلدی کرنا چاہیے۔"

"اچھا خیر! سوچوں گا۔ یہ تم نے رونا کیوں شروع کر دیا۔"

"صدمہ پہنچا ہے مجھے!" ساحرہ نے سسکی لی۔ "پہلی مرتبہ آپ سے کوئی بات منوانا چاہی جس میں میری اپنی کوئی غرض بھی نہیں، لیکن آپ میری یہ پہلی بات بھی نہیں مان رہے ہیں۔"

"اچھا تم میرے قریب تو آؤ۔" آغا نصیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ہونٹوں سے تمہارے آنسو تو پی لوں۔"

ساحرہ نے شراب کا ایک گھونٹ لیا اور خود ہی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے، بستر پر آغا نصیر کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کا منہ اب بھی پھولا ہوا تھا۔

آغا نصیر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو وہ کسمساتے ہوئے بولی۔ "اب آپ مجھ سے دور ہی رہیے۔ مجھے شیبا سے بھی شرمندہ ہونا پڑے گا اب! آپ کی محبت پر ناز تھا اس لیے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ آپ کو آمادہ کر لوں گی۔"

آغا نصیر نے زبردستی اسے اپنے قریب گھسیٹ لیا اور اس کی بھیگی ہوئی سی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

"رہنے دیں یہ دکھاوے کی محبت!" ساحرہ نے اس کی آغوش سے نکلنا چاہا۔

"دکھاوا نہیں ہے۔ دل و جان سے چاہنے لگا ہوں تمہیں! چلو ٹھیک ہے۔ شیبا کی شادی اسی سے کر دی جائے گی جس سے وہ چاہتی ہے لیکن تمہاری بات ٹھیک ہے۔ احسن کو یہاں آ کر رہنا پڑے گا۔"

"پکی بات؟" ساحرہ نے مسکرا کر آغا نصیر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"بالکل پکی۔" آغا نصیر نے کہا۔ "لیکن چند دن تو رکنا پڑے گا۔ شہریار تو آ جائے۔"

شہریار، شیبا کے بڑے بھائی کا نام تھا۔

ساحرہ بولی۔ "آپ نے بتایا تھا کہ ہم سوات سے لوٹیں گے تو دو چار دن میں شہریار آ جائے گا۔"

"ہاں کہا تو تھا لیکن کسی وجہ سے کچھ دن اور لگیں گے۔ آج شہریار کا فون پھر آیا تھا۔ اسے آنے میں دس پندرہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"اتنے دن شیبا انتظار نہیں کر سکتی۔"

"اس کا مطلب ہے....." آغا نصیر سوچتے ہوئے بولا۔ "غلطی ہو چکی ہے شیبا سے! تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔"

"آپ شیبا سے کوئی بات نہیں کیجیے گا۔" ساحرہ نے کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ آغا نصیر اس شک میں مبتلا رہے۔

"تو پھر یہ شادی دو تین دن میں ہی ہو جانا چاہیے۔"

ساحرہ کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ احسن جلد از جلد اس کے قریب آجائے۔

"بس۔" آغا نصیر بولا۔ "وہ کسی طرح بھی احسن کو یہاں رہنے پر آمادہ کرلے۔"

"میں اس سے کہہ دوں گی۔ پوری کوشش کروں گی کہ ایسا ہی ہو۔"

"اب تو دور نہ رہو مجھ سے!" آغا نصیر نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اس مرتبہ ساحرہ نے اس سے بچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے جو چاہا تھا، وہ ہو گیا تھا۔

دوسرے دن ساحرہ نے صبح ہی صبح مسکرا کر شیبا سے کہا۔ "آغا صاحب سے منوالی ہے میں نے بات! احسن سے تمہاری شادی دو تین دن میں ہو جائے گی۔ شادی کی تیاریوں کی ساری ذمے داری آغا صاحب نے مجھے ہی سونپ دی ہے۔"

خوشی سے شیبا کا چہرہ کھل اٹھا۔

"لیکن ایک شرط ہے آغا صاحب کی۔" ساحرہ نے کہا۔ "وہ احسن کو اپنی ایک شوگر مل کا منیجر تو بنا دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ احسن کو یہیں آکر رہنا پڑے گا۔"

شیبا کے چہرے سے خوشی رخصت ہو گئی۔ اس نے پریشانی سے کہا۔ "احسن شاید یہاں رہنا پسند نہ کرے۔"

"اگر اسے تم سے محبت ہے تو وہ سب کچھ مانے گا۔ آغا صاحب تو یہ شادی دس پندرہ دن بعد کرنا چاہتے تھے کیونکہ تمہارا بھائی شہریار دس پندرہ دن بعد ہی آئے گا لیکن میں نے آغا صاحب کو جلدی کرنے پر آمادہ کرلیا ہے۔"

"بھائی جان تو دو تین دن میں آنے والے ہیں۔"

"نہیں۔" ساحرہ نے جواب دیا اور اسے جو کچھ آغا نصیر سے معلوم ہوا تھا، وہ اس نے شیبا کو بتا دیا۔

شیبا اپنی الجھن کے باوجود خفیف سا مسکرا دی۔ "میرا خیال ہے کہ بھائی جان دو تین روز میں ہی آجائیں گے۔ انہیں سرپرائز دینے کی عادت سی ہے۔"

"آجاتے ہیں تو اچھا ہے۔ تم احسن کو جلد از جلد تیار کرو۔"

"میں اسی کے پاس جا رہی ہوں۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہوگا، مجھے ہی اس کی ہر بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"تو جاؤ!" ساحرہ نے مسکرا کر شیبا کا گال تھپکا۔ "بیسٹ آف لک!"

♥♥♥

شیبا گھر سے روانہ ہوئی۔ کار چلاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی، کیا احسن مان جائے گا کہ وہ اس کے گھر میں آکر رہے؟ شیبا کو یہ معاملہ خاصا مشکل نظر آرہا تھا۔ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچنا چاہتی تھی کہ احسن کو اس پر کس طرح آمادہ کیا جائے؟ ذہن میں بہت سی تدبیریں ابھریں تو سہی لیکن اس نے محسوس کیا کہ ان میں سے کوئی بھی تیر بہ ہدف کے نسخے کے مصداق نہیں تھی۔

کار اس نے اپارٹمنٹس کی ایک عمارت کے احاطے میں پارک کی۔ دوسری منزل کا ایک اپارٹمنٹ فوری طور پر کرائے پر مل گیا تھا۔ دوسرا مکان خریدنے سے پہلے احسن کا پہلا مکان بکنا ضروری تھا۔ وہ شیبا نے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے حوالے کر دیا تھا۔

دوسری منزل کے اپارٹمنٹ کا لاک شیبا نے چابی سے کھولا۔ خود احسن ہی کی خواہش تھی کہ شیبا اپارٹمنٹ لاک کر کے جایا کرے۔ وہ بہت پژمردہ تھا اور اپارٹمنٹ سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اپارٹمنٹ کی دوسری چابی شیبا نے احسن کے پرس میں رکھ دی تھی کہ شاید اسے کسی وقت باہر نکلنے کی ضرورت پڑ جائے۔

شیبا اس کمرے میں داخل ہوئی جسے خواب گاہ کے فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس نے احسن کو بستر پر نیم دراز دیکھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر احسن نے بھی اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے۔ اس کا شیو خاصا بڑھا ہوا تھا۔

"اب آج تو شیو بنا لو احسن!..... میں اتنی دیر میں ناشتا تیار کرتی ہوں۔"

"کچھ زیادہ تو نہیں بڑھا!" احسن نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"تم کو تو کسی بات کا احساس ہی نہیں رہا ہے۔ کل تک شیو اتنا بڑھ جائے گا کہ ڈاڑھی کا گمان ہونے لگے گا۔ پلیز! آج شیو کرلو!"

"اچھا!" احسن نے طویل سانس لی اور بستر سے اٹھنے لگا۔ شیبا کے اصرار پر ہی وہ شیو بنایا کرتا تھا۔ اسے اپنی سدھ بدھ ہی نہیں رہی تھی۔ کپڑے بھی وہ شیبا کے اصرار پر ہی تبدیل کرتا تھا۔ شیبا کی عدم موجودگی میں اس کے بال بھی بکھرے رہتے تھے اور اس وقت بھی بکھرے ہوئے تھے۔ شیبا ہی اس کے بالوں میں برش کیا کرتی تھی۔

شیبا نے ناشتا خاصے اہتمام سے تیار کیا۔ جب وہ ٹرے لے کر احسن کے کمرے میں داخل ہوئی تو احسن شیو بنا

کر بستر پر لیٹ چکا تھا۔

"آؤ!" شیبا اس صوفہ سیٹ کی طرف بڑھی جو ایک گوشے میں لگایا گیا تھا۔ اس نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی۔

"یہ آج اتنا کچھ کیوں بنالیا؟" احسن نے قریب آتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس کا انداز گفتگو عموماً ایسا ہی رہنے لگا تھا جیسے کوئی مشین بول رہی ہو۔

شیبا نے کہا۔ "اتنے دن سے میں چپ ہوں۔ تم نہ تو کھانا ٹھیک سے کھاتے ہو، نہ ہی ناشتا ٹھیک سے کرتے ہو۔ اب واضح طور پر نظر آنے لگا ہے کہ اس سے تمہاری صحت خراب ہو رہی ہے۔" پھر وہ ہنس کر بولی۔ "اگر آج بھی تم نے ٹھیک سے ناشتا نہیں کیا تو میں بھوک ہڑتال شروع کر دوں گی۔"

"میری صحت خراب ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے شیبا! زندگی سے اب مجھے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔"

"اب تمہاری زندگی صرف تمہاری نہیں رہی۔ میرا بھی حق ہے اس پر!" شیبا جذباتی ہو گئی۔ "تمہیں میری خاطر جینے کی امنگ پیدا کرنا ہوگی خود میں!"

"میں اندر سے بالکل ویران ہو چکا ہوں شیبا!"

"چلو ناشتا کرو۔ باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔"

اسی روز شیبا نے شدید اصرار کر کے احسن کو معمول سے زیادہ ناشتا کرایا۔ وہ خود گھر سے صرف چائے پی کے آیا کرتی تھی اور ناشتا احسن کے ساتھ کرتی تھی۔

ناشتے کے بعد شیبا برتن کچن میں رکھ آئی اور بستر پر احسن کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کب تک سوگ مناتے رہو گے احسن!"

"سوگ منایا نہیں جاتا شیبا! سوگ تو ہوتا ہے۔ میری زندگی میں اگر کچھ تھا تو وہ میرے ماں باپ ہی تھے۔ ویسے تو اولاد ہی ماں باپ کا سرمایہ ہوتی ہے لیکن میرا سرمایہ میرے والدین تھے۔"

"میرا خیال تھا کہ گھر کی تبدیلی سے تم پر اچھا اثر پڑے گا۔"

"گھر....." احسن بولا۔ "یہ لفظ اب میرے لیے بے معنی ہو چکا ہے۔ کوئی محل ہو یا جنگل، کوئی اہمیت نہیں میرے لیے۔"

"میں تمہیں جہاں چاہوں لے جاؤں؟" شیبا نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔ "تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟"

"کیوں اعتراض ہوگا مجھے! تم مجھے کہیں بھی لے جاؤ۔ میرے لیے ایک سی بات ہوگی۔"

شیبا کی کچھ امید بندھی۔ اس نے کہا۔ "میں تمہیں ایک اچھی خبر سناؤں! ڈیڈی تم سے میری شادی کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔"

احسن نے ایک بار اس کی طرف دیکھا، پھر سر جھکا لیا۔

شیبا بولی۔ "کیا تمہیں اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی؟"

"خوشی!" احسن نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے مزید کچھ کہنا چاہیے تھا لیکن وہ صرف لفظ "خوشی" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ شاید اب خوشی بھی اس کے لیے بے معنی ہو چکی تھی۔

شیبا کا دل بھر آیا۔ جب سے احسن کے والدین کی وفات ہوئی تھی، احسن کی حالت دیکھ کر اکثر شیبا کا دل بھر آتا تھا لیکن وہ مایوس نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی "قربت" پانے کے بعد احسن دھیرے دھیرے نارمل ہو ہی جائے گا۔ ابھی تو وہ طے شدہ پروگرام کے تحت صرف دوست ہی بنے ہوئے تھے۔ باقاعدہ شادی کے بعد ہی ان دونوں میں میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوتا۔

احسن نے پھر نظریں جھکا لیں۔

شیبا بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ اب دو تین روز میں ہی ہماری شادی ہو جائے۔ ڈیڈی کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"ہماری شادی تو ہو چکی ہے شیبا!" احسن نے آہستہ سے کہا۔

"سول میرج۔" شیبا بولی۔ "اور طے یہ پایا تھا کہ ہماری باقاعدہ شادی بھی ہوگی۔ سول میرج کی بات تو ہم کسی کو بتائیں گے ہی نہیں۔"

"ہوں۔"

"تو تم تیار ہو نا!"

"ایک رسم۔" احسن بولا۔ "ٹھیک ہے، تمہاری خاطر یہ بھی سہی..... تم نے ٹھیک کہا تھا شیبا کہ اب میری زندگی صرف میری نہیں رہی۔ تمہارا بھی حق ہو چکا ہے اس پر! یقین کرو شیبا! اگر ان حالات میں تم نہ ہوتیں تو شاید میں پاگل ہو جاتا، یا شاید خودکشی کر لیتا۔ تم سے پہلے میرا سب کچھ میرے والدین ہی تھے۔"

"والدین کے علاوہ تو کوئی خلش نہیں ہے تمہارے دل میں؟"

"اور کیا ہوگی؟"

"ساحرہ۔" شیبا نے اسے غور سے دیکھا۔

احسن نے اس کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے سر ہلایا۔

"ہاں۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ "ایک خلش وہ بھی ہے تو

سہی! لیکن وہ خلش..... میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہمیشہ نہیں رہے گی۔ یہ تو تم بھی کہہ چکی ہو اور میں بھی سوچتا رہا ہوں کہ ساحرہ سے شادی کا نتیجہ میرے لیے بہت کرب ناک ہوتا۔ میں بھول جاؤں گا اسے!''

شیبا سنبھل گئی۔ وہ خوش ہوگئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ابھی تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں کہیں بھی لے جاؤں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا تمہارے لیے۔''

''ہاں۔'' احسن نے کہا۔ ''کسی جگہ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں کسی محل میں بھی رہوں تو بس ایک کمرا ہی تو ہوگا میرے لیے سب کچھ۔''

''تو پھر۔'' شیبا نے ہمت کر کے کہا۔ ''شادی کے بعد تم میرے ساتھ میرے گھر میں رہو گے۔''

''تمہارا گھر؟'' پہلی مرتبہ احسن کا لہجہ سپاٹ نہیں تھا اور اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات بھی نظر آئے تھے۔

''ہاں، میرا گھر۔'' شیبا کے دل کی دھڑکن تیز تھی۔ ''جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ میرے ماں باپ کا گھر۔''

''گویا..... گھر داماد!''

''تم وہاں رہ کر ایسی کوئی بات محسوس نہیں کرو گے۔'' شیبا نے جلدی سے کہا۔ ''ابھی بات ہو چکی ہے نا! تم تو بس ایک کمرے میں رہو گے۔ میرے علاوہ تمہیں کسی سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''احسن!'' شیبا کے منہ سے نکلا۔ وہ اتنی خوش ہوئی تھی کہ بے اختیار ہو کر اٹھی اور احسن سے لپٹ گئی لیکن پھر دوسرے ہی لمحے چونکی اور احسن سے الگ ہوگئی۔ اسے یہ عہد یاد آ گیا تھا کہ فی الحال وہ صرف دوست رہیں گے۔ ان میں کسی قسم کی قربت نہیں رہے گی۔

شیبا کی اس حرکت کے باوجود احسن کا چہرہ بے تاثر رہا۔

احسن کو دوپہر کا کھانا کھلانے کے بعد شیبا نے کہا۔ ''شادی کے بعد تمہیں ایک ایسی بات معلوم ہوگی احسن جو میں نے تمہیں اب تک نہیں بتائی۔ کیا میں امید کروں کہ وہ بات معلوم ہونے پر تمہیں مجھ پر غصہ نہیں آئے گا؟''

''ایسی کیا بات ہے؟''

''ابھی نہیں بتانا چاہتی۔''

''اچھا۔'' احسن اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

ان دنوں اس کی حالت ایسی ہی تھی۔ نہ کسی معاملے میں متجسس ہوتا تھا، نہ کسی معاملے میں سوچ بچار کرتا تھا۔ اسی لیے اس نے سوچے سمجھے بغیر شیبا کے گھر میں رہنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

''وعدہ کر رہے ہو نا؟'' شیبا نے پوچھا۔

''کس بات کا؟''

''بعد میں تم مجھ پر غصہ نہیں کرو گے۔''

''ٹھیک ہے، نہیں کروں گا۔ جو چاہو، وہ کرو شیبا!..... ہاں شیبا!..... اب مجھے صرف تمہارے لیے ہی تو زندہ رہنا ہے۔''

شیبا کے سر سے بوجھ اتر گیا۔ شادی کے بعد احسن کو معلوم ہوتا کہ آغا نصیر کی چوتھی بیوی ساحرہ تھی تو وہ یقیناً چونک جاتا لیکن شیبا نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ چراغ پا نہیں ہوگا۔ اس پر غصہ نہیں کرے گا۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں'' شیبا بولی۔ ''تیسرے پہر کو آؤں گی۔''

شیبا کو اتنی آزادی حاصل تھی کہ گھر سے اس کی عدم موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا تھا۔

جب وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو بہت خوش تھی۔ وہ تو احسن کو اپنے گھر میں لانے کے لیے تدبیریں سوچتی رہی تھی لیکن معاملہ کسی خاص تدبیر پر عمل کرنے کے بجائے بڑی آسانی سے طے پا گیا تھا جس کی وجہ شیبا نے سمجھ لی تھی۔ احسن ان دنوں بالکل خالی الذہن رہنے لگا تھا۔ گھر پہنچ کر وہ فوراً ساحرہ سے ملی۔

''آ گئیں احسن سے مل کر؟'' ساحرہ مسکرائی۔

''ہاں۔'' شیبا نے خوشی سے کہا۔ ''میں نے اسے تیار کر لیا ہے۔ وہ شادی کے بعد یہیں رہے گا۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا جانی! اب میں تمہارے ڈیڈی کو بتا دوں گی کہ احسن نے ان کی شرط مان لی ہے۔''

''لیکن ایک مشکل اب بھی باقی ہے ساحرہ!''

''وہ کیا؟''

''شادی کے موقع پر اگر اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا اور یہ بھی جان لیا کہ تم یہاں کس حیثیت سے ہو تو اس کا ردعمل نہ جانے کیا ہو!''

''اس کی فکر نہ کرو، میں کوئی ایسی تدبیر سوچ لوں گی کہ شادی سے پہلے اس کے سامنے نہ آؤں۔ بس اب تم شادیانے بجاؤ خوشی کے۔''

شیبا کو خوب اندازہ تھا کہ ساحرہ کے دل میں کیا تھا لیکن وہ مطمئن تھی، اس کا خیال تھا کہ احسن یہاں رہے گا تو وہ اس کی حفاظت آسانی سے کر سکے گی اور اسے ساحرہ سے بچا

کر رکھنے میں کامیاب رہے گی۔ اگر اس کے برخلاف ہوتا تو اس کے خیال میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ احسن ساری زندگی تو اس طرح خالی الذہن نہیں رہتا۔ ماں باپ کا صدمہ دھیرے دھیرے سہی لیکن کم ہوتا رہے گا اور کم ہوتا رہے گا تو ختم بھی ہو جائے گا۔ وہ اس کی نظروں سے دور رہتا اور اس دوری سے ساحرہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتی تھی۔ اس کے برخلاف ایک گھر میں رہنے کے باعث شیبا کے لیے احسن کا خیال رکھنا آسان ہوتا۔ کم از کم وہ یہی سمجھ رہی تھی۔

دوسری طرف ساحرہ بھی بہت خوش تھی اور اب اسے احسن کا قرب حاصل کرنے کی کوششوں کے زیادہ مواقع مل سکتے تھے۔

اسی دن عشرت اعوان نے آغا نصیر کی ہدایت پر شیبا اور احسن کی شادی کی تیاریاں شروع کروا دیں۔

انسان دولت مند ہو تو بیشتر کام مہینوں کے بجائے ہفتوں میں اور ہفتوں کے کام دنوں میں ہو جاتے ہیں۔ اس شادی کی مکمل تیاری میں بھی تین دن سے زیادہ نہیں لگے اور چوتھے دن شادی کی تقریب میں حصہ لینے کے لیے آغا نصیر کے مہمانوں کا ہجوم ہوگیا۔

احسن دلہا کی حیثیت سے وہاں موجود تھا لیکن ایسی ذہنی کیفیت میں جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کہاں ہے۔ اسی لیے وہ یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکا کہ آغا نصیر اس دوران میں افراتفری کا شکار کیوں تھا۔ وہ نکاح تک اور نکاح کے بعد کھانے کے خاتمے تک گھر کے بھی کئی چکر لگا چکا تھا۔ جب وہاں موجود ہوتا تو بھی بار بار موبائل پر کسی نہ کسی سے بات کرتا رہتا تھا۔

صرف شیبا ہی جانتی تھی کہ تقریب میں شریک نہ ہونے کے لیے ساجرہ نے پیٹ کی شدید تکلیف کا بہانہ بنایا تھا۔ آغا نصیر کی وجہ سے کئی ڈاکٹر آغا نصیر کے گھر پہنچتے رہے۔ تکلیف کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ابتدا ہی میں کسی ڈاکٹر نے رائے دی تھی کہ ساحرہ کو کسی اسپتال لے جایا جائے جہاں پیٹ کی تکالیف سے متعلق تمام ٹیسٹ کیے جا سکتے تھے لیکن ساحرہ نے ضد کا مظاہرہ کیا تھا کہ وہ اسپتال نہیں جائے گی چنانچہ ڈاکٹرز آپس کے مشورے سے مختلف دوائیں آزماتے رہے۔ آخر ساحرہ نے تکلیف بتدریج کم ہونے کا اظہار اس وقت شروع کیا جب تقریب ختم ہونے میں ایک گھنٹہ رہ گیا تھا اور وہ اس وقت خود کو بالکل ٹھیک ظاہر کرنے لگی جب شیبا اور احسن کمرے میں جا چکے تھے۔

اگرچہ شادی کے بعد وہ پہلی رات تھی لیکن سول میرج ہوئے اتنے دن گزر چکے تھے کہ شیبا پہلی رات کی دلہن کی طرح شرمائی ہوئی نہیں تھی۔ ''بہت تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو۔'' اس نے احسن سے کہا۔ ''کچھ دیر آرام کر لو۔''

احسن پہلے ہی بستر پر لیٹ چکا تھا۔ شیبا اس کے برابر میں لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں ماضی کے واقعات کسی کتاب کے اوراق کی طرح پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ جب اس نے کالج میں احسن کو دیکھا تھا، پھر اس کا اور ساحرہ کا تعلق سمجھنے کے بعد اس نے خود کو ان دونوں کے درمیان آنے سے روک لیا تھا۔ اس وقت وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب وہ بیوی کی حیثیت سے احسن کے برابر میں لیٹی ہوگی۔

لیکن برابر لیٹنے کا یہ دورانیہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ شیبا نے تو سوچا تھا کہ احسن بس آدھے پون گھنٹے آرام کر لے گا لیکن دو گھنٹے گزر گئے۔ احسن اگرچہ اب بھی جاگ رہا تھا لیکن کبھی کروٹ لے لیتا تھا کبھی چت لیٹ کر چھت کو تکنے لگتا تھا۔

اب شیبا کو جھنجلاہٹ سی ہونے لگی۔ بستر سے اٹھ کر اس نے اپنے زیورات اتار کر رکھے اور جو کپڑے وہ دلہن کی حیثیت سے پہنے رہی تھی، وہ اتار کر اس نے ایک باریک نائٹی پہن لی تھی۔ وہ پہن کر اس کے جسم کا ہر عضو بڑی حد تک نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اب جو احسن نے اسے دیکھا تو چند لمحوں کے لیے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر نظریں ہٹائیں لیکن دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔

شیبا دبی دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے پہلو میں اس سے لپٹ کر لیٹ گئی۔

یہ سنسنی خیز قرب احسن کو زیادہ دیر تک خالی الذہن نہیں رکھ سکا۔ دھیرے دھیرے احساسات کی بے داری شروع ہوئی اور جب احساسات پوری طرح بیدار ہو گئے تو وہ بھونچال بھی آیا جو شادی کی پہلی رات کا خاصہ ہوتا ہے۔

♥♥♥

اس رات شیبا نہ تو خود سوئی تھی، نہ اس نے احسن کو سونے دیا تھا۔

''ڈیڈی نے کہا تھا کہ ناشتا ہم دونوں ان کے ساتھ ہی کریں۔'' شیبا نے احسن سے کہا۔ ''وہ آٹھ بجے ناشتے کی میز پر ہوتے ہیں۔ ہمیں اب تیار ہو جانا چاہیے۔''

''ہوں۔'' احسن خفیف سا مسکرایا۔

شیبا خوش ہوگئی۔ گزشتہ دنوں میں اس نے احسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق بھی نہیں دیکھی تھی۔ گزری ہوئی رات نے احسن کے دل و دماغ پر یقیناً کچھ مثبت اثرات

مرتب کیے تھے۔

لیکن اب کمرے سے نکل کر ڈائننگ روم کی طرف جاتے وقت شیبا پر یہ ہول سوار ہوا کہ ڈائننگ روم میں آغا نصیر کے ساتھ ساحرہ بھی ہوگی۔

"احسن؟" وہ دھیرے سے بولی۔

"ہوں۔" احسن نے اس کی طرف دیکھا۔

شیبا تذبذب کا شکار تھی۔

"بولو شیبا! کیا کہنا چاہتی ہو؟" احسن نے پوچھا۔ اس کا یہ سوال بھی اس کی واضح ذہنی تبدیلی کی طرف اشارہ تھا، ورنہ تو شیبا اگر اپنی کوئی بات ادھوری چھوڑ دیتی تو وہ بھی خاموش ہوجاتا تھا، کبھی استفسار نہیں کرتا تھا۔

ڈائننگ روم قریب آتا جارہا تھا۔ شیبا جلدی سے بولی۔ "شادی سے پہلے، میں نے تم سے کہا تھا نا کہ..... ایک بات..... شادی کے بعد بتاؤں گی۔"

"مجھے یاد ہے۔" احسن نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم نے مجھ سے وعدہ بھی لیا تھا کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا، تم پر غصہ بھی نہیں کروں گا۔"

"وہی بات..... میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں اب۔" شیبا کی سانسیں ناہموار ہوگئی تھیں۔

"تو بتاؤ!"

"وہ..... وہ میں نے تمہیں ڈیڈی کی..... چوتھی شادی کے بارے میں بتایا تھا نا؟" شیبا رک رک کر بول رہی تھی۔ جملے اس کے حلق میں اٹکنے لگے تھے۔

"ہاں ہاں بتایا تھا!..... پھر.....؟"

"وہ شادی....."

"ہوں....."

"ڈیڈی کی وہ شادی....."

"گھبرا کیوں رہی ہو شیبا!" احسن نے کہا۔ "بتا بھی چکو۔"

ڈائننگ روم کا دروازہ اب دو قدم کے فاصلے پر تھا۔

شیبا نے جلدی سے کہا۔ "ساحرہ سے ہوئی تھی۔"

"کیا!" احسن ایک جھٹکے سے رک گیا۔ "تمہارا مطلب ہے..... ساحرہ نے تمہارے ڈیڈی سے شادی کی ہے؟"

اس وقت وہ دونوں ڈائننگ روم کے دروازے پر رکے ہوئے تھے جو بند نہیں تھا۔ پردے کے بجائے اس میں رنگارنگ موتیوں کی جھالریں لٹکی ہوئی تھیں۔

"ہاں احسن!" شیبا نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ڈائننگ روم میں وہ بھی ہوگی۔"

"یہ..... یہ..... یہ تم نے....."

احسن اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ اندر سے آغا نصیر کی آواز آئی۔ "وہاں کیوں رک گئے تم دونوں.....؟ آؤ نا!"

"آؤ۔" شیبا نے احسن کا ہاتھ پکڑ کر اندر قدم رکھا۔

احسن کی اس وقت عجیب کیفیت ہوگئی تھی۔ اس کی ٹانگیں سنسنانے لگی تھیں۔

"آؤ بیٹے!" آغا نصیر نے اس سے کہا۔ "تم میرے برابر میں آکر بیٹھو! شیبا ساحرہ کے برابر والی کرسی پر بیٹھ جائے گی۔"

آغا نصیر ڈائننگ ٹیبل کے سرے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں جانب ساحرہ بیٹھی تھی۔ احسن اسی کرسی پر بیٹھا جس کی طرف آغا نصیر نے اشارہ کیا تھا۔ اس طرح احسن اور ساحرہ بالکل آمنے سامنے ہوگئے۔ ساحرہ کے برابر میں شیبا بیٹھی۔ وہ کچھ پریشان نظروں سے احسن کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے چہرے کی کیفیت اس وقت ایسی تھی جیسے بار بار رنگ بدل رہا ہو۔

"کیسے ہو احسن!" ساحرہ نے چہکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ آغا نصیر کو بتا چکی تھی کہ وہ اور شیبا اسی کالج میں پڑھا کرتے تھے جہاں احسن زیر تعلیم رہا تھا۔

احسن کے ہونٹ ہلے لیکن وہ ساحرہ کو جواب نہیں دے سکا۔ الفاظ اس کے حلق میں ہی اٹک گئے تھے۔

ساحرہ پھر بولی۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم دونوں کی شادی میں شریک نہیں ہوسکی۔ کل رات میرے پیٹ میں جانے کیوں بڑی شدید تکلیف ہوگئی تھی۔ آدھی رات کے بعد ٹھیک ہوئی ہوں۔ اس کے بعد بھی بہت دیر تک نڈھال پڑی رہی۔ یہ تو جانتے ہیں۔" اس کا اشارہ آغا نصیر کی طرف تھا۔

"ہاں احسن میاں!" آغا نصیر نے کہا۔ "بہت بری حالت ہوگئی تھی ان کی۔ خیر، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ ناشتا شروع کرو۔"

احسن جیسے تیسے ناشتا کرسکا۔ شیبا اس کی حالت کا جائزہ لیتی رہی۔ اس دوران میں ساحرہ چہکتی رہی۔ اس نے کالج کے زمانے کی باتیں چھیڑ دی تھیں۔ بیچ میں ایک جگہ اسے روک کر آغا نصیر نے احسن سے کہا کہ وہ اسے اپنی ایک شوگر مل کا منیجر بنادے گا۔ جواب میں احسن نے کہا تھا کہ اس میں اس قسم کی ذمے داری سنبھالنے کی اہلیت نہیں۔

"دو تین ماہ کی ٹریننگ سے سب ٹھیک ہوجائے گا۔" آغا نصیر نے کہا۔

"ڈیڈی!" شیبا بولی۔ "منیجر کا کوئی سیکریٹری بھی ہوتا ہوگا!"

"اسٹینو ہوتا ہے۔"

"سیکریٹری کی جگہ نکالی تو جاسکتی ہے۔ آپ مجھے احسن کی سیکریٹری بنادیجیے گا۔"

اس وقت ساحرہ نے معنی خیز نظروں سے شیبا کی طرف دیکھا۔

شیبا بولتی رہی۔ "اس طرح میں گھر میں اکیلی پڑی بور ہونے سے بچ جاؤں گی۔"

"اچھا!" آغا نصیر ہنسا۔ "اگر تم چاہتی ہو تو ایسا ہی سہی۔"

کیونکہ ساحرہ نے اسے بتایا تھا کہ شیبا کو احسن سے بے پناہ محبت ہے اس لیے اس نے یہی سوچا ہوگا کہ شیبا محبت ہی کی وجہ سے ہر وقت احسن کے قریب رہنا چاہتی ہے۔

ناشتا کرچکنے کے بعد شیبا احسن کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹی تو وہ کسی قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ احسن کا ردعمل جانے کیا ہو!

کمرے میں داخل ہوکر احسن ٹہلنے لگا۔ شیبا نے بستر کے قریب جاکر سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ایک رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ وہ اس وقت چور سی بن گئی تھی۔

"یہ بات ایسی نہ تھی شیبا جو تم مجھے پہلے نہ بتاسکیں۔" احسن بولا۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا احسن!" شیبا نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ "تم مجھ پر ناراض نہیں ہوگے، تمہیں مجھ پر غصہ نہیں آئے گا۔"

"میں ناراض کب ہورہا ہوں شیبا!" احسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "نہ میں نے غصے کا اظہار کیا ہے۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ بات تم مجھے پہلے کیوں نہیں بتاسکتی تھیں؟"

"میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی احسن!" شیبا کی آواز بھرا گئی۔ "پہلے تو ایک مرتبہ میں خود ہی تم سے دور ہوگئی تھی، اب دوبارہ تم سے دور ہوجاتی تو شاید خود کو سنبھال نہیں پاتی۔"

"یہ بتادیتیں تو مجھ سے دور کیسے ہوجاتیں؟ ہم سول میرج تو کرہی چکے تھے۔"

"لیکن تم شاید اس گھر میں رہنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جہاں ساحرہ ہو۔"

احسن فوراً کچھ نہیں بولا، ٹہلتا رہا۔ اس کے انداز سے پریشانی ظاہر ہورہی تھی۔ شیبا سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"یہ تو تم غالباً ٹھیک کہہ رہی ہو۔" احسن قدرے توقف سے بولا۔ "یہ جاننے کے بعد اس گھر میں آنا....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر نفی میں سر ہلایا، اس کے بعد پھر کچھ رک کر بولا۔ "لیکن تم یہ کیوں چاہتی تھیں شیبا کہ میں یہاں آکر رہوں؟"

"صرف اس لیے احسن کہ میں تمہیں ساحرہ سے بچانا چاہتی ہوں۔"

"ساحرہ کے قریب لاکر؟"

"اپنے قریب رکھ کر۔" شیبا نے جواب دیا۔ "اب تم ہر وقت میری نظر میں رہو گے، جبکہ یہاں نہ رہتے تو....." پھر اس نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو اس نے سوچا تھا۔

احسن خاموش رہا۔

شیبا کچھ رک کر پھر بولی۔ "کیا میری یہ سوچ غلط ہے؟"

"یہ تو میں ابھی نہیں کہہ سکتا شیبا!" احسن نے کہا۔ "یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ تم نے صحیح سوچا تھا یا غلط، لیکن اس بات سے یہ ضرور اندازہ ہوا ہے کہ تم مجھ سے شدید محبت کرتی ہو۔" وہ شیبا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

شیبا نے اطمینان کی سانس لی اور اٹھ کر احسن کے قریب آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ احسن کی گردن میں ڈال دیے اور اس کے سینے سے لگ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم میری روح بن چکے ہو اب، اور روح کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔"

احسن نے محبت سے اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اپنی زندگی کی ایک اہم رات گزارنے کے بعد اس کی خالی الذہنی کی کیفیت بالکل ختم ہوچکی تھی۔ وہ معمول کے مطابق نظر آنے لگا تھا۔ یکایک اس نے شیبا کو گود میں اٹھایا اور اسے لے جاکر بستر پر ڈال دیا۔ پھر بستر پر بیٹھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "اور تم میری زندگی بن چکی ہو۔ زندگی..... جس کے بغیر روح آدھی ہوجاتی ہے، لیکن میری یہ فکرمندی اپنی جگہ ہے شیبا کہ ساحرہ کی موجودگی میں ہم سکون سے زندگی گزار سکیں گے؟"

"بالکل گزار سکیں گے۔" شیبا نے مسکرا کر کہا۔ "ساحرہ کے خیالات کچھ بھی ہوں، میں جانتی ہوں کہ تم اس کے سامنے پگھل نہیں سکتے اور میں جو ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گی۔ ساحرہ کو ایسا موقع ہی نہیں مل سکے گا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق کوشش بھی کرسکے۔ گھر میں تو میں تمہارے ساتھ رہوں گی ہی، لیکن جب تم شوگر مل کے منیجر بن جاؤ گے تو

میں تمہاری سیکریٹری کی حیثیت سے وہاں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تمہیں ڈیڈی کی پیشکش منظور ہے نا؟"

"منظور تو کرنا ہی پڑے گی۔" احسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس گھر میں آتو گیا ہوں لیکن میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ میرا اور میری بیوی کے اخراجات کا بوجھ تمہارے ڈیڈی ہی اٹھاتے رہیں۔"

"میں خوش ہوں گی تمہارے جواب سے۔"

"لیکن مجھے منیجر بننے سے پہلے کچھ عرصے تربیت بھی تو حاصل کرنا ہے۔ اس وقت تو تم میرے ساتھ نہیں رہو گی۔"

"کیوں نہیں رہوں گی۔" شیبا مسکرائی۔ "مجھے بھی تو تربیت حاصل کرنا پڑے گی کہ سیکریٹری کی ذمے داریاں کیا ہوتی ہیں۔"

احسن ہنس پڑا۔ "تم نے سب کچھ سوچ لیا ہے لیکن مجھ پر تمہاری یہ پہرے داری ساحرہ کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کرسکتی ہے۔"

"اس کی جھنجلاہٹ سے ہماری صحت پر کیا اثر پڑسکتا ہے؟"

"تم دونوں اب تک دوست بنی رہی ہو لیکن پھر شاید ایسا نہ رہ سکے۔ وہ تمہیں اپنا رقیب محسوس کرنے لگے گی۔"

"میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ تم کسی اور لڑکی کے نہیں، اس کی دوست کے شوہر بنے ہو اس لیے اسے اب تمہارے بارے میں سوچنا چھوڑ دینا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ وہ بات سمجھ لے گی۔"

لیکن شیبا کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ کچھ دن بعد وہ دونوں تربیت کے لیے ساتھ ساتھ جانے لگے اور گھر میں بھی شیبا ہر پل احسن کے ساتھ رہنے لگی تو ساحرہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھنا شروع کردیا۔ اس کی یہ تبدیلی شیبا نے بھی محسوس کرلی اور احسن نے بھی۔

"سگنل اچھا نہیں مل رہا ہے شیبا!" ایک روز احسن نے کہا۔

شیبا اس کا مطلب سمجھ گئی اور بولی۔ "دیکھا جائے گا۔"

ان دونوں میں جس دن یہ بات ہوئی تھی، اسی رات کو شیبا نے کمرے میں اپنے موبائل پر ساحرہ کی کال ریسیو کی۔

"میں اپنے کمرے میں ہوں شیبا!" وہ کہہ رہی تھی۔ "کیا تم ذرا دیر کے لیے میرے پاس آؤ گی؟"

"آتی ہوں۔" شیبا نے آہستہ سے کہا۔

احسن اس کے اتنے قریب تھا کہ اس نے ساحرہ کی آواز سن لی تھی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔

"کیوں بلا رہی ہے وہ تمہیں!" وہ بولا۔ اس کے لہجے میں بڑی سنجیدگی تھی۔

شیبا نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھتے ہوئے بولی۔ "دیکھتی ہوں، کیا کہتی ہے وہ!"

اپنے کمرے سے نکل کر شیبا ساحرہ کے کمرے میں پہنچی اور جاتے ہی مسکراتے ہوئے بولی۔ "کوئی خاص بات ہے کیا ساحرہ، اور....." اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "ڈیڈی نہیں ہیں؟"

"وہ کسی کاروباری میٹنگ میں گئے ہیں۔" ساحرہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ "اور تم سے مجھے کسی تمہید کے بغیر ایک سوال کرنا ہے۔"

"کرو۔" شیبا مسکراتی رہی۔ اگرچہ اسے کچھ کھٹکا ہوگیا تھا لیکن وہ اس نے اپنی مسکراہٹ میں چھپالیا۔

ساحرہ بولی۔ "تم احسن کی بیوی بنی ہو یا اس کی پہرے دار؟"

"میں اس سے محبت کرتی ہوں ساحرہ!" شیبا نے کہا۔ "اور تم خوب جانتی ہو کہ میری محبت سطحی نہیں! میرا دل چاہتا ہے کہ ایک پل کے لیے بھی احسن سے دور نہ رہوں۔"

"تمہاری محبت قطعی خود غرضانہ ہے۔" ساحرہ نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم جانتی ہو کہ میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ تم مجھے اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع تک نہیں دینا چاہتی ہو۔ یہ خود غرضانہ محبت نہیں تو اور کیا ہے۔ تمہیں ذرا بھی خیال نہیں کہ مجھے بھی اس سے محبت ہے۔"

"لیکن اب تم ڈیڈی سے شادی کرچکی ہو۔" شیبا اب سنجیدہ ہوگئی تھی۔

"شادی اور محبت، دو الگ الگ باتیں ہیں۔" ساحرہ بولی۔ "کیا میں نے یہ بات تم سے پہلے نہیں کہی؟"

"کہی تھی۔" شیبا ٹہلتے ہوئے کھڑکی تک چلی گئی اور ساحرہ کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ "لیکن..... اگر احسن کی شادی کسی اور لڑکی سے ہوتی تو تم کچھ بھی کرتیں، میں اس میں دخل اندازی نہیں کرتی۔ اب تمہیں سوچنا چاہیے کہ وہ کسی اور کا نہیں، تمہاری دوست کا شوہر ہے۔"

"دوستوں کی ہر چیز ایک دوسرے کی ہوتی ہے، مشترک ہوتی ہے۔"

شیبا تیزی سے اس کی طرف گھومی۔ "شوہر کبھی مشترک نہیں ہوتے۔"

"تم میرے خیالات سے واقف تھیں شیبا!..... اگر تم میرے خیالات کی مخالف تھیں یا ہو، تو تمہیں احسن سے شادی

شکرانہ

مہمان نے میزبان کے بچے سے پوچھا: "بیٹے، کیا تم رات کو سونے سے پہلے خدا کا شکر ادا کرتے ہو۔"

بچے نے جواب دیا: "میں تو نہیں البتہ میری امی ضرور شکر ادا کرتی ہیں۔"

مہمان نے کہا: "کیا کہتی ہیں؟"

بچہ بولا: "خدا کا شکر ادا کرتی ہیں کہ میں سو گیا ہوں"

نہیں کرنا چاہیے تھی اور اب شادی کرلی ہے تو اسے اپنی جاگیر نہ سمجھو۔"

"اگر تمہارے یہ خیالات ڈیڈی کو معلوم ہوجائیں تو؟" شیبا کے لہجے میں تلخی آگئی۔

ساحرہ چند لمحے اسے گھورتی رہی، پھر اس نے کہا۔ "میں خوب جانتی ہوں کہ اس سوسائٹی میں کیا ہوتا ہے جہاں میں ایک الٹرا ماڈرن شخص کی بیوی ہوں۔ اس سوسائٹی کے مرد اپنی بیویوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے بھی تعلقات رکھتے ہیں۔ مرد ہی نہیں، عورتیں بھی رکھتی ہیں۔ بس معاشرتی جبر کی وجہ سے مردوں کو ذرا کم لیکن عورتوں کو یہ سب کچھ بہت زیادہ چھپ کے کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کبھی کبھی یہ بات میاں بیوی پر کھل بھی جاتی ہے لیکن وہ ایک دوسرے کی ان باتوں کو اس طرح نظر انداز کردیتے ہیں جیسے انہیں کچھ معلوم ہی نہ ہوا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہی میرے اور آغا صاحب کے معاملے میں بھی ہوسکتا ہے لیکن تم سے مجھے یہ توقع نہیں کہ تم انہیں میرے خیالات سے آگاہ کرو گی۔ تم میری بہت اچھی دوست ہو۔"

شیبا نے یہ تقریر بڑے تحمل سے سنی ورنہ دو ایک مواقع پر اس کا جی چاہا تھا کہ کچھ بول پڑے۔

"میں یقیناً ڈیڈی سے کچھ نہیں کہوں گی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "یہ ان کا معاملہ ہے، وہی جانیں..... شاید ہر ایک کو اپنے طرز کی زندگی گزارنے کا حق ہے لیکن اسے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کون سا طرزِ زندگی اس معاشرے کی تباہی کا سبب نہیں بنے گا۔"

"انسان کے فطری اعمال معاشرے کو تباہ نہیں کرتے۔"

"ضروری نہیں کہ میں تمہارے اس خیال سے بھی اتفاق کروں۔ میں بس یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرا شمار تم اس سوسائٹی کی ان بعض عورتوں میں نہ کرو جنہیں اس معاشرے کی تباہی کا خیال نہیں ہوتا۔"

"تو تم۔" ساحرہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "احسن کو اپنی ملکیت بنائے رکھنا چاہتی ہو؟"

"بنانا کیا مطلب! وہ میری ملکیت ہے۔" شیبا نے زور دے کر کہا۔ "اور میں اس کی ملکیت ہوں۔"

ساحرہ تلخی سے ہنسی۔ "میں نہیں جانتی کہ تم اس کی ملکیت رہ سکو گی یا نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ وہ تمہاری ملکیت نہیں رہ سکے گا۔ جب اس نے مجھ سے گریز کیا، اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ عورت کا قرب کیا ہوتا ہے لیکن اب..... تم سے شادی کرکے اس نے جان لیا ہوگا کہ یہ پیٹ کی بھوک سے زیادہ طاقتور خواہش ہے اور اس معاملے میں تنوع پسندی تو ہوتی ہی ہے۔"

"میں احسن کو ایسا نہیں سمجھتی۔"

"تو اس کی پہرے دار، اس کی محافظ کیوں بنی ہوئی ہو؟"

"میں نہیں چاہتی کہ تم اس کی پریشانی کا سبب بنو۔"

"اب وہ عورت کے قرب کا مزہ چکھ چکا ہے اور میں نے کہا نا کہ اس معاملے میں تنوع پسندی بھی ایک فطری بات ہے۔ اب احسن کسی وقت بھی میری طلب محسوس کرکے سرنگوں ہوسکتا ہے اور ایسا ضرور ہوگا شیبا، تم لاکھ اس کی پہرے دار بنی رہو۔"

"آئندہ مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کرنا۔" شیبا نے مشتعل لہجے میں کہا اور تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے اپنے عقب میں ساحرہ کی طنزیہ ہنسی سنی لیکن پلٹ کر نہیں دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔

احسن بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کررہا تھا۔

"کیا بات تھی؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"پاگل ہوگئی ہے۔" شیبا نے غصے سے کہا اور بستر کے قریب جاکر جھٹکے سے بیٹھ گئی۔

"پاگل وہ کب نہیں تھی۔" احسن نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "خیر! بتاؤ تو سہی! کیا کہہ رہی تھی؟"

"اپنے نظریات کا پرچار کررہی تھی۔" شیبا نے تلخی سے کہا۔ "ایک دوست کی حیثیت سے اس نے مجھ سے یہ باتیں کی تھیں تو میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا تھا لیکن تمہاری بیوی کی حیثیت سے میں وہ باتیں برداشت نہیں کرسکتی۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی!"

کسی بھی گفتگو کو جملوں یا الفاظ کے ساتھ یاد نہیں رکھا جاسکتا۔ شیبا کو بھی یاد نہیں تھا۔ اس نے گفتگو کا لب لباب بتادیا

جو ساحرہ سے ہوئی تھی۔

احسن نے سب کچھ سن کر سر جھکا لیا۔ وہ اس دوران میں بستر کے قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

شیبا بھی خاموش ہو جانے کے بعد کچھ سوچنے لگی۔ اس کے دماغ میں ساحرہ کی یہ بات بگولے کی طرح چکرا رہی تھی کہ احسن نے جب اس سے گریز کیا تھا، اس وقت وہ عورت کے قرب سے ناآشنا تھا لیکن اب شادی کے بعد وہ اس خواہش کا طالع ہوگا جو پیٹ کی بھوک سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے اور اس معاملے میں تنوع پسندی ایک فطری بات ہے۔

ان خیالات کی گونج میں اس نے احسن کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، احسن ایسا نہیں ہوگا۔

احسن اب بھی نظریں جھکائے ہوئے تھا۔

''کچھ سوچ رہے ہو؟'' شیبا بولی۔

''ہاں۔'' احسن نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مناسب یہی ہوگا شیبا کہ ہم اس گھر میں نہ رہیں۔ کیوں یہاں کی فضا میں تناؤ پیدا کیا جائے۔ ساحرہ اب کھل کر سامنے آگئی ہے۔''

''تو میں بھی اب کھل کر اس کا سامنا کروں گی۔'' شیبا کے لہجے میں ضد تھی۔ ''اب میں بھول جاؤں گی کہ وہ میری دوست تھی۔ مجھے خود پر بھی اعتماد ہے اور تم پر بھی...... ! یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کسی کے حق پر ڈاکا ڈالنا چاہے اور ڈاکے کے خواہش مند کو دوست سمجھا جائے۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ اسے سمجھاؤ گی۔''

''اس نے اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔''

احسن چپ ہو گیا۔

♥ ♥ ♥

شادی کو آٹھ دن گزر چکے تھے۔ اس دوران میں گھر کا ماحول پرسکون رہا تھا لیکن اس کے بعد تناؤ کی فضا کم از کم احسن نے محسوس کر لی۔ پہلے تو وہ سب ٹی وی لاؤنج میں یا لان میں ٹہلتے ہوئے بھی گپ شپ کیا کرتے تھے۔ ان اوقات میں کبھی آغا نصیر نہیں بھی ہوتا تھا لیکن اس دن کے بعد صورت حال بدل گئی۔ ان کا آمنا سامنا صرف ناشتے یا کھانے کی میز پر ہی ہونے لگا۔ اگر شیبا کھانے پینے کا اہتمام اپنے کمرے ہی میں کرنے لگتی تو یہ آغا نصیر کو چونکانے والی بات ہوتی اس لیے مجبوراً ڈائننگ ٹیبل پر تو یک جا ہونا ہی پڑتا تھا۔

ساحرہ کے رویے میں اس کے بعد بھی کوئی ظاہری تبدیلی نہیں آئی۔ وہ بدستور ہنس ہنس کر اسی طرح باتیں کیا کرتی جیسے پہلے کرتی تھی لیکن شیبا سنجیدہ ہی رہنے لگی تھی۔

احسن ضرور کوشش کرتا تھا کہ اس کے انداز میں ایسی تبدیلی نہ آئے جو آغا نصیر کو محسوس ہو اور وہ شیبا کو بھی سمجھاتا تھا کہ وہ اپنا رویہ معمول کے مطابق رکھے لیکن شیبا نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ خود پر مصنوعی خول نہیں چڑھا سکتی۔

ساحرہ کا سارا وقت سیر سپاٹے، شاپنگ اور بیوٹی پارلر میں گزرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے والدین سے ملنے بھی چلی جاتی تھی۔ گھر کے معاملات سے اس نے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا۔ ان سب باتوں کو عشرت اعوان دیکھتی تھی یا شیبا تھوڑا بہت خیال رکھتی تھی۔ کبھی کسی ملازم کے معاملے میں یا کسی اور مسئلے میں کچھ گمبھیرتا آجاتی تھی تو عشرت اعوان وہ بات آغا نصیر تک پہنچا دیتی تھی۔ ایسے مواقع پر آغا نصیر کبھی کبھی شیبا کو بلا کر مشورہ کر لیا کرتا تھا۔ احسن کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا۔ اس صورت میں شیبا اس کے کمرے کا دروازہ مقفل کر کے جایا کرتی تھی تاکہ باہر سے کوئی اور اس کے کمرے میں داخل نہ ہو سکے۔ دوسری چابی وہ احسن کے پاس رہنے دیتی تھی تاکہ وہ خود کو قید میں نہ سمجھے لیکن وہ احسن کو تاکید کر کے جاتی تھی کہ اس کی واپسی تک احسن کمرے سے نہ نکلے تو بہتر ہے۔

یہ صورتِ حال احسن کو ذہنی طور پر بوجھل کرنے لگی تھی لیکن وہ شیبا کو اس پر آمادہ نہیں کر سکا تھا کہ ان دونوں کو اپنے رہنے کے لیے کوئی فلیٹ لے لینا چاہیے۔

ایک رات نہ جانے کیا مسئلہ تھا کہ آغا نصیر نے شیبا کو بلوایا۔ معمول کے مطابق شیبا کمرا مقفل کر کے گئی۔

احسن ایسے مواقع پر زیادہ الجھ جاتا تھا اور اس معاملے پر غور کرنے لگتا تھا۔

شیبا کو گئے ہوئے مشکل سے دو تین منٹ گزرے تھے کہ احسن کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ اسے توقع تھی کہ شاید شیبا ہی نے کسی وجہ سے کال کی ہو لیکن اسکرین پر ساحرہ کا نام چمک رہا تھا۔ احسن نے ابھی تک اس کا نام اور اس کا موبائل نمبر ختم نہیں کیا تھا۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھوں سے ساحرہ کا نام مٹا دے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اب بھی اپنے دل میں ساحرہ کے لیے کوئی نرم گوشہ رکھتا تھا۔

شادی کے بعد اس کے لیے یہ ساحرہ کی پہلی کال تھی۔

احسن نے فوری طور پر کال ریسیو کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک بار وہ بھی ساحرہ کو سمجھانے کی کوشش کرے۔

''ہاں ساحرہ!'' اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے طویل سانس لینے کے ساتھ کہا تھا۔

''شکر ہے تم نے کال ریسیو کی!'' ساحرہ کے لہجے میں چہکار تھی۔ ''خوشی ہے یہ میرے لیے کہ میرا نام اب بھی تمہارے موبائل میں محفوظ ہے۔ یقیناً تمہارے دل میں بھی ہونا چاہیے۔''

''ساحرہ!'' احسن نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں واقعی تمہیں بھول نہیں سکا ہوں، اگرچہ بھلانے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔''

ساحرہ ہنسی۔ ''بھلا بھی نہیں سکو گے۔''

''کہاں سے بول رہی ہو؟''

''یہیں لان میں ہوں۔ شیبا کو آغا صاحب نے بلایا تھا۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہاں سے کھسک آئی۔ یقین تو نہیں تھا کہ تم میری کال ریسیو کرو گے لیکن میں نے ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ احسن! اگر تم اب بھی مجھے نہیں بھلا سکے تو ملاقات کی کوئی سبیل نکالو۔ شیبا سے پیچھا چھڑاؤ کسی وقت۔''

''میں شیبا کو دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ساحرہ! غلطی ہوئی مجھ سے بے اختیار کہ میں تم سے سچ بات کہہ بیٹھا۔ میرا خیال اب اپنے دل سے نکال دو۔''

''تم بھی نہیں نکال سکے ہو مجھے اپنے دل سے۔''

''لیکن میں کوشش کر رہا ہوں۔''

''میں کوشش نہیں کروں گی۔'' ساحرہ پھر ہنسی۔ ''کیوں کروں کوشش! محبت جب کسی سے ہوتی ہے، تو بس ہو جاتی ہے۔''

''لیکن اب تم شادی کر چکی ہو۔''

''پھر وہی بے تکی بات! شادی کا محبت سے کیا تعلق...... ! آغا صاحب نے اگر میرے جسم کی پکار سنی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے ان سے محبت ہو جائے گی۔ محبت مجھے صرف تم سے ہے۔ کاش تم نے ہی میرے جسم کی پکار سن لی ہوتی۔''

ساحرہ کو بے باکانہ باتوں کی طرف آتے دیکھ کر احسن گھبرایا اور جلدی سے بولا۔ ''تمہیں اب ہر وقت آغا صاحب کا خیال رہنا چاہیے۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض بنتے جا رہے ہیں۔ دس بارہ دنوں میں دو مرتبہ ڈاکٹر گھر آچکا ہے۔ ایک مرتبہ وہ چند گھنٹوں کے لیے ہاسپٹلائز بھی ہو چکے ہیں۔''

''بتا رہے تھے وہ مجھے!'' ساحرہ نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ ''مجھ سے شادی کرنے کے بعد ہی انہیں یہ مرض لاحق ہوا ہے۔ میں نے ان کے سامنے تو اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن تم سے کہہ رہی ہوں کہ کسی دن ان کا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا ہے وہ بھی میرے قرب کی وجہ سے۔''

''یہ فضول باتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے تم نے مجھے!'' احسن نے ناگواری سے کہا۔

''نہیں احسن! یہ تو بات سے بات نکلی ہے۔ ویسے سچی بات یہی ہے احسن کہ...... میرا مطلب ہے...... اگرچہ آغا صاحب کی عمر بہت زیادہ نہیں لیکن ساٹھ سال بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ اس عمر میں ہائی بلڈ پریشر ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ میں مانتی ہوں کہ شیبا مجھ سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے مگر امڈتی ہوئی جوانی اس نے نہیں پائی۔''

احسن نے کچھ غصے سے کہا۔ ''تم نے یہ بے ہودہ باتیں اگر میرے جذبات بھڑکانے کے لیے کی ہیں تو یقین کر لو کہ تمہیں ناکامی ہوئی ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' ساحرہ بڑے مزے سے بات کر رہی تھی۔ ''لیکن عملاً یہ صورتِ حال سامنے آئے گی تو تم بے بس ہو جاؤ گے۔''

''میری قوت ارادی بہت مضبوط ہے۔''

''سب دھری رہ جائے گی۔''

''مجھے لگتا ہے کہ شادی کے بعد تم بہت جنونی ہو گئی ہو۔''

''صحیح کہہ رہے ہو۔ پہلے چکھی نہیں تھی نا!''

''میں تمہیں نصیحت ہی کر سکتا ہوں کہ اپنے جنون پر قابو پا لو تو اچھا ہوگا۔''

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں احسن!...... بس!...... اور کچھ نہیں سننا مجھے! اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا تو پھر انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑتی ہیں۔''

احسن نے جھنجلا کر رابطہ منقطع کر دیا اور یہ شاید اس نے اچھا ہی کیا۔ اس نے ایسی آواز سنی تھی جیسے باہر سے دروازے کا لاک کھولا گیا ہو۔

آنے والی ظاہر ہے کہ شیبا ہی ہونا چاہیے تھی۔ احسن نے محسوس کیا کہ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔

''خیریت؟'' احسن نے پوچھا اور لیٹے لیٹے موبائل کے ریکارڈ سے وہ کال ختم کر دی جو ساحرہ نے کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شیبا کی نظر اس پر پڑ جائے۔ احسن اسے اس کال کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کال کے بارے میں بتاتا تو ساری باتیں بھی بتانا پڑتیں۔ وہ زیادہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور سچ بتاتا تو شیبا، عین ممکن تھا کہ وہ آپے سے باہر ہو جاتی۔

''کیا کر رہے ہو؟'' شیبا کی نظر اس کے موبائل پر تھی۔

احسن نے موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔
"وقت گزاری کے لیے ایک گیم کھیلنے لگا تھا۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ ڈیڈی نے کیوں بلوایا تھا؟"
"میں ان کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔" شیبا نے بستر کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "دو ملازموں میں کچھ تنازعہ ہوگیا تھا بلکہ بڑھ گیا تھا۔ عشرت اعوان اس معاملے کو سنبھال نہیں سکی تھی اس لیے ڈیڈی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ڈیڈی نے مجھے اس لیے بلایا تھا کہ میں معاملہ رفع دفع کروانے میں عشرت اعوان کی مدد کروں۔ میں پریشان تو اس لیے ہوئی کہ ساحرہ وہاں سے کھسک لی تھی۔ مجھے ڈر ہوا تھا کہ وہ ادھر نہ آئی ہو۔"
"ادھر آتی بھی تو کیا فرق پڑتا۔" احسن خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں اس کے لیے دروازہ تو نہیں کھول دیتا۔"
"ہاں۔ میں شاید بلاوجہ ہی پریشان ہوئی تھی۔" شیبا نے بستر پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
احسن کو ایک ڈر یہ بھی لگا ہوا تھا کہ ساحرہ پھر فون نہ کر بیٹھے مگر جب اتنی دیر تک گھنٹی نہیں بجی تو اسے اطمینان ہوا۔
"چلو اب لیٹو، آرام کرو۔"
"نو بجنے والے ہیں۔ کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ اب لیٹ کے کیا کرنا۔ تم بھی اٹھو ڈائننگ روم میں چلنے کے لیے!"
"ہاں۔" احسن اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے ابھی کچھ زیادہ بھوک نہیں تھی اس لیے خیال ہی نہیں رہا۔"
"یہ ساحرہ۔" شیبا سوچتے ہوئے بولی۔ "میرے اعصاب پر سوار ہوتی جارہی ہے۔"
"ارے دفع کرو۔" احسن نے کہا، پھر اس کا دھیان بٹانے کے لیے بولا۔ "پرسوں تمہاری سالگرہ بھی تو ہے۔ تم نے آج تک اس کی کوئی تیاری ہی نہیں کی۔ کل شاپنگ کے لیے چلو۔"
"اس مرتبہ چند دن کی تاخیر سے منالوں گی۔ بھائی جان کے آنے کے بعد....."
"ہاں! وہ شاید دو چار دن میں آنے والے ہیں مگر انہیں تو اب تک آجانا چاہیے تھا۔ تم کہہ رہی تھیں کہ انہیں سرپرائز دینے کا بہت شوق ہے۔"
وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کمرے سے نکل کر ڈائننگ روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔
شیبا بولی۔ "ضروری نہیں کہ وہ اس مرتبہ بھی اپنی آمد کا سرپرائز دیں، ہاں البتہ کل شاپنگ تو کر ہی لوں گی۔"
لیکن دوسرے دن ایسا ہو نہیں سکا۔ صبح لان میں شیبا کے ساتھ ٹہلتے ہوئے احسن کا ایک پیر بے دھیانی میں ایک گملے سے ٹکرا گیا۔ ٹخنے میں خاصی چوٹ آئی۔ وہ لنگڑانے لگا تھا۔ احسن گھر میں موجود بام سے کام نکالنا چاہتا تھا لیکن شیبا اسے اسپتال لے گئی۔ اس کے ٹخنے کا ایکسرے کروایا گیا لیکن اس سے کوئی تشویشناک بات سامنے نہیں آئی۔ ڈاکٹر نے ایک کیپسول اپنے سامنے کھلایا اور ایک کریم دے کر رخصت کردیا۔ اس کا خیال تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں ٹخنے کا ورم بالکل اتر جائے گا اور وہ آرام سے چلنے پھرنے لگے گا۔
اسی شام دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ آغا نصیر کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ عشرت اعوان نے ان کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ وہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ عشرت اعوان نے فوری طور پر انہیں کوئی دوا کھلائی لیکن یہ ضروری سمجھا کہ انہیں فوراً اسپتال لے جایا جائے۔
افراتفری سی مچ گئی۔ لنگڑانے کے باوجود احسن بھی سب کے ساتھ تھا لیکن جب آغا نصیر کو اسپتال لے جایا جانے لگا تو شیبا کو یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ لنگڑاتا ہوا ساتھ جائے۔ کیونکہ آغا نصیر کو اسپتال لے جانے میں شیبا اور عشرت اعوان کے ساتھ ساحرہ بھی تھی اس لیے شیبا نے احسن کو گھر پر اکیلا چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ احسن اپنے کمرے میں رہ گیا۔ شیبا اس ہنگامی صورتِ حال میں بھی اس کا کمرا مقفل کرنا نہیں بھولی تھی۔
آٹھ بجے آغا نصیر کو اسپتال میں داخل کرادیا گیا تھا۔ نو بجے شیبا نے مضطرب احسن کو اطلاع دی کہ اب معاملہ ڈاکٹروں کے قابو میں آچکا ہے لیکن اسپتال سے ڈسچارج کرنے کا فیصلہ وہ ساڑھے دس بجے کے چیک اپ کے بعد کریں گے۔
ہمیشہ کی طرح آغا نصیر نے ڈاکٹروں کا یہ مشورہ رد کردیا تھا کہ وہ دو ایک دن اسپتال ہی میں رہے اور مکمل آرام کرے۔
"وحشت ہوتی ہے مجھے اسپتال کے بستر سے۔" آغا نصیر کا کہنا تھا۔
شیبا نے اسپتال سے اطلاع دینے کے بعد احسن سے کہا۔ "عشرت اعوان نے ایک ملازم کو فون کرکے ہدایات دے دی ہیں، وہ تیس چالیس منٹ میں ہم لوگوں کا کھانا لے کر آہی جائے گا۔ آج تم اکیلے ہی کھالینا۔ مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا ہے یہ کہتے ہوئے لیکن....."
"تم اطمینان سے وہاں رکو اور ڈیڈی کو لے کر آؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ مجھے جب بھی بھوک لگے گی، کھالوں گا۔"
ان دونوں میں مختصر گفتگو ہوئی۔
شادی کے بعد احسن کو نو بجے کھانا کھانے کی عادت پڑ

گئی تھی۔ سوا نو بجے اس نے ملازم سے کمرے ہی میں کھانا منگوا کر کھایا۔
ساڑھے دس بجے وہ بستر پر لیٹا ہی تھا کہ شیبا کا فون پھر آیا۔
"کھانا کھالیا؟"
"کھالیا بھئی!" احسن نے مسکرا کر کہا۔ "تم ڈیڈی کی فکر کرو۔"
"ان کی طبیعت اب بالکل ٹھیک معلوم ہورہی ہے۔ میں، ساحرہ اور عشرت اعوان انہی کے کمرے میں بیٹھے ان سے باتیں کررہے ہیں۔ دس پندرہ منٹ میں ڈاکٹر چیک اپ کے لیے آئے گا۔ امکان یہی ہے کہ ڈیڈی کو ڈسچارج کردیا جائے گا۔ ہم لوگ، میرا خیال ہے کہ گیارہ بجے تک تو آہی جائیں گے۔ تمہیں اگر نیند آئے تو سو جانا۔"
"ہاں، سو جاؤں گا۔"
احسن نے یہ کہہ تو دیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے نیند نہیں آئے گی۔ وہ کم ہی دنوں میں شیبا کی موجودگی کا عادی ہوچکا تھا۔ اس کے بغیر اسے مشکل ہی سے نیند آسکتی تھی۔
گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب احسن نے گھڑی دیکھی اور پھر کسی قسم کی آواز سے چونکا۔
ہلکی سی آواز دوبارہ آئی تو احسن کی نظریں بائیں جانب کی کھڑکی کی طرف گئیں جس پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ پردے ہلتے دیکھ کر چونک پڑا۔ ایک تو وہ کھڑکی ہوا کے رخ پر نہیں تھی، دوسرے بند بھی تھی۔ پھر پردے پر ایسا دباؤ پڑتا نظر آیا جیسے اس کے پیچھے کوئی ہو۔
"کون ہے؟" احسن بے اختیار زور سے بول پڑا۔
اب پردہ پوری طرح ہٹا اور کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھی ہوئی ساحرہ کود کر کمرے میں آگئی۔ وہ جینز اور کرتک کی بنیان میں تھی۔
"تم!" احسن گھبرا کے بستر سے اٹھا۔ اسے ٹخنے کی تکلیف کا دھیان نہیں رہا تھا لیکن جب اس نے سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش کی تو درد کے باعث دھم سے بستر پر بیٹھ گیا۔
"احسن! میری جان!" ساحرہ تیزی سے اس کی طرف آئی۔
احسن پھر جلدی سے اٹھا۔ اس مرتبہ اس نے بائیں پیر پر دباؤ نہیں ڈالا تھا جس کے ٹخنے میں تکلیف تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ ساحرہ اس سے لپٹ جائے گی۔
"رک جاؤ ساحرہ!" احسن نے سخت لہجے میں کہا۔
"آج میں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی احسن!" ساحرہ نے اس کے قریب آکر دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیے اور اس کے سینے سے لگ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "شیبا کی وجہ سے مجھے ایسے موقعے بار بار نہیں مل سکتے۔ آغا صاحب کو گھر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ میں عشرت اعوان کے ساتھ بل کی ادائیگی کے لیے کمرے سے نکل آئی تھی۔ پھر عشرت اعوان کو چھوڑ کر کار میں تیزی سے یہاں پہنچی ہوں۔ شیبا آغا صاحب کے کمرے میں تھی لیکن اب تک اسے معلوم ہوچکا ہوگا کہ میں اسپتال سے جاچکی ہوں۔ وہ میری وجہ سے پریشان رہنے لگی ہے۔ وہ جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ یوں سمجھ لو کہ بس پندرہ منٹ ہیں میرے پاس!" وہ برق رفتاری سے بولتی چلی گئی تھی اور پھر اس کا ایک ہاتھ احسن کی گردن سے ہٹ کر اس کی قمیص کے بٹن تک پہنچا۔
احسن نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے بولا۔ "یہ کیا کررہی ہو؟"
"شیبا سے شادی ہوچکی ہے تمہاری۔ یہ اب تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ میں کیا کررہی ہوں۔"
احسن نے اسے قمیص کا بٹن نہیں کھولنے دیا اور کوشش کی کہ اسے دھکیل دے لیکن ساحرہ کا ایک ہاتھ بڑی مضبوطی سے اس کی گردن کے گرد جما ہوا تھا۔ خود احسن اپنے ٹخنے کی تکلیف کے باعث زیادہ طاقت صرف نہیں کرسکا۔
"تم مجھے کیوں دور کرنا چاہتے ہو احسن!" ساحرہ کے تنفس کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ "کیا میرا لمس تمہارے جسم میں بجلیاں نہیں بھر سکا؟"
احسن کا جسم سنسنا تو اٹھا تھا۔ شیبا اس کے سینے سے بالکل چپکی ہوئی تھی۔
"تم جو کچھ چاہتی ہو، وہ کبھی نہیں ہوگا۔" احسن نے کہا۔ اس کی سانس پھولنے لگی تھی اور وہ اب بھی کوشش کررہا تھا کہ شیبا کو خود سے الگ کردے۔
"میں تم سے محبت کرتی ہوں احسن!" اس مرتبہ ساحرہ کا انداز ایسا تھا جیسے رو پڑے گی۔ "تمہیں حاصل کرنا تو میری زندگی کی تمنا رہی ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ تم صرف شیبا کی ملکیت بنے رہو۔"
"تم جسے محبت کہہ رہی ہو، یہ ہوس ہے ساحرہ!"
"یہ انسان کی فطرت ہے۔"
"انسان کی نہیں، جانور کی فطرت ہے۔ اس جنون نے تمہیں جانور بنادیا ہے لیکن میں جانور نہیں ہوں۔"
ساحرہ ایک جھٹکے سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپکنے لگی تھی۔ اس نے احسن کو گھورتے

ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں مجھ سے کبھی محبت نہیں رہی۔ جھوٹ بولتے رہے ہو تم مجھ سے!'' ساحرہ کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔

احسن نے کہا۔ ''محبت کا اس وحشت سے کوئی تعلق نہیں جو اس وقت تم پر طاری ہے۔''

''میں یہ وحشت تم پر طاری کر دوں گی۔ ابھی تم نے دیکھا نہیں ہے کہ میں کیا ہوں۔'' ساحرہ نے کہتے ہوئے اپنی گردن کے قریب سے اپنی بنیان پکڑی اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ جھرجھرا کر اتنی پھٹ گئی کہ اس کا جسم کسی سرکش موج کی طرح امڈتا دکھائی دیا۔ احسن نے گھبرا کر اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔

''میری طرف دیکھو احسن!'' ساحرہ ہانپنے سی لگی تھی۔

''شیبا میں یہ سب کچھ ایسا نہیں ہوگا۔''

''چلی جاؤ ساحرہ!'' احسن نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لیکن ساحرہ کسی پاگل بلی کی طرح اس پر جھپٹ پڑی۔ اس نے احسن کا ہاتھ پکڑ کر کوشش کی کہ وہ اس کے جسم کا لمس محسوس کرلے۔

احسن نے پوری طاقت سے اپنا ہاتھ کھینچنے کی کوشش کی۔ ٹخنے کی تکلیف کے باعث وہ بستر پر گر پڑا۔ ساحرہ اسے بستر پر پوری طرح گراتے ہوئے اس پر چھا گئی۔

احسن کا ایک ہاتھ اب ساحرہ کی خواہش پوری کر رہا تھا لیکن دوسرا ہاتھ آزاد تھا۔ اس نے ساحرہ کے بال پیچھے سے پکڑ کر انہیں اس طرح کھینچا کہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھا۔ احسن کا وہ ہاتھ آزاد ہوگیا جو شیبا کے ہاتھ میں دبا ہوا اس کے جسم پر تھا۔ اب احسن نے دھکیل کر ساحرہ کو اپنے اوپر سے ہٹایا اور تیزی سے بستر کی دوسری جانب اتر گیا۔ اگر اس کے ٹخنے میں تکلیف نہ ہوتی تو وہ ساحرہ کو اتنا بے قابو ہونے سے بہ آسانی روک لیتا۔

ساحرہ بستر کی دوسری جانب اتر گئی اور احسن کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''کچھ بھی ہوجائے احسن! آج میں تمہارے کمرے سے پیاسی نہیں لوٹوں گی۔''

احسن اب بھی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

اسی وقت دروازے کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے اس کا قفل کھولنے کی کوشش کی جارہی ہو۔

''نہیں کھلے گا۔'' ساحرہ دیوانگی سے ہنسی۔ ''میں نے اسپتال جانے سے پہلے ہی اس میں اینٹی ڈال دی تھی۔''

''کون ہے اندر؟'' باہر سے شیبا کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''احسن! کیا ساحرہ ہے؟''

''ہاں۔'' ساحرہ نے بلند آواز اور جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں ہی ہوں لیکن بہتر ہوگا کہ آج تم مجھے بھول جاؤ ورنہ شاید بہت برا ہو، آج میں یہاں سے ناکام نہیں جاؤں گی۔''

''یہ چابی کیوں نہیں لگ رہی ہے احسن!'' شیبا کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''اسپتال جانے سے پہلے ہی بے کار کر دیا تھا میں نے لاک۔'' ساحرہ حقارت سے مسکرائی۔ ''آج کی رات اس کمرے میں قدم رکھنا تمہارے لیے ممکن نہیں۔ آج یہاں میری حکومت رہے گی۔''

پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر احسن کی طرف متوجہ ہوئی اور تیزی سے بستر کے گرد گھوم کر احسن کی طرف بڑھی۔

احسن نے بھی تیزی سے بستر کے گرد گھوم کر ساحرہ سے دور رہنے کی کوشش کی۔ ٹخنے کی تکلیف کے باوجود وہ ساحرہ سے بچنے میں کامیاب رہا تھا۔ گھبراہٹ، پریشانی اور ساحرہ پر غصے کے باوجود اسے اس وقت اپنی حالت مضحکہ خیز محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ایک لڑکی سے بھاگنا پڑ رہا تھا۔ اگر اس کے ٹخنے میں تکلیف نہ ہوتی تو وہ ساحرہ کو بے بس کرسکتا تھا۔

باہر اب شور ہونے لگا تھا۔ شیبا اب ملازموں کو پکار رہی تھی۔

''یہ اتنی جلدی کیسے آگئی!'' ساحرہ کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔

احسن بستر کی دوسری جانب تھا۔ اس نے کھڑکی کی جانب بڑھنا چاہا۔ اسے خیال ہوگا کہ جس طرح ساحرہ ادھر سے آگئی تھی، اسی طرح وہ بھی ادھر سے نکل سکتا ہے۔

اس مرتبہ ساحرہ نے بستر کے گرد چکر نہیں لگایا۔ وہ بستر پر چڑھ کر احسن کی طرف جھپٹی اور اسے کمر سے پکڑ لیا۔ وہ اسے کھینچتے ہوئے بستر کے قریب لے گئی۔ احسن کے ٹخنے کی تکلیف اب بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ خود کو ساحرہ کے سامنے بے بس محسوس کر رہا تھا۔

باہر سے دروازے کو دھکے مارے جانے لگے۔ دھکے مارنے والے ملازم ہی ہوسکتے تھے اور دروازہ توڑنے کی ہدایت انہیں شیبا ہی سے ملی ہوگی۔

''اندر کیا ہو رہا ہے احسن؟'' شیبا نے چیخ کر پوچھا۔

''گھبرانا مت شیبا!'' احسن نے بھی چیخ کر کہا۔ ''میرے ٹخنے کی تکلیف مجھے بے بس کر رہی ہے لیکن میں

ساحرہ کا گھناؤنا مقصد پورا نہیں ہونے دوں گا۔''

''دروازہ بہت مضبوط ہے۔'' ساحرہ احسن کو بستر پر گراتے ہوئی بڑبڑائی۔ ''دیر لگے گی اسے ٹوٹنے میں۔'' لیکن اپنے اس خیال کے باوجود وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے چیخی۔ ''اگر کوئی اندر داخل ہوا شیبا...... تو قیامت آجائے گی آج......! اگر میری آگ نہ بجھی تو میں اس گھر میں آگ لگا دوں گی۔''

''یہ اندر کیسے پہنچ گئی!'' یہ عشرت اعوان کی آواز تھی۔ اسے دروازے پر دھکے لگنے والے شور کے باعث زور سے بولنا پڑا تھا۔

''یہ بھی آگئی۔'' ساحرہ بڑبڑائی اور پھر احسن کی طرف متوجہ ہوئی۔ احسن اب بستر پر بیٹھ گیا تھا اور کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساحرہ نے پھر اسے دھکیل دیا اور خود بھی اس پر چھا گئی۔ اس نے احسن کے کالر کے اندر ہاتھ ڈال کر زور سے جھٹکا دیا۔ قمیص بہت مضبوط کپڑے کی تھی۔ وہ پھٹ تو نہیں سکی لیکن اوپر کے دو بٹن ٹوٹ گئے۔

احسن کے ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے بڑی زور سے ساحرہ کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا۔

ساحرہ یک لخت خود ہی اس سے الگ ہو گئی اور اس طرح احسن کی طرف دیکھنے لگی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

''تم نے مجھے مارا احسن!'' ساحرہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''اپنی ساحرہ کو طمانچہ مار دیا؟''

احسن کو بستر سے اٹھنے کا موقع مل گیا۔

یک لخت ساحرہ دیوانوں کی طرح ہنس پڑی۔ ''لیکن تم نے مجھے نفرت سے نہیں مارا ہوگا۔ مجھے یقین ہے، تمہارے دل میں میری محبت اب بھی ہے۔ تم نے یہ تھپڑ میری وحشت کو مارا ہے کیونکہ شیبا سے شادی کے بعد تمہیں اس سے آشنا ہو جانا چاہیے تھا''

اس وقت احسن نے دوبارہ کھڑکی کی طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ساحرہ کی طرف دیکھ رہا تھا اس وقت اسے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ ساحرہ کی قمیص اس حد تک پھٹی ہوئی تھی کہ وہ تقریباً بے لباس نظر آنے لگی تھی۔

دروازہ دھڑام سے چوکھٹ سے نکل کر اندر آگرا۔ ساحرہ کا خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ دروازہ ٹوٹنے میں زیادہ دیر لگے گی۔ وہ چونک کر اس طرف متوجہ ہوئی۔

شیبا دروازے کو پھلانگتے ہوئے اندر آگئی۔ ملازمین اندر نہیں آئے۔ غالباً شیبا ہی نے انہیں روک دیا ہوگا۔ احسن اب لنگڑاتا ہوا پیچھے ہٹا تا کہ شیبا کے قریب پہنچ جائے۔

''میں نے کہا تھا تم سے کہ اندر نہ آنا۔'' ساحرہ نے دانت پیسے۔ اس وقت اس کے بال بالکل بکھر گئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے پاگل خانے سے کوئی دیوانی لڑکی بھاگ نکلی ہو۔

شیبا کا چہرہ سفید ہوا جا رہا تھا لیکن وہ غصے سے بولی۔ ''بس اب یہاں سے چلی جاؤ ساحرہ! اس سے پہلے کہ ڈیڈی کو سب کچھ معلوم ہو جائے، یہاں سے چلی جاؤ۔ میرا وعدہ ہے کہ میں زبان بند رکھوں گی اور اب احسن کی بات بھی مان لوں گی۔ ہم اس گھر سے کہیں چلے جائیں گے۔''

''میں جانے دوں گی، تب نا!'' ساحرہ نے پھر دانت پیسے اور اپنا دایاں ہاتھ اپنی پشت پر لے گئی۔ جب اس کا ہاتھ سامنے آیا تو اس میں پستول تھا۔ غالباً وہ چھوٹا سا پستول اس نے پیٹھ کی طرف اپنی جینز میں اڑس رکھا تھا۔

''میں ہر طرح کی صورتِ حال کے لیے تیار ہو کر آئی تھی شیبا!'' ساحرہ نے خوں خوار لہجے میں کہا۔ ''میں نے آغا صاحب سے نشانہ بازی بھی سیکھی ہے اور دو دن پہلے یہ پستول بھی خرید لائی تھی۔ اس وقت مجھے خیال نہیں تھا کہ یہ مجھے کن حالات میں استعمال کرنا پڑے گا۔ چلی جاؤ تم یہاں سے۔ احسن کی ٹھیکے دار مت بنو۔''

''ٹھیکے دار تو میں ہوں احسن کی!'' شیبا نے پستول سے خوف زدہ ہوئے بغیر کہا۔

اسی وقت ایک نوجوان تیزی سے کمرے میں آیا اور پھر ٹھٹک گیا۔ ساحرہ نے تیزی سے اپنے پستول کی نال اس کی طرف کر دی تھی۔

''بھائی جان!'' نوجوان کو دیکھتے ہی شیبا کے منہ سے نکلا۔

ایک غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے اس کے لہجے میں خوشی کی وہ لہر نہیں تھی جو بھائی کو دیکھ کر ہونا چاہیے تھی۔

''کیا ہے یہ سب!'' نوجوان کے لہجے میں حیرت تھی، پریشانی بھی اور تناؤ کی کیفیت بھی!

''تم بھی چلے جاؤ یہاں سے!'' ساحرہ غرائی، پھر شیبا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''احسن کو یہاں چھوڑ کر تم بھی چلی جاؤ ورنہ تم دیکھ رہی ہو کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے، کچھ بھی ہو جائے گا شیبا! کچھ بھی!''

''کون ہو تم؟'' شیبا کے بھائی نے ساحرہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ خاصا تیکھا تھا۔

شیبا تلخی سے بول پڑی۔ ''یہ ہماری ہی سوتیلی ماں ہے بھائی جان اور یہ......'' وہ نہ جانے کیا کہتے کہتے رک گئی۔

''چلی جاؤ شیبا!'' ساحرہ پھر کھا جانے والے انداز میں بولی۔ ''میں احسن کو ساتھ لے کر ہی یہاں سے جا سکتی ہوں۔''

''احسن نہیں جائے گا۔'' ساحرہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اور اگر جائے گی تو اس کی لاش جائے گی۔ اسے گولی مار کر میں خود کو بھی ختم کر لوں گی۔ اگر احسن میرا نہیں ہو سکتا تو پھر کسی کا بھی نہیں ہوگا۔''

اس صورتِ حال میں بہتر یہی تھا کہ ساحرہ پسپائی اختیار کر لیتی مگر وہ شاید اس وقت پاگل ہو چکی تھی۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔

شیبا جلدی سے احسن کے سامنے آگئی اور ساحرہ کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''احسن سے پہلے تمہیں مجھے گولی مارنا پڑے گی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ''میں احسن کو اپنے سامنے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔''

احسن نے شیبا کو اپنے سامنے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ''وہ پاگل ہو رہی ہے۔''

''اس کے پاگل پن کا نشانہ پہلے میں بنوں گی۔''

''چلو تو ایسا ہی سہی!'' ساحرہ نے دانت پیسے۔ اس وقت اس کی توجہ شیبا کے بھائی کی طرف سے کم ہو گئی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ دھیرے دھیرے ساحرہ کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔

''خدا حافظ شیبا!'' ساحرہ نے کہا۔

اور پھر گولی چلی!...... شیبا کا بھائی ابھی ساحرہ سے کچھ دور ہی تھا۔

ساحرہ کے منہ سے کراہ نکلی۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کے سینے سے خون ابل پڑا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ڈگمگائی اور گر پڑی۔

احسن، شیبا اور اس کے بھائی کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ اس آواز سے چونکے جو کھڑکی کی طرف سے آئی تھی۔ انہوں نے عشرت اعوان کو دیکھا جو کود کر کمرے میں آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا۔ وہ بڑی نفرت سے ساحرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''پولیس کو فون کرے کوئی۔'' احسن بوکھلا کر بولا۔

''نہیں۔'' عشرت اعوان سخت لہجے میں بولی۔ ''میں نے اس طرح گولی ماری ہے کہ اس کا دل زد پر نہ آئے۔ اس کا خون بہنے دو۔ اسے تڑپ تڑپ کر ہی مرنا چاہیے۔ پولیس آئے گی تو ایمبولینس بھی آئے گی اور اسپتال میں اسے شاید بچا لیا جائے۔''

ساحرہ تڑپ رہی تھی۔ احسن سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ عشرت اعوان کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ پڑا۔ ''کیا پاگل ہو گئی ہو تم!''

''کوئی فون نہیں کرے گا۔'' عشرت اعوان نے سفاک لہجے میں کہا اور گولی چھت کی طرف چلا کر ان لوگوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔

کمرے کے باہر سے ملازمین کی بلند آوازیں آنے لگی تھیں۔

احسن فرش کے قریب پڑی ساحرہ کے قریب پہنچ کر بیٹھا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

یک لخت ساحرہ کے چہرے سے اذیت کے آثار ختم ہو گئے۔ وہ مسکرا اٹھی۔ اس کا خون آلود ہاتھ احسن کے چہرے پر گیا اور وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ ''میں نے کہا تھا نا! اب بھی محبت کرتے ہو تم مجھ سے!''

اسی وقت پریشان حال آغا نصیر تیزی سے کمرے میں آیا۔ اسے ملازمین سے صورتِ حال کا علم ہو گیا ہوگا لیکن اس کے ادھر آنے کا سبب گولیاں چلنے کی آوازیں ہی ہو سکتی تھیں۔

''کیا ہوا ہے یہ!'' وہ ایک ایک کا منہ تکتے ہوئے بولا۔ اس نے خون آلود ساحرہ کا سر احسن کی گود میں دیکھا تھا لیکن اس کی نظریں عشرت اعوان پر جم گئیں۔ ''یہ تم نے کیا، کیا؟'' وہ چیخ پڑا۔

''میں نے وہی کیا ہے جو پہلے کرتی رہی ہوں۔'' عشرت اعوان نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تمہاری دوسری اور تیسری بیوی کو بھی میں نے ہی مارا تھا۔ اب اسے بھی گولی مار دی ہے۔ جلد ہی یہ بھی مرنے والی ہے۔''

''یہ کیوں کیا تھا تم نے!'' آغا نصیر پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔

''تم نے مجھے ذلیل کیا تھا آغا!'' عشرت اعوان نے آغا نصیر کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے مجھے محبت کا جھانسا دے کر میری دوشیزگی ختم کی تھی اور پھر شیبا کی ماں سے شادی کر لی تھی۔ مجھے بتایا تھا کہ تم نے اپنے والد کے جبر کی وجہ سے وہ شادی کی تھی۔ پھر جب تمہارے والد کا انتقال ہو گیا تو تم نے مجھے بہلا پھسلا کر اپنی سیکریٹری بنا لیا، لیکن شیبا کی ماں کے انتقال کے بعد بھی تم نے مجھ سے شادی نہیں کی۔''

کمرے میں موجود سبھی لوگ حیرت سے عشرت اعوان کی باتیں سن رہے تھے مگر احسن ان سے بے خبر، ساحرہ کو اپنی

آغوش میں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے کپڑے بھی ساحرہ کے خون سے رنگین ہو گئے تھے۔

''بہت خوش قسمت ہوں میں!'' ساحرہ ڈوبتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ''مرتے وقت ہی سہی!..... مجھے کم از کم تمہاری آغوش تو.....'' اس سے مزید نہیں بولا جا سکا۔ تیزی سے بہتے ہوئے خون کے ساتھ اس کا چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔

عشرت اعوان تلخ لہجے میں بول رہی تھی۔ ''شیبا کی ماں کے انتقال تک میری عمر خاصی ہو چکی تھی اس لیے اس وقت بھی تم نے مجھ سے شادی کرنے کے بجائے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر لی۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے منصوبہ بندی کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد تم نے پھر ایک نوجوان لڑکی سے شادی کی۔ موقع پا کر میں نے اسے بھی ہلاک کر دیا۔ میں تمہاری کسی نوجوان بیوی کو زندہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تم کو میں نے اس لیے نہیں مارا آغا کہ تمہاری محبت تو میرے دل میں آج بھی ہے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ تم شادیاں کرتے رہو گے اور میں انہیں اس طرح مارتی رہوں گی کہ میں قانون کی زد پر نہ آؤں لیکن آج مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ قانون میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ گزشتہ ماہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میں کینسر کا شکار ہو گئی ہوں۔ مرنا تو اب مجھے ہے۔''

اس وقت احسن کی آغوش میں ساحرہ کا سر ڈھلک چکا تھا۔ احسن کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور اس نے ساحرہ کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔

شیبا کی نظریں کبھی عشرت اعوان کی طرف جا رہی تھیں اور کبھی ساحرہ اور احسن کی طرف.....!

شیبا کا بھائی سکتے کے سے عالم میں کھڑا ہوا تھا اور آغا نصیر کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اسے اس وقت شاید یہ خیال بھی نہ ہو کہ اس کی مقتول بیوی احسن کی آغوش میں تھی۔

وزنی جوتوں کی دھمک سنائی دی۔ وہ پولیس کے آدمی تھے۔ غالباً کسی ملازم نے فون کر دیا تھا۔

♥♥♥

تین دن گزر گئے۔ آغا نصیر کے گھر میں سناٹا چھایا رہا۔ احسن اور شیبا ایک ہی بستر پر سو رہے تھے مگر ان کی آپس میں کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔

تیسری رات احسن سے خاموش نہ رہا گیا۔ ''مجھ سے ناراض ہو شیبا؟''

''نہیں احسن!'' شیبا نے طویل سانس لی۔ ''بس سوچتی رہی ہوں کہ تم سے کیا بات کروں۔ ہاں ایک بات کا احساس مجھے بہر حال ہے..... انسان اپنی پہلی محبت کبھی بھول نہیں سکتا۔''

''میں شرمندہ ہوں۔'' احسن نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے اس رات ساحرہ کو طمانچا بھی مار دیا تھا۔ میں اس کی وحشت کا نشانہ کسی قیمت پر نہیں بنتا۔ مجھے اس پر شدید غصہ آتا رہا تھا لیکن جب اس کے گولی لگی، جب وہ مرنے لگی تو وہ منظر میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ مجھے خوب احساس ہے کہ جب میں نے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا، اس وقت تمہارے دل پر کیا گزر گئی ہو گی۔''

''میرے دل پر جو کچھ گزری، وہ تو فطری امر تھا۔''

''یقین کرو۔ میں اسے بھلانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا تھا لیکن اسے مرتے دیکھ کر مجھے نہ جانے کیا ہو گیا۔''

''وہی ہوا جو کسی محبت کرنے والے کو ہوتا ہے۔'' شیبا کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''ابھی کہہ چکی ہوں میں!..... پہلی محبت شاید کبھی نہیں بھلائی جا سکتی۔''

''لیکن اب وہ اس دنیا سے جا چکی ہے۔ اب صرف تم ہو اور میرے لیے ہو اور میں تمہارے لیے!''

''بدنصیب تھی وہ۔'' شیبا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اور جیسی بھی تھی، اس کا ذمے دار کسی کو ٹھہرانا شاید ٹھیک نہ ہو لیکن کاش..... کاش والدین اپنی جوان ہوتی ہوئی بیٹی کو اپنے کمرے میں نہ سلایا کریں۔''

''کیا مطلب؟''

''غربت..... انتہائی غربت میں زندگی گزاری تھی ساحرہ نے!..... گھر میں ایک ہی کمرا تھا۔ والدین کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ بیچ میں پردہ ڈال لیں۔ پردہ بھی نصیب نہ ہو تو ٹاٹ ڈال لیا کرتے۔''

احسن چپ رہ گیا۔ غالباً بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ رشتے داری بہت دور کی سہی لیکن اسے علم تھا کہ ساحرہ اپنے والدین کے ساتھ ہی کمرے میں سویا کرتی تھی۔

''خیر!'' شیبا پھر بولی۔ ''جو ہونا تھا، ہو گیا۔ اب تو تم صرف میرے ہو نا؟'' اس نے احسن کی طرف کروٹ لی اور مسکرائی۔

''ہاں شیبا!..... تمہارا ہوں، صرف تمہارا۔''

احسن واقعی پھر صرف شیبا ہی کا رہا لیکن جب ساحرہ کی برسی آتی تو وہ اس کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانے ضرور جاتا تھا۔

♠♠♠